سچ بیانیاں جو آپ کو حیران کر دیں گی

آداب عرض

جنوری 2012ء

PDFBOOKSFREE.PK

انوار علیگی کے قلم سے ایک
دہشت ناک سچائی

آسیب

ایک حسینہ کا قصہ حیات
ایک جن جس کی زلفوں کا اسیر تھا

نیا سال مبارک

اپنی ازدواجی اور ذہنی الجھنوں سے

ماریہ جوزف

کو آگاہ کیجئے اور پرسکون ہو جایئے

عنوان	تعارف	مصنف	صفحہ
آپ کی محفل	قارئین اور مدیر اعلیٰ کی چاہت بھری سرگوشیاں دل کی دھڑکنوں سے آراستہ محفل	خالد بن حامد	7
حضرت زکریا علیہ السلام	قرآن و حدیث کے حوالے سے آپ کے لئے معلومات افزا مضمون، انسانیت کے فروغ کا ابتدائی نصاب ہمیں یہیں سے ملتا ہے	م۔قادر یوسفی	11
عشق سیڑھی کانچ کی	بلال کے دل میں سچائی کی، نور کی اک کرن اتر آئی تھی اسی لئے اس کا ہر فیصلہ اللہ کی خوشنودی کے لئے تھا۔ پھر قدرت بھی اس پر مہربان رہی۔ ایک خوبصورت تحریر کی آخری قسط!	امجد جاوید	19
انجام	جب آپ دوسروں کو فریب دے رہے ہوتے ہیں تو کوئی دیکھے یا نہ دیکھے، قدرت ہر لمحہ کی گواہ ہوتی ہے۔ پھر جب گرفت ہو تو دراز رسی گلے کا پھندا بن جاتی ہے۔ ایک سچائی!	راجہ ضیاء اللہ	61
مرحلے وفا کے	وفا کے مرحلے ابھی توصیف کی جان پر قرض ہیں لیکن کوئی نہ کوئی حادثہ پھر اسے معاشرے کی بدصورتیاں ختم کرنے کی خاطر مجبور کر دیتا ہے۔ ایک طویل سچائی کی 111 ویں قسط!	ڈاکٹر نسیم جاوید سید	76
غم کے رنگ ہزار	زندگی کے کینوس پر ہر کوئی خوبصورت رنگ بکھیرنا چاہتا ہے لیکن سب کچھ تو اپنے اختیار میں نہیں ہوتا نا! کسی کی زندگی سے وابستہ سچائیاں آپ کو بھی دکھی کر دیں گی۔	اعتبار ساجد	103
آخری لڑکی	یہاں جن کے پیٹ خالی ہیں، وہ پیٹ بھرنے کے لئے گمراہی اختیار کرتے ہیں اور جن کے پیٹ بھرے ہیں، وہ تفریح کے لئے بھٹکتے ہیں۔ ایک چیختی تحریر کی آخری قسط!	احمد اعجاز	121
سلگتی روح	ہر انسان کی زندگی میں ایسا لمحہ ضرور آتا ہے جب اپنا آپ کسی کو سونپ دینے کو دل چاہتا ہے اور پھر جیسے کچھ بھی دسترس میں نہیں رہتا۔ ایک سلگتی روح کا سچا اعتراف!	ایم۔سلیم	157
آسیب	وہ مخلوق جس کی تخلیق آگ سے ہوئی، وہ یہیں ہمارے آس پاس بلکہ ہمارے درمیان ہی رہتی ہے۔ اس خاندان کا واسطہ ایک مخلوق سے رہا۔ حیران کر دینے والے واقعات کی دوسری کڑی!	انوار علیگی	163
ناقابلِ فراموش	ہر ماہ آپ کی جانب سے ملنے والے واقعات کا اچھوتا انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔ اس ماہ یہ مختصر واقعات پیش ہیں	مستقل عنوان	207

فریب کار	اے۔ایف	صبر کا صلہ	خالد محمود شیخ	جذبات کا شکنجہ	فریدہ جیلانی
یہ کیسی خوشی	محمودہ خانم آرزو	آزمائش	آسیہ راجپوت	واہ ری عورت	سفار حسین
کسی کا دوش نہیں	فرح دیبا لاشاری				

عنوان	تعارف	مصنف	صفحہ
منظوم حکایات	شاعری کا ذوق رکھنے والوں کے لئے ہر ماہ ایک اچھوتا انتخاب--- اس ماہ 72 شعراء کرام کا کلام آپ کی نذر ہے	شعراء کرام	225
آپ کے نام	آداب عرض قبیلہ کی بزم آرائیاں ایک مقبول سلسلہ--- یہاں کوئی دستک شاید آپ کے لئے بھی ہوگی	مستقل عنوان	238
نفسیاتی مسائل	جوانی دوانی یا ذہنی پریشانی آپ بھی اپنے لوگوں کو بتاتے ہوئے شرماتے یا گھبراتے ہیں، ماریہ جوزف سے کہہ دیجئے اور پر سکون ہو جایئے۔	ڈاکٹر ماریہ جوزف	247
کچھ تو کہیئے	اجتماعی نوعیت کے ایک سوال کا جواب آپ یقیناً دینا چاہیں گے اور sms کے ذریعے تو آپ اپنے خیالات کا اظہار آسانی سے کر سکتے ہیں۔	م۔قادر یوسفی	253
طب نبوی	آپ کے جذبات کے ترجمان آپ ہی کے ارسال کردہ پسندیدہ اشعار کا من موہنا انتخاب!	حکیم شیخ محمد امین	256
سوچ نگر	آپ کے ذہن میں اُبھرنے والی سوچ کرنیں اس عنوان سے جلا پاتی ہیں، یہ سوچیں آپ کی شخصیت کی آئینہ دار ہیں	مستقل عنوان	259
میرا پسندیدہ شعر	آپ کے جذبات کے ترجمان آپ ہی کے ارسال کردہ پسندیدہ اشعار کا من موہنا انتخاب	مستقل عنوان	267
بحث و نظر	گزشتہ شمارے کے بارے میں آپ کی بے لاگ رائے--- آپ کی پرکھ ہی ہمارے انتخاب کی کسوٹی ہے	مستقل عنوان	270

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قارئین اور مدیر اعلیٰ کے براہ راست رابطہ کی خاطر ایک عنوان۔۔۔
اپنائیت اور چاہت بھری سرگوشیاں' آپ کا اعتماد اور ہمارا مان بڑھانے
والے دل کی دھڑکنوں سے آراستہ محفل۔ اپنے خطوط اس پتہ پر بھیجئے۔

"آپ کی محفل" ماہنامہ "آداب عرض" پوسٹ بکس نمبر 4132 ملتان روڈ لاہور 54500

آپ سب کے لئے خیر و سکون کی دعائیں لئے حاضر ہوں۔

آج شدت سے یہ احساس ذہن و دل کو مضطرب رکھے ہوئے ہے کہ اپنے زندہ ہونے کا احساس دوسروں کو کیسے دلایا جائے اور خود کیسے کیا جائے۔ اک صورت تو یہ ہے کہ جس کی تکمیل اپنی دانست میں آج میں نے کی ہے، خود کو بہلا لیا ہے۔ ماضی سے پیوستہ رہ کر، اپنی روایتوں کو نبھا کر آپ کو یہ یقین دلا رہا ہوں کہ ابھی زندہ ہوں۔ وہ اک وعدہ جو آپ کے روبرو کیا تھا اس پرچے کی صورت پورا کر دیا ہے لیکن اس دوران لمحہ لمحہ جو اس دل پر گزرتی ہے، اس کا اندازہ کچھ میں ہی کر سکتا ہوں۔ یہ دن مجھ پر جس طرح گزر رہے تھے، اس کا اک اک لمحہ میرے لئے اک عنوان کی صورت رکھتا ہے اور ذہن کے کمپیوٹر میں ہر عنوان کے تحت ایک کہانی موجود ہے۔ یہ وہ سوئیاں ہیں جو سینے میں چبھتی رہتی ہیں اور ان مہینوں، ان دنوں میں ان کی کھٹک کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی ہے۔ ادھر آپ کو بھی اپنے زندہ ہونے کا احساس دلانے کے لئے مجھے الجھنا پڑتا ہے اور ادھر یہ ٹیسیں چاہتی ہیں کہ خود کو فراموش کی اک طویل رات گزاری جائے۔ وہ سارے منظر، وہ ساری ساعتیں اک مرتبہ پھر متحرک کر لی جائیں جو رگوں میں منجمد سی دکھائی دیتی ہیں۔ یوں مجھے اک دوہری جنگ لڑنا پڑتی ہے۔ ان بیتے دنوں کے گواہ تو آپ بھی ہیں، آپ کو بھی میں ہمیشہ ساتھ لے کر چلا ہوں اس لئے انہیں دہرانا نہیں چاہتا لیکن یہ طے ہے کہ آپ کے ہاتھ تو یقیناً کچھ نہ کچھ جاتا ہوگا مگر اس جنگ کا انجام مجھے نڈھال کر دیتا ہے۔ آپ کو اپنے زندہ ہونے کا احساس دلا کر میں خود یہ یقین پانے کو بھٹکنے لگتا ہوں اور یہی وہ مرحلہ ہوتا ہے کہ جب اندھیرے میں کوئی کرن نہیں دکھائی دیتی۔ آپ کے لئے تو میری ان بیدار ساعتوں میں دل بستگی کا بہت سا سامان نکل آتا ہے لیکن آپ کو یہ سب دینے کے بعد میری رگوں سے یہ ساعتیں زندگی کی تمام حرارت نچوڑ لیتی ہیں۔ شاید آج کے دور میں یہ اک میرا ہی مسئلہ نہیں، جو بھی انسان آج احساس رکھتا ہے، زندہ رہنے کے لئے دوسرے کے سہارے کو ڈھونڈتا ہے، وہ شاید اسی کرب میں مبتلا ہے۔ وہ دوسروں کو تو اپنے ہونے کا احساس دلا دیتا ہے لیکن خود اپنی ذات کو یہ احساس دلانا اسے بہت کٹھن دکھائی دیتا ہے یا شاید ایسا ہے کہ دوسروں کی خود غرضیاں ہم جیسے حساس دلوں کو آج متحرک رکھے ہوئے ہیں۔ ہم صرف ان کو شاداب رکھنے کے لئے خود مرجھائے جاتے ہیں، یوں خود کو بہلا لیتے ہیں کہ فلاں کی جانب سے جو فرض ہم پر واجب تھا پورا ہوا۔ کم از کم اس کو تو ہماری طرف سے مایوسی نہیں ہوئی، اس کی امید کا پودا تو سرسبز رہا خود اپنا کیا حال ہوا، یہ جاننے کی شاید اس کو ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ جس کے لئے ہم عذاب جھیلتے ہیں، اپنے آپ کو گردش میں رکھتے ہیں۔ ہم جن کے لئے جیتے ہیں، ان کی یہ بے اعتنائیاں ہمارے سینے کو بوجھل کر دیتی ہیں، ہر سانس یوں لگتا ہے کہ کسی دہکتی ہوئی آگ سے گزر کر آتا ہے لیکن کسی کو اس جلن، اس تپش کا احساس نہیں ہوتا۔ ہم جن کے لئے پریشان ہوتے ہیں، انہیں اتنی بھی فرصت نہیں ملتی کہ اک لمحے کو رک کر یہی پوچھ لیں کہ تمہارا یہ حال کیوں کر ہوا۔ آج کے اس دور میں شاید حساس دل صرف دوسروں کو ہی اپنے زندہ ہونے کا احساس دلا سکتے ہیں، خود ان کے لئے یہ احساس پانا مشکل ہے لہٰذا ان کی عمروں کو چڑھتے اور ڈوبتے سورج کے ساتھ بیتے دنوں سے شمار نہ کیا جائے، ان کی عمر کو اس کرن سے شمار کیا جائے تو اندھیرے میں کبھی لپکتی ہے اور انہیں زندہ ہونے کا احساس دلا جاتی ہے لیکن پھر اک طویل وقفہ ایسا آ جاتا ہے کہ چار سُو اندھیرے ہوں، جسم و جان پر موت کا سا سناٹا رہے اور کچھ خبر نہ ہو کہ پھر صبح کب ہوگی، وہ کرن پھر کب دکھائی دے گی اور کب اپنے زندہ ہونے کا احساس ملے گا۔ یہ بوجھ آج دل پر بہت بھاری ہے۔ اسے ہٹاتے ہٹاتے کہیں یہ صفحات جو میری دسترس میں ہیں، تمام نہ ہو جائیں۔ یہ جھگڑا تو شاید کبھی نہ نمٹے لہٰذا اس دعا کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

سائل خود کو سمجھتا ہوں کہ وہ سدا خوش و آباد رہیں کہ جنہیں ہم نے زندگی کے نام کا زخم دے دیا ہے۔

اس بار پہلا خط کراچی کے جناب **محمد باقر اقبال** کا ہے۔ چلئے، پانچ برس بعد آپ کو مخاطب ہونے کا حوصلہ تو ملا۔ میں یہ ہی سمجھوں گا کہ ان پانچ برسوں میں آپ یقیناً اپنے مزاج کو آداب عرض سے ہم آہنگ کرتے رہے ہوں گے جب ہی تو پہلی دستک پر یہ در کھل گیا۔ ہے، نا!! اپنی ذاتی چھتیس غزلوں میں سے کوئی اک جھلک مجھے دیجئے، شاید وہ بھی آداب عرض کے حسن میں اضافہ کا سبب بنیں۔ کراچی تو اکثر آنا ہوتا ہے اور گزر بہادر آباد سے بھی ہوتا ہے۔ کوشش کروں گا کہ اس بار آنا ہوا تو آپ کو مطلع کر سکوں۔ میرے لائق کوئی اور خدمت۔۔۔؟

ملتان کے **عادل جواد**! آپ کا طویل خط میرے سامنے ہے۔ اک اک سطر پڑھنے کے بعد واقعی میں خود الجھ گیا ہوں۔ شاید آپ کو کبھی احساس ہوا ہو یا سوچا ہو کہ یہاں ہمارے دیس میں اک رت ایسی آتی ہے جب آسمان رنگوں سے بھرا ہوا ہوتا ہے، اسے اک جوان نسل کا نام دے لیجئے۔ ان میں سے کچھ پتنگیں کٹ کر کسی آنگن میں جا گرتی ہیں جہاں انہیں پکڑنے، انہیں سنبھال کر رکھنے والے ہاتھ ہوتے ہیں۔ کچھ ویرانوں میں جا گرتی ہیں یا تاروں میں الجھ جاتی ہیں، انہیں کوئی سنبھالنے والا نہیں ہوتا۔ وقت کی یہ ہوائیں اسے کھیلتی رہتی ہیں، ان کے بدن کے تار کھلتے رہتے ہیں اور آخر میں ان کے تنکے ہی تنکے دکھائی دیتے ہیں۔ پھر بھی میں آپ سے یہ نہیں کہوں گا کہ آپ انہی تاروں سے لپٹے رہئے کہ آنے والا کل کوئی معجزہ دکھائے گا۔ آج معجزے بھی تبھی جنم لیتے ہیں جب ان کو پکارنے کی سکت ہو۔ ہمت سے کام لیجئے، ماضی سے فی الحال ہر ناطہ توڑ لیجئے اور حال اور مستقبل کو سوچئے، اسے سنوارنے کا جتن کیجئے۔ جو کچھ بیت چکا ہے، اس کے بارے میں سوچنا تو حوصلے پست کرنا ہوگا۔ کبھی کبھی ایسا بھی تو ہوتا ہے نا، کہ ہم کوئی انتہائی ڈراؤنا خواب دیکھتے ہیں لیکن صبح ہونے اور آنکھ کھلنے کے بعد وہ کہیں لاشعور میں تو ہوتا ہے لیکن اس کی کڑیاں ملانا چاہیں تو نہیں ملتیں۔ اپنے ماضی کو آپ فی الحال اک ایسے خواب ہی کی صورت دے دیجئے اور مستقبل کے لئے اک نئے عزم سے جدوجہد کیجئے۔ اپنوں تو آپ آزما ہی چکے ہیں، اب ان کی مدد لیجئے جو اپنے نہیں لیکن کبھی کبھی اپنوں سے بڑھ کر ثابت ہوتے ہیں۔ میری کہیں بھی ضرورت محسوس ہو تو بنا تکلف پکار لیجئے گا، بس قریب ہی ملوں گا۔

اچھرہ لاہور کی **صائمہ نظیر**! اچھی بہن، یہ اہمیت بڑھانے کا انداز نہیں بلکہ میری مجبوریاں ہیں۔ یہاں انتخاب سے لے کر ترتیب و تکمیل کا ہر مرحلہ مری ذات سے ہو کر گزرتا ہے اور یہ مصروفیات ایسی ہیں جو مجھے بڑا پابند اور محدود رکھتی ہیں۔ آپ کی ارسال کردہ کہانی منتخب ہو چکی ہے۔ آئندہ ایک دو اشاعتوں میں آپ اسے شامل پائیں گی۔ امید ہے، اب آپ مطمئن ہو گئی ہوں گی اور میری اس یقین دہانی کے بعد یقیناً آئندہ ایسا طنز نہ کریں گی۔ پرخلوص دعاؤں کے جواب میں ایسی ہی ڈھیروں دعائیں آپ کے نام!

سرگودھا کے جناب **عامر وفا**! وہ آپ کا پہلا اک خط مجھ تک نہیں پہنچ پایا ورنہ جواب میں تاخیر کی کوئی صورت نہ تھی۔ اب اس خط میں آپ نے تفصیل سے تو آگاہ نہیں کیا لیکن جو چند سطریں ہیں، وہی معاملے کی سنگین نوعیت سے آگاہ کر رہی ہیں۔ میرے بھائی! آپ کے نام میں ہی وفا شامل ہے تو پھر اس گوہر کی دمک کو آپ کیوں ماند کرنا چاہتے ہیں، کیوں اسے محدود کرنا چاہتے ہیں؟ یہ جوہر اگر آپ رکھتے ہیں تو اس کے وصف سے بھی آپ آگاہ ہوں گے۔ اسے یوں اک چہرے، اک جذبے کا پابند نہ کیجئے۔ اک وسعت اسے دیجئے کہ زندگی اک ندی پر پڑے لکڑی کے اک تختے کو پار کرنے کا ہی نام نہیں۔ اس ندی میں تیر کر اسے عبور کیا جائے تو اک سیدھ میں ہی آدمی پار نہیں اترتا بلکہ کوئی نیا کنارا ملتا ہے اور پھر اسے پار کرنے کے لئے جو جدوجہد کی جائے، زندگی اس کا نام ہے۔ یوں حوصلے پست کر کے بیٹھ رہیں گے تو واقعی خودکشی کر لینے کے سوا اور کوئی خیال دماغ میں نہ آئے گا۔ سکوت اک خاموش یا موت کا نام ہے جب کہ زندگی متحرک رہنے کا تقاضا کرتی ہے۔ صرف اتنا کیجئے کہ دوست کو بھول کر اس سے جدا ہونے کے اسباب تلاش کیجئے اور وہ یقیناً اتنے ٹھوس ہوں گے کہ دوست بھی حق بجانب ہوگا، ان اسباب اور اپنی ان کمزوریوں پر عبور حاصل کیجئے، پھر یقیناً آپ اپنے آپ کو توانا محسوس کریں گے اور یہ شکستگی کا احساس جاتا رہے گا۔ کہنے کو اور بھی بہت کچھ ہے لیکن ابھی صرف یہ جاننا چاہوں گا کہ میری بات نے آپ کو کتنی اہمیت دی، یہ مان لی جائے تو پھر آپ مجھے اور نزدیک پائیں گے۔

حیدرآباد کی **آمنہ جمیل**! خط مل گیا اور یہ جان کر بھی خوشی ہوئی کہ آپ نے میرے لہجے کی اس تلخی کو محسوس کئے بغیر ان میں چھپی ہدایت کو پالیا لیکن یہاں اک اختلاف کی صورت پھر میں رکھتا ہوں۔ وہ جنہیں پوجنے کی حد تک چاہا جائے، کہیں کسی دوراہے پر آ کر بھی ان کے لئے لب پر دعائیں ہونی چاہئیں۔ مان لیا کہ اس جذبے کا خراج وہ جسم و جان کو اک کرب میں مبتلا کر کے لیتے ہیں لیکن یہ بھی تو سوچئے کہ انہیں یہ اختیار

دینے میں خود ہمارا بہت دخل ہوتا ہے۔ پھر کوئی اپنی فطرت کا وار کر جائے تو دوش صرف وہی نہیں، ہم بھی ہیں کہ یہ فریب کھانے کے لئے ہم نے خود ہی یہ جنجال اپنے سر پر لیا ہوتا ہے لہٰذا آئندہ کم از کم میرے سامنے یہ اظہار نہ کیجئے گا۔ ''سوچ نگر'' ابھی بہت سوں کا من پسند عنوان ہے لہٰذا فی الحال اسے بند کرنا ممکن نہیں۔ اگر کبھی یہ فیصلہ کرنا پڑا تو آپ کی رائے مقدم ہوگی۔ دعائیں کہ خدا آپ کو اک نئے عزم و حوصلے کی نعمت سے نوازے۔

پنڈی گھیب کے محترم **ذاکر علی**! آداب عرض کا اپنا اک مزاج ہے لہٰذا ایسے مضامین کی گنجائش یہاں ممکن نہیں، آپ ان کے لئے اخبارات کی جانب رجوع فرمایئے اور آداب عرض ایسے ہی جذبات کا احترام رکھنے کا درس دیتا آیا ہے لیکن میرے بھائی! میرے اوپر کچھ پابندیاں دوسروں کی جانب سے بھی واجب ہوتی ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ میں براہ راست کسی کا پتہ نہیں دے سکتا اور خاص طور پر کسی خاتون کا پتہ دینا میرے لئے ممکن نہیں۔ آپ کے جذبے کو سراہتے ہوئے یہ ممکن ہے کہ ان کے نام اک خط لکھ کر آپ آداب عرض کی معرفت بھیج

بصدِ خلوص

خدا وہ وقت نہ لائے کہ میری آنکھوں میں
تمہارے پیار کا ہر اک خواب جل جائے
ہوا کے رخ کی طرح راستہ بدل جائے
خدا وہ وقت نہ لائے کہ اپنے کمرے میں
کسی کے درد بھرے گیت گنگناؤ تم
کتابیں، کاپیاں حیرت سے تم کو تکنے لگیں
وہ دن نہ آئے کہ پڑھنے سے جی چراؤ تم
خدا وہ وقت نہ لائے کہ شام ہوتے ہی
جلا کے بیٹھ رہو انتظار کی شمعیں
تمہاری آنکھوں میں مایوسیوں کی گرد جمے
نہ راس آئیں تمہیں اعتبار کی شمعیں
خدا وہ وقت نہ لائے کہ بے خیالی میں
جسے پکارو غلط نام سے پکارو تم
سہیلیاں تمہیں چھیڑیں تمہاری حالت پر
نہ اس طرح سے کبھی زندگی گزارو تم
پرانی یادیں کوئی مشورہ نہ دیں مجھ کو
دعا کرو کہ یہی موڑ راس آ جائے
بہت دنوں میں ملا ہوں تو اب نہ کھو جاؤں
خدا وہ وقت نہ لائے کہ میری آنکھوں میں
تمہارے پیار کا ہر اک خواب جل جائے
ہوا کے رخ کی طرح راستہ بدل جائے
خدا وہ وقت نہ لائے

☆

۞..... خالد بن حامد

دیجئے، آپ کا یہ خط میں ان تک پہنچا دوں گا اور پھر آپ کے جذبات کی مزید پذیرائی کا اختیار ان ہی کے پاس ہوگا۔ امید ہے کہ اس راہ کو اپنانے میں آپ تاخیر سے کام نہ لیں گے۔

لاہور سے **سید عفت کاظمی**! واقعی کافی مدت کے بعد آپ کو اس محفل کا خیال آیا لیکن یہ تو آپ نے بتایا ہی نہیں کہ اس دوران آپ کی مصروفیات کیا رہیں؟ یقیناً کوئی ایسی بات تو ہوگی جو آپ اپنے چہکتے آداب عرض کو بھی بھلا بیٹھیں۔ چھ سات ماہ قبل بھیجا جانے والا ناقابل فراموش واقعہ اب ممکن نہیں کہ قابل اشاعت ہو۔ طویل حقائق کی اشاعت میں تاخیر ممکن ہوا کرتی ہے لیکن واقعات اگر اشاعت کے قابل ہوں تو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دو تین ماہ کی اشاعتوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ دوبارہ کوشش فرمایئے اور کسی نئے واقعہ سے آداب عرض کو نوازیئے اور وہ منی بہن! کیوں لڑے گی وہ آپ سے، اسے کہہ دیجئے گا کہ اچھے بچے ضد نہیں کیا کرتے۔

اسلام آباد کی **برجیس ماہم!** اپنی اس حساس فطرت کو اگر آپ نفسیاتی کمزوری کا نام دیں گے تو پھر ہم جیسوں کو تو دیوانہ ہی کہا جائے گا۔ اپنے اس نام پر بھی اعتراض ہمیں اس وقت تک نہیں جب تک کہ دیوانگی اپنی ذات میں پھول اور کانٹوں کو جنم دیتی رہے۔ اعتراض تب ہوگا جب ہوش مندوں کو اس دیوانگی کی خبر ہو جائے اور آپ جانیں کہ وہ اپنے درمیان پھر ہم جیسوں کو برداشت نہیں کرتے، انہیں علیحدہ چار دیواری میں بند کر دیئے ہیں لہٰذا آئندہ آپ اپنی تحریر کو یہ نام نہ دیجئے گا۔ اس محفل کی ابتدائی سطور مجھے بھی بہت ہی ہلکا پھلکا کر دیتی ہیں لیکن کبھی کبھی میرے پڑھنے والے شاید اس بوجھ کو برداشت نہیں کر پاتے اور معترض ہوتے ہیں لہٰذا ان ہی کا خیال کرتے ہوئے خاموش ہو لیتا ہوں حالانکہ یہ خاموشی مجھے بعد میں بہت مضطرب رکھتی ہے۔ اپنی دعاؤں میں مجھے یاد رکھا کیجئے۔ آپ کا یہی ایثار مجھے زندگی دے گا۔

علووالی کے جناب **محمد جہاں زیب!** یہ خط آپ نے بیاری کی حالت میں لکھا ہے اور یقیناً اس محبت کا اظہار ہے جو آپ مجھ سے رکھتے ہیں۔ میری دعا ہے کہ خدا آپ کو جلد از جلد صحتِ کامل سے نوازے اور اگلے ماہ آپ جب یہ خط لکھیں تو صحت پا چکے ہوں--- کہانیوں کے بارے میں اک ذرا سے انتظار کی زحمت اور جلد ہی مطلع کر دوں گا۔

سندھ سے **امینہ خان!** آپ جو کچھ بھی کہنا چاہ رہی ہیں، اس کی نزاکت میں سمجھ رہا ہوں۔ ملک کے حالات پر اک میں ہی نہیں، پوری قوم مشکل میں ہے۔ اسے آپ نے میری خود غرضی کا نام دیا ہے لیکن کہوں کہ یہ میری ہی پریشانی نہیں، سب کی ہے۔ سندھ میں جو کچھ ہو رہا ہے، اس پر بھی ہر دل متاسف ہے۔ یہ حالات کسی بھی محب وطن کے لئے کوئی اچھی صورت نہیں رکھتے، ان دیکھے اندیشوں اور وسوسوں کو جنم دیتے ہیں۔ سیاست میرا میدان نہیں، اس انسانیت کا ناطہ اور یہی درد رکھتا ہوں۔ کوئی خبر آتی ہے تو جی لرزنے لگتا ہے اور ہم جیسے بے وقعت لوگ دعاؤں کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتے۔ یہاں اک مقامِ افسوس یہ بھی ہے کہ ان کارروائیوں میں بھی ہمارے ہی بھائی بند ملوث ہیں، انہیں حادثے نہیں کہا جا سکتا، منصوبے کا نام دیا جا سکتا ہے۔ آپ بھی میرے ساتھ یہی دعا کیجئے کہ خدا اس ملک کے ہر شہری کو اپنے وطن سے محبت کا جذبہ دے، ہم اس کی آبرو کے محافظ کہلائیں۔

سکردو سے اچھی بہن، **صباحت!** مصروفیات بڑھنے کے بعد ایک ہی بار طویل خط لکھنے کی بھی خوب رہی۔ بھئی، اسے طویل خط کہتے ہیں؟ یوں مذاق نہ کیا کرو۔ دعائیں لو کہ خدا تمہیں ہر دم آسودہ و خوشحال رکھے۔

راولپنڈی کے جناب **صائم ناز!** یہاں اس محفل میں آپ کی آمد پر ممنون ہوں۔ واقعی بعض رفاقتیں یونہی چلتے چلتے حاصل ہو جاتی ہیں لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ ان رفاقتوں کو ہم اک عمر پر محیط کر دیں۔ دعا ہے کہ یہ ساتھ سدا رہے۔ دوسرے شعبوں تک آپ کے خطوط پہنچ چکے۔ اک حوصلے سے ان کی اشاعت کا انتظار فرمایئے کہ ترتیب کا لحاظ بہرحال رہتا ہے۔

اس ماہ کی محفل اب اختتام تک پہنچی لیکن جانے سے پہلے میں اپنے ان چاہنے والوں کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا جنہوں نے عید کے موقع پر اپنی خوشیوں اور دعاؤں میں مجھے یاد رکھا اور اپنی نیک خواہشات و جذبات کا اظہار فون کالز اور ایس ایم ایس کے ذریعے کیا۔ میں آپ سب کا ممنون ہوں لیکن سچ پوچھیئے تو اس مرتبہ عید ہم پر بہت اداس گزری ہے۔ بس اس سے زیادہ نہ کہوں گا کہ پھر بہک جانے کا اندیشہ ہے۔ وہ عزیز از جان لوگ جو مجھے اپنے جذبوں سے نواز کر میرا انتظار کرتے رہے، ان سے بھی مجھے معذرت کرنی ہے کہ میں انہی جذبوں کا اظہار نہ کر سکا۔ اجازت دیجئے آئندہ ماہ پھر ملاقات ہوگی۔ اس دعا کے ساتھ رخصت ہوں کہ اللہ ہم سب کو اپنی امان میں رکھے اور پاکستان کو استحکام بخشے۔

✿ خالد بن حامد

موبائل: 0312/0333-4284875

☆☆

☆ م۔ قادر یوسفی

حضرت زکریا علیہ السلام

قرآن وحدیث کے حوالے سے آپ کے لئے معلومات افزا مضمون، انسانیت کے فروغ کا ابتدائی نصاب ہمیں یہیں سے ملتا ہے

کلام پاک میں ارشاد ربانی ہے۔

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے مریم کو اچھی قبولیت سے نوازا اور اس کی خوب نشو ونما فرمائی اور زکریا کو اس کی کفالت سپرد کی۔ جب بھی زکریا اس کے مخصوص کمرے میں داخل ہوتے تو اس کے پاس رزق موجود ہوتا۔ آپ کہتے، مریم! یہ تیرے پاس کہاں سے آیا ہے۔ وہ کہتی یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا ہے۔ بلاشبہ، اللہ تعالیٰ جسے چاہے، بے حساب و گمان رزق دیتا ہے۔ وہیں کھڑے زکریا اپنے رب سے دعا کرتا ہے۔ اے میرے پروردگار! مجھے اپنی رحمت سے نیک اور پاکیزہ اولاد عطا فرما، بلاشبہ تو دعاؤں کو خوب سننے والا ہے۔

آخر کار جب وہ اس مخصوص کمرے میں کھڑا دعا کر رہا تھا تو فرشتوں نے اُسے پکارا، اللہ تعالیٰ نے تجھے یحییٰ بیٹے کی خوشخبری دیتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے ایک عظیم کلمہ (عیسیٰ) کی تصدیق کرے گا۔ سردار ہوگا، پاکباز ہوگا اور نیک نبی ہوگا۔ زکریا نے گزارش کی، پروردگار! میرے ہاں بیٹا کیسے ہو سکتا ہے، میں تو بوڑھا ہو چکا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''اسی طرح ہوگا۔ اللہ جو چاہتا ہے، کر گزرتا ہے۔ زکریا نے کہا۔ رب کریم! کوئی نشانی مقرر فرما دیجئے۔ اللہ نے فرمایا۔ تیرے لئے نشانی یہ ہے کہ تو لوگوں سے تین دن تک کلام نہیں کرے گا اور اشارے سے کام چلائے گا، اب اپنے رب کا ذکر کثرت سے کر اور صبح وشام تسبیحات میں مصروف رہ۔

(سورۃ آل عمران آیات 37 تا 41)

کلام الٰہی میں یہ ذکر اس وقت کا ہے جب حضرت عالی مریم سن رشد و شعور کو پہنچ گئی تھیں اور بیت القدس کی عبادت گاہ ''ہیکل'' میں داخل کر دی گئی تھیں۔ وہ شب و روز ذکر الٰہی میں مصروف رہنے لگی تھیں۔ حضرت زکریا علیہ السلام رشتے میں آپ کے خالو تھے اور بی بی مریم ان کی زیر کفالت پروان چڑھی تھی۔ حضرت زکریا علیہ السلام عبادت گاہ بیت القدس کے مجاوروں میں شامل تھے۔ زکریا نام کے دو انبیاء بنی اسرائیل میں گزرے ہیں، ایک زکریا بن برخیا جو انبیائے تورات میں سے تھے۔ زکریا بن برخیا کا ظہور ایران کے بادشاہ دارا ابن گشتاسپ کے دور میں ہوا۔ دوسرے نبی حضرت زکریا ابو یحییٰ ہیں۔ آپ ہی بی بی مریم کے خالو تھے۔ بیت القدس کے مجاور تھے اور آپ ہی کا اسم گرامی قرآن پاک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ان دو مقامات پر آیا ہے جب کہ اول الذکر زکریا بن برخیا کا ذکر قرآن مجید میں تو نہیں آیا لیکن مجموعہ تورات کے ایک صحیفہ میں آتا ہے۔ ان دونوں انبیاء کرام کے درمیان چار سو سال کا عرصہ حائل ہے۔ زکریا ابو یحییٰ وہ "زکریا" نہیں جن کے قتل کا ذکر بائبل کے عہد نامہ قدیم میں آیا ہے (تفہیم القرآن جلد اول)

حضرت بی بی مریم بیت القدس کے اس عبادت خانے میں معتکف تھی جہاں اُس وقت کے خدا رسیدہ افراد مختلف کمروں میں جنہیں "محراب" کا نام دیا جاتا تھا معتکف رہتے تھے۔ حضرت زکریا جب حضرت مریم سے ملاقات کرنے جاتے تو انواع و اقسام کے موسمی پھل اور کھانے دیکھتے اور ... اللہ تعالیٰ اپنی اس صالحہ بندی و اپنی کرم نوازی سے ... سب رزق مہیا فرما رہا ہے تو اللہ تعالیٰ کی اس کرم فرمائی کو دیکھ کر حضرت زکریا علیہ السلام کے دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ ان کا بھی صالح فرزند ہوتا۔ چنانچہ انہوں نے دعا میں اللہ تعالیٰ سے اولاد کی درخواست کی۔ فتح الباری کے مصنف کے مطابق اس وقت آپ کی عمر 90، 92 یا 120 سال تھی۔ اللہ پاک نے آپ کی دعا اور خواہش کو شرف قبولیت عطا فرمایا اور بیٹے کے متولد ہونے کی خوشخبری دی۔ یہاں تک اللہ تعالیٰ نے خود بیٹے کا نام "یحییٰ" بھی بتا دیا اور یہ بھی فرمایا کہ دعا کی قبولیت کی نشانی یہ ہے کہ آپ زبان سے نہیں بلکہ اشاروں سے گفتگو فرمائیں گے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا معجزہ تھا کہ سن کبیر میں حضرت زکریا علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے فرزند یحییٰ سے نوازا۔

سورۃ مریم میں ارشادِ ربانی ہے۔

ترجمہ: ک، ا، ی، ع، ص "ذکر ہے اس رحمت کا جو تیرے رب نے اپنے بندے زکریا پر کی تھی جب کہ اس نے اپنے رب کو چپکے چپکے پکارا تھا۔ اس نے عرض کیا، اے پروردگار! میری ہڈیاں تک گھل گئی ہیں اور سر بڑھاپے سے بھڑک اُٹھا ہے۔ اے پروردگار! میں کبھی تجھ سے دعا مانگ کر نامراد نہیں رہا۔ مجھے اپنے پیچھے اپنے بھائی بندوں کی بُرائیوں کا خوف ہے اور میری بیوی بانجھ ہے، تو اپنے فضل خاص سے مجھے ایک وارث عطا کر دے جو میرا وارث بھی ہو اور آل یعقوب کی میراث بھی پائے اور اے پروردگار! اس کو ایک پسندیدہ انسان بنا۔ (جواب دیا گیا)" اے زکریا! ہم تجھے ایک لڑکے کی بشارت دیتے ہیں جس کا نام یحییٰ ہوگا۔ ہم نے اس سے پہلے کوئی آدمی اس نام کا پیدا نہیں کیا۔ عرض کیا، پروردگار! بھلا میرے ہاں کیسے بیٹا ہوگا جبکہ میری بیوی بانجھ ہے اور میں بوڑھا ہو کر سوکھ چکا ہوں۔ جواب ملا کہ ایسا ہی ہوگا، تیرا رب فرماتا ہے۔ یہ تو میرے لئے ذرا سی بات ہے آخر اس سے پہلے میں تجھے پیدا کر چکا ہوں جبکہ تو کوئی چیز نہ تھا۔ زکریا نے کہا، پروردگار! میرے لئے کوئی نشانی مقرر فرما۔ فرمایا، تیرے لئے نشانی یہ ہے کہ تو تین دن لوگوں بات نہ کر سکے گا چنانچہ وہ (زکریا) محراب سے نکل کر اپنی قوم کے سامنے آیا اور اس نے اشارے سے ان کو ہدایت کی کہ صبح شام تسبیح کرو (سورۃ مریم آیات 1 تا 11)

قارئین نے محسوس کیا ہوگا کہ ایک ہی بات کو مکرر طور پر کہا گیا ہے لیکن یہ اس لئے ضروری ہوگا کہ سورۃ آل عمران اور سورۃ مریم کی آیات دونوں ایک ہی جیسی ہیں اور سورۃ مریم کا اس تحریر میں حوالہ از حد ضروری امر تھا۔۔۔ حضرت زکریا علیہ السلام حضرت ہارون کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ بنی اسرائیل کے نظام Priest Hook کے تحت فلسطین پر قبضے کے بعد ملک کا انتظام اس طرح کیا تھا کہ سارا ملک آل یعقوب کے 12 قبیلوں میں بانٹ دیا گیا تھا اور تیرھواں قبیلہ جو لاوی بن یعقوب کا تھا اُسے مذہبی خدمات کے لئے مخصوص کر دیا گیا۔ پھر "بنی لاوی" میں سے ایک خاندان ایسا تھا جو حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد میں سے تھا اور اسی خاندان کے افراد بیت المقدس کے اندر جا کر خداوند کے گھر میں بخور جلانے کی خدمت سرانجام دیتے تھے۔ بنی لاوی کے دیگر خاندانوں کے افراد بیت المقدس کے اندر نہیں جا سکتے تھے، وہ باہر رہ کر صحن اور کوٹھڑیوں کی صفائی کرتے تھے۔ عید اور دیگر تقریبات پر قربانیاں بنی ہارون کے چوبیس خاندان تھے جو باری باری بیت المقدس میں خدمت سرانجام دیتے تھے۔ ان ہی خاندانوں میں ایک ابیاہ" کا خاندان تھا جس کے سردار حضرت زکریا علیہ السلام تھے۔ اپنے خاندان کی باری کے ایام میں حضرت زکریا ہی "مقدس" میں جاتے اور خداوند کے حضور بخور جلانے کی خدمت سرانجام دیتے تھے۔ (بائبل۔ کتاب تواریخ باب اول)

بیت المقدس فلسطین کا وہ شہر ہے جس میں مسجد

137۔ بلاک بی ہاؤسنگ سکیم نمبر 2 لیہ

دوستو، کرم فرماؤ، ساتھیو! آپ سب تک ہمارا سلام پہنچے۔ حکایات قرآنی کے پاکیزہ سلسلے کی قسط پیش خدمت ہے۔ یہ سلسلہ چند مخصوص لوگوں کے لئے نہیں بلکہ ہر اس فرد کے لئے ہے جو اسلام کے دائرہ عمل میں رہ کر زندگی گزارنے کا متمنی ہے۔ ہماری تحریریں کسی ایسے نقطہ نظر کی عکاسی نہیں کرتیں جس میں فرقہ وارانہ عصبیت، اور مختلف مسالک میں سے کسی ایک مسلک کی تبلیغ و ترویج ہو بلکہ اس میں اسلام اور صرف اسلام کی وہ تعلیم جو ابتدائے آفرینش سے اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک اور صالح بندوں کے ذریعے عام انسانوں تک پہنچائی اور آخرش حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت نے اس انسانی معاشرے کے رہن سہن، گزر اوقات، عبادات و اعمال کی جامع کتاب انسانی معاشرے تک پہنچا دی اور فرما دیا کہ "آج میں نے دین مکمل کر دیا"۔ انسانی معاشرے کے سدھارنے کے لئے اصول و قوانین کی تکمیل کر دی گئی۔ سورۃ "البقرۃ" میں فرمانِ باری تعالیٰ ہے۔

ترجمہ: اور ہم نے تمہیں ایک نمونے کی جماعت بنایا ہے تاکہ تم لوگوں کے لئے ایک مثال بن سکو۔

قرآن مجید کے پڑھنے اور سمجھنے کے بعد یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ اسلامی معاشرہ ایک مثالی معاشرہ ہو اور ان لوگوں کے لئے مثالی نمونہ ہو جو امن، سکون، عدل و انصاف کی کامیاب اور صاف ستھری زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ انسان کامیاب اور پُرامن زندگی کے ساتھ ساتھ دوسروں کے لئے اس بات کا ثبوت مہیا کرے کہ صاف ستھری اور پاکیزہ زندگی صرف اور صرف اسلام کے زریں اصولوں میں موجود ہے۔ اگر ان اصولوں پر عمل پیرا ہوا جائے تو یہ زندگی اوجِ کمال پر پہنچ کر اس خطہ ارضی کو جنت بنا سکتی ہے۔ صاف ستھری اور پاکیزہ دستوازن زندگی کے دروازے اسلام کے ذریعے انسان کے لئے کھول دیئے گئے ہیں۔ اب یہ ہمارا اپنا فرضِ عین ہے کہ ہم خلوص نیت اور راستی کے ساتھ اسلام کی متعین کردہ راہ پر گامزن ہوں۔ یہ بات بھی ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ انسان ایک "گروہ پسند" مخلوق ہے۔ تمدنی علوم انسان کی اس اجتماعی زندگی گزارنے کے لئے اصول اور قوانین مرتب کرتے ہیں اور اسلام وہ دین کامل ہے جو نظامِ معاشرت بہترین خطوط پر استوار کرتا ہے۔ اور اسلام نے وقت کے ساتھ ساتھ مختلف معاشروں کو، مختلف اقوام کو انبیاء کرام کے ذریعے وہ راہ صاف ... ہے۔ سکون ہے، عدل ہے، انصاف ہے، توازن ہے، پاکیزگی ہے اور سب سے بڑی بات، خوف خدا ہے کہ واضح الفاظ میں ہر نبی نے بتایا کہ اگر تم اسلام کی پکی اور سیدھی راہ سے بھٹکو گے تو مختلف اقسام کے عذاب تمہیں گھیر لیں گے۔

دوستو! میں آپ سب کا شکرگزار ہوں کہ آپ میری تحریروں کو پڑھتے ہیں اور ان صاحبان کا بہت ہی زیادہ شکرگزار ہوں جو مجھے اپنے قابل قدر مشوروں سے نوازتے ہیں، مجھے اپنی دعاؤں میں یاد کر لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو اپنی امان میں رکھے اور اس پُرآشوب دور کی صعوبتوں سے محفوظ رکھے، آمین!

☆ آپ سب کا مخلص، م۔ قادر یوسفی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اقصی اور اللہ تعالے کے پاک گھر کی بنیاد حضرت یعقوبؑ نے ڈالی تھی۔ بیت المقدس کے متعلق کچھ بیان کرنے سے پہلے ضمناً فلسطین کے متعلق چند سطور پیش کی جاتی ہیں۔ جس کے اکثر حصے پر آج کل یہودیوں کی حکومت ''اسرائیل'' کے نام سے قائم ہے اور اس مملکت کے کارپرداز ان نصرانیوں کی مدد سے مسلمانوں پر ایک عرصے سے ظلم و ستم ڈھا رہے ہیں۔ مملکت فلسطین کا نام، فلسطین بن سام بن ارم بن سام بن نوح علیہ السلام کے نام پر رکھا گیا ہے۔ اس خطہ زمین کے شمال میں لبنان، شمال مشرق میں شام اور قطبی مشرق میں اردن واقع ہے۔ جنوب میں خلیج عقبہ اور جنوب مغرب میں صحرائے سینا واقع ہے۔ دریائے اردن فلسطین اور اردن کے درمیانی حد فاصل ہے۔ بیت المقدس یا القدس، فلسطین کے تقریباً وسط میں واقع ہے۔ یہ شہر مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں، تینوں اقوام کے لئے مقدس اور متبرک ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں بھی کچھ عرصہ تک مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) کی جانب منہ کر کے نماز پڑھی جاتی رہی تھی، بعد میں بارگاہِ ایزدی سے خانہ کعبہ اور مسجد الحرام کی جانب سمتِ نماز مقرر کی گئی۔ یہیں بیت اللحم ہے جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام متولد ہوئے تھے۔

بیت المقدس کی تعمیر کی ابتداء تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمائی تھی لیکن اس کی تکمیل حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور میں ہوئی۔ (مسجد اقصیٰ) یعنی بیت المقدس کی تعمیر کے ساتھ اس علاقے میں آبادی شروع ہوئی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے حکم سے مسجد اور شہر کی توسیع و تجدید کا کام شروع ہوا۔ تسخیر جنات کے سبب یہ کام جنات نے سرانجام دیا اور اس طرح ایک شاندار اور حیران کن تعمیر عالم وجود میں آئی۔ یہ تعمیر آج تک لوگوں کے لئے باعث حیرت ہے کہ اس قدر بھاری بھرکم پتھر کہاں سے لائے گئے تھے اور وہ کون سے آلات اس وقت موجود تھے جن کے ذریعے ان بھاری بھرکم پتھروں کو اس قدر بلندی پر پہنچا کر عمارت کا حصہ بنایا گیا تھا اور وہ کون سے مصالحہ جات تھے جن کے ذریعے ان پتھروں کو جوڑا گیا تھا۔ اسرائیلی روایات کے مطابق بیت المقدس اور ہیکل (مسجد اقصیٰ) کی تعمیر سات سالوں میں ہوئی تھی۔

حضرت زکریا علیہ السلام نے اپنی اولاد کے لئے دعا مانگی اور دعا قبول ہونے پر تعجب سے عرض کیا کہ باری تعالیٰ یہ تیرا احسان ہے کہ اس بڑھاپے میں مجھے یحییٰ نام کا فرزند عطا ہو رہا ہے کہ میری اہلیہ بھی اولاد پیدا کرنے کے قابل نہ ہے۔ حضرت زکریا نے اس خدائی معجزے پر خوشی اور تعجب سے اپنے رب کا شکر ادا کیا اور پھر ذکر الٰہی میں مصروف ہو گئے۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی ولادت کے بعد بھی آپ اشاعت و ترویج دین حق کے لئے کوشاں رہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی معجزاتی ولادت اور آپ کے اس اعلان کے بعد کہ میں اللہ پاک کا بندہ ہوں اور خدا کا نبی ہوں، آپ اور آپ کے فرزند حضرت یحییٰ علیہ السلام نے حکم الٰہی کے پیش نظر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیغمبر ہونے کی تصدیق فرمائی۔ پیشہ کے لحاظ سے حضرت زکریا علیہ السلام بڑھئی کا کام کرتے تھے۔ حضرت زکریا علیہ السلام کی وفات کے ضمن میں مختلف آراء ہیں۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ وہ طبعی موت کے ذریعے راہی ملک عدم ہوئے جبکہ ابن اثیر نے بیان کیا ہے کہ بعثت مسیح علیہ السلام کے بعد تورات کے کچھ احکامات منسوخ ہو گئے تھے اور ان منسوخ شدہ احکامات میں سے ایک حکم بھتیجی سے عقد (نکاح) کا بھی تھا۔ یہودیوں کا بادشاہ ''ہیروس'' اپنی سگی بھتیجی سے نکاح

کرنے کا متمنی تھا۔ چونکہ حضرت یحییٰ علیہ السلام شریعت عیسوی پر ایمان رکھتے تھے اس لئے اس نکاح کے سخت خلاف تھے۔ بادشاہ ہیروس نے اپنے مذموم عزائم کی تکمیل کے لئے حضرت یحییٰ علیہ السلام اور حضرت زکریا علیہ السلام سے جان چھڑانے کے لئے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو عین عبادت کے وقت عبادت کرتے ہوئے قتل کر دیا۔ اس تکلیف دہ اور خوفناک صورت حال کو دیکھ کر حضرت زکریا علیہ السلام وہاں سے فرار ہو گئے اور ایک باغ میں جا کر ایک درخت کے تنے میں پناہ لی۔ بادشاہ کے اہلکاروں کو پتہ چلا کہ آپ درخت کے تنے میں پناہ گزین ہیں تو ان نابکاروں نے اس درخت کے تنے کو حضرت زکریا علیہ السلام سمیت آرے سے چیر دیا۔ (فتح الباری 571/6) محققین کے مطابق آپ کے جسد خاکی کو حلب کی ایک مسجد میں دفن کیا گیا ہے۔

حلب: ملک شام کا یہ شمالی شہر یورپی زبانوں میں (ALEPO) ایلپو کے نام سے ہے۔ حران سے دمشق جانے والی شاہراہ پر واقع ہے۔ اس کی آبادی 13 لاکھ سے زائد ہے۔ مصنف ''معجم البلدان'' کے مطابق اس شہر کا نام ''حلب'' (دودھ) اس لئے رکھا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے یہاں قیام کے دوران اپنی بھیڑ بکریوں کا دودھ نکال کر فقیروں اور پردیسیوں میں تقسیم فرما دیتے تھے۔ یہاں کے فقرا جمع ہو کر پکارتے ''حلیب! حلیب'' اس وقت سے اس کا نام حلب پڑ گیا۔ حلب کے قلعے میں اب بھی دو مقامات حضرت ابراہیم علیہ السلام سے منسوب ہیں۔ قلعہ حلب میں ایک صندوق میں حضرت یحییٰ کے سر مبارک کا ایک حصہ دفن ہے۔ حضرت زکریا علیہ السلام بھی ایک مسجد میں دفن ہیں۔ الجنان کے پاس مبینہ طور پر مشہد علی بن ابی طالب ہے جس کی نشاندہی کسی کو خواب میں کرائی گئی

اخلاقیات

آزادی کے وقت جو ہندو اور سکھ بھارت چلے گئے تھے وہ صوبہ پنجاب میں بہت سی فیکٹریاں، سینما گھر اور دیگر صنعتی ادارے چھوڑ گئے تھے۔ حکومت پاکستان کا فیصلہ تھا کہ ان فیکٹریوں اور صنعتوں کو کسی صورت میں بھی بند نہ ہونے دیا جائے اور انہیں ان مسلمان مہاجرین کو الاٹ کر دیا جائے جو اسی قسم کا کاروبار یا جائیداد چھوڑ آئے ہیں۔ اس مقصد کے لئے ایک بورڈ قائم کیا گیا اور ڈائریکٹر آف انڈسٹریز کی حیثیت سے میں بھی اس بورڈ کا ممبر تھا۔ بورڈ قائم ہوتے ہی درخواستوں کا ایسا سیلاب اُمڈ کے آیا کہ الامان والحفیظ۔ جو کلیم داخل ہوئے ان سے تو یہ ظاہر ہوتا تھا کہ امرتسر سے لے کر دہلی، لکھنؤ اور پٹنہ تک جتنے صنعتی ادارے اور سینما گھر تھے وہ زیادہ تر مسلمانوں ہی کی ملکیت تھے۔ اس میں شک نہیں کہ کچھ مطالبے ضرور جائز حقوق پر مبنی ہوں گے لیکن بہت سے کلیم صریحاً جھوٹ، فریب اور جعلسازی کی پیداوار تھے۔ ان ہی میں ایک شخص محمد دین تھا۔ اس نے ضلع لدھیانہ کے کسی گاؤں میں آٹا پیسنے کی مشین لگائی ہوئی تھی، اس نے اس کی مالیت دو ہزار دو سو روپے درج کی ہوئی تھی۔ مشین خریدنے کی اصل رسید بھی درخواست کے ساتھ منسلک تھی۔ ہمارا بورڈ پانچ ہزار روپے سے زیادہ مالیت کے اثاثوں کا فیصلہ کرتا تھا۔ میں نے محمد دین سے کہا کہ اگر اس نے اپنی مشین کی قیمت دو ہزار دو سو کی جگہ پانچ ہزار روپے درج کی ہوتی تو بورڈ اُسے ضرور معاوضہ دے دیتا کیونکہ اس کے کاغذات بڑے صاف اور سچے ہیں۔ اس نے جواب دیا۔

''اچھا میری قسمت، قیمت ہی دو ہزار دو سو روپے ہے تو میں پانچ ہزار کیسے لکھ دیتا؟''

میں نے کہا۔ ''تم نے یہ مشین آٹھ برس پہلے خریدی تھی۔ اب تو قیمتیں بڑھ گئی ہیں، اب تو اس کی قیمت پانچ ہزار سے اوپر ہو گی؟''

محمد دین ہنسا اور بولا۔ ''صاحب! آپ بھی بڑے بھولے ہیں۔ پرانی ہو کر تو مشین کی قیمت گھٹتی ہے، بڑھا نہیں کرتی۔''

محمد دین کو ہم کچھ نہ دے سکے لیکن وہ ہمیں بہت کچھ دے گیا----

اس ماحول میں محمد دین جیسے انسان دیانت اور امانت اور پاکیزگی کے وہ ستون تھے جن کی برکت سے قومیں زندہ رہتی ہیں اور پروان چڑھتی ہیں۔

(شہاب نامہ سے اقتباس)

سیف اللہ، لاہور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھی۔ باب الیہود کے پاس ایک پتھر ہے جو مسلمانوں، یہودیوں اور عیسائیوں کے لئے زیارت گاہ ہے۔ مشہور ہے کہ اس کے نیچے بعض انبیاء کی قبور ہیں۔ (واللہ اعلم)

ارم ذات العماد

کلام پاک میں ارشاد ربانی ہے۔

ترجمہ: کیا تجھے علم نہیں کہ تیرے رب نے عاد کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ بڑے بڑے ستونوں والے ارم کے ساتھ؟ جن جیسے لوگ کسی علاقے میں پیدا نہیں کئے گئے تھے اور ثمود کی قوم کے ساتھ؟ جنہوں نے وادی میں چٹانوں کو کاٹ کاٹ کر گھر بنائے اور میخوں کے ساتھ عذاب دینے والے فرعون کے ساتھ؟ جنہوں نے اپنے اپنے علاقوں میں سرکشی کی اور بہت فساد برپا کیا۔ تو تیرے رب نے ان پر عذاب کا کوڑا برسا دیا۔ بلاشبہ تیرا رب گھات لگائے ہوئے ہے۔ (الفجر آیت 6 تا 14)

مولانا مودودی لکھتے ہیں کہ عادِ ارم سے مراد وہ قدیم قوم عاد ہے جسے کلام پاک اور تواریخ عرب میں عادِ اولیٰ کا نام دیا گیا ہے۔ سورۃ نجم کی آیت 5 میں فرمایا گیا ہے کہ "---اور یہ کہ اُس نے قدیم قوم عاد کو ہلاک کر دیا۔" یہ وہ قوم ہے جس کی ہدایت کے لئے حضرت ہود علیہ السلام کو مبعوث کیا گیا تھا لیکن اس قوم کی نافرمانی اور ناعاقبت اندیشی کے سبب عذاب الٰہی سے اس قوم کے جو افراد بچ گئے تھے وہ سرزمین عرب پہ پھلے پھولے اور انہیں "عادِ اُخریٰ" کا نام دیا گیا۔ قوم عاد کو عادِ ارم اس لئے کہتے ہیں کہ یہ قوم "سامی" نسل سے متعلق تھی اور اِرم بن سام بن نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ مورخ اس شاخ کی ضمنی شاخوں کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ اس شاخ کی ضمنی شاخوں میں قوم "ثمود" کا ذکر قرآن پاک میں آیا ہے۔ علاوہ ازیں "آرامی" نسل کے لوگ ہیں۔ عاد کے لئے "ذات العماد" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اس کا مطلب "اونچے ستونوں" والے ہیں کیونکہ قوم عاد کے افراد بڑی بڑی بلند عمارتیں بناتے تھے۔ اونچے ستونوں پر عمارتیں تعمیر کرنے کا طریقہ دنیا میں سب سے پہلے قوم عاد کے افراد نے شروع کیا تھا۔ سورۃ "الشعراء" میں اللہ پاک نے اس خصوصیت کا ذکر فرماتے ہوئے یوں فرمایا "تمہارا کیا حال ہے کہ ہر اونچے مقام پر ایک یادگار عمارت بنا ڈالتے ہو اور بڑے بڑے محلات تعمیر کرتے ہو۔ گویا تمہیں ہمیشہ یہیں رہنا ہے۔" سورۃ الشعرا 139،138

کلام پاک کے الفاظ سے کہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ قوم عاد کے افراد فن تعمیر اور دیگر خصوصیات کے لحاظ سے اپنے وقت کے بہترین افراد تھے۔ قوت اور شان و شوکت کے لحاظ سے اس زمانے میں کوئی دوسری قوم اِن کے مدِ مقابل نہ تھی۔ سورۃ الاعراف میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"تم (افراد عاد) کو جسمانی ساخت میں خوب تنومند بنایا" ایک دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے---رہے عاد، تو انہوں نے زمین پر کسی حق کے بغیر اپنی بڑائی کا گھمنڈ کیا اور کہنے لگے کہ ہم زیادہ زور آور اور تنومند قوم ہیں---سورۃ (حم۔ السجدہ)

اس قوم نے پہاڑوں کو تراش تراش کر ان کے اندر عمارتیں بنائیں اور غالباً یہ دنیا کی پہلی قوم ہے جس نے فن تعمیر شروع کیا تھا۔

بعض محققین کا کہنا ہے کہ ارم عاد کے نام سے معروف ہونے کا سبب یہ ہے کہ اس قوم کا ایک فرد عاد تھا اور اس کی والدہ کا نام ارم ہو سکتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ ایک قبلے کا نام ہے اور اگر یہ درست ہے تو پھر "عاد" اس قبلے کا جدامجد ہے۔ بعض محققین نے یہ بھی کہا کہ "ارم" ایک شہر کا نام ہے، یہ شہر سطح ارضی پر جہاں کہیں بھی تھا اب اس کے نشانات مٹ چکے ہیں اور یہ شہر صفحۂ ہستی سے مکمل طور پر غائب ہو چکا ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اسکندریہ کا شہر ہی ارم کہلاتا تھا اور بعض محققین تاریخ کا دعویٰ ہے کہ دمشق کا شہر ہی دراصل "ارم" ہے۔

چند ماہرین تاریخ یہ بھی کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں جس "ارم ذات العماد" کا ذکر ہے وہ یمن میں حضر موت اور صنعاء کے درمیان "ابین" کے صحرا میں ہے اور یہیں سام کے بیٹے ارنوح علیہ السلام کے پوتے آباد ہوئے تھے۔ یہ بات بھی مشہور ہے کہ شداد بن عاد نے اس شہر کو اس قدر خوبصورت بنا دیا تھا کہ یہ شہر "ارم شداد" کے نام سے مشہور ہو گیا۔ غالباً ان کے خیال کے مطابق یہی شہر شداد کی جنت کہلاتا تھا۔

مختلف آراء اور جستجو کے بعد جو حتمی رائے اب تک سامنے آئی ہے، وہ یہ ہے کہ "احقاف" ہی عادِ اولیٰ کا مسکن تھا۔ احقاف جزیرہ نما عرب میں ربع الخالی اور حضر موت کے درمیان واقع ہے۔ اس کے مشرق میں عمان اور مغرب میں یمن واقع ہیں۔ شمال میں رُبع الخالی اور جنوب میں حضر موت واقع ہے۔ مورخین کے مطابق عاد اولیٰ عرب کے بہترین قطعہ زمین حضر موت اور یمن سے لیکر خلیج فارس اور عراق تک آباد تھے۔ ان کے معبودان باطل بھی تھے جن کے نام "ود" سواع اور یغوث، یعوق اور نسر تھے یہی جھوٹے معبود حضرت نوح علیہ السلام کی بگڑی ہوئی قوم کے بھی تھے۔ حضرت ابنِ عباس راوی ہیں کہ ان کے ایک بت کا نام "عصموذ" اور ایک کا نام "ہتاذ" تھا۔

احقاف کا لفظی مطلب ریت کے بڑے بڑے ٹیلے ہے۔ یہ ٹیلے عمان سے یمن تک پھیلے ہوئے تھے۔ یہاں سے نکل کر عاد گردوپیش کے علاقوں میں جا بسے اور کمزور قوموں پر مسلط ہو کر ان کو زیر نگیں کر لیا تھا۔

دینیات

ایک بار حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ ایک یہودی سوال کرتا پھرتا ہے۔ آپ نے اُس کو بلا کر پوچھا۔ "تم سوال کیوں کرتے ہو جبکہ قانوناً اس کی ممانعت ہے؟"

اُس نے کہا۔ "میری عمر نوے سال ہے میرے اہل وعیال سب ختم ہو گئے ہیں میری امداد کرنے والا کوئی نہیں اور میں خود کسی کام کے لائق نہیں۔ سوال نہ کروں تو پیٹ کیسے پالوں؟"

حضرت عمرؓ نے اسی وقت حکم دیا کہ بیت المال سے اس کا وظیفہ مقرر کر دیا جائے۔ لوگوں نے کہا کہ حضور یہ تو یہودی ہے۔ آپؓ نے فرمایا کہ پھر کیا ہوا ہماری رعایا تو ہے۔ اسلامی بیت المال سے ہر شخص کو مدد دی جائے گی خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم۔ ہم نے اس شخص سے جوانی میں جزیہ وصول کیا ہے تو اب بڑھاپے میں اس کی مدد کیوں نہ کی جائے؟

نور العین عینی، لاہور

بحیرہ عرب کے ساحل پر واقع یمن کے معروف شہر مسکلا سے تقریباً 200 کلومیٹر شمال کی جانب حضر موت میں ایک مقام ہے جہاں لوگوں نے حضرت ہود علیہ السلام کا مزار بنا رکھا ہے۔ اس علاقے میں ایسے کھنڈرات موجود ہیں جنہیں مقامی باشندے دارِ عاد کہتے ہیں۔

ہزاروں سال قبل احقاف میں بہترین تمدن رکھنے والی قوم، قوم عاد آباد تھی اور یہ علاقہ سرسبز و شاداب تھا مگر آج کل یہ جنت ارضی کا علاقہ لق و دق صحرا میں تبدیل ہو چکا ہے اور اس صحرا کے اندر جانے کی کوئی ہمت بھی نہیں کر سکتا۔ 1843ء میں جرمنی کا ایک فوجی اس ریگستان کے جنوبی کنارے تک پہنچ گیا تھا اس کے بقول اگر شمالی حصے کی سطح مرتفع پر کھڑے ہو کر دیکھا جائے تو یہ صحرا ہزار فٹ نشیب میں واقع دکھائی دیتا ہے۔

☆☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اپنا محاسبہ کیجئے

- ترتیب کا اصول اپنائیے اور قطار میں اپنی باری کا انتظار کیجئے۔ بے ترتیبی ہمیشہ خودغرضی اور انتشار کو جنم دیتی ہے' اس سے گریز کیجئے۔
- گھر میں اور گھر سے باہر بھی انسان دوستی کا ثبوت دیجئے کہ یہ جذبہ دلوں کو منور رکھتا ہے۔
- ہر جگہ صبر و تحمل اور نظم و ضبط کا مظاہرہ کیجئے۔ خود بھی پرسکون رہئے' دوسروں کو بھی پرسکون رہنے کی تلقین کیجئے۔
- وقت کی قدر کیجئے' اسے باتوں اور بے مصرف کاموں میں ضائع کرنے کی بجائے اپنے مستقبل کو درخشاں اور اپنے ملک کو تاباں بنانے میں صرف کیجئے۔
- ٹریفک کے اصولوں کی پابندی کیجئے۔ اگر آپ جلدی میں بھی ہیں تو دو چار منٹ تاخیر سے سہی' آپ کا صحیح و سلامت پہنچنا ضروری ہے۔
- رب کریم نے اس پوری زمین کو مسجد قرار دیا ہے لہٰذا آپ اپنے حصے کی مسجد' اپنے گھر کو صاف ستھرا رکھئے۔
- صفائی نصف ایمان ہے' صفائی کا خیال اپنے گھر سے لے کر اپنے محلے اور شہر تک رکھئے۔
- اپنی کامیابی کے لئے اپنے وسائل اور اپنی محنت پر بھروسہ کیجئے۔ دوسرے ناجائز راستے نہ صرف آپ کی اہلیت کو ماند کرتے ہیں بلکہ اس طرح دوسروں کو بھی ان کا حق نہیں ملتا۔
- قانون اس کا احترام کرنے والوں کے لئے بنایا جاتا ہے لہٰذا اپنے آپ کو مشکلات سے دوچار کرنے کی بجائے اس کا احترام کیجئے۔
- اپنی پہچان کے لوگوں کو ہی نہیں' اپنے ہر ہم وطن کو قابل احترام سمجھئے۔ دوسروں کی عزت کیجئے' لوگ آپ کی عزت کریں گے۔
- دوسری قومیں ہمیں بحیثیت پاکستانی شناخت کرتی ہیں۔ آپ بھی بحیثیت پاکستانی اپنا تعارف کرائیے کہ آپ کی شناخت اُجاگر ہو۔
- دُنیا کے دھندوں میں سے صرف ایک گھنٹہ اس رب کریم کی خاطر نکالئے جس نے ہمیں اپنی رحمتوں اور نعمتوں سے نوازا۔ اس ایک گھنٹے میں پانچ وقت اس کے سامنے سر جھکایا جاسکتا ہے' یہ جھکا سر غرور اور تکبر سے نجات دلاتا ہے۔

اگر آپ یہ تمام اوصاف رکھتے ہیں تو پاکستان کو آپ پر فخر ہے

ادارہ "آداب عرض" نے انسان دوستی اور قومی یک جہتی کی ضرورت کے تحت شائع کیا

عشق سیڑھی کانچ کی

☆امجد جاوید

یہ دنیا بہت وسیع ہے لیکن آج کے دور میں رابطہ اور تعلق استوار کرنے کے لئے ایسے وسیلے انسان کے ہاتھ آ گئے ہیں کہ ہزاروں میل دور بسنے والے لوگ بھی اپنے بن جاتے ہیں اور اپنائیت کا یہی احساس لوگوں میں، خاندانوں میں فاصلے بھی بڑھا رہا ہے۔ بلال بھی کچھ ایسی ہی صورتحال سے دوچار رہا لیکن سچائی کی، نور کی جو کرن اس کے دل میں اتر آئی تھی، وہ اس کے دل کو منور کر گئی۔ اس کا ہر فیصلہ اللہ کی خوشنودی کے لئے تھا اور شاید اسی لئے قدرت اس پر مہربان رہی۔۔۔ امجد جاوید کی خوبصورت تحریر کی یہ دسویں اور آخری قسط ہے اور اس کا انجام یقیناً آپ کے دل میں مثبت جذبوں کو فروغ دے گا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نورالٰہی عشاء پڑھ کر واپس آئے تو افضال نور کے ساتھ زبیدہ خاتون بھی ان کے کمرے میں جا پہنچیں۔ دادا انہی کے انتظار میں تھے، سہولت سے بیٹھ جانے کے بعد انہوں نے پوچھا۔

''ہاں بھئی، افضال! اب بتاؤ، تم کیا کہہ رہے تھے؟''

''ابا جی! میں رقیہ کے بارے میں آپ سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔ مجھے احساس تو ہو گیا ہے کہ تجمہ کا رجحان اب ہماری طرف نہیں رہا، اب اس کے بارے میں سوچنا بھی تو ہے، نا---!'' افضال نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔

''ہاں، کیوں نہیں--- میں تب ہی سمجھ گیا تھا کہ جب بلال کی شادی پر انہوں نے منگنی نہیں کی تھی۔ انہوں نے ایسا کیوں کیا تھا، اس کی دھندلی سی وجہ میرے ذہن میں آ رہی ہے۔ میں پوری تصدیق کر لوں تو پھر ان سے بات کروں گا، اس کی طرف سے تو سمجھ اب نہ ہی ہے---'' دادا نے بڑے دکھی لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

''چلیں کوئی بات نہیں، یہ خواہش بھی تو انہوں نے کی تھی--- اب خاندان میں کوئی دوسرا لڑکا تو نہیں ہے، اب ہمیں باہر ہی دیکھنا ہو گا نا! کچھ خاندانوں کی خواہش بھی ہے، ان میں چودھری سرفراز نے میرے ساتھ بات کی تھی۔''

افضال نے کہا تو دادا جی چونک گئے۔

''اس نے کب بات کی تھی؟'' ان کے لہجے میں حیرت تھی۔

''کافی عرصے سے ہمارے درمیان ایک مشترکہ دوست بات چلا رہا تھا۔'' افضال نے بتایا۔

''تو پھر ٹھیک ہے۔ اس سے اچھا خاندان اور کیا ہو سکتا ہے۔ انہیں تم چاہے، صبح ہی بلوا لو۔'' دادا جی نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''جی، وہ تو صبح آ جائیں گے، میں اپنے دوست سے ابھی بات کر لیتا ہوں۔ میرے خیال میں اس موقعہ پر احسان کو بھی تو بلوا لیں، اس سے مشورہ کر لیں۔'' افضال نے احترام سے کہا۔

''ہاں، اس سے مشورہ بھی کر لیں گے--- ایک بار وہ اپنی خواہش کا اظہار کر جائیں تو زیادہ بہتر ہے۔'' دادا جی نے کہا۔

''ابا جی کی بات بالکل ٹھیک ہے۔'' زبیدہ خاتون نے ہنکارا دیا۔

''صاف بات ہے، ابا جی! یہ میری بیٹی کا معاملہ ہے اور میں نہیں چاہتا کہ اگر وہ لوگ آئیں تو کسی بھی قسم کا کوئی غلط تاثر لے کر جائیں۔'' وہ دھیمے سے لہجے میں بولا۔

''تم کہنا کیا چاہتے ہو---؟'' نورالٰہی نے پھر چونکتے ہوئے کہا۔

''چودھری سرفراز ہمارے خاندان سے تو نہیں ہے، اس سے تو وہ امید کی جا سکتی ہے کہ وہ کسی بات کو نظر انداز کر دے لیکن اس کے ساتھ آئی خواتین یا دوسرے لوگ اپنی رائے دے سکتے ہیں نا! ---میری مراد ماہا سے ہے۔''

وہ بولا تو دادا ایک دم سوچ میں پڑ گئے، پھر خوش گمانی سے بولے۔

''نن نہیں--- میرا خیال ہے، وہ ایسی کوئی بات تو نہیں کرے گی کہ جس سے کوئی غلط تاثر جائے---''

''ضروری نہیں ہوتا، ابا جی! کہ کوئی بات ہی کی جائے---'' زبیدہ خاتون نے بڑے احترام سے کہا۔ ''اب وہ جنید کور وغیرہ آئے تھے۔ بات تو نہیں کی انہوں نے لیکن ان کے سامنے ماہا کا رویہ کیا تھا؟ وہ تو پردیسی تھے، چلے گئے۔ ان کا تعلق اگر رہے گا بھی تو بلال سے۔ وہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہو گا لیکن ان مہمانوں کے سامنے اگر اس کا رویہ یہی رہا تو وہ یہاں سے کیا تاثر لے کر جائیں گے؟''

''بات تو معقول ہے مگر ماہا سے کس طرح کہا جائے، وہ تو فوراً کہہ دے گی کہ آپ سب میرے بارے بدگمانی رکھتے ہیں--- نہیں، میرا نہیں خیال کہ وہ ایسا کرے گی۔'' دادا نے بڑے وثوق سے کہا۔

''لیکن اگر احسان اور ذکیہ آ جائیں تو میرا خیال ہے، وہ---''

افضال کہنے لگا تو دادا نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے، میں انہیں بھی بلوا لوں گا بلکہ تم خود فون کر دینا۔ انہیں اچھا بھی لگے گا اور مہمانوں کو بھی آگہی ہو گی کہ ان دونوں بھائیوں کی ایک بات ہے۔''

دادا نے اس سے رضامندی کرتے ہوئے کہا۔ پھر وہ دیر تک اس موضوع پر بات کرتے رہے۔ یہاں تک کہ طے پا گیا کہ چودھری سرفراز کو بلوا لیا جائے۔ ان کی خواہش پر کچھ وقت مانگ لیا جائے لیکن وہ زیادہ نہ ہو، اس میں چند دن یا ایک آدھ ہفتہ ہو اور منگنی کر دی جائے۔ پھر شادی کا بعد میں سوچ لیا جائے گا۔

تیسرے دن حویلی میں خاصی گہما گہمی ہو گئی۔ اس

18۔رانا ٹاؤن۔حاصل پور

محترم خالد بن حامد صاحب! السلام علیکم!

بہت دنوں بعد خط لکھ رہا ہوں۔ سچ پوچھیے تو وقت کہاں ملتا ہے، حالات سے چرایا ہوا وقت سکون کی نذر ہو جاتا ہے لیکن وہ بھی کہاں؟ ایوان ذہن میں کردار آ کر داستانیں اپنے کاندھوں سے اتار کر سامنے رکھ دیتے ہیں، وہ سکون کہاں لینے دیتے ہیں۔ انہی کرداروں سے الجھتے ہوئے تھکن بھی تو ہو جاتی ہے مگر یہ بھی سچ ہے کہ یہی کردار توانا بھی کر دیتے ہیں۔ نجانے میرے ساتھ ایسا کیا ہے۔ میں سامنے آنے والی رکاوٹ کو ہٹ جانے تک سکون سے دیکھتا رہتا ہوں۔ یہ دیکھتا ہوں کہ وہ خود کو کس مقام تک لے جاتی ہے۔ وہ رکاوٹ خود نہ ہٹے تو اسے پار کر لیتا ہوں۔ پھر اگر وہ رکاوٹ مڑ کر میری جانب دیکھتی ہے تو میں اسے ذرا سا بھی وقت نہیں دیتا۔ اب بات کرتے ہیں ''عشق سیڑھی کانچ کی'' سے متعلق--- محترم اعجاز حسین سخار! اس کہانی کے بارے میں آپ کی جو رائے بھی ہے وہ سر آنکھوں پر، ممکن ہے کہ آپ کسی اور زاویہ نگاہ سے دیکھ رہے ہوں۔ بہر حال میں نے یہ کہانی لکھی ہی ان سوالوں کے جواب دینے کے لئے ہے جو عالمی سطح پر مسلمانوں کے بارے میں اٹھائے جا رہے ہیں۔ جس سے نہ صرف غیر بلکہ اپنے بھی متاثر ہو رہے ہیں سوالوں کو جواب دینے کے لئے اس بار میں نے کہانی کو محض کہانی نہیں، مقصد سمجھ کر لکھا ہے۔ ایک گزارش ہے آپ سے، آپ نے لکھا ''خود ساختہ نظریات'' تو پلیز، مجھے ضرور بتایئے گا کہ میں نے کون سے خود ساختہ نظریات دیئے ہیں۔ یہ آپ کے ذمے ہے، پلیز! اسے نظر انداز مت کیجیے گا--- محترمہ شبیہہ مظہر رانجھا! اتنے عرصے بعد آپ کا دکھائی دے جانا ہی خوشی کا باعث ہے، دوسرا آپ نے تبصرے کے قابل سمجھا۔ اس بار بتایئے گا کہ جمود ٹوٹا ہے کہ نہیں؟ اور یہ یکسانیت کہاں سے آ گئی، ذرا بتانا تو کہ یکسانیت سے مراد مماثلت ہے یا؟--- محترم سید وہاب! اگر بلال پہلے ہی سب کچھ بتا دیتا تو یہ کہانی کس طرح وجود میں آتی؟ اب آپ نے اس پر غور ضرور کرنا ہے کہ بلال اپنی بیوی کو قائل بھی کر سکتا ہے یا نہیں؟--- محترم عبدالغفار عابد! حضور، اب صحت کیسی ہے؟ لگتا ہے، اسی باعث تبصرہ نہیں کیا--- محترم محمد احمد فہیم قائپوری! آپ نے مجھے دعائیں دیں، ایسے ہی انمول تحفے آپ کے لئے--- آخر میں ایک اپیل کہ یہ اپنے محترم ایم اشرف نجمی کہاں گم ہو گئے ہیں۔ اب تو گرمیاں بھی ''کٹ'' گئیں۔ کہاں ہیں آپ، واپس آ جائیں، کچھ نہیں کہا جائے گا۔

آپ کا اپنا☆ امجد جاوید

موبائل: 0333-6347166

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شام چودھری سرفراز کے ساتھ مہمانوں نے آنا تھا۔ احسان نور اور ذکیہ بیگم دوپہر ہی کے وقت پہنچ گئے تھے۔ افضال نے انہیں تفصیل سے اس بارے معاملے میں بتایا، وہ لوگ خوش تو ہوئے مگر نجمہ کے بارے میں افسوس کرنے لگے کہ اس نے اچھا نہیں کیا۔

''افضال بھائی! ویسے ایک بات ہے---'' ذکیہ بیگم نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''میرے ساتھ بھی نجمہ باجی کی باتیں چلتی رہی ہیں۔ جب شروع شروع میں اس نے بات کی تھی تو کیا اس نے فہد سے پوچھے بغیر کی تھی؟ یہ بات کم از کم میں نہیں مانتی کیونکہ ایک بار اس نے میرے سامنے یہی بات کی تھی اور فہد اس وقت ہمارے پاس تھا۔ اگر اسے روکنا ہوتا تو اسی وقت یا بعد میں لاہور جا کر روک دیتا، اپنی مرضی بتاتا لیکن وہ بدستور رقیہ کے لئے کوشش کرتی رہی لیکن ایسا ہوا کہ اچانک اس نے انکار کر دیا۔''

''انکار تو اس نے کیا ہی نہیں، بیگم---!'' احسان نے اسے یاد دلایا۔

''مطلب، ابا جی کے سامنے تو یہی کہہ گئی ہے نا!--- حتمی بات نہ کرنے والا، تذبذب میں رکھنے والا انکار ہی کر رہا ہوتا ہے۔ کیا ہمیں اس نکتے پر نہیں سوچنا چاہئے؟'' ذکیہ بیگم نے کہا۔

''بات تو تمہاری سوچنے والی ہے مگر وہ ایسا کیوں کرے گا، وہ اپنی مجبوری بتا گئی ہے کہ فہد نہیں مانا---'' احسان نے پھر سے کہا۔

''میں نہیں مانتی --- کوئی دوسری بات ہو سکتی ہے، کم از کم یہ عذر نہیں ہے۔'' وہ سر پھیرتے ہوئے بولی۔

''چلو بتاؤ، تمہارے خیال میں کیا ہو سکتا ہے؟'' احسان نے پوچھا۔

''اب میرے ذہن میں تو نہیں ہے، اس پر سوچا ضرور جا سکتا ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

''ویسے بھابی کی بات ہے سوچنے کے قابل---'' افضال نے کہا۔

''چلو، یہ باتیں بعد میں سوچتے رہنا، پہلے ہمیں مہمانوں کو دیکھنا ہے۔ میرے خیال میں وہ آنے والے ہی ہوں گے۔''

احسان نے طویل ہوتی ہوئی بحث کو سمیٹ لیا۔ تبھی اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ ماہا دکھائی نہیں دے رہی ہے--- کہاں ہے وہ؟''

اس کا روئے سخن زبیدہ خاتون کی طرف تھا تبھی ذکیہ بیگم بولی۔

''بھئی، وہ رقیہ کے پاس ہو گی--- بچیاں تیار ہو رہی ہیں---''

''وہ میرا چشمہ ادھر اس کے کمرے میں رہ گیا ہے، وہ تو منگوا لو۔''

احسان نے کہا تو ذکیہ نے ملازمہ سے چشمہ لانے کو کہا اور پھر وہ اپنی باتوں مشغول ہو گئے۔ ملازمہ نے تھوڑی دیر بعد چشمہ لا کر دے دیا۔ تبھی مہمانوں کے آنے کی اطلاع ملی تو ان کی توجہ باہر کی سمت ہو گئی۔ چودھری سرفراز کے ساتھ اس کی بیگم، بیٹیاں، بہو کے ساتھ ایک قریبی خاتون بھی تھی۔ اس کے پیچھے دونوں کا مشترکہ دوست فدا حسین اپنی بیگم کے ہمراہ تھا۔ اچانک ہی ڈرائنگ روم بھر گیا اور ان کے بیٹھتے ہی مشروب آ گیا، ساتھ میں خوشگوار ماحول میں باتیں چلتی رہیں۔ دادا نور الٰہی بھی وہیں آ گئے جس کے باعث خواہ مخواہ ہی علاقے کی بات ذکر چھیڑ گیا--- کچھ ہی دیر بعد سرفراز چودھری کی بیوی نے کہا۔

''چودھری صاحب! ہم یہاں سیاست کرنے نہیں

آئے---'' اس نے کچھ اس انداز سے کہا کہ سبھی مسکرا دیئے۔

''تو پھر تمہی کہو، نا---!'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ اس نے دادا نور الٰہی کی طرف دیکھا اور پھر سنجیدگی سے بولا۔ ''ہم دونوں خاندان ایک دوسرے کے بارے میں جانتے ہیں۔ میری بہت عرصہ سے خواہش تھی کہ ہم کوئی تعلق آپس میں جوڑ لیں۔ مجھے بڑی امید تھی کہ شاید آپ میری جانب رجوع کریں گے لیکن ایسا نہ ہو سکا سو اب میں خود آپ کے پاس آیا ہوں تاکہ ہمارے درمیان ایک مضبوط تعلق بن جائے۔''

''یہ آپ کی بڑی مہربانی ہے کہ آپ نے ایسا سوچا---''

دادا جی نے بڑی فراخدلی سے کہا تو اس نے بڑے احترام سے کہا۔

''میں چاہتا ہوں آپ میرے چھوٹے بیٹے جنید کو اپنی فرزندی میں قبول کر لیں، یہ میرے لئے فخر کی بات ہو گی۔''

''چودھری صاحب! بیٹیوں کو تو اپنے گھر جانا ہوتا ہے۔ آپ نے یہ خواہش کی ہے تو ہمیں تھوڑا سا وقت سوچنے کا دیں تاکہ ہم مشورہ کر سکیں۔'' دادا نے بڑے تحمل سے کہا۔

''وہ تو جی، آپ کا حق ہے لیکن میری اتنی درخواست ہے کہ آپ جس قدر جلدی یہ فیصلہ کر لیں، اس قدر ہی ہم اپنی خوشیاں ایک دوسرے کے ساتھ شیئر کر لیں گے۔'' اس نے بڑے اچھے انداز سے کہا۔

''میرا خیال ہے، ویسے ہی ہو گا۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''ہمارے دونوں خاندان ایک دوسرے سے ڈھکے چھپے تو نہیں ہیں لیکن پھر بھی اگر کوئی بات ہو تو فدا حسین ہیں یا پھر براہ راست مجھ سے پوچھیں---''

چودھری سرفراز نے رسماً یہ بات بھی کہہ دی تو زبیدہ خاتون نے کہا۔

''آئیں، باہر لان میں چلتے ہیں۔ وہاں چائے لگا دی گئی ہے۔''

سب دھیرے دھیرے اٹھ کر باہر جانے لگے تو آخر میں احسان نور نے محسوس کیا کہ ان کے درمیان ماہا نہیں آئی حالانکہ یہ بات زبیدہ خاتون کے بجائے گھر کی بہو کو کہنی چاہئے، اسے ہر معاملے میں پیش پیش ہونا چاہئے تھا--- چند قدم کے فاصلے پر ذکیہ کھڑی تھی، احسان نے اسے ٹھہرنے کا اشارہ کیا تو وہ واپس آ گئی۔

''جی، کہئے---''

''یہ ماہا دکھائی نہیں دے رہی ہے؟'' احسان کے کہنے پر اچانک اسے بھی خیال آیا۔

''آپ چلیں، میں دیکھتی ہوں۔''

ذکیہ نے کہا تو افضال باہر کی جانب چلا گیا جبکہ وہ اس حویلی کے حصے کی جانب بڑھ گئی جو ماہا کے لئے مختص تھا۔

جیسے ہی وہ کمرے میں داخل ہوئی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ ماہا بڑی سکون سے میوزک لگائے سن رہی ہے۔ اس نے وہی رف کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ کانوں سے ایئر فون لگائے، آنکھیں بند کئے، دنیا و مافیا سے بے نیاز تھی۔ ذکیہ بیگم حیرت زدہ رہ گئی۔ چند لمحے تو اس کی سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ وہ اسے کیا کہے، پھر یکدم ہی اس کا پارہ چڑھ گیا۔ اس نے ماہا کے کانوں سے ایئر فون ہٹائے تو وہ چونک گئی۔ پھر سامنے ذکیہ بیگم کو دیکھ کر بولی۔

''اوہ، ماما! آپ--- آئیں، بیٹھیں۔''

''ماہا! تم اس قدر بے حس ہو چکی ہو، تمہیں ذرا سا بھی اپنی یا دوسروں کی عزت کا خیال نہیں ہے---؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس نے انتہائی تلخ لہجے میں کہا تو ماہا نے ائیرفون ایک طرف رکھ کر میوزک بند کیا اور بولی۔

”میں بے حس خود نہیں بنی، بنا دی گئی ہے سو مجھے بتایئے کہ میں کیا کروں؟“ اس کے لہجے میں لاپروائی تھی۔

”گھر میں اتنے مہمان ہیں اور یہ ساری ذمہ داری تمہاری ہے اور تم ہو کہ یہاں پڑی میوزک سن رہی ہو--- بہت نام روشن کر رہی ہو اپنے والدین کا---؟“ ذکیہ بیگم نے انتہائی غصے میں کہا۔

”ماما! یہ سب آپ کی سوچ ہے ورنہ جہاں جس بندے کی اہمیت ہی نہ ہو، وہاں ایک طرف کونے میں پڑا رہنا ہی اپنی عزت بچانا ہوتا ہے۔ مجھ سے کسی نے کہا ہی نہیں کہ گھر میں مہمان آنے والے ہیں تو میں ایویں تیار ہوتی پھروں۔“ وہ بولی، اس کا لہجہ اطمینان بھرا تھا۔

”لیکن یہ سوچو کہ ہم بھی تو یہاں ہیں، مہمانوں میں سے کسی نے یہ پوچھ لیا کہ بہو کہاں ہے تو ہم کیا جواب دیں گے--- یہی کہ وہ میوزک سن رہی ہے؟ حویلی والوں کی جو عزت ہوگی سو ہوگی، ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔“ ذکیہ بیگم نے روہانسی ہوتے ہوئے کہا۔

”تو پھر کیا ہو جائے گا؟--- یہی نا! کہ مہمان غلط تاثر لے کر جائیں گے تو مجھے کیا---؟“ اس نے لاپروائی سے کہا اور دوسری کروٹ بیٹھ گئی۔

”تو یہ ہیں تمہارے خیالات؟---اور ہماری قسمت دیکھو، کسی سے بہانہ بھی نہیں کر سکتی کہ اس کی طبیعت خراب ہے اور اگر تمہیں دیکھنے کوئی آ گئی تو--- یا اللہ! میں کیا کروں---؟“

اس نے بددل سی ہو کر کہا اور یوں دکھائی دینے لگی ...سوں کی بیمار ہو۔ ماہا چند لمحوں تک اسے دیکھتی رہی، پھر بولی۔

”آپ سب کو اپنی عزت کا خیال ہے؟---ٹھیک ہے۔ بولیں، کیا کروں---؟“ اس کے لہجے میں دبا دبا غصہ تھا۔

”میرا نہیں خیال کہ تم اتنی احمق، بے وقوف اور پاگل ہو---“

ذکیہ بیگم نے کہا اور اٹھ کر بجھے قدموں سے باہر چلی گئی جبکہ وہ اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

لان میں مرد ایک طرف اور خواتین دوسری جانب بیٹھی ہوئی تھیں۔ دونوں جانب پرتکلف چائے کا اہتمام تھا، رقیہ بھی وہیں موجود تھی۔ وہ اس قدر اہتمام سے تیار نہیں ہوئی تھی کہ وہ بنی ٹھنی دکھائی دے، بس تھوڑا بہت تھا۔ اس کے چہرے کی معصومیت ویسے ہی بھا جاتی تھی---ذکیہ بیگم بھی ان کے درمیان جا کر بیٹھ گئی۔ اس نے احسان کی طرف دیکھا جو اسی کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اس نے ذکیہ کے چہرے سے اندازہ لگا لیا کہ ضرور کوئی اچھی بات نہیں ہے لیکن مجبوری یہی تھی کہ وہ پوچھ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ بجھی بجھی سی بیٹھی تھی۔ تبھی سرفراز چودھری کی بیگم نے وہی پوچھ لیا، جس کا ڈر تھا۔

”زبیدہ بہن! آپ کی بہو دکھائی نہیں دے رہی، بہت مصروف ہے کیا؟--- میں بھی اسے دیکھ لیتی، شادی پر تو ایک جھلک دیکھی تو اس کی---“

اس نے خوشگوار انداز میں کہا تو جہاں زبیدہ پر گھڑوں پانی پڑ گیا، وہاں ذکیہ بیگم ایک دم سے ساکت ہو گئی کہ نجانے وہ کیا کہہ دے۔ تبھی وہ جلدی سے بولی۔

”وہ بلال کے پاس لاہور گئی ہے، یہاں نہیں ہے۔“

تب زبیدہ نے چونک کر اس کی جانب دیکھا اور خاموش رہی۔

”اچھا، چلیں اب تو ملاقات ہوتی رہے گی۔ پھر اگلی بار سہی۔“

بیگم سرفراز نے کہا اور دوسری باتوں میں لگ گئی۔

تقریباً ایک گھنٹے تک وہ وہیں بیٹھے گپ شپ کرتے رہے۔ مردوں میں تقریباً طے پا گیا تھا کہ وہ تعلق جوڑ لیں گے اور ایسا ہی حال خواتین کا بھی تھا۔ وہ یہی پوچھ رہی تھیں کہ آپ بتائیں، آپ کب ہمارے ہاں آ رہے ہیں اور زبیدہ خاتون کوئی واضح جواب نہیں دے پا رہی تھی---بیگم سرفراز نے کہا۔

”اچھا، چلیں ٹھیک ہے۔ جب آپ کا بیٹا اور بہو آ جائیں تو مشورہ کرتے ہی ایک چکر ضرور ہمارے ہاں لگایئے گا۔ ایک بار معاملہ طے ہو گیا تو پھر ہم نے بہت جلدی کرنی ہے۔“

”انشاء اللہ---اللہ پاک سب اچھا کرے گا۔ ان کی قسمت اچھی ہے۔“

زبیدہ خاتون نے کہا تو مردوں کی جانب سے سب اٹھ کھڑے ہوئے تو خواتین بھی اٹھ گئیں۔ انہیں ڈرائنگ روم سے ہو کر پورچ تک جاتا تھا۔ جیسے ہی وہ کوریڈور تک گئے، سامنے سے ماہا آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس نے بہت اچھا لباس پہنا ہوا تھا، ہلکا ہلکا میک اپ کیے وہ سکون سے آ رہی تھی۔ اس کا لباس ویسا نہیں تھا جیسا بہو بیٹیوں کا ہونا چاہیے تھا۔ انتہائی جدید فیشن والا جس میں کافی حد تک بدن دکھائی دے رہا تھا، مہین سے کپڑے کا آنچل اس کے گلے میں تھا۔ وہ ان سب کو آتا دیکھ کر رک گئی۔ ذکیہ بیگم تو یوں ہو گئی جیسے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں، زبیدہ خاتون الگ شرمندہ ہو رہی تھی اور رقیہ نے سر جھکا لیا کیونکہ بیگم سرفراز نے حیرت سے ماہا کی جانب دیکھ کر کہا۔

”یہ آپ کی بہو نہیں ہے اور آپ تو---“

قائداعظمؒ ماؤنٹ بیٹن کے ہمراہ سٹیج پر رونق افروز تھے۔ قرآن پاک کی تلاوت سے تقریب کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ بابائے قومؒ چونکہ صدر محفل تھے لہٰذا آپ سے پہلے ماؤنٹ بیٹن کو اظہار خیال کی دعوت دی گئی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن مائیک کی طرف بڑھے اور سب سے پہلے مسلمانانِ ہند کو حصول پاکستان پر مبارکباد پیش کی۔ قائداعظمؒ اپنے گال پر ہاتھ ٹکائے بڑے انہماک سے تقریر سن رہے تھے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے جونہی یہ کہا کہ مجھے اُمید ہے ”اقلیتوں کے سلسلہ میں پاکستان اکبر بادشاہ کی تقلید کرے گا تو قائداعظمؒ نے فوراً ہی انہیں ٹوک دیا اور اُٹھ کر مائیک کی طرف بڑھے“ عوام حیران ہو کر قائدؒ کے اس فعل کو دیکھ رہے تھے۔ قائداعظمؒ نے مائیک کے سامنے کھڑے ہو کر کہا۔

”مسٹر بیٹن! ہمیں اکبر کی تقلید کی کیا ضرورت ہے؟ ہم اپنے رسول پاک ﷺ کے نقش قدم پر چلیں گے جنہوں نے تیرہ سو برس پہلے صرف الفاظ ہی سے نہیں بلکہ عملاً عیسائیوں اور یہودیوں سے انتہا درجہ کی رواداری کا سلوک کیا اور اُن کے عقیدے اور دین کا از حد احترام کیا۔“

مملکت خداداد پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد آزادی کی پہلی تقریب میں قائداعظمؒ کی یہ پہلی وضاحت تھی جو انہوں نے ریاست کو چلانے کے متعلق بھرے مجمع میں کی۔ قائداعظمؒ کی گفتگو اگرچہ انگریزی زبان میں تھی مگر قائدؒ کی زبان سے نبی پاک ﷺ کا نام سن کر عوام نے بے اختیار ”پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ“ اور ”قائداعظمؒ زندہ باد“ کے نعرے لگانے شروع کر دیے۔

کامران سعید۔ لاہور

ایک دم سے خاموشی چھا گئی تھی، وہ کوئی جواب ہی نہ دے سکیں تھیں۔ بیگم سرفراز نے اس پر مزید بات نہیں کی، وہ سب سے ملی جیسے فارمیلٹی پوری کر رہی ہو۔ وہ وہاں چند منٹ رکے اور پھر پورچ تک جا پہنچے۔ جس دل سے زبیدہ خاتون نے انہیں رخصت کیا تھا، وہی جانتی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھی۔ وہ مہمان تو چلے گئے لیکن زبیدہ خاتون اور ذکیہ بیگم ایک دوسری کی طرف دیکھ کر خاموش ہو گئیں۔ وہ کچھ بھی تو نہ کہہ سکیں۔

☆☆

گزرتی ہوئی شب کے ساتھ دکھ کی شدید لہر میرے من میں سرائیت کر گئی تھی۔ بات مجھ تک رہتی تو ٹھیک تھی۔ ماہا کی دشمنی، نفرت یا بغاوت میرے ساتھ تھی، اس میں میری بہن کا کیا قصور تھا؟ وہ بے چاری کیا سوچتی ہو گی، اس نے ماہا کا کیا بگاڑا تھا؟ وہ اس قدر بے حس ہو گئی ہے کہ اس کا بھی خیال نہیں کیا، وہ کیا اس کی کچھ بھی نہیں لگتی تھی؟ خاندان کے ہر فرد کو اس کے اس رویے سے کس قدر دکھ پہنچا ہو گا اور یہ سب میری بیوی ماہا کر رہی ہے جس کے بارے میں مجھے دعویٰ ہے کہ وہ میرا عشق ہے--- میں مسلسل اس بات پر سوچتا چلا جا رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے جب میری امی سے تفصیل کے ساتھ بات ہوئی تو انہوں نے مجھے سب بتا دیا۔ ان کے من میں جو بھڑاس تھی، وہ میرے سامنے نکال دی اور میں ان کے سامنے شرمندہ ہو رہا تھا۔ کیا میں نے اسے بیمار قرار دے کر غلط کیا تھا، کیا میرے ہی عشق میں کہیں کھوٹ ہے یا پھر ماہا ہی اس قابل نہیں ہے کہ اس سے عشق کیا جا سکے؟--- یہ عاشق، عشق اور معشوق کی تکون کیا ہے؟ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے، معشوق ہی اس قابل نہ ہو کہ اس سے عشق کیا جا سکے؟ بت کے سامنے گڑگڑانے والا کیا یہ نہیں جانتا کہ بت کی سماعت ہی نہیں ہے تو پھر وہ کیوں گڑگڑاتا ہے؟--- یہ سب کچھ تو عاشق کے اپنے من میں چل رہا ہوتا ہے۔ وہ جس سے عشق کرے آزاد ہے لیکن اپنے عشق میں بلند تو وہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب معشوق اعلیٰ و ارفع ہو۔ فنا نہ ہونے والا، بے جان بت۔ کسی کے زورِ عشق کا ردعمل کیا دے گا؟--- ہاں، جب دوسری طرف سے قبولِ عشق کا احساس بندے کو مل جائے تو زورِ عشق میں اپنا آپ وا دینا فنا نہیں ہوتا، وہ تو بقا کے راستے پر چل رہا ہوتا ہے۔ کسی نے پوچھا کہ جب میں اللہ کا ذکر کرتا ہوں، سبحان اللہ کہتا ہوں تو کیا وہ قبولیت پا لیتا ہے؟ مجھے کیسے پتہ چلے کہ میرا سبحان اللہ کہنا میرے اللہ نے قبول کر لیا؟--- دوسرے نے جواب دیا، ایک بار سبحان اللہ کہنے کے بعد اگر تمہیں دوسری بار سبحان اللہ کہنے کی توفیق مل جاتی ہے اور وہ تم کہہ دیتے ہو تو ایسا اس وقت ہوتا جب پہلی بار کہا گیا سبحان اللہ قبول ہو جاتا ہے--- اہل تصوف کا بھی یہی خیال ہے کہ جب بندہ اللہ کی راہ پر چل نکلتا ہے تو پھر اللہ پاک اس کی عبادتوں، ریاضتوں، ذکر اذکار کی قبولیت کے بدلے میں انعام و اکرام سے ضرور نوازتا ہے۔ پھر بندے کے درجات بلند ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ ان درجات کی بلندی کا اظہار قبولیت دعا کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ انکشاف، الہام وغیرہ ایسی بے شمار نعمتیں ملتی چلی جاتی ہے۔ اب یہ بندے کا اپنا ظرف ہے کہ وہ یہیں قناعت کر کے بیٹھ گیا یا پھر درجہ بدرجہ عشق سیڑھی چڑھتا چلا گیا۔ حقیقت عشق تو یہی ہے کہ معشوق کامل ہو، اس کی راہ پر اگر چلا جائے، پاؤں لہولہان بھی ہوں تو اس کا احساس بھی ہو، اس کا بدلہ بھی دیا جائے تاکہ عشق کی لو اور تیز ہو جائے--- میں اپنے خیالات میں کہیں اور نکل گیا تھا۔ رات آہستہ آہستہ گزرتی چلی جا رہی تھی اور میری آنکھوں میں نیند کا شائبہ تک نہیں تھا۔ میں ماہا کے بارے میں سوچتا چلا جا رہا تھا۔ میں زندگی کے کس مقام پر آ پہنچا ہوں، اس کی یہ کیسی محبت ہے کہ جو اسٹیٹس کے ساتھ ہے، ایک خاص طرز زندگی کے ساتھ ہے۔ کیا وہ مجھے پسند نہیں کرتی، کیا اس کی محبت میری ذات سے نہیں۔ میں مانتا ہوں کہ میں اپنی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسے کچھ نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں

چاہتا ہوں کہ وہ ٹھیک ہو جائے لیکن کب تک؟ وہ میری توہین اگر کر رہی تھی تو میں برداشت کر رہا تھا لیکن اب تو وہ سارے لوگوں کو شامل کرتی چلی جا رہی تھی۔ میں اسے ساتھ لے کر چل رہا تھا تو اپنے من میں لہولہو ہو رہا تھا۔ شرمندگی، دکھ، توہین کے احساس میری انا، میری ذات اور میری شخصیت کو اندر ہی اندر سے کچل رہے تھے۔ مجھے اگر اس قدر تحمل ملا تو صرف اپنے دین کے باعث لیکن دین بھی تو ایک خاص حد تک اجازت دیتا ہے--- تند و تیز سوچوں میں اچانک خیال نے ٹھٹک جانے پر مجبور کر دیا کہ اگر میں اسے چھوڑ دوں گا اور چھوڑ دینا بہت آسان ہے تو پھر وہ کیا کرے گی؟ وہ جو کچھ بھی کرے لیکن جب میں اپنی زندگی سے نکال دوں گا تو مجھے اس سے کیا واسطہ؟--- یہ معاملہ اپنی جگہ مگر بحیثیت مسلمان میں اس کو یونہی چھوڑ دوں گا۔ وہ اگر ایسے راستے پر جا رہی ہے جو سراسر غلط ہے تو کیا مجھے اس کو بچانا نہیں چاہئے، اسے صراطِ مستقیم دکھانا چاہئے۔

''کیا وہ تمہاری بات سنتی ہے؟--- صراطِ مستقیم تو وہاں دکھا پاؤ گے جب وہ تمہاری سنے گی۔ اسے تم سے لگاؤ ہو گا، وہ تم پر اعتماد کرے گی۔ اسے یقین ہو گا کہ جو تم کہہ رہے ہو، وہ سچ ہے۔ نہ اسے تمہاری ذات سے نفرت ہے اور نہ کسی دیگر معاملے سے، اسے تو فقط یہ دکھ ہے کہ تم نے اپنا اعتماد کھو دیا۔''

''مگر میرا ارادہ تو فقط پی اون کے تعصب زدہ سوالوں کے جواب دینا تھا، اس سے ماہا کی زندگی پر کوئی فرق نہیں پڑنے والا تھا۔ پھر مجھے اتنی بڑی سزا کیوں دی جا رہی ہے؟ میں اپنے حد تک تو سزا برداشت کر سکتا ہوں، مگر میری ماں---''

میں اس سے آگے نہیں سوچ سکا، میں اس طرح الجھن کا شکار ہو گیا کہ مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ مجھے کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا کہ میں کیا کروں، انہی کٹھن لمحوں میں مجھے میاں صاحب کی بات یاد آ گئی کہ جب بھی الجھن بڑے اور تمہاری بے بسی انتہا کو پہنچ جائے تو اس ربِ عظیم کو یاد کیا کرو جو ہر شے پر قادر ہے۔ اس کی ربوبیت کو یاد کرو، وہ تمام جہانوں کا مالک ہے، اس کے خزانوں میں کمی نہیں--- یہ بات یاد آتے ہی میں اٹھا اور میں نے وضو کیا۔ پھر سب کچھ بھول کر میں جائے نماز پر نوافل ادا کرنے کے لئے کھڑا ہو گیا۔ میں اس ربِ عظیم کے حضور اپنی بات کہنے کا ارادہ رکھتا تھا، جس کے قبضہ قدرت میں ہر شے ہے۔

☆☆

اس سہ پہر ماہا تیار ہو رہی تھی۔ اس کا اہتمام دیکھنے لائق تھا۔ اس نے بلیک ٹائٹس کے ساتھ بلیک شرٹ اور اوپر سے بلیک کلر کا کوٹ پہنا تھا۔ بالوں کو کھلا چھوڑا اور کانوں میں بڑے بڑے جھمکے ڈالے تیزی کے ساتھ میک اپ میں مصروف تھی۔ آخری ٹچ کے بعد اس نے جلدی سے میچنگ شوز پہنے، اپنا پرس اٹھایا اور باہر کی جانب چل دی۔ اس نے کافی دیر پہلے ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کا کہہ دیا تھا۔ اس نے ایک نگاہ اپنے کمرے پر ڈالی، خاصی افراتفری تھی۔ اس نے بعد میں آ کر ٹھیک کرنے کا سوچا اور باہر کی سمت چل دی۔ وہ ڈرائنگ روم سے ہو کر جانا چاہتی تھی تاکہ اتمامِ حجت ہی کے لئے سہی، زبیدہ خاتون کو بتا جائے۔ ڈرائنگ روم میں کوئی نہیں تھا۔ وہ خوشبو چھوڑتی ہوئی راہداری میں آئی جہاں اس نے ایک ملازمہ کو دیکھا اور اسے کہا۔

''جاؤ، آنٹی کو بتا دو کہ میں نور پور جا رہی ہوں۔ ممکن ہے کہ میں رات نہ آ سکوں، صبح آؤں گی۔''

یہ کہہ کر وہ واپس مڑی اور چند قدم ہی چلی تھی کہ سامنے سے زبیدہ خاتون آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہا کے کہے ہوئے لفظ سن لئے تھے لیکن پھر بھی پوچھا۔

''کہاں جا رہی ہو؟''

زبیدہ خاتون کے لہجے میں بڑا تحمل تھا۔ ماہا نے اپنی ت دُہرادی۔ پھر کوئی اور بات سنے بغیر سامنے کی جانب قدم بڑھا دیئے جو ڈرائنگ روم ہی کی جانب تھے۔

''ماہا! ذرا میری بات سنو---'' زبیدہ خاتون نے کہا تو وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ تبھی وہ بھی وہاں آ کر ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔ ''بیٹھو---''

''کیا ہے، آنٹی! مجھے پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔'' وہ بولی۔

''میں نے کہا، نا! بیٹھو---''

اس بار زبیدہ خاتون کا لہجہ سخت تھا۔ ماہا نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا اور پھر سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ تب زبیدہ خاتون نے نرم لہجے میں کہا۔

''کیا نور پور میں بہت اہم کام ہے؟''

''جی ہاں--- وہاں میری این جی او کی سہیلیوں نے ایک زبردست پارٹی دی ہے۔ برطانیہ سے ایک خاتون آئی ہے، اس کے اعزاز میں۔ چونکہ میں چیئر پرسن ہوں اس لئے میرا جانا بہت ضروری ہے۔'' اس نے یوں کہا جیسے وہ کسی بہت اہم کام کے لئے جا رہی ہو۔

''یہ پارٹی ہو گی کہاں---؟'' زبیدہ خاتون نے پوچھا۔

''ظاہر ہے، آنٹی! ادھر ہمارے بنگلے میں جہاں میری این جی او کا آفس ہے---'' اس نے حیرت سے کہا اور پھر لمحہ بھر خاموشی کے بعد پوچھنے لگی۔ ''مگر آپ ایسے کیوں پوچھ رہی ہیں، کیا میں پہلی بار وہاں پر جا رہی ہوں؟''

''ہاں--- مجھے یہی لگتا ہے کہ تم پہلی بار جا رہی ہو ورنہ کوئی بھی بیٹی، اس قدر بیہودہ لباس میں اپنے والدین کے سامنے نہیں جاتی جس قدر تم نے پہنا ہوا ہے۔'' زبیدہ خاتون نے انتہائی تلخ لہجے میں کہا۔

''کیا ہے میرے لباس کو---؟'' ماہا ایک دم بھنچے سے اکھڑ گئی۔

''پہلی تو بات ہے کہ تم یہ اپنا حلیہ درست کرو اور اس کے بعد یہ سن لو کہ یہ تمہارا این جی او والا ڈرامہ اب ختم ہے۔ میں تمہیں قطعاً اجازت نہیں دیتی ہوں کہ اب تم یہ تماشا کرو--- واپس جاؤ اپنے کمرے میں---''

زبیدہ خاتون نے یوں سرد مہری سے کہا کہ ماہا کو چند لمحے سمجھ ہی نہیں آ سکا کہ اتنی نرم طبع خاتون اتنے سخت لفظ بھی کہہ سکتی ہے۔ کتنے لمحے تک یونہی خاموشی چھائی رہی۔ جب اسے سمجھ میں آیا کہ اس کس قسم کا حکم دے دیا گیا ہے تو وہ حیرت سے بولی۔

''آپ کو پتہ ہے کہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟''

''نہ صرف پتہ ہے بلکہ سوچ سمجھ کر تم سے کہہ رہی ہوں--- واپس جاؤ، میرا وقت ضائع نہ کرو۔'' وہ اس بار تحمل سے بولیں۔

''دیکھیں، آنٹی! میرا وہاں جانا بہت ضروری ہے اور میں وہاں جاؤں گی۔ آپ بھی مجھے نہیں روک سکتیں اور اگر آپ نے اس موضوع پر مجھ سے بات کرنی ہی ہے تو میں کل آ جاؤں گی تو ہم تفصیل سے کر لیں گے، اس وقت آپ مجھے جانے دیں۔ میرا موڈ بہت اچھا ہے، آپ اسے خراب مت کریں۔'' ماہا نے اپنے غصے کو دباتے ہوئے کہا۔

''مجھے تمہارے موڈ سے کوئی غرض نہیں ہے۔ اب تک تم نے جو کیا، وہ بہت ہے۔ اب تمہیں اس حویلی کی روایات کے مطابق چلنا پڑے گا۔''

زبیدہ خاتون نے پھر اسی تحمل سے کہا تو ماہا چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔

''آج تک آپ کو اپنی روایات یاد نہیں آئیں؟--- اپنی بیٹی کا معاملہ آیا ہے تو ساری روایات یاد آ گئی ہیں؟ ان لوگوں کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ آپ اپنی بہو کے ساتھ کیا سلوک کر رہی ہیں تبھی---''

''ذکیہ بہن سے غلطی ہوئی کہ اس نے تمہاری پردہ پوشی کرنا چاہی تھی لیکن تم نے خود ہی اپنا آپ بتا دیا۔ بعد میں اگلے دن تمہارے والدین ہی نے جا کر انہیں تمہارے رویے کے بارے میں بتا دیا تھا۔ ہم تم پر کیا کیا ظلم کر رہے ہیں، وہ تمہارے والدین بتا آئے ہیں اور میں تمہیں بتا دوں کہ ہم ان کے گھر سے ہو آئے ہیں۔ انہی دو چار دنوں میں وہ رقیہ کی منگنی کے لئے آ رہے ہیں۔ یہ ساری ذمہ داری ہم نے نہیں، تمہارے والدین نے نبھائی ہے کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ خاندان کی عزت کیا ہوتی ہے اور تمہیں اس کا احساس نہیں۔ میری مانو تو اب بھی سنبھل جاؤ اور اپنی سوچ درست کر لو، اسی میں ہی بہو بیٹیوں کی شان ہوتی ہے۔''

زبیدہ خاتون نے بہت نرم لہجے میں اسے بتایا تو ماہا کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کے والدین یہ سب کریں گے۔

''اچھا، جو بھی ہے ٹھیک ہے لیکن مجھے تو جانا ہے۔'' وہ ہٹ دھرمی سے بولی۔

''میں نے ڈرائیور کو منع کر دیا ہے، وہ تمہیں لے کر نہیں جائے گا--- اب تم واپس اپنے کمرے میں جاؤ۔''

انہوں نے پیار سے کہا تو ماہا ایک دم سے پھٹ پڑی۔

''میں دیکھتی ہوں کہ کون مجھے روکتا ہے۔ میرے والدین نے مجھے گاڑی دی ہے اور مجھے ڈرائیو کرنا آتا ہے--- میں جا رہی ہوں، کوئی مجھے نہیں روک سکتا۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شگفتہ شگفتہ

ایک صاحب عشق کے موضوع پر لمبا چوڑا لیکچر دے رہے تھے۔ لیکچر کے دوران کئی بار انہوں نے عشق کی نشانیاں بتائیں کہ جب کسی شخص کو عشق ہو جاتا ہے تو اس کی نیند اُڑ جاتی ہے، بھوک ختم ہو جاتی ہے اور اسے دن اور رات کا بالکل پتہ نہیں چلتا کہ کب صبح ہوئی، کب شام--- سامعین میں سے ایک شخص جسے نیند آ رہی تھی اور بھوک بھی شدت سے محسوس ہو رہی تھی، کھڑا ہو کر بولا۔

''جناب! یہ تو بتائیے کہ جب اس کے برعکس کسی کو بہت زیادہ نیند آئے اور بھوک بھی زیادہ لگنے لگے تو کیا ہوتا ہے؟''

تقریر کرنے والے صاحب نے ایک لمبی جمائی لی اور آرام سے بولے۔

''اس نے عشق کرنے کا انجام دیکھ لیا ہوتا ہے۔''

اختر عباس قریشی، ملتان

سمجھانے کی ضرورت کسے ہے۔"
زبیدہ خاتون نے کہا تو ماہا نے چونک کر اسے دیکھا۔
"پہلے میرا دماغ درست نہیں تھا، اب مجھے عقل آ گئی ہے۔ مجھے اب پتہ چلا ہے کہ خاندان کے بڑے اپنے مفاد کے لئے، اپنی جائیداد کو بچانے کے لئے اپنی اولاد کو بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ اگر اولاد احتجاج کرے تو اسے روایات سنا کر اس کا گلا دبا دیا جاتا ہے۔ میں جانتی ہوں اور سمجھ رہی ہوں بلکہ بھگت بھی رہی ہوں۔ آپ اپنی بیٹی کا رشتہ باہر کر رہی ہیں، میں دیکھوں گی جب آپ اس کا حصہ اسے نہیں دیں گی۔"
"ماہا! تم بات کو بڑھا رہی ہو۔ ہمیں تمہاری جائیداد کی قطعاً ضرورت نہیں ہے، میں تو تمہیں بیٹی جان کر اپنے بیٹے کی پسند سمجھ کر اپنی جگہ دی ہے لیکن تم خود ہی قبول نہیں کر رہی ہو، اس میں کسی کا کیا دوش؟---اور رقیہ اگر اپنا حق مانگتی ہے تو تمہارا تو کچھ نہیں مانگے گی اور نہ ہی تم اسے کچھ دے سکتی ہو۔ اس کا مطالبہ اپنے باپ اور بھائی سے ہوگا اور اسے حصہ دینا بھی چاہئے کہ اس کا حق ہے۔"
"خیر، یہ حصے داریاں کل آ کے کر لوں گی۔ فی الحال میں جا رہی ہوں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔
"ماہا، میری بچی! ضد مت کرو اور واپس اپنے کمرے میں چلی جاؤ۔" زبیدہ خاتون نے اسے واپس جانے کا اشارہ کیا۔
"آنٹی! اگر میں آج نہ گئی تو پھر میں کبھی نہیں جا سکوں گی۔ مجھے آپ کا جواب بھی معلوم ہے کہ آخر میں آپ کے پاس یہی دھمکی ہوگی نا! کہ میں اس حویلی میں قدم نہ رکھوں، واپس نہ آؤں۔ اس کا انجام اگر یہی ہے کہ میں واپس نہیں آؤں گی تو ہوتا رہے، میں آج ضرور جاؤں گی۔" ماہا نے انتہائی ہٹ دھرمی میں کہا۔
"ٹھیک ہے، بیٹی! اب اگر تم آخری بات بھی سوچ چکی ہو اور پوری ڈھٹائی سے کہہ بھی چکی ہو تو اب میں تمہارا راستہ نہیں روکوں گی۔ تم جا سکتی ہو مگر اس حویلی کے دروازے تم پر ہمیشہ کھلے رہیں گے، تم جب بھی آؤ۔"
"نہیں، آنٹی! اب مجھے یہاں آنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ مجھے پتہ چل گیا ہے کہ حویلی میں میری حیثیت کیا ہے۔"
ماہا نے کہا، اپنا پرس اٹھایا اور ڈرائنگ روم سے نکلتی چلی گئی۔ وہ پورچ میں جا کر کھڑی ہوئی تو وہاں گاڑی نہیں تھی۔ اس نے حویلی کی دائیں جانب وہاں دیکھا جہاں گیراج تھا، وہاں گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اسے یوں پورچ میں کھڑا دیکھ کر ڈرائیور آ گیا۔ پھر گاڑی آنے میں چند منٹ لگے اور نور پور کے لئے روانہ ہو گئی۔
اس کا دماغ سلگ رہا تھا۔ اسے یہ قطعاً امید نہیں تھی کہ زبیدہ خاتون اسے یوں جانے سے روکے گی۔ ایسا کیوں کیا تھا، کیا انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ اس کی این جی او کا بہت بڑا فنکشن ہونے والا ہے اور یہ لوگ اسے برداشت نہیں کر سکے؟---جب اسے کچھ سمجھ نہ آیا تو وہ خود کو نارمل کرنے لگی۔ پارٹی میں اس کا فریش چہرے کا ساتھ جانا بہت ضروری تھا، اس نے سکون سے ٹیک لگا کر سارے خیال ذہن سے نکال دیئے۔

☆☆

شام ڈھل چکی تھی اور اندھیرا پھیل چکا تھا۔ شہر بھر میں برقی قمقمے جل چکے تھے۔ ایسے میں نجمہ الطاف بہت خوشگوار موڈ میں اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اپنا سیل فون ہتھیلی میں دبائے اپنے ہی خیالوں میں کھوئی ہوئی یوں بیٹھی تھی کہ جیسے بڑی مضطرب ہو۔ پورا گھر روشن تھا اور اس کی نگاہیں بار بار اس داخلی دروازے کی جانب اٹھ رہی تھیں جہاں سے الطاف انور اور فہد نے آنا تھا۔

اس نے تھوڑی دیر قبل دونوں کو باری باری فون کر کے بلایا تھا۔ الطاف انور تو لان ٹینس کی گیم کرنے کے بعد اپنے دوستوں میں بیٹھا ہوا تھا جبکہ فہد اپنے دوست ذیشان کے ساتھ بلال کے پاس تھا۔ دونوں نے فوراً آنے کی وجہ فطری طور پر دریافت کی تھی لیکن نجمہ نے انہیں یہاں آ کر بتانے پر اصرار کیا تھا۔ کچھ دیر بعد پہلے الطاف انور آیا اور نجمہ کے پاس صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔
"ہاں، بیگم! بتاؤ آخر اتنی کیا ایمرجنسی آ گئی ہے کہ مجھے فوراً گھر آنے کو کہا ہے؟"
اس سے پہلے کہ وہ بات کا جواب دیتی، باہر فہد کی گاڑی رکنے کی آواز آئی تو اس نے کہا۔
"فہد آ جائے تو بتاتی ہوں۔" اس کے لہجے میں اضطراب تھا۔
کچھ دیر بعد وہ بھی آ کر بیٹھا تو اور اس نے بھی یہی سوال کیا۔
"ماما! کوئی خاص بات---؟"
"آج میں بہت خوش ہوں کیونکہ آج میں اپنے مقصد کے بالکل قریب پہنچ گئی ہوں---میری مراد ہے کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے ماہا کا فون آیا ہے۔ وہ اب ہمیشہ کے لئے حویلی چھوڑ کر نور پور آ گئی ہے۔" وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔
"لیکن دلی ہنوز دور است---تم جو چاہ رہی ہو، ابھی وہ کچھ تو نہیں ہوا۔" الطاف نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"باقی بچا بھی کیا ہے؟ معاملہ ہی کچھ ایسا ہو گیا ہے کہ وہ اس وقت خود کو تنہا محسوس کر رہی ہے، بالکل تنہا۔ یہاں تک کہ اسے اپنے والدین پر بھی اعتماد نہیں رہا۔"
"کیا مطلب---تم کیا کہنا چاہ رہی ہو؟" الطاف نے حیرت سے کہا۔
"آج ماہا کی این جی او والی سہیلیوں نے بڑا اہتمام کیا تھا۔ کوئی برطانیہ سے خاتون آئی تھی، اس کے اعزاز میں بڑی زبردست پارٹی تھی۔ ماہا کے ساتھ ہوا یہ کہ زبان نہ رکھنے والی زبیدہ خاتون نے اسے روکا اور بڑے زبردست طریقے سے باتیں سنا کر روکا اور آئندہ سے پابندی لگا دی کہ تم این جی او وغیرہ بند کر دو۔"
"بڑی بات ہے---یہ کیسے ہو گیا؟" الطاف نے حیرت سے کہا۔
"اب آگے تو سنیں۔ ماہا نے اس کی کوئی پروا نہیں کی اور نور پور چل دی۔ وہاں آ کر پتہ چلا کہ احسان بھائی نے ان این جی او والیوں کو منع کر دیا کہ یہاں کوئی پارٹی نہیں ہوگی۔ جدھر چاہیں مرضی بندوبست کر لیں۔ ظاہر ہے، اس پر ماہا نے سخت بے عزتی محسوس کی ہے تو احسان بھائی نے سختی کے ساتھ اسے بھی منع کر دیا کہ تم واپس حویلی جاؤ یا پھر یہاں بنگلے سے قدم باہر نہیں رکھ سکتی ہو۔" نجمہ نے ساری روداد کہہ دی۔
"تو اس کا مطلب ہے کہ ماہا کو سدھارنے کے لئے سارے ایک ہو گئے ہیں۔" الطاف نے سوچتے ہوئے کہا۔
"ظاہر ہے، ایسا ہی ہو گیا ہے---اب اسے جتنا دبائیں گے، وہ ان کی بات نہیں مانے گی۔" نجمہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"وہ تو ٹھیک ہے لیکن ان سب کا ایک ہو جانا بھی تو مسئلہ ہے، نا!" الطاف نے اسے یاد دلایا۔
"کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ پہلے بھی تو وہ سب ایک ہو کر ہی شادی کر چکے ہیں، اس کا کیا ہوا؟---خیر، اب تو یہ ہمارے لئے بہت ضروری ہو گیا ہے کہ اس وقت ماہا کو تنہا نہ چھوڑا جائے۔ اب بھی وہ اپنے کمرے میں پڑی رو رہی ہے، اس نے مجھے ساری تفصیل بتا دی۔ اس نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مجھے اپنا سمجھا ہے تو اپنے دکھ شیئر کر رہی ہے۔ اب زیادہ دن کی بات نہیں ہے، وہ طلاق مانگ لے گی۔"

نجمہ نے دو اور دو چار کر کے بتاتے ہوئے کہا تو الطاف نے فہد سے پوچھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے، فہد---؟"

"امی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ وہ بات جو ناممکن دکھائی دے رہی تھی، انہوں نے ممکن کر کے دکھا دی ہے۔ پھل پک چکا ہے، اب اسے توڑنا باقی ہے۔" وہ دھیمے سے لہجے میں بولا۔

"تم نے کبھی بلال کو ٹٹولا؟" الطاف نے پوچھا۔

"نہیں---وہ تو اب اللہ لوک بن چکا ہے۔ اس کی تو خیر بات ہی کیا اور مجھے لگتا ہے کہ وہ بہت جلد یہ نوکری بھی چھوڑ جائے گا، اس کے بس کا روگ نہیں رہے گا۔" فہد نے بتایا۔

"یہ مشکل نہیں ہو جائے گا، الطاف---!" نجمہ نے پوچھا۔

"کیسے---؟" وہ بولا۔

"وہ اگر نوکری چھوڑ کر چلا گیا تو باپ کی جگہ وہی سیاست کرے گا اور وہ جو مستقبل میں فہد کو وہاں کا سیاست دان دیکھ رہے تھے، وہ---؟" نجمہ تشویش سے بولی۔

"بیگم! جو کچھ میں نے سوچا تھا اور جن خطوط پر میں نے پلان کی تھا، اب وہ تو رہا نہیں۔ تم نے اور تمہارے بیٹے نے وہ سب کچھ ڈسٹرب کر دیا ہے۔ یہ تو حقیقت ہے۔ اس کی جگہ تم نے اپنی مرضی کی ہے۔ اب یہ مسئلہ بھی تم نے حل کرنا ہے اور یہی نہیں، اس کے بعد بھی بہت سارے مسائل پیدا ہوں گے۔" الطاف نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"کیا مطلب--- آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟" نجمہ نے پوچھا۔

"میں جو کہہ رہا ہوں، وہ تم سمجھ رہی ہو۔ میں نے جو سوچا تھا، اس میں تلخیاں نہیں تھیں۔ محبت کے ساتھ فیملی میں سرائیت کر جانے والی بات تھی۔ اس میں رشتے ناطے اور ان کے تقاضوں کی بنیاد پر سب کچھ ہوتا۔ بلال کی بہن کا اگر میں سسر ہوتا تو وہ کبھی میری بات رد کر ہی نہیں سکتا تھا لیکن اب اس پر میرا کوئی زور نہیں ہوگا، وہ چاہے تو میری بات بھی نہ مانے، اسے اختیار ہے۔" الطاف نے اسے سمجھایا۔

"تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میں نے خاندان میں تلخیاں ڈال دیں؟---اگر میں نے اپنے بیٹے کے لئے کچھ کیا، اس کی خواہش کا احترام کیا تو کیا اس کا کوئی مسئلہ آپ کا مسئلہ نہیں ہوگا؟" نجمہ نے کہا۔

"اس وقت جب وہ میری بات مان لیتا لیکن جو تم کر رہی ہو، اس کی مجھے بہرحال کچھ سمجھ نہیں ہے۔ اب دیکھو، ماہا ہی جب سب سے کٹ جائے گی تو فہد کو مان، عزت اور احترام خاندان میں نہیں مل سکے گا جو ملنا چاہئے۔ کیا اس مسئلے کا حل ہے تمہارے پاس؟"

الطاف نے اس کے سامنے مستقبل کی تصویر رکھی تو ایک دم سے تذبذب میں پڑ گئی۔ پھر چونکتے ہوئے بولی۔

"یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے، دھیرے دھیرے سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اس کے ساتھ کروڑوں کی آنے والی جائیداد ہی کافی ہے، وقت کے ساتھ سارے ہی مل جاتے ہیں۔" نجمہ نے کہا۔

"وہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ تم کیا کر رہی ہو۔ اگر تم نے کامیابی حاصل کر لی ہے تو ٹھیک ہے، اس کے پس منظر میں کوئی مسئلہ یا آسانی آنی ہے تو تبھی اسے خوب سمجھ سکتی ہو۔" وہ اطمینان سے

بولا۔

"مطلب، تم اس معاملے میں میرا ساتھ نہیں دے رہے ہو؟" نجمہ نے قدرے تلخی سے پوچھا۔

"اس سے بڑا ساتھ کیا ہوگا کہ میں خاموشی سے دیکھ رہا ہوں کہ تم کیا کر رہی ہو اور پھر وہ پلان جو میں نے سوچا تھا، اس سے دستبردار ہو گیا ہوں۔ اس کے علاوہ جو تم چاہو، میں اگر اسے ٹھیک سمجھا تو بالکل تمہارا ساتھ دوں گا۔" وہ بولا۔

"اب بھی یہ "ٹھیک سمجھا" والی شرط ساتھ میں لگی ہوئی ہے؟" نجمہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

"اب یہ کوئی بحث والی بات تو نہیں ہے نا، بیگم! میں تمہاری ہر بات پر آنکھیں بند کر کے عمل کرتا چلا جاؤں، میں نے بھی معاشرے میں رہنا ہے۔" اس نے صاف گوئی سے کہا۔

"تو ٹھیک ہے، میں جو چاہوں گی سو کروں گی۔"

یہ کہہ کر وہ چند لمحے خاموش رہی، پھر فہد کی جانب دیکھ کر بولی۔

"تم اس وقت ماہا کی دلجوئی کرو، وہ بہت زیادہ تنہائی محسوس کر رہی ہوگی لیکن یہ خیال رکھنا کہ ابھی چند دن وہاں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں اسے دیکھتا ہوں۔"

فہد یہ کہہ کر اٹھ گیا تو الطاف نے کہا۔

"چلو، بیگم! کھانا لگاؤ۔"

یہ کہہ کر وہ بھی اٹھا اور اندر کی جانب چل دیا۔ نجمہ وہاں اکیلی رہ گئی۔ وہ گہری سوچ میں ڈوب چکی تھی۔

☆☆

جاتے ہوئے دن کی سنہری دھوپ اپنی گرمی آہستہ آہستہ کھو رہی تھی۔ میں عصر پڑھنے کے بعد لان میں آ بیٹھا، معمول تھا کہ میں اس وقت چائے پیتا تھا۔ میں میگزین پڑھنے کے ساتھ چائے بھی پی رہا تھا۔ ایسے میں ذیشان کا فون آ گیا۔ وہ آج رات کھانے پر مجھے اپنے گھر بلا رہا تھا۔ یہ بھی ہمارا معمول تھا اکثر اوقات ہم ایک دوسرے کے ہاں کھانا کھا لیتے تھے۔ فون سننے کے دوران میں نے میگزین رکھ دیا۔ فون سن چکا تو میرا دھیان ماہا کی طرف چلا گیا۔ اگر وہ یہاں ہوتی تو ہم بھی ایک خوشگوار زندگی بسر کر رہے ہوتے جبکہ ہمارے ہاں بجائے قربت کے دوریاں بڑھتی چلی جا رہی تھیں--- میں ان دنوں مسلسل یہی سوچتا چلا جا رہا تھا کہ مجھے لاہور کے بجائے گلاب نگر میں زیادہ وقت گزارنا چاہئے یا پھر کسی طرح میں ماہا کو یہاں لاہور لانے پر راضی کر لوں۔ لاہور میں رہنے کے باعث میری ماہا سے ذہنی دوری بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ ظاہر ہے، جب تک میں اس سے بات نہیں کروں گا، اسے اپنی بات نہیں سمجھاؤں گا، اس کی الجھنیں دور نہیں کر سکوں گا تو وہ اپنی سوچ میں تبدیلی کیسے لا سکتی ہے؟ پہلے پہل تو میں نے یہ سمجھا تھا کہ اس کا غصہ وقتی ہے۔ اس نے چند ایشوز کو بنیاد بنا کر اپنے شدید ردعمل کا اظہار کیا ہے اور پھر کرتی چلی جا رہی ہے۔ دھیرے دھیرے اس شدت میں کمی آتی چلی جائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس کا یہ ردعمل طویل تر ہوتا چلا جا رہا تھا۔ مجھے اس کی سوچ میں کوئی تبدیلی دکھائی نہیں دے رہی تھی بلکہ اس نے جن راہوں کا انتخاب کر لیا تھا، ان راہوں پر آگے سے آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی سو میرے خیال میں بھی تبدیلی آتی چلی گئی اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ یہ فقط غصے کا اظہار نہیں ہے۔ حویلی سے جو بھی اطلاع مجھے آتی تھی، وہ بھی کوئی اچھا تاثر نہیں دے رہی تھیں۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ شاید میں نے کوئی بہت بڑی غلطی کر لی ہے اور میری وجہ سے پورا خاندان ڈسٹرب ہو رہا ہے--- یہ ساری سوچیں تو میں سوچتا رہتا تھا لیکن ماہا کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سوچ میں تبدیلی کیسے لائی جاسکتی ہے، اس کی مجھے قطعاً سمجھ نہیں آرہی تھی۔ مجھے اپنی اور اللہ کی ذات پر بھروسہ تو تھا کہ میں کوئی نہ کوئی ایسی راہ نکالنے میں کامیاب ہو جاؤں گا لیکن ابھی تک مجھے کچھ ایسا سوجھا نہیں تھا اس لئے میں بھی کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ میں کیا کروں، لاہور ہی میں رہوں یا پھر گلاب نگر چلا جاؤں؟--- میں نہیں چاہتا تھا کہ ماہا مجھ سے دور ہو جائے۔ بچپن سے لے کر شادی کے دن تک کی بے شمار یادیں میری ہستی کا سرمایہ بن چکی تھیں، میں نہ چاہتے ہوئے بھی ان سے دستبردار نہیں ہو سکتا تھا۔ نہ جانے کب سے میرے اندر محبت کی چنگاری عشق کی آگ بن چکی تھی۔ میں اپنے محبوب کو گمراہیوں کے راستے پر کیسے دیکھ سکتا تھا؟ جس زندگی کی اسے خواہش تھی، وہ اب میں اسے دے نہیں سکتا تھا۔ قربت کا تقاضا تو یہی تھا کہ کوئی ایک دوسرے کی ذات میں ڈھل جائے۔ کبھی کبھی میرے دل میں خیال آجاتا کہ یار کو منانے کے لئے تو بہت کچھ کرنا پڑتا ہے، گھنگھرو بھی باندھ کر ناچنا پڑتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ خیال آتا کہ یہ معاملہ اس وقت ہوتا ہے جب گھنگھرو باندھ کر ناچنے والے کی محبوب کے دل میں قدر ہو۔ اسے معلوم ہو کہ اس کا ناچنا کیوں ہے، مقامِ یار کی سمجھ بوجھ کیا ہوتی ہے، مقامِ عشق کیا ہوتا ہے؟--- پھر یہ خیال آتا کہ محبوب تو نادان ہے۔ اب جبکہ تم اس سے دل لگا ہی بیٹھے ہو تو پھر اسے اپنے مقام تک خود لے آؤ، اگر تم اس کے مقام تک خود نہیں جاسکتے ہو۔ اب میرے پاس دو ہی راستے تھے۔ ایک یہ کہ جو ماہا کہتی ہے، اسے قبول کرلوں اور اس کے رنگ میں رنگ جاؤں یا پھر ماہا کو اپنے رنگ میں رنگ لوں۔ اس کے علاوہ میرے لئے کوئی تیسرا راستہ نہیں تھا۔ میں اگر ماہا کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کا فیصلہ کرتا ہوں، چاہے بعد میں اسے پھر سے اپنی راہ پر لے آؤں تو مجھے اس راہ سے ہٹنا پڑے گا جسے میں قبول کر چکا ہوں۔ یہ وہ راہ تھی جسے اس کائنات کی عظیم و اکمل ہستی، ہادیٔ برحق نے انسانوں کو دکھایا تھا۔ اس راہ پر چلنے والا انسان پھر زمین کا باشندہ نہیں رہ جاتا، اس کی اٹھان آسمانوں کی جانب ہوتی ہے جس کا منتج و مقصد قربِ الٰہی کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ جس انسان کو قربِ الٰہی میسر آجائے تو اس کے نزدیک کائنات ہیچ ہو کر رہ جاتی ہے۔ اگرچہ یہ راستہ انسانوں میں سے ہی ہو کر گزرتا ہے لیکن اس کے لئے بھی عشق درکار ہوتا ہے۔ عشق نہ ہو تو یہ منزلیں بھی پار نہیں ہو سکتیں۔ میں تو دن بدن یہ کوشش کر رہا تھا کہ سنتِ نبوی کو اپناتا چلا جاؤں اور اگر میں ماہا کے کہنے پر ایک بھی سنت کا تارک ہو گیا تو میری یہ بہت بڑی ناکامی ہے۔ میں اس کے راستے پر نہیں چل سکتا تھا۔ میں نے تاریخ کے جھروکوں میں جھانک کر دیکھا جس نے بھی قربِ الٰہی کے لئے عشق کی سیڑھی استعمال کی ہے، اسے زمین سے ناطہ توڑنا ہی پڑا ہے۔ یہ عشق مجھ سے ماہا کی قربانی مانگ رہا تھا، میں اسے ایک طرف ہٹا کر آسودگی کے ساتھ اس کانچ کی سیڑھی پر پاؤں رکھ سکتا تھا۔ ظاہر ہے، زینہ بہ زینہ چڑھنے میں جب زمین سے ناطہ ٹوٹتا ہے تو پھر لہولہان ہو جانا یقینی ہے۔ ماہا سے دور ہو جانے کا تصور اگرچہ بہت دکھ دینے والا تھا۔ میرے کانوں میں یہ سرگوشیاں بھی پڑتی تھیں کہ یہ تمہاری مردانگی کے خلاف ہے، کیا کہے گی دنیا کہ ایک لڑکی نے تمہیں ٹھکرا دیا۔ تمہاری شخصیت مسخ ہو کر رہ جائے گی۔ یہ بہت بڑی ناکامی ہے جو تمہیں دنیا میں ذلیل کر رکھ دے گی--- میں ان سرگرشیوں پر کان بھی دھرتا تھا لیکن میرے من پر کوئی اثر پیدا نہیں کر سکیں لہٰذا میں ان پر توجہ ہی نہیں دیتا۔ یوں مسلسل ہونے والی سرگوشیاں دم توڑتی چلی جا رہی تھیں۔

مجھے اپنے طور پر یہ راستہ زیادہ آسان دکھائی دیتا تھا کہ اسے اپنے رنگ میں رنگ لوں، وہ رنگ جو ایک مسلمان کا ہونا چاہئے کیونکہ اگر وہ اپنے آپ کو نہ بھی بدلے تو نہ سہی لیکن یہاں نتیجے پر کامیابی یا ناکامی کا انحصار نہیں ہے بلکہ خلوصِ نیت سے کی جانے والی کوشش کو دیکھا جاتا ہے۔ میں نے کس قدر خلوص سے اسے وہ راستہ دکھایا ہے جس پر اللہ اور اس کا رسول برحق خوش ہوتا ہے۔ اب آگے اللہ کی مرضی ہے کہ اس کے من میں ہدایت اترتی ہے یا نہیں، میرا فرض ادا ہو گیا۔ اصل میں الجھن بھی یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو پورے خلوص کے ساتھ آگ سے بچا رہا ہوتا ہے اور وہ خلوصِ نیت میں اس قدر آگے بڑھ جاتا ہے کہ دوسرے کو بزورِ بازو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ طریقہ کار غلط ہو جاتا ہے اور یہ فطری سی بات ہے کہ جب بھی کہیں جبر بڑھتا ہے وہاں بغاوت ضرور جنم لیتی ہے، چاہئے جبراً اپنے تئیں حق پر ہی کیوں نہ ہو--- کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ جب خالق کائنات نے یہ فیصلہ دے دیا کہ "حق آگیا اور باطل مٹ گیا، بے شک باطل مٹ جانے والا ہے"--- حق اور باطل کا فرق کیا ہے؟ کیا ہمیں پہلے یہ نہیں سمجھنا چاہئے۔ جب حق کی سمجھ آجائے گی تو ہی معلوم ہو گا کہ باطل کیا ہے؟ کبھی پتہ چلے گا کہ ہمارا دوست کون ہے اور ہمارا دشمن کون ہے۔ آپ کے پاس اگر حق ہے اور یہ فیصلہ خداوندی ہے کہ باطل نے مٹ جانا ہے تو پھر چاہے جس قدر ظلمت ہو، پورا ماحول پراگندہ اور بدبودار ہو۔ اس میں اگر نور لایا جاتا ہے تو ظلمت ضرور ختم کر کے رکھ دیتا ہے۔ خوشبو ضرور اپنا آپ منواتی ہے۔ مثال کے طور پر آلاتِ جدید میں ٹیلیویژن ہی کو لیں۔ اسے اگر شیطانی آلہ سمجھ کر پھینک دیں گے، اسے نظر انداز کر دیں گے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہمارا اس پر پیغام نہیں آسکتا۔

شادیوں پر شاہ خرچیاں

شادی ایک حسین بندھن ہے اور قدرت کی طرف سے اس انمول تحفے سے بروقت لطف اندوز ہونے کا حق ہر کسی کو حاصل ہونا چاہئے لیکن آپ کو کیا معلوم کہ وقت کی ناانصافی اور حالات کی ستم ظریفی کی بھینٹ چڑھ کر وطنِ عزیز اسلامی جمہوریہ پاکستان میں کتنے زیادہ نوجوان لڑکے لڑکیاں تنہائی کی آگ میں جھلس رہے ہیں اور معاشی حالات بہتر نہ ہونے کی وجہ سے شادی کی نعمت سے محروم ہیں۔ یہ ناانصافی اور ظلمِ عظیم ہے کہ حق حلال اور محنت کی روزی کمانے والے تو زندگی کی حقیقی مسرتوں کے لئے ترستے رہیں اور ناجائز ذرائع سے دولت لوٹنے والے غریبوں کی خوشیاں لوٹ کر دن رات عیش و عشرت میں گزاریں اور شادیاں اتنی دھوم دھام سے کریں کہ سارا شہر جگمگ جگمگ کر اٹھے اور غریبوں کے ارمان دم توڑ جائیں--- ہم مسلمان ہیں اور ہمارا مذہب اسلام عظیم ہے لیکن ہم اسلامی تعلیمات پر عمل ہی کب کرتے ہیں؟ فرسودہ رسم و رواج ہمارے معاشرے کو دیمک کی طرح چاٹ رہے ہیں۔ اسلام نے شادی کا جو طریقہ کار بتایا ہے، وہ بہت سادہ اور کم خرچ ہے۔ ہمارے معاشرے میں والدین قرض تلے دبے اور پریشان رہتے ہیں لیکن لڑکی کی بروقت شادی نہیں کر سکتے اور بالآخر لڑکی ادھیڑ عمر یا بوڑھی ہو جاتی ہے اور لڑکے بیچارے تو تعلیم اور معیار کے مطابق روزگار ملنے کے انتظار میں ہی بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ حکومتِ سرکاری طور پر شادی کی فضول رسم و رواج پر سخت پابندی لگائے اور شادیوں پر شاہ خرچیاں فوراً بند کی جائیں۔ معاشی ناانصافی کا خاتمہ کیا جائے، دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کے خاتمے کے لئے فوراً اہم اقدامات کئے جائیں۔ سرکاری طور پر شادی فنڈ کے ذریعے عوام کو بچوں کی شادی کے لئے خصوصی گرانٹ (قرض) دینے کے فوراً انتظامات کئے جائیں۔ ون ڈش کے علاوہ شادی کے موقع پر درجنوں کھانے کھلانے والوں کو بھاری جرمانہ اور عبرتناک سزا دی جائے۔ وطنِ عزیز میں اسلامی کلچر کے فروغ کے لئے اہم اقدامات کئے جائیں کیونکہ کیبل، ڈش، موبائل اور مغربی ثقافتی یلغار نے ہمارا اپنا تشخص کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے۔

چوہدری محسن بشیر، گجرات

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہاں لاکھ گند ہو لیکن جب ایک پرنور پیغام جائے گا اور اس پیغام کو موثر انداز میں پیش کیا جائے گا تو کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ وہ دلوں پر اثر نہ کرے۔ کہیں یہ ہمارے یقین میں کمی تو نہیں ہے یا پھر پیغام پیش کرنے میں کہیں کمزوری ہیں۔ یہ ہماری کمزوری کوتاہی تو ہو سکتی ہے، پیغام کی نہیں۔ شعرائے عرب کو اپنے کلام پر ناز تھا لیکن کلام الٰہی کا چیلنج اتنی صدیوں بعد اب تک موجود ہے، کوئی اس کے برابر اپنا پیغام نہیں لا سکا۔ قرآن کا معجزہ تو پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔ ضرورت ہے اسے سمجھنے کی، اس پر عمل کرنے کی۔ اس پیغام کی روح کو سمجھنے کی جو دلوں پر اثر کرتا ہے کیونکہ بے شک یہ کلام الٰہی ہے--- میں اپنی سوچوں میں بہت دور تک نکل آیا تھا۔ میں ماہا کے بارے میں سوچتے ہوئے جس قدر دکھ محسوس کرتا تھا، اس قدر میں پورے خلوص سے دعا مانگا کرتا تھا کہ وہ میری وجہ سے اگر گمراہی کی راہ پر چل دی تو پھر میں کیسے جواب دے پاؤں گا؟ مجھے کوئی راہ سجھا دے جس سے میں اس کی زندگی کو بدل سکوں، بے شک یہ اختیار تیرے ہاتھ میں ہے لیکن مجھے اتنی رسائی دے دے کہ میں تیرا پیغام اس تک ضرور پہنچا سکوں--- میں انہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ میرا سیل فون بج اٹھا، وہ امی کی طرف سے فون تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر فون رسیو کر لیا۔

''کیسے ہو، بیٹے---؟'' ان کی ممتا بھری آواز نے میری روح تک سرشار کر دی۔

''میں ٹھیک ہوں، امی! آپ سنائیں؟'' میں نے جلدی سے کہا۔

''میں بھی ٹھیک ہوں اور سب گھر والے بھی ٹھیک ہیں---'' یہ کہہ کر انہوں نے لمحہ بھر توقف کیا، پھر بولیں۔ ''میں اصل میں تمہیں کل سے فون کرنا چاہ رہی تھی لیکن مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ فون کروں یا نہ کروں۔ کہیں تم ڈسٹرب نہ ہو جاؤ لیکن پھر سوچا کہ بجائے ادھر ادھر سے پتہ چلنے کے، میں ہی تمہیں بتا دوں۔'' انہوں نے کہا۔

''کیا بات، امی! خیریت تو ہے، نا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں تمہیں بتائے دیتی ہوں، آگے تم خود اندازہ لگا لینا کہ خیریت ہے یا نہیں--؟''

یہ کہہ کر انہوں نے ماہا پر نور پور چلے جانے کے بارے میں بتایا۔

''امی! یہ معاملہ دن بدن بگڑتا نہیں چلا جا رہا ہے، احسان تایا تو بہت پریشان ہوں گے؟'' میں نے کہا۔

''میرا تمہیں فون کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ اگر تمہیں ایسی بات کا کہیں سے پتہ چلتا بھی ہے تو اس پر کسی قسم کے ردعمل کی ضرورت نہیں۔ یہ معاملہ یہاں کا ہے، اسے اب ہم خود حل کر لیں گے۔'' امی نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

''ٹھیک ہے، امی! آپ جیسا چاہئیں۔''

میں نے احترام سے کہا تو وہ بولیں۔

''لیکن تم کچھ مت سوچنا، اللہ بہتر کرے گا۔''

''جی، اللہ بہتر ہی کرتا ہے۔''

میں نے کہا اور چند الوداعی فقروں کے بعد فون بند کر دیا۔ میں چند لمحے یونہی ساکت سا بیٹھا رہا۔ میرے ذہن میں کوئی خیال بھی نہیں تھا جیسے کسی گہرے صدمے کے بعد ذہن بالکل ماؤف ہو جاتا ہے اور سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں ختم ہو کر رہ جاتی ہیں۔ میں تو اس کے پاس جانا چاہتا تھا، اس کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اسے مناؤں گا، اسے بتاؤں گا کہ جس راہ پر میں چل رہا ہوں، وہ کیسا رستہ ہے لیکن وہ میری بات سنے بغیر سارے ناطے توڑ کر جا چکی ہے۔ میں اس ضدی طبیعت والی لڑکی کا ردعمل سمجھ رہا تھا۔ وہ اپنی ضد میں مزید پختہ ہو جانے

والی تھی، شاید میرے نصیب میں نہیں تھا کہ میں اسے بتا سکتا--- میرا دل لہولہان ہو رہا تھا، اس وقت میں ایسے بچے کی مانند تھا جس کا پسندیدہ کھلونا دے کر توڑ دیا جائے۔ ماہا کی یادیں میرے ذہن میں فلم کی مانند چل پڑیں۔ میرے اندر طوفان برپا رہا، میں دکھ کی اس انتہا پر پہنچ چکا تھا جہاں انسان ساکت ہو جاتا ہے۔ امی نے تو فکر نہ کرنے کو کہا تھا لیکن میں سمجھ رہا تھا کہ اب وہ ناطہ پہلے کی مانند نہیں رہے گا۔ تعلق اگر جڑ بھی جاتا ہے تو اس میں ایک لکیر ضرور رہے گی--- اذان مغرب ہونے لگی تھی، میں اپنے خیالات سے یوں چونکا جیسے کوئی تہہ آب سے سطح آب پر آ گیا ہو۔ میں نے سکون سے اذان سنی اور پھر اٹھ کر وضو کرنے چل دیا۔

میں ذیشان کے گھر میں تھا اور وہ دوسری بار مجھ سے پوچھ چکا تھا کہ میں اتنا پریشان کیوں ہوں۔ میں اسے کیا جواب دیتا؟ میں نے حتی المقدور اپنے آپ کو خوشگوار بنانے کی کوشش کی لیکن شاید میرے اندر اسے صدمے کا اثر اتنا تھا کہ میں اس سے باہر نکل ہی نہیں پا رہا تھا۔ عشاء پڑھنے کے بعد ہم نے کھانا کھایا تو میں وہاں زیادہ دیر تک نہیں بیٹھ سکا اس لئے میں نے ذیشان سے اجازت چاہی تو وہ حیرت سے بولا۔

''کمال کرتے ہو، یار! تم--- صبح آف ہے، کام پر تو جانا نہیں۔ ایک یہی دن تو ہوتا ہے گپ شپ کرنے کو، تم ابھی سے جا رہا ہو۔ ابھی تو صرف گیارہ بجے ہیں؟''

''ویسے ہی، یار! لگتا ہے، میری طبیعت نہیں ٹھیک ورنہ شاید زیادہ دیر تک بیٹھتا اور پھر آج فہد بھی تو نہیں ہے۔'' میں نے یونہی کہہ دیا۔

''فہد کو میں نے فون کیا تھا لیکن اس نے کہا کہ ضروری کام ہے گھر پر وہ آ نہیں سکتا اور رہی تمہاری بات تو میری جان، تمہاری طبیعت خراب نہیں، کوئی پریشانی ہے تمہیں--- میں شیئر کرنے پر اصرار نہیں کروں گا مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ اگر میں اسے حل کرنے میں تھوڑی سی بھی مدد کر سکتا ہوا، نا! تو ضرور کروں گا اس لئے مجھ سے کہنا ضرور۔'' وہ بڑے خلوص سے بولا۔

''اگر ایسی کوئی بات ہوئی تو میں ضرور کہوں گا۔'' میں نے صاف لفظوں میں کہہ دیا۔

''میں جانتا ہوں، بلال! کہ تمہاری ازدواجی زندگی ٹھیک نہیں ہے مگر---''

اس نے کہنا چاہا تو میں اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''تمہیں کیسے پتہ جبکہ میں نے تم سے کبھی ذکر نہیں کیا؟''

''سچ پوچھو تو، فہد! میرے ساتھ یہ ساری باتیں شیئر کرتا ہے مگر وہ کچھ کر نہیں سکتا نا! اس کے خیال میں تم سے بنیادی غلطی یہی ہوئی کہ تم نے ماہا کو اعتماد میں لئے بغیر پتا یا کا نور کیا۔ بس تب سے اس کے دل میں گرہ پڑ گئی ہے اور اس کا دور ہونا اب بہت مشکل ہے۔'' وہ مایوسی سے بولا۔

''ذیشان! اگر قسمت میں ایسے ہی لکھا ہے تو یونہی سہی--- یہ تم بھی جانتے ہو کہ میری نیت میں کوئی شک نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''نیت ایسی شے نہیں ہے کہ جس کا کوئی وجود ہو اور تم اسے کسی دوسرے کو دکھا سکو۔ کون یقین کرتا ہے؟ میں تو یقین کر لوں گا، میں تمہارا دوست ہوں لیکن--- اب فہد بھی تو ہمارا دوست ہے، وہ بھی یقین نہیں کرتا۔ ممکن ہے، اس میں کوئی رشتے داری کا پہلو ہو۔'' ذیشان نے کہا۔

''لیکن ہماری نیتوں کا حال وہ تو جان رہا ہوتا ہے، نا! جس کے قبضہ قدرت میں ہر شے ہے۔ وہ پورا پورا انصاف کرتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مجھے دکھ نہیں ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک کمزور جذباتی انسان ہونے کے ناطے میرا ایمان شاید ابھی اس سطح پر نہیں ہے کہ میں خود پر قابو رکھ سکوں مگر میں اس حد تک اللہ کی ذات پر بھروسہ رکھتا ہوں کہ جس طرح مجھے اپنے ہونے کا یقین ہے۔'' میں نے کہا۔

''خیر، تم بہتر سمجھتے ہو کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ میری ذات تمہارے لئے ہر طرح سے حاضر ہے۔''

وہ پھر بڑے خلوص سے بولا۔ تب ہمارے درمیان خاموشی چھا گئی جیسے بات کرنے کے لئے ہمارے پاس کوئی موضوع ہی نہ رہا ہو۔ تبھی نیلم بھابی، ٹرے میں دو مگ رکھے آ گئی۔

''یہ لیں گرما گرم کافی ---!''

اس نے ٹرے ہمارے درمیان پڑی ہوئی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ پھر ہمارے درمیان ٹھہری خاموشی محسوس کر کے بولی۔

''ویسے آپ لوگ اتنے خاموش کیوں ہیں، خیریت ---؟''

''کچھ نہیں، ویسے ہی ---''

ذیشان نے چونکتے ہوئے کہا تو وہ سعادت مندی سے بولیں۔

''چلیں، ٹھیک ہے۔'' یہ کہہ کر وہ واپس پلٹ گئی۔

''کب تک ایسے چلے گا؟'' ذیشان نے میری جانب دیکھ کر کہا۔

''جب تک قسمت میں ہے --- فی الحال کافی پیئو۔''

میں نے کہا اور مگ اٹھا لیا۔ کافی خاصی مزے دار تھی۔ میں گھونٹ گھونٹ پی رہا تھا کہ میرا سیل فون بج اٹھا۔ مقامی نمبر دیکھ کر پہلے میں نے اسے نظر انداز کر دینا چاہا لیکن پھر جب مسلسل بجتا گیا تو میں نے کال ریسیو کر لی۔

''بلال بات کر رہے ہو؟'' میں پی اون کی آواز سن کر بری طرح چونک گیا۔

''ہاں --- اور تم پی اون --- یہاں ---'' میں نے لڑکھڑاتے ہوئے کہا۔

''جھٹکا لگ گیا ہے، نا! میں نے کہا نا، کہ جب میں آؤں گی تو تمہیں زبردست جھٹکا دوں گی۔'' وہ انتہائی شوخی سے بولی۔

''کہاں ہو تم؟'' میں نے پوچھا۔

''لاہور ائیر پورٹ پر --- تم آؤ گے یا میں پہنچ جاؤں تمہارے گھر؟''

اس نے پھر اسی لہجے میں کہا تو میں نے فوراً کہا۔

''میں آ رہا ہوں، تم وہیں میرا انتظار کرو۔''

الفاظ میرے منہ ہی میں تھے کہ وہ بولی۔

''دیکھو، دھیان سے آنا، میں انتظار کر لوں گی۔''

اس نے بہت سکون سے کہا تو میں نے فون بند کر دیا۔

''پی اون یہاں پر ہے --- مطلب، ائیر پورٹ پر ---'' میں نے ذیشان کو بتایا۔

''اوہ ---''

اس کا چہرہ ایک دم سے اتر گیا اور اس نے اپنا مگ میز پر رکھ دیا۔

''کیا ہوا، تم خوش نہیں ہوئے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''سچ پوچھو تو نہیں --- وہ غلط وقت پر آئی ہے۔ ممکن ہے، اس سے مسائل بڑھ جائیں --- خیر، آؤ اسے لے آتے ہیں۔''

ذیشان نے بددلی سے کہا تو میں نے کہا۔

''تم ٹھہرو، میں لے لیتا ہوں۔'' میں نے مگ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

''میری بات سے ناراض ہو گئے ہو لیکن حقیقت یہی ہے۔''

وہ تلخ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا اور اٹھ گیا۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ میں اور ذیشان ائیر پورٹ پر پہنچ کر گاڑی پارک میں لگا چکے تھے۔ ہم دونوں تیز قدموں سے اس متوقع جگہ کی جانب بڑھے جہاں پی اون ہو سکتی تھی۔ ہمیں زیادہ ادھر ادھر نہیں گھومنا پڑا، پی اون کچھ فاصلے پر کھڑی مسکراتے ہوئے میری جانب دیکھ رہی تھی۔ وہ بالکل ہی بدلی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے نیلی جین کے اوپر سنہری کام والا سفید رنگ کا لمبا کرتا پہنا ہوا تھا اور پھر اسی طرح کا سکارف سر پر باندھا ہوا تھا۔ زیادہ تر ملائیشیا کی مسلمان خواتین ویسا لباس پہنتی تھیں۔ میں ایک لمحے کو مسکرا کر رہ گیا۔ اس نے شاید اسلامی ملک اور میرے ذہن کے مطابق ایسا لباس پہنا تھا۔ میں اس کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ وہ میری جانب یوں دیکھ رہی تھی کہ مجھ پر گزرنے والی تبدیلی کا اس پر کوئی اثر نہ ہو۔ میں جیسے ہی اس کے قریب اس نے بڑے رسان سے کہا۔

''اسلام وعلیکم ---!'' لیکن اس کے ساتھ اس نے اپنا ہاتھ نہیں بڑھایا۔

''وعلیکم اسلام ---!'' میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا اور پھر ہنس دیا۔ پھر بولا۔ ''لگتا ہے، تم نے یہاں آنے سے پہلے کافی اسلامی آداب سیکھ لئے ہیں؟''

''ہاں --- میں نے سیکھے اور بہت سیکھے اور یہ سب مجھے سیکھنا بھی چاہئے تھا کیونکہ اب تمہارے سامنے پی اون نہیں، عائشہ کھڑی ہے۔ میں اسلام قبول کر چکی ہوں، الحمدللہ ---''

اس نے ٹھہر ٹھہر کر کہا تو میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''پی --- او --- ن --- نہیں، عائشہ! کب، تم نے مجھے بتایا نہیں؟'' میں نے کہا۔

''بلال! تم نے مجھے کتنا ستایا تھا اور میں تمہیں اتنا بھی جھٹکا نہیں دے سکتی --- خیر، ان سے ملو ---''

یہ کہہ کر اس نے ذرا سے فاصلے پر ایک تھائی لڑکے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ آگے بڑھ کر میری جانب ہاتھ بڑھایا۔ میں نے اس سے ہاتھ ملایا، پھر اس نے ذیشان سے ہاتھ ملایا۔ تب میں نے عائشہ کی جانب دیکھا تو وہ بولی۔

''یہ میرے شوہر ہیں، علی یان --- صرف ایک ہفتہ پہلے ہماری شادی ہوئی ہے۔''

اس نے کہا تو میرے دل میں اس کے لئے محبت اور احترام کے جذبات اُمنڈ پڑے۔ میں نے فوراً علی کو اپنے گلے سے لگایا، علیک سلیک کے ساتھ احوال پوچھا۔

''اب میرا خیال ہے، باقی باتیں گھر جا کر ہو سکتی ہیں۔''

ذیشان نے کہا تو میں نے دونوں سے ان کا تعارف کرایا اور پھر ہم سامان کے ساتھ ائیر پورٹ سے باہر آ گئے۔ سامان کے نام پر ان کے پاس فقط دو بیگ تھے۔ وہ گاڑی میں بیٹھ چکے تو میں نے ذیشان سے کہا۔

''دیر تو ہو گئی ہے لیکن کیا امی کو بتا دوں کہ ---''

''آرام کرنے دو انہیں، صبح بتا دینا۔''

اس نے کہا تو میں نے گاڑی بڑھا دی۔

''عائشہ! یہ اچانک تمہارا پروگرام کیسے بن گیا یا پھر ---''

میں نے فقرہ جان بوجھ کر ادھورا چھوڑ دیا۔ میرے ذہن میں تھا کہ شادی کے بعد وہ ہنی مون کے لئے نکلے ہوں گے لیکن یہ بات میرے دل کو لگ نہیں رہی تھی۔

''میں جانتی ہوں، بلال! تمہارے دل میں بہت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سارے سوال امنڈ رہے ہیں مگر میں سارے سوالوں کے جواب ابھی نہیں دے پاؤں گی۔ میں نے ساری باتیں تم سے ہی شیئر کرنی ہیں اس لئے میرا خیال ہے تم صبر کرو تو زیادہ بہتر ہے۔''

اس نے کہا تو میں سمجھتے ہوئے بولا۔

''تمہاری انگریزی پہلے سے زیادہ صاف ہوگئی ہے۔''

میرے لہجے میں خوشگواریت تھی اس لئے وہ ہنس دی۔ پھر سفر کی باتوں کے دوران ہم گھر تک آ پہنچے۔ ذیشان باہر ہی سے اپنے گھر چلا گیا تاکہ صبح نیلم بھابی کے ساتھ آسکے۔ ملازمین میرے انتظار میں تھے۔ میں نے فوراً ایک کمرہ درست کرنے کو کہا اور عائشہ یان سے پوچھا۔

''فوری طور پر کیا کھانا پسند کرو گی؟ ممکن ہے، تھائی کھانے کے لئے کچن میں کچھ دستیاب بھی ہو یا نہیں؟''

''ہم جہاز میں کھانا کھا چکے ہیں---'' پھر علی کی جانب دیکھ کر پوچھا۔ ''کیا خیال ہے؟''

''ہلکی سی بھوک تو ہے---تم خود جاؤ کچن میں، جو مناسب سمجھو لے آؤ۔''

اس نے کہا تو عائشہ نے فوراً کچن کا راستہ پوچھا جو میں نے اشارے سے بتا دیا۔ میں علی سے باتیں کرنے لگا۔ اس کا تعلق ملائیشیا سے تھا۔ غیر ملکی ماہر زبان کی حیثیت سے اس نے تھوڑا عرصہ پڑھایا اور پھر تھائی لینڈ آ گیا۔ اس نے اپنی تعلیم کا بیشتر حصہ امریکہ میں مکمل کیا تھا۔ عائشہ یان کچھ بنا کر لے آئی، اس کے پیچھے میرا شیف چائے لے آیا تب بھی یونہی باتیں چلتی رہیں۔ کھانے پینے کے بعد وہ سونے کے لئے چلے گئے اور میں اپنے بیڈ پر پڑا یہ سوچ رہا تھا کہ کیا واقعی پی اون، اب عائشہ یان ہے؟

☆☆

ماہا کے سرہانے پڑا ہوا سیل فون مسلسل بج رہا تھا۔ وہ گہری نیند میں تھی۔ وہ رات گئے تک جاگتی رہی تھی۔ اس کا ذہن مسلسل سوچوں کی آماجگاہ بنا رہا تھا۔ بہت دیر تک اس کی فہد سے باتیں ہوتی رہیں اور وہ خود یونہی بے سروپا سوچیں سوچ رہی تھی، یہی وجہ تھی کہ مسلسل بیل ہونے کی آواز پر اس کی آنکھ نہیں کھل رہی تھی۔ فون کرنے والے نے بھی یہ سوچ رکھا تھا کہ بات ضرور کرے گا اس لئے بیل بند ہی نہیں ہو رہی تھی۔ اب ماہا بے ہوش تو نہیں تھی کہ اس کی آنکھ ہی نہ کھلتی۔ اس نے بند آنکھوں سے کسمساتے ہوئے فون اٹھا لیا اور خمار آلود لہجے میں بولی۔

''ہیلو---کون---؟'' اس نے سکرین پر نمبر ہی نہیں دیکھے تھے۔

''ماہا بیٹی! میں ہوں، تمہاری پھوپھو---!''

نجمہ نے حیرت ملی آواز میں کہا تو ماہا کے ذہن پر چھائی دھند اترنے لگی۔

''خیریت، پھوپھو! اتنی صبح صبح---؟''

'اب کہاں صبح رہی ہے، بھئی! دس بج رہے ہیں---کیا تم ابھی تک جاگی نہیں ہو؟'' وہ پھر حیرت سے بولی۔

''نہیں، پھوپھو! ابھی تک بستر میں ہوں---خیریت تو تھی؟'' اس نے خمار آلود لہجے میں پوچھا۔

''تم ذرا ہوش کرو تو بتاؤں۔'' وہ بولی۔

''ایسی بھی کیا بات ہے، پھر پھوپھو! آپ کہیں، میں سن رہی ہوں۔'' وہ عام سے انداز سے بولی۔

''تو پھر سنو---وہ لڑکی جس کے پیچھے بلال تھائی لینڈ گیا تھا، رات سے بلال کے گھر میں آ چکی ہے اور اب وہیں ہے۔''

''کیا---آپ کیا کہہ رہی ہیں، پھوپھو؟''

اس نے چونکتے ہوئے کہا تو ذہن پر چھائی ساری دھند دور ہوگئی۔

''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ یقین نہ آئے تو خود پتہ کر لو اور ویسے بھی میں نے تم سے غلط بات کبھی نہیں کہی۔'' نجمہ نے فوراً ہی یوں کہا جیسے وہ اپنی بات کا یقین دلا رہی ہو۔

''نہیں، نہیں پھوپھو! ایسی بات نہیں، میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں تھا۔ میرا مطلب تھا کہ آپ کو کیسے پتہ چلا؟'' وہ بولی۔

''صبح صبح فہد اور ذیشان کی بات ہوئی تھی، اس نے بتایا کہ وہ اسے ایئر پورٹ سے لائے ہیں اور اب فہد بھی وہیں پر ہے اور ذیشان اپنی بیگم کے ساتھ---'' نجمہ نے اسے تفصیلی انداز میں بتایا۔

''لیکن یہ اچانک---کیوں---'' وہ سرسراتے ہوئے لہجے میں بولی۔

''سیدھی سی بات ہے، میری بیٹی! وہ تم سے تو اب متنفر ہو چکا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ تم ہمیشہ کے لئے حویلی چھوڑ کر آ چکی ہو، اب تو اس کا راستہ صاف ہوگیا۔ میں بھی کہوں کہ زبیدہ خاتون کے منہ میں زبان کس نے ڈال دی، یہ ان کا ایک سوچا سمجھا منصوبہ تھا۔'' وہ رازدانہ لہجے میں بولی۔

''ہاں، پھوپھو! میں خود حیران تھی نا، کہ چاچی اماں اس قدر کیوں تلخ ہو رہی ہیں۔ اب سمجھ میں آیا کہ اس لڑکی کے ساتھ تو رابطے ختم نہیں ہوئے ہوں گے لہٰذا اب اسے بلوا لیا۔ ظاہر ہے، وہ اب حویلی بھی جائے گی۔'' ماہا نے سوچتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ہی تو---اب احسان بھائی اور ذکیہ کے سامنے سچا ہونے کے لئے تمہیں بھی بلایا جائے گا۔'' اس نے آنے والے دنوں کا نقشہ کھینچا۔

روشن باتیں

☆اسلام کے نفاذ کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اسلام کی تبلیغ بند کر دی جائے اور لوگوں سے ہمدردی کی جائے اور ان کی مدد کی جائے۔

☆اللہ کو پکارنے سے پہلے پکارنے کی وجہ ضرور ہوتی ہے لیکن اللہ ہمیں بغیر کسی وجہ سے ہر وقت نظر میں رکھتا ہے۔

☆انسان انسان ہو کر بھی اللہ کی مرضی پر نہیں چلتا اور چاہتا یہ ہے کہ وہ اللہ ہونے کے باوصف انسان کی مرضی پر چلے۔

☆ضرورت کے لئے اللہ کو پکارنے والا دونوں حالتوں میں اللہ کو چھوڑ دیتا ہے۔ ضرورت پوری ہو جائے تب بھی چھوڑ دے گا' ضرورت پوری نہ ہو تب بھی چھوڑ دے گا۔

میاں جاوید جالندھری

''تو پھر مجھے کیا کرنا چاہئے، پھوپھو---؟'' وہ بولی۔

''یہی تو سوچنے والی بات ہے، بیٹی! تم اگر چلی جاتی ہو تو پھر اپنی ہی کہی بات پر شکست کھا جاؤ گی۔ جس مان پر تم یہ کہہ کر آئی تھی کہ میں دوبارہ حویلی میں قدم نہیں رکھوں گی، وہ تو نہیں رہا، مٹی میں مل گیا۔ وہ مان تو نہ رہا۔ ناک نیچی کر کے ہی جانا پڑے گا کیونکہ انہوں نے خود تو کہنا نہیں، تمہارے والدین ہی سے کہلوائیں گے۔'' نجمہ نے تفصیل بتائی۔

''---اور اگر میں نہیں جاتی تو---؟'' اس نے پوچھا۔

''تو پھر تمہارے ہی والدین تم سے ناراض ہوں گے۔ انہیں یہ تصدیق ہو جائے گی کہ تم ہی ضد اور ہٹ دھرمی پر قائم ہو۔ حویلی والے تو سچے ہی رہیں گے اور سارے ہی الزام تم پر آ جائیں گے جیسے چودھری سرفراز کے خاندان میں انہوں نے تمہیں ہی برا بنایا ہے، خود تو وہ سچے ہیں۔ میرے خیال میں اب تو وہ رقیہ کی منگنی کے لئے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھی آنے والے ہوں گے۔"

"ہاں، یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں--- اب کیا کیا جائے؟"

"میری بیٹی! میں نے تمہیں دونوں رخ بتا دیئے ہیں جو میری سمجھ میں آئے ہیں۔ اب یہ فیصلہ تمہیں کرنا ہے کہ تم کیا کرو گی۔" نجمہ نے بہت پیار سے اپنا دامن بچا لیا۔

"پھر بھی، پھوپھو! مجھے کچھ مشورہ تو دیں--- آپ میری جگہ ہوتی تو کیا کرتیں؟" وہ الجھن بھرے انداز میں بولی۔

"میں تمہیں یہ بتا سکتی ہوں لیکن بتاؤں گی اس لئے نہیں کہ تم اپنا دماغ استعمال کرو، میری ہر بات پر آنکھیں بند کر کے مت چلو۔ اپنے فیصلے کرنا سیکھو، میں تمہاری دشمن نہیں ہوں کہ تمہیں اپنی زندگی کے بارے میں سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہ دوں کیونکہ نتیجہ تمہارے سامنے ہے اور ہمارے درمیان جو طے ہو چکا، وہ تو ہو ہی چکا ہے۔" نجمہ نے بڑی چابکدستی سے اپنا پہلو بچا لیا۔

"ٹھیک ہے، پھوپھو! میں اس پر سوچ لوں گی--- ویسے نہ جاؤں تو بہتر ہے۔ مجھے اس سے کیا لینا دینا۔ حویلی والے اور میرے والدین پہلے ہی مجھ سے ناراض ہیں، اب مزید ناراض کیا ہوں گے؟" وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولی۔

"جو تم چاہو، میں اس پر کوئی رائے نہیں دوں گی۔" نجمہ نے کہا اور پھر تھوڑی دیر بعد فون کرنے کا کہہ کر کال ختم کر دی۔ جبکہ ماہا گہری سوچ میں ڈوب گئی کہ وہ بلال کو کیا سمجھے؟--- کوئی بھی پہلو اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کیا اس نے تھائی لڑکی کو اس لئے بلایا ہے کہ میں جیلس ہو جاؤں گی اور اس طرح بلال کے بارے میں سوچنے لگ جاؤں گی--- نہیں، میرے اندر ایسا کوئی جذبہ نہیں ابھرے گا۔ وہ اس سے چاہے شادی بھی کر لے کیونکہ اب میں اپنے بلال سے الگ کر چکی ہوں۔ اس نے یہ سب سوچا اور پھر ایک تلخ سی مسکراہٹ کے ساتھ بستر سے اٹھ گئی۔

☆☆

میرے دائیں جانب والے صوفے پر علی یان اور فہد بیٹھے ہوئے تھے جبکہ بائیں جانب عائشہ یان کے ساتھ نیلم بھابی بیٹھی ہوئی تھی جبکہ ذیشان بالکل میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ دن اچھا خاصا چڑھ آیا تھا اور ہم ناشتے سے فراغت کے بعد یونہی گپ شپ میں مصروف تھے، تبھی فہد نے کہا۔

"عائشہ! میرے خیال میں آپ نے حال ہی میں اسلام قبول کیا ہے، میں اس کی وجہ جان سکتا ہوں؟"

"نہیں---" اس نے پوری سنجیدگی سے کہا۔ "کیونکہ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ ابھی اس بات کو ظاہر کرنے کا وقت نہیں ہے۔ جب وقت آیا تو میں خود ہی بتا دوں گی۔"

اس کے یوں کہنے پر فہد کا چہرہ تن گیا۔ اسے امید نہیں تھی کہ عائشہ یان اس طرح جواب دے گی اس لئے پھر اس نے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ تب میں نے عائشہ سے پوچھا۔

"مطلب--- اب تم یہاں نہیں، میرے آبائی گھر جانا چاہتی ہو، یہاں ادھر لاہور میں نہیں رہنا چاہتی؟" میں نے صبح کی اس بات کو جوڑا جو وہ ناشتے کے دوران مجھ سے کہہ چکی تھی۔

"مجھے معلوم ہے کہ لاہور بہت تاریخی شہر ہے اور اگر میں نے اسلام قبول نہ کیا ہوتا تو سب سے پہلے ٹیکسلا جانا پسند کرتی مگر میں پہلے وہاں جانا چاہتی ہوں۔ میرے پاس بہت دن ہیں۔ جب تم کہو گے نا، کہ جاؤ تب میں

جاؤں گی۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تو پھر ٹھیک ہے، ہم آج ہی نکل چلتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"نہیں، یار! آج دوپہر کا کھانا تو کم از کم میرے ہاں کھاؤ، پھر جدھر مرضی جانا۔" ذیشان جلدی سے بولا۔

"بہت کھانے کھاؤں گی بلکہ آپ کے کچن میں خود بنا بنا کر کھاؤں گی۔ آپ کی بیگم کو تھائی کھانے بھی سکھاؤں گی تاکہ بعد میں بھی میری یاد آتی رہے لیکن فی الحال مجھے وہاں جانے دیا جائے۔ میں بلال کے دادا جی سے ملنا چاہتی ہوں۔"

وہ بڑی حسرت سے بولی تو ذیشان نے حتمی انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے، تو پھر نکلو انہیں لے کر تاکہ وقت پر حویلی پہنچ سکو۔"

"چلو، عائشہ! تیار ہو جاؤ، چلیں۔"

میں نے کہا تو وہ دونوں اٹھ گئے۔

شہر سے باہر نکلتے ہوئے دوپہر ہونے کو آ گئی۔ تب پچھلی سیٹ پر بیٹھی عائشہ یان نے کہا۔

"بلال! کیا تم نے حویلی میں بتا دیا ہے کہ میں وہاں آ رہی ہوں اور میرے ساتھ علی بھی ہے۔"

"بالکل--- امی تو بہت خوش ہو رہی تھیں۔" میں نے خوش کن لہجے میں کہا۔

"---اور تمہاری بیگم---؟"

اس نے پوچھا تو میں چند لمحے خاموش رہا کہ اسے کیا بتاؤں، حویلی جا کر بھی تو اسے معلوم ہو ہی جانا تھا اس لئے میں نے حقیقت بتاتے ہوئے کہا۔

"عائشہ! وہ حویلی میں نہیں ہے۔ کچھ دن پہلے وہ سب سے روٹھ کر اپنے والدین کے گھر چلی گئی ہے، ہمیشہ کے لئے۔"

"وہ خود ہی گئی ہے یا تم---؟" وہ لرزتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"نہیں--- میرے ساتھ اس کی کوئی بات نہیں ہوئی، اس کے جانے کے بارے میں بھی مجھے امی نے بتایا تھا۔" میں نے کہا تو اس نے ایک اطمینان بھری سانس لے کر کہا۔

"او، خدایا! شکر ہے---! تم اسے کہو کہ حویلی آ جائے۔"

"میرے خیال میں وہ اب نہیں آئے گی۔" میں نے اکتاتے ہوئے کہا۔

"تم کہو تو--- اگر وہ نہیں آئے گی تو میں اس سے ملنے چلی جاؤں گی۔"

اس نے کہا تو علی بولا۔

"بلال! اصل میں یہ تمہاری بیگم ہی سے ملنے یہاں آئی ہے اور یہ اس لئے---"

اس نے کہنا چاہا لیکن وہ ٹوکتے ہوئے بولی۔

"علی! پلیز، ہمارے درمیان کیا طے ہوا تھا۔"

"او کے، جیسے تم چاہو۔" وہ کندھے اچکاتے ہے بولا، اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

"اچھا، جہاں آگے کوئی ٹھہرنے کی جگہ آئے تو گاڑی روکنا، نماز بھی پڑھ لیں گے اور فون بھی کر لیں گے۔"

اس نے کہا تو میں نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

تقریباً مغرب کے وقت ہم نور پور پہنچ گئے تھے۔ گھما گھمی کے علاقے سے نکل کر پرسکون جگہ آئے تو میں نے عائشہ یان کو بتایا۔

"یہاں پر میری بیگم کا گھر ہے اور یہاں سے بیس منٹ کے فاصلے پر گلاب نگر ہے، مطلب حویلی---"

"اگر اس نے ہمارے ساتھ جانا ہوتا تو ہم اسے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ابھی لے لیتے۔ میرے خیال میں وہ اپنے والدین کے ساتھ حویلی پہنچ چکی ہوگی، کنفرم تو کرو۔" اس نے مشورہ دیا۔

"ابھی یہاں ایک قریبی مسجد آرہی ہے، ہم وہاں نماز بھی پڑھیں گے اور تصدیق بھی کرلیں گے۔"

میں نے کہا تو وہ سر ہلا کر رہ گئی۔

میں نے مسجد کے باہر گاڑی روکی اور امی کو فون کیا۔ تھوڑی دیر بعد میری ان سے بات ہوگئی تو میں نے ان سے پوچھا۔

"امی! کیا ماہا یہاں آگئی ہے؟"

"ہاں، آگئی ہے۔ تم کہاں پر ہو، ابھی تک پہنچے کیوں نہیں ہو؟"

وہ ذرا تشویش سے بولیں تو میں نے اپنے بارے میں بتاتے ہوئے کہا کہ میں تھوڑی دیر میں پہنچ جاؤں گی۔ میں نے فون بند کیا اور مسجد میں داخل ہوگیا۔ سامنے ہی دائیں جانب میاں جی چند لوگوں کے درمیان بیٹھے باتیں کررہے تھے، مجھ پر نگاہ پڑتے ہی خاموش ہوگئے۔ مجھے بڑی سبکی سی محسوس ہوئی کہ میں خود کو اتنا نمایاں کرلیا کہ وہ اپنی بات روک کر میری جانب دیکھنے لگے۔ میں شرمندہ سا ان کی جانب بڑھا۔ انہوں نے اٹھ کر مجھے گلے لگایا۔ میرا حال احوال پوچھا تو میں نے بتایا۔

"میرے ساتھ غیر ملکی مہمان ہیں۔ ان میں ایک نو مسلم خاتون ہے جسے نماز پڑھنا ہے۔"

میرے یوں کہنے پر ان کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی اور خوشی بھرے لہجے میں بولے۔

"الحمدللہ---" پھر وہاں پر موجود لوگوں سے معذرت کرتے ہوئے بولے۔ "چند باتیں رہتی ہیں لیکن مہمانوں کے باعث معذرت خواہ ہوں۔ اگر ہم نماز کے بعد چند منٹ بیٹھ جائیں تو کیا مجھے اجازت ہے---؟"

یہ سنتے ہی لوگ فوراً اٹھ گئے اور میاں جی میرے ساتھ چلتے ہوئے باہر تک آگئے۔ دونوں گاڑی سے باہر آگئے تھے۔ میں نے ان کا تعارف کرایا۔ انہوں نے علی کو گلے لگایا، پھر عائشہ یان کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"آؤ، اندر آؤ---"

یہ کہتے ہوئے وہ اندر کی جانب چل دیئے، پھر مسجد کا صحن پار کرکے اپنے حجرے میں چلے گئے اور مجھے کہا

"بھئی، مجھے ان کی زبان شاید نہ آئے، تم اس بیٹی سے کہو کہ یہاں نماز پڑھ لے اور ہم وہاں جماعت کے ساتھ نماز ادا کرلیتے ہیں۔"

میں نے یہی بات عائشہ یان سے کہی تو اس نے سر ہلاتے کہا۔

"ٹھیک ہے، میں یہیں پڑھ لوں گی---وضو کے لئے پانی چاہئے ہوگا۔"

"وہ مل جاتا ہے---"

میں نے کہا اور ہم حجرے سے باہر آگئے۔ پھر وضو کے بعد ہم نے جماعت کے ساتھ نماز ادا کرلی تو نماز کے بعد میاں جی نے ہمیں رخصت کرتے ہوئے میرے ذریعے ان سے کہا۔

"بلال بیٹا! ان سے کہو کہ مجھے بہت خوشی ہوئی ہے ان سے مل کر اور میں امید کروں گا کہ یہ مجھے دوبارہ ضرور ملنے آئیں گے تاکہ ان سے تھوڑی بات ہوسکے۔"

میں نے کہا تو علی جلدی سے بولا۔

"میں بھی چاہوں گا کہ آپ سے ضرور باتیں ہوں۔ انشاء اللہ، بہت جلد آپ سے ملاقات ہو گی۔"

"فی امان اللہ---!"

میاں جی نے کہا اور پھر پیچھے مڑ کر دیکھا ایک شخص آرہا تھا۔ وہ ہانپتے ہوئے قریب پہنچ کر رک گیا اور ایک

شاپنگ بیگ ان کی جانب بڑھا دیا۔ میاں جی نے اس میں سے ایک روایتی آنچل اور سفید پگڑی نکالی اور مجھے دکھاتے ہوئے بولے۔

"یہ، بیٹا! ان کے لئے، انہیں بتا دینا کہ روایتی طور پر یہ کیا علامت ہوتی ہے۔"

"ٹھیک ہے، میاں جی---!"

میں نے وہ شاپنگ بیگ پکڑ کر علی کے ہاتھ میں دے دیا اور پھر ان سے مل کر حویلی کی جانب چل پڑے۔ پھر راستے میں ان دونوں کو بتایا کہ ہمارے علاقے میں آنچل اور پگڑی کے بارے میں کیا تصور ہے۔ یوں خوشگوار باتوں میں ہم حویلی کے پورچ میں جا رکے۔

سوائے ماہا کے حویلی میں مقیم سبھی لوگ ڈرائنگ روم میں موجود تھے، یہاں تک کہ ملازمین بھی۔ میں نے سب کا تعارف کرایا تو سبھی نے اپنے مراتب کے لحاظ سے کسی نے سر پر پیار کیا اور کسی نے گلے لگایا۔ علی سب سے مل کر دادا جی نورالٰہی کے پاس بیٹھ گیا اور بولا۔

"بلال! بہت اچھی حویلی ہے، ایسا تو انڈین کلچر میں ہوتا ہے، نا!"

"ہاں، لیکن اب پاکستانی کلچر اپنی شناخت بنا رہا ہے بلکہ بہت ترقی کررہا ہے۔"

میں نے اسے کہا تو دادا جی نے بولے۔

"بلال پتر! یہ تو بڑا مسئلہ آن پڑا ہے، اس بارے میں پہلے بھی بات کرنا چاہتا تھا- میں ان مہمانوں سے کیسے بات کرسکوں گا، تم لوگ تو شاید کرلو۔"

ان کے یوں کہنے پر احسان تایا جلدی سے بولے۔

"میں کس لئے ہوں، ابا جی! میں ترجمہ کردوں گا نا، یہ کچھ انگریزی میں کہیں گے، میں آپ کو بتا دوں گا اور---"

معلومات

☆ براعظم ایشیا میں سب سے پہلے اولمپک گیمز ملک جاپان کے دارالخلافہ ٹوکیو میں ہوئے تھے۔

☆ کیرم کے کھیل میں انیس گوٹیں اور ایک سٹرائی کر ہوتے ہیں۔

☆ ٹیبل ٹینس کا پرانا نام پنگ پانگ ہے۔

☆ لان ٹینس کی ابتدا انگلینڈ سے ہوئی تھی۔

☆ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے ڈنیا کے سب سے کم عمر ورلڈ اسکوائش چمپئن جہانگیر خان ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر واجد گنگنوی، کراچی

"چلو، یہ ٹھیک ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ یہ اپنی تھائی زبان بولیں گے۔"

انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا تو میں نے ہنس دیا۔

"چلو، آپ ان سے کوئی بات کریں۔" میں نے کہا۔

"انہیں کہو کہ پہلے جا کر فریش ہو جائیں، پھر کھانے کے بعد باتیں ہوں گی۔"

ابا جی نے احسان تایا سے کہا تو انہوں نے علی کی جانب دیکھ کر کہا۔ وہ مسکرا دیا اور جواباً بولا۔

"بالکل---" یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"نہیں---میں پہلے بلال کی بیگم سے ملوں گی۔"

عائشہ یان ایک دم سے بولی۔ احسان انکل سمجھ گیا تو ملازمہ کو ماہا کے بلانے کے لئے کہا تو علی یان بیٹھ گیا۔ پھر ان میں سفر کی باتیں ہوتی رہیں۔ کچھ دیر بعد ماہا ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ وہی لاپرواہانہ انداز، کوئی سنگھار نہیں۔ بیہودہ لباس، گلے میں آنچل اور اجنبی چہرہ، اس نے آتے ہی میری جانب دیکھا، پھر اس کی نگاہ عائشہ یان پر گئی اور پھر اس نے علی یان کو دیکھا۔

"میری بیگم---!"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے سرسراتے ہوئے انداز میں تعارف کرایا تو عائشہ یان کھڑی ہو گئی اور پھر چند قدم چل کر ماہا تک پہنچی۔ ماہا نے سردمہری سے سلام لینا چاہا لیکن اس نے ماہا کو گلے لگا لیا۔

''کیسی ہو---؟'' اس نے الگ ہو کر ماہا کے چہرے پر نگاہیں جماتے ہوئے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں۔'' اس نے اجنبی لہجے میں جواب دیا۔

''آؤ ان سے ملو، یہ میرے شوہر ہیں علی یان---''

اس نے فخریہ انداز میں تعارف کرایا تو وہ جلدی سے کھڑا ہوا اور سلام کہہ دیا۔ ماہا نے اسی انداز میں جواب دیا اور ایک جانب ہو کر بیٹھنے لگی تو عائشہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے کہا۔

''میرے پاس بیٹھیے---''

اتنے میں ملازمین وہاں پر مشروب لے کر آ گئے، تب عائشہ نے دادا جی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ اس خاندان کے سربراہ ہیں۔ میں آپ کے بعد خاص طور پر ماہا سے ملنے کے لئے آئی ہوں۔ میں نے ایسا کیوں کیا، اس کے پس منظر میں ایک چھوٹی سی کہانی ہے۔ میں چاہوں گی کہ وہ کہانی میں سب کو سناؤں۔ کیا آپ مجھے اس کی اجازت دیں گے؟''

''ہاں، ہاں--- احسان بیٹا! اسے کہو میں ضرور سنوں گا لیکن پتر! یہ کھانا وانا کھا لیں، پھر سکون سے بیٹھیں گے تو سنتے ہیں۔'' دادا جی نے کہا۔

''ٹھیک ہے---لیکن میں آپ سب کو سنانا چاہوں گی۔''

عائشہ یان نے کہا اور پھر ماہا کا ہاتھ پکڑے وہ اٹھ گئی۔ میں بھی ان کے ساتھ اٹھا، دونوں کو ان کا کمرہ دکھایا، پھر میں اور ماہا جب پلٹنے لگے تو اجنبی نگاہوں سے میری جانب دیکھ کر اپنے کمرے کی جانب بڑھی تو میں اپنے کمرے میں چلا گیا۔

☆☆

میں عائشہ یان، جو چند ماہ پہلے پی اون کے نام سے پکاری جاتی تھی اور میرا پورا نام پینسری لوئیلی رینٹ چائی تھا۔ میں نے ایک ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی جس میں مذہب کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ میری ماں کا مذہب بدھ مت تھا لیکن وہ بہت کم کسی پگوڈا میں جاتی تھی۔ وہ کبھی کبھی کسی رسم یا میلے میں شریک ہو جاتی، جب اس کے پاس وقت ہوتا تھا ورنہ پورے گھر کی ذمہ داری اس پر تھی۔ میرا باپ ذہنی طور پر عیسائیت کے قریب تھا مگر وہ کبھی کسی چرچ میں نہیں گیا۔ اس کا زیادہ تر وقت جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ گزرتا تھا۔ وہاں سے اگر اس نے کچھ حاصل کر لیا تو تھوڑا بہت میری ماں کو دے دیتا ورنہ زیادہ تر وہ اپنی عیاشیوں کی نذر کر دیتا۔ وہ خود تو مذہبی نہیں تھا لیکن دنیا بھر میں اگر اسے کسی سے نفرت تھی تو وہ مسلمانوں سے۔ وہ انہیں دہشت کی علامت سمجھتا تھا۔ یہ یقیناً اس لئے تھا کہ اس کے خون میں تھوڑی بہت امریکی ہونے کی رمق تھی۔ میں بچپن ہی سے سنا کرتی تھی کہ وہ مسلمانوں کے خلاف زہر اگلتا رہتا تھا۔ وہ مسلمانوں کو دنیا کا امن تباہ کرنے کا ذمہ دار قرار دیتا تھا لیکن خود نہیں جانتا تھا کہ امریکی کیا کر رہے ہیں۔ میں اسی ماحول میں پرورش پاتی چلی گئی--- تھائی عورتوں کو اپنا بوجھ خود اٹھانا پڑتا ہے اس لئے میری ماں نے مجھے بچپن ہی سے ذہنی طور پر تیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ میں کچھ پڑھ لکھ جاؤں تاکہ اس کی مانند مزدوری نہ کرتی رہوں۔ اس نے میرا خرچ برداشت کیا جب تک وہ کر سکتی تھی کیونکہ بعد میں میرا بھائی زبردستی سے اپنے اخراجات میری ماں سے

چھین لیتا تھا۔ وہ پڑھا نہیں اور میرے باپ کے نقش قدم پر چل پڑا تھا۔ اسے مجھ سے تو کیا، اپنے آپ سے بھی غرض نہیں تھی سو میں پڑھنے کے ساتھ ساتھ مزدوری کرتی رہی۔ وہ لڑکیاں جو کچھ نہیں کر سکتی یا زندگی گزارنے کا آسان راستہ تلاش کرتی ہیں، وہ جنسی زندگی کی جانب راغب ہو جاتی ہیں۔ جوانی تو وہ بڑے اچھے انداز میں بسر کر لیتی ہیں لیکن پھر انہیں کوئی نہیں پوچھتا، بقیہ زندگی انتہائی بیماری اور نفرت والی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ میرے سامنے بھی یہ راہ تھی لیکن میں نجانے کیوں اس راہ پر نہیں جا سکی، شاید میں اپنے ماحول میں خوفزدہ تھی یا میری ماں کی تربیت جس نے اپنی زندگی بہت مشکل سے گزاری تھی یا پھر قسمت تھی۔ کچھ تھا ایسا کہ میں نے مشکل زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا اور اس راستے پر چل نکلی جہاں مجھے زیادہ دولت کمانے اور آسائش کی زندگی کے لئے بہت سارے راستے دکھائی دیئے اور میں صبر سے ان پر چلتی رہی۔

انہی دنوں مجھے میری ایک ٹیچر نے سمجھایا کہ میں انگریزی زبان پر عبور حاصل کروں تو بہت زیادہ ترقی کر سکتی ہوں۔ ہمارے ہاں سیاحت کا شعبہ بہت مضبوط ہے، اس میں ایسے لوگوں کی بہت مانگ ہوتی ہے۔ زبان پر مہارت میں جہاں دوسرے مشورے ملے، وہاں ایک یہ بھی تھا کہ میں انٹرنیٹ کے ذریعے پوری دنیا کے لوگوں سے رابطہ کروں اور یہ اعتماد حاصل کروں کہ ان سے انگریزی میں بات کس طرح کی جاتی ہے۔ تب مجھے بلال ملا۔ اس کے ساتھ اور بہت سارے لوگ تھے مگر دھیرے دھیرے وہ ختم ہوتے چلے گئے اور میری بلال کے ساتھ بہت اچھی دوستی بن گئی۔ میں یہ اعتراف کرتی ہوں کہ میرے دل میں مسلمانوں کے بارے میں کوئی اچھے جذبات نہیں تھے۔ میں بھی انہیں ویسا ہی سمجھتی تھی جیسے میرا باپ خیال کرتا تھا۔ اس وقت میں ذہنی طور پر اتنی پختہ نہیں تھی اور میں دنیا بھر کی معلومات بھی اپنے پاس رکھنا چاہتی تھی سو میں جب بلال سے بات کرتی تو اس سے ایسے سوال کرتی جس میں مسلمانوں کے بارے میں نفرت انگیزی ہوتی۔ یہ ان سوالوں کے جواب دینے کی کوشش کرتا لیکن مجھے مطمئن نہیں کر پاتا تھا اور میں خیال کرتی کہ جو میں سوچ رہی ہوں وہی ٹھیک ہے کیونکہ میں اپنا ذہن ان معلومات پر خرچ کرتی جو مجھے مل جاتیں، خود سے بھی کوشش نہیں کی تھی کہ تحقیق کروں اور پرکھوں کہ آیا میں درست بھی ہوں یا غلط--- میں ہوٹل میں ملازمت کرتی تھی اور دنیا بھر کے لوگوں سے ملتی تھی۔ انہیں دیکھتی اور پرکھتی اور اپنے طور پر تجزیہ کرتی رہتی۔ وہ مجھے سب ایک جیسے نظر آتے جنہیں سوائے عیاشی، شراب نوشی اور عورت سے رغبت کے کچھ آتا ہی نہیں تھا۔ ان کی غلیظ نگاہیں دوسروں کا بدن ٹٹولنے کے علاوہ کچھ کرتی ہی نہیں تھیں سو میں اپنے ماحول سے بھی کوئی اچھا تاثر نہیں لے رہی تھی لیکن تھی تو اسی معاشرے کا حصہ جس کی اپنے انداز میں پرورش ہوئی ہوتی ہے۔ میری بلال کے ساتھ دوستی چلتی رہی اور میں نے محسوس کیا کہ اب اگر میں اس سے مسلمانوں کے خلاف بات کرتی ہوں نا! تو وہ میری بات کو اہمیت نہیں دیتا اسے نظر انداز کر جاتا ہے جسے میں نے اپنے خیالات کی فتح مندی قرار دیا۔

میں جس انسٹیٹیوٹ میں تعلیم حاصل کرتی تھی، وہاں ایک مسلمان لڑکی بھی تعلیم حاصل کرتی تھی۔ وہ وہیں پتایا میں رہتے تھے۔ وہ چند لڑکیوں کا ہاسٹل تھا جس کی نگران ایک ملائیشین خاتون ہیں۔ میں نے اس لڑکی کو دہشت گرد ہی خیال کیا لیکن مجھے اس کی باتوں میں یا کسی بھی طرز عمل میں بھی کوئی ایسی بات دکھائی نہیں دی مگر میرے سوالوں کا جواب وہ بھی نہیں دے پائی تھی۔ وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بہت دب کر رہتی تھی اس لئے میری اس سے اتنی زیادہ دلچسپی نہ بڑھی۔ پھر اچانک ایک دن بلال پتا یا آ گیا۔ اس نے مجھے حیران کر دیا۔ اس نے چھپ کر میرے بارے میں جانا کہ میرا کردار کیا ہے۔ وہ میرے سامنے رہا لیکن میری نگاہوں سے اوجھل رہا۔ جب وہ میرے سامنے آیا تو مجھے اس کا یہ طرزِ عمل بہت برا لگا تھا لیکن بعد میں سوچنے پر اتنا برا نہیں کیونکہ وہ حق بجانب تھا اور اب میں سمجھتی ہوں کہ جس مقصد کے لئے بلال وہاں گیا تھا، اس کا یہ تقاضا تھا کہ وہ ایسا ہی کرے۔ وہ اس لئے کہ اگر میں بھی کوئی عام تھائی لڑکی ہوتی جو رقم کے عوض اپنا آپ کرائے پر دے دیتی ہے تو اس کا میرے ساتھ بات کرنا بنتا ہی نہیں تھا۔ وہ مجھے میرے حال پر چھوڑ کر خاموشی سے واپس چلا جاتا تو وہ بالکل درست تھا۔

بلال نے میرے نفرت انگیز سوالوں کے جواب دینے کے بجائے، دین اسلام کا وہ بنیادی نکتہ نظر سمجھایا جس کا مطالبہ وہ انسان سے کرتا ہے۔ اس نے مجھے سمجھایا کہ خدا کا وجود ہے، نبی آخر الزمان کیوں مبعوث ہوئے اور دین اسلام انسانیت سے کیا چاہتا ہے۔ میں جو خدا کو نہیں مانتی تھی، یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ میں کیا ہوں؟ میری ساری سوچیں تو میرے ذہن سے اُڑ گئیں، جیسے خزاں رسیدہ پتے طوفان اُڑا کر لے جاتا ہے۔ میں نے جانا کہ وجود کیا ہے اور روح کیا ہوتی ہے، سماجی زندگی کے بنیادی اصول کیا ہوتے ہیں، انسانیت کسے کہتے ہیں۔ مسلمانوں کے خلاف نفرت انگیزی میں کون اپنی ذہنی غلاظت پھیلا رہا ہے۔ کلچر کے نام پر غیر اخلاقی اقدام کو فروغ کیوں دیا جا رہا ہے، امن کو تہہ و بالا کر کے سامراجیت کو فروغ کون دے رہا ہے۔ یہ اور ایسے بے شمار سوالوں نے مجھے ایک نئی زندگی سے متعارف کرا دیا۔ میرے سامنے فقط ایک ہی راستہ تھا کہ میں قرآن پاک پڑھوں، اسے سمجھوں اور خود تجزیہ کرنے کی کوشش کروں کہ آیا مسلمانوں کی بنیادی تعلیمات میں وہ سب کچھ ہے جس کا پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے، کیا ان کے سماج میں وہ اخلاقیات ہیں جو مسلمانوں کے خلاف غلاظت پھیلا رہے ہیں؟---ان دنوں میں بلال کے کردار سے بہت متاثر ہوئی۔ میں اعتراف کرتی ہوں کہ میں نے اپنے دل میں اس کے لئے بہت محبت محسوس کی۔ ایک بار اس نے میری کوشش کے باوجود مجھے نظر انداز کر دیا۔ مجھے اپنے جسم کے ٹھکرائے جانے پر غصہ بھی بہت آیا لیکن اس کا یہ مقصد ہی نہیں تھا۔ میں نے خود کوشش کر کے اس کے جذبات کو بھڑکانے کی کوشش کی مگر میں ناکام رہی اور بلال کے کردار کے سامنے شکست کھا گئی۔ اپنے وطن واپس آنے تک اس نے میرے ساتھ بہت اچھا رویہ رکھا جیسا کہ ایک اچھے دوست کے ساتھ ہوتا ہے لیکن میں آخری دم تک اس کے لئے ایک تنقیدی ذہن لئے رہی۔ اس نے مجھے بتایا میں موجود ہمت سنگھ اور جندکور سے ملایا جو بہر حال بہت مخلص لوگ ہیں۔ بلال تو وطن واپس آ گیا لیکن میرے لئے ایک نیا راستہ، نئی سوچیں اور نیا طرزِ زندگی سامنے تھا۔ ہاں، یہاں میں ایک بات بھول رہی تھی۔ بلال نے مجھے بتایا تھا کہ مجھ سے بات کرنے سے قبل اس نے اگرچہ اپنے دین کے بارے میں پڑھا ہے لیکن اس حد تک نہیں کہ میرے سوالوں کا جواب دے سکے، تب اس نے اپنا مطالعہ وسیع کیا اور اس قابل ہو گیا کہ میرے ہر سوال کا جواب دے سکے اور ایسا اس نے کیا جس کا ردِعمل یہ ہوا کہ میں نے بھی چاہا کہ دین اسلام کے بارے میں جانوں، خود پڑھوں اور تجزیہ کروں کہ کیا بلال درست بھی کہہ گیا ہے یا یونہی فلسفہ اور منطق جھاڑ کر چلا گیا ہے کیونکہ اس نے مجھے بتایا تھا کہ اب شاید وہ کبھی مجھ سے نہ مل سکے گا کیونکہ جاتے ہی اس کی شادی ہو جائے

گی---وہ ہفتے تک میں اس تجسس میں مبتلا رہی کہ مجھے ایسا کرنا چاہئے یا نہیں، پھر میری کون سی ملاقات ہو گی۔ مجھے اس سمیت ساری باتوں کو بھول کر اپنی زندگی میں مگن ہو جانا چاہئے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ میرے اندر انتہائی درجے کے تجسس نے آنکھ کھول دی۔ اب وہ سارے منظروں کو خود دیکھنا چاہ رہا تھا جس کے بارے میں بلال اشارہ کر گیا تھا۔ پھر ایک دن میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس الجھن سے نجات حاصل کر لوں، میرے سامنے سب کچھ عیاں ہو جائے گا۔

میں نے ہوٹل کی نوکری تو چھوڑ ہی دی تھی۔ میں اس مسلم لڑکی سے ملی جو میرے ساتھ پڑھتی تھی۔ وہ مجھے ایک خاتون کے پاس لے گئی جس نے وہ تمام کتابیں اور لٹریچر فراہم کیا جو پڑھنا چاہتی تھی۔ میں نے سب سے پہلے قرآن پاک کا ترجمہ پڑھا۔ تب مجھے لگا کہ میں نے تو زندگی میں کچھ بھی نہیں سیکھا، بلاشبہ میرے پاس تو علم ہی نہیں ہے۔ بلال کی ایک ایک بات میرے ذہن میں تھی۔ میں نے اپنے طور پر سوالوں کی ایک فہرست ترتیب دی اور پھر اس کی تلاش میں لگ گئی۔ اس دوران میرے پاس رقم ختم ہو گئی۔ مجھے یہ فکر لاحق ہو گئی کہ اب میں کیسے اپنا خرچ کر پاؤں گی، یہاں تک کہ میرے پاس ایک بھات بھی نہ رہا۔

وہ شام کا وقت تھا۔ میں نے ڈھلتے ہوئے سورج کی جانب دیکھا اور دل سے کہا کہ اگر بلال کا خدا ہے تو پھر آج کے بعد مجھے کم از کم معاشی تنگی نہیں ہونی چاہئے تاکہ میں پوری یکسوئی سے ازلی سچائی تک پہنچ سکوں۔ شاید یہ قبولیت کا وقت تھا، میں جندکور کے پاس جا پہنچی۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کے پاس بلال کے دیئے ہوئے بھات پڑے ہیں، اس نے وہ سارے مجھے دے دیئے۔ میں واپس آ گئی۔ اسی رات مجھے فون ملا کہ میں اگر چاہوں تو پڑھنے کے ساتھ پڑھا بھی سکتی ہوں اور جتنا چاہوں کما لوں۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ میں نے صبح ہی سے وہ انسٹیٹیوٹ جوائن کر لیا اور پھر اس مسلم خاتون کے پاس آ گئی تاکہ پوری یکسوئی کے ساتھ اپنی جاب اور تحقیق کر سکوں۔ میں نے دن رات ایک کر دیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں صدیوں سے پیاسی ہوں، میرے سامنے لاتعداد انکشافات ہونے لگے۔ میں جو سوچ لے کر بھی قرآن پاک کے پاس جاتی، مجھے اس کا جواب مل جاتا۔ بلاشبہ اس معاملے میں اس مسلم خاتون نے میری بہت مدد کی تھی، اس نے میرا راستہ آسان کر دیا اور پھر ایک دن میں نے اسلام قبول کر لیا اور ایسا میں نے اپنے دل سے کیا۔

مجھے معلوم تھا میرے والدین مجھ سے متنفر ہو جائیں گے اور ایسا ہی ہوا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر مجھے تنگ کیا گیا یا پھر مجھ پر جبر کیا گیا تو میں یہ ملک چھوڑ دوں گی لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا اور میں سکون سے تعلیم حاصل کرتی چلی جا رہی ہوں اور ساتھ میں بہترین جاب کر رہی ہوں۔ میرے پاس بے شمار مواقع ہیں جن سے میں کما سکتی ہوں۔ اب سوال یہ ہے کہ میں پاکستان کیوں آئی ہوں؟ اگر ہمت سنگھ اور جندکور پاکستان نہ آتے اور وہ واپس جا کر مجھے بلال کے حالات نہ بتاتے تو شاید میں کبھی بھی پاکستان نہ آتی اور شاید میں تب بھی نہ آتی اگر بلال کی ازدواجی زندگی پرسکون اور خوشحال ہوتی۔ جندکور یہاں سے بہت کچھ لے کر گئی تھی۔ رویے، تاثرات، پیار، سب کچھ۔ اس کا کلچر بھی آپ جیسا ہے اور وہ ان باتوں کو زیادہ سمجھتی ہے۔ میں نے اسے کہا تھا کہ بلال کی بیگم کے لئے میں جو تحفہ بھیج رہی ہوں، اس میں اس کی تصویر لے آنا تاکہ میں دیکھ سکوں ماہا کیسی ہے جس کی بلال نے اس قدر تعریف کی تھی کہ اسے اپنا عشق مانا تھا اور اپنا سب کچھ اس کے لئے بچا کر رکھا تھا۔ ماہا کو شاید معلوم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بی نہ ہوتا کہ بلال کہاں پر کیا کر رہا ہے لیکن اس نے اپنی ذات کو گواہ بنا کر اس کی محبت کو اپنے اندر زندہ رکھا۔ وہ شخص جس کے باعث میں ازلی سچائی کو پا چکی ہوں، اس کی محبت کتنی خوبصورت اور اعلیٰ ہوگی، میں یہ دیکھنا چاہتی تھی لیکن جب میں نے بلال کے حالات سنے تو میں نے خود میں بہت دکھ محسوس کیا۔ کیا اسے یہ سزا ملی ہے کہ اس نے اپنے دین کے بارے میں غلط فہمی دور کرنے کے لئے اتنا لمبا سفر کیا؟--- میں نے بہت سوچا اور جتنا سوچتی رہی، میرے اندر دکھ بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ میں نے فیصلہ کرلیا کہ میں پاکستان جاؤں گی اور کم از کم سب کو حقیقت سے آگاہ ضرور کروں گی، آگے اللہ بہتر کرنے والا ہے--- اب میرے لئے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ میں اکیلی کیسے سفر کروں؟ میں پی اون ہوتی تو فوراً یہاں آ جاتی لیکن میں تو اب عائشہ یان ہوں، بغیر محرم کے سفر کیسے کر سکتی ہوں۔ میں نے اپنا مسئلہ ان کے سامنے پیش کیا جن کے ہاتھ پر میں نے اسلام قبول کیا تھا۔ انہوں نے یہ مسئلہ حل کر دیا۔ علی یان انہی کے بڑے بیٹے ہیں اور میں یہاں پر ہوں۔ میں ان سے شادی کر کے خود کو خوش قسمت تصور کر رہی ہوں۔

☆☆

اس وقت ہمارے سارے ڈرائنگ روم میں تھے اور رات خاصی بھیگ گئی تھی۔ جنوری کے ان دنوں میں سردی اچھی خاصی تھی۔ آتش دان سلگ رہا تھا جس میں لکڑیاں جلنے کی آواز سے گہری خاموشی کا اندازہ ہوتا تھا۔ عائشہ یان نے بات ختم کی تو سب کی نگاہیں ماہا کی جانب اٹھ گئیں۔ اس نے چند لمحے برداشت کیا اور پھر اٹھ کر وہاں سے چلی گئی۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ عائشہ نے جو طویل داستان سنائی تھی، اگر یہ حقیقت ہے تو پھر بلال کو میں غلط ہی سمجھتی رہی ہوں۔ میں جو اسے ایک دہشت گرد، انتہا پسند وغیرہ قرار دے کر اسے خود سے الگ کر دیا تھا، کیا میرا یہ قدم درست ہے؟ وہ کتنا اچھا انسان ہے، جس کے باعث ایک گمراہ خاتون نے قبول اسلام کیا، اور میں--- میں نے اسے کیا صلہ دیا۔ اس کی ذات کو اس کی انا کو، اس کی شخصیت کو کچل دیا۔ صرف اس لئے کہ میں اپنی پسند کے مطابق اسے دیکھنا چاہتی تھی--- وہ اپنے بستر پر پڑی یہی سوچے چلی جا رہی تھی۔

”کہیں یہ مجھے اپنے قریب کرنے کے لئے اور اپنی بات منوانے کے لئے کوئی کھیل ہی نہ کھیلا جا رہا ہو، کہیں مجھے بے وقوف تو نہیں بنایا جا رہا ہے؟“

اچانک ماہا کے ذہن میں آیا تو وہ چونک گئی۔

”کیا بلال اس قدر جھوٹ کر سہارا لے کر میری محبت حاصل کر سکتا ہے؟“

”نہیں--- بلال ایسا نہیں کر سکتا۔ اسے مجھ سے محبت تو ہے لیکن عائشہ یان اس قدر جھوٹ نہیں بول سکتی۔“

”کیوں نہیں بول سکتی؟ تم نے تو اپنی طرف سے ختم کر دی تھی، یہ اچانک آمد ضرور دال میں کچھ کالا رکھتی ہے ورنہ وہ پہلے بھی آ سکتی تھی۔ اسے آنے کا شوق تھا تو پہلے آتی--- پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اس نے اسلام قبول کیا ہو اور بلال کو اس نے نہ بتایا ہو؟“

”ممکن ہے، ایسا نہ ہو۔ تم اپنا اطمینان کر سکتی ہو۔“

”پھر مجھے تو اپنی انا قربان کرنا پڑے گی؟“

”لیکن اس کے عوض تمہیں کیا ملنے والا ہے، یہ بھی سوچو۔ ایک محبت کرنے والا شوہر۔ بالفرض محال، اس نے یہ کھیل بھی کھیلا ہوگا تو کس کے لئے، تمہاری لئے، نا! ورنہ کیا وہ تمہاری پروا کرتا---؟“

”جائیداد کے حصول کے لئے سب کچھ کیا جا سکتا ہے۔ اگر اس نے چار پانچ لاکھ لگا بھی دیئے ہوں تو انہیں بلوانے میں تو کیا گھاٹا ہے--- میں اس قدر احمق ہوں کہ ان کے اس کھیل سے متاثر ہو جاؤں گی۔“

”اگر وہ تمہاری جائیداد سے دستبردار ہو جائے تو پھر تمہارے پاس کیا جواز رہ جاتا ہے؟“

”جب میں اسے اپنا آپ سونپ دوں گی تو پھر کیا بچے گا۔ وہ میرا برین واش کر کے سب کچھ حاصل کر لے گا، یہ تو کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے۔“

”وہ اگر---“

وہ اپنی سوچ کی رو میں بہے جا رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی اور چند لمحوں بعد عائشہ یان اس کے کمرے میں آ گئی۔ ماہا کو امید نہیں تھی کہ وہ یوں آ جائے گی اس لئے جلدی سے اٹھ کر اسے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا لیکن عائشہ یان اس کے پاس بیڈ پر ہی آن کر بیٹھ گئی اور نرم سے لہجے میں بولی۔

”اگر میری باتیں بری لگی ہیں، ماہا! اور تمہیں اس سے دکھ ہوا ہے تو میں بہت زیادہ معذرت چاہتی ہوں---“

”نہیں، مجھے تمہاری بات سے کوئی دکھ نہیں ہوا لیکن تم نے اپنی تان مجھ پر آ کر توڑی ہے کہ جیسے میں ہی قصوروار ہوں۔“

”میں نے یہ تو نہیں کہا مگر میں یہ چاہ رہی تھی کہ اگر تمہیں یہ غلط فہمی کہ بلال فقط میری دوستی میں پھنسایا گیا تھا تو---“

اس نے کہنا چاہا تو ماہا نے ٹوک دیا۔

”مجھے اس سے کوئی گلہ نہیں ہے۔ اس کی [illegible] ہے، جس طرح گزارے۔ میرے لئے یہ بھی کوئی بڑی بات نہیں ہے کہ تم اس کی وجہ سے مسلمان ہو گئی ہو۔ مجھے تم پر یہ حیرت ہے کہ تم میری وجہ سے پاکستان آئی ہو اور

تجربہ، کامیابی کا سرچشمہ

”تجربہ“ کا لفظ انسانی کامرانی کے شگفتہ رنگ لئے ہوئے ہے۔ کسی نئے کام کو کرنے اور چیز کو پرکھنے آزمانے کے عمل کا نام تجربہ ہے اور کسی کام میں شعبے میں عمل کرنے کی واقفیت، علم آگاہی اور مہارت تجربہ کاری کہلاتی ہے۔ انسان نے یہ تعمیر و ترقی کے کام بڑے تجربات کے بعد کئے ہیں۔ یہ مفید ترین ایجادات ایک ہی کوشش ایک ہی عملی تجربے سے معرض وجود میں نہیں آئیں بہت سے تجربات کرنے کے بعد اپنی آخری تکمیل حالت میں پہنچی ہیں۔ ویسے تو ہر ایجاد کئی کئی تجربات کرنے کے بعد بنائی گئی لیکن بجلی کا بلب ایک ایسی ایجاد ہے جس کو بنانے اور روشن کرنے کے لئے سینکڑوں تجربات کئے گئے۔ بلب مشہور موجد ایڈیسن کی ایجاد ہے۔ ایڈیسن جب رات کے اندھیروں کو روشن کرنے والا ایجاد بلب بنا رہا تھا تو اسے کامیابی نہ ہو رہی تھی لیکن ایڈیسن نے ہمت نہ ہاری۔ بار بار ناکامی کے باوجود کوشش کرتا رہا اور اسی کوشش میں تجربے پر تجربہ کرتا رہا۔ بالآخر 1053 بار ناکام رہنے کے بعد 1054 ویں بار بلب روشن ہو گیا۔ راتوں کی تاریکی کو دور کرنے والی ایک مفید ترین ایجاد معرض وجود میں آ گئی۔ ایڈیسن کہتا ہے کہ ہر ناکام تجربہ مجھے کامیابی کی طرف بڑھانے میں میری مدد کرتا تھا۔ جب میرا ایک تجربہ ناکام ہوتا تھا تو یہ ناکام تجربہ مجھے بتاتا تھا کہ تیری منزل اس طرف نہیں ہے۔ تب میں اپنی منزل دوسری طرف تلاش کرتا تھا۔ جب دوسری طرف بھی مجھے اپنی منزل نہ ملتی تو تب میں تیسری طرف قدم بڑھاتا۔ یوں منزل کی تلاش میں مختلف اطراف میں قدم بڑھاتا رہا۔ ہر ناکام اور غلط قدم مجھے صحیح طرف آگے بڑھانے میں میری راہنمائی کرتا۔ یوں ناکام تجربات کی راہنمائی میں میں صحیح تجربہ کرنے میں کامیاب ہو گیا اور بلب روشن ہو گیا۔ یہ روشن بلب میرے 1053 ناکام تجربات کا مرہون منت ہے۔

یاد رکھئے ہر ناکامی ناکامی نہیں ہوتی۔ یہ ناکامی ہمیں کامیابی کی طرف بڑھانے میں ایک راہنما کا کام کرتی ہے۔ تلاش جاری رکھو آپ منزل مراد تک رسائی حاصل کرنے کا شرف ضرور حاصل کریں گے۔

اے ایم انصاری، شکر گڑھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بلال کے کردار بارے تصدیق کر رہی ہو جسے میں بچپن سے جانتی ہوں---؟'' ماہا نے قدرے نخوت سے کہا۔

''او کے--- مجھے یہ اندازہ ہے کہ تم اسے مجھ سے کہیں زیادہ جانتی ہو اور سمجھتی بھی ہو لیکن اتنے اچھے انسان کی بیوی جو اس کی محبوبہ بھی ہو، وہ اس سے متنفر ہو جائے، ایسا کیوں؟'' اس نے پوچھا۔

''تم مجھے یہ بتاؤ، کیا ہر انسان کو اپنی پسند کی زندگی جینے کا اختیار ہے کہ نہیں؟'' ماہا نے پوچھا۔

''بالکل ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''تو پھر اگر میں اپنی پسند کی زندگی جینا چاہتی ہوں اور اگر کسی کو میری چاہت ہے تو وہ میری سطح پر آئے۔''

اس نے واضح انداز میں کہا تو عائشہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''بالکل، یہ تمہارا حق ہے--- لیکن مجھے ایک بات بتاؤ، ماہا! تمہارا دین کیا ہے، تم کون ہو؟''

''میں الحمدللہ مسلمان ہوں، اس میں کسی کو کیا شک ہے؟'' ماہا نے کہا۔

'لیکن مجھے شک ہے اور تم اگر کسی بین الاقوامی جگہ پر جاؤ تو تمہاری پہچان کیا ہوگی؟ تمہیں شاید نہ ضرورت ہو لیکن کسی دوسرے کو تو ضرورت ہو سکتی ہے کہ وہ ویسا رویہ تمہارے ساتھ اپنائے۔'' وہ بولی۔

''تم کون ہوتی ہو شک کرنے والی؟--- ہو سکتا ہے، میں تم سے بہتر مسلمان ہوں؟'' ماہا نے دبے دبے غصے میں کہا۔

''دلوں کے بھید تو اللہ جانتا ہے لیکن بندے کی شخصیت سے بھی یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ کس قدر مسلمان ہے اور وہ اللہ کو کس قدر مانتا ہے۔'' عائشہ نے مسکراتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔

''تم کہنا کیا چاہتی ہو؟'' اس نے نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

''میں کہنا یہ چاہتی ہوں کہ یہ ٹھیک ہے کہ دین بندے اور اللہ کا معاملہ ہے لیکن ایک مسلمان اور خاص طور پر ایک مسلمان خاتون کا اظہار یہ بتا دیتا ہے کہ وہ اللہ پر کتنا یقین رکھتی ہے اور کس قدر مانتی ہے۔''

''کیسے کہہ سکتی ہو تم؟'' وہ بولی۔

''میں بتاتی ہوں---'' عائشہ یان نے خود کو سمیٹا اور کہا۔ ''اللہ پاک نے قرآن مجید میں فرمایا ہے سورہ نور کی اکتیسویں آیت میں کہ جو مومن عورتیں ہیں، وہ اپنی زینت و سنگار کی نمائش نہ کریں۔ سینوں پر اپنے دوپٹہ، چادر اوڑھیں رکھیں اور سنگھار ظاہر نہ ہونے دیں سوائے اپنے شوہر پر، باپ، سسر، بیٹوں، خاوند کے بیٹوں، بھائیوں، بھتیجوں، بھانجوں اور اپنی جیسی عورتوں پر---'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو رکی پھر بولی۔ ''کیا تم نے کبھی یہ آیت پڑھی ہے، اس کا ترجمہ دیکھا ہے---؟''

''ہاں--- میں نے یہ آیت سنی ہے۔''

''تو پھر تمہارا سینہ، چادر سے ڈھکا ہونا چاہئے---''

اس نے کہا تو ماہا نے چونک کر اس کی جانب دیکھا اور خاموش رہی۔

''میں کوئی بہت بڑی عالم نہیں ہوں۔ مجھے مسلمان ہوئے بھی اتنا وقت نہیں ہوا مگر میں ایک بات ضرور سمجھتی ہوں۔ جسے ہم مانتے ہیں، جس کی پرستش کرتے ہیں اسی کا حکم نہ مانیں تو--- اور پھر ہم اس کے واضح احکامات سے روگردانی کریں تو اس کا مطلب کیا ہوگا؟ تم یہ بھی سوال کر سکتی ہو کہ اس کی تشریح و تفصیل کیا ہے۔ پردہ کرنا چاہئے نہیں کرنا چاہئے۔ مطلب چہرہ چھپانا چاہئے نہیں چھپانا چاہئے۔ اس کی تفصیلات کیا ہیں، کس نے اس پر کیا کہا ہے، اس کو بھی ایک جانب رکھ دیں--- فوری طور پر

سامنے کیا حکم ہے، پہلے اس کو تو پورا کر لیں، پھر بعد کے معاملات دیکھے جائیں گے--- یا پھر کیا ہمیں مسلمان کہلانے کا کوئی حق ہے، بالکل آزادی ہے اپنی پسند کے مطابق زندگی گزارنے کی، پھر آپ کی اپنی پسند کے مطابق جو دین یا مذہب ہو، اسے اختیار کر لیں یا سرے سے انکار کر دیں۔ آپ کو آزادی ہے---''

''یہ--- تم--- کیا کہہ رہی ہو---؟'' ماہا نے ایک ٹک اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''ماہا! میرے ملک میں مسلمان محض دو یا چار فیصد ہیں۔ اگر اللہ نے مجھے یہ توفیق دی تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ بہت بڑی شے ہوں بلکہ میں نے زندگی کا وہ راز پا لیا جس کی ہر انسان کی ضرورت ہے۔ ہمیں تو حلال کھانا تلاش کرنا پڑتا ہے اور تم اتنی آزادی میں--- کس آزادی کی بات کر رہی ہو۔ وہ آزادی جو مغرب میں ہے۔ جہاں نہ عزت ہے، نہ عفت ہے، نہ عصمت ہے اور نہ پاکیزگی اور یہی چیزیں کسی بھی عورت کی عظمت ہوتی ہیں--- میں تم سے زیادہ جانتی ہوں اس آزادی کو جس میں روح تک جھلس جاتی ہے۔ جن کے پاس کوئی بھی اخلاقی معیار نہیں ہے---'' عائشہ یان نے بڑے جذباتی لہجے میں کہا اور پھر اٹھتے ہوئے بولی۔ ''تم سوچنا کہ تم کیا کر رہی ہو۔''

پھر وہ چند لمحے کھڑی رہی، جب ماہا کی طرف سے کوئی توجہ نہ پائی تو واپس چلی گئی۔

ماہا ایک نئی دنیا میں پہنچ چکی تھی۔ اسے احساس ہی نہیں تھا کہ وہ کیا کرتی چلی جا رہی ہے، وہ کس آزادی کی بات کر رہی ہے؟ اور اس سے بھی پہلے اسے یہ سوچنا ہے کہ کیا وہ مسلمان ہے بھی یا نہیں--- وہ اللہ کے احکامات پر کس قدر عمل کرتی ہے؟ نبی رحمت، دو جہاں کے رسولؐ کے بتائے ہوئے راستے پر اس نے کتنے قدم بڑھائے ہیں، وہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اگر اسے یہ سب پسند نہیں ہے تو پھر--- وہ چونک گئی، اس کے آگے وہ سوچ ہی نہ سکی۔

یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ مسلمان چاہے جتنے کمزور ایمان کا مالک ہو، جب اس کی مسلمانی پر زد آتی ہے تو پھر وہ پوری جان سے لرز جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی زندگی بھی اپنے دین کے لئے نچھاور کر دیتا ہے۔ یہاں تو اس کے اور اللہ کے تعلق پر انگلی اٹھ گئی، کون مسلمان چاہے گا کہ اس کا اللہ سے تعلق ٹوٹ جائے؟ وہ تو شافعی روزِ محشر کی شفاعت کا ہمیشہ طلب گار رہتا ہے--- ماہا کو پتہ ہی نہ چلا کہ کب دو آنسو اس کی گالوں کو بھگو گئے۔

☆☆

دادا نور الٰہی ساری رات نہیں سو پائے تھے۔ وہ اپنے بستر پر پڑے عائشہ یان کی ساری گفتگو پر غور و فکر کرتے رہے تھے۔ یہ ان کی زندگی کا پہلا تجربہ تھا کہ کوئی نومسلم اس طرح ان کے سامنے اپنے جذبات کا اظہار کرے، انہیں بلال پر رشک آ رہا تھا۔ اس کے بارے میں کس طرح کے شکوک و شبہات کئے گئے لیکن وہ خاموشی سے اور بڑے صبر و تحمل کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرتا رہا۔ اس کے ذہن میں ماہا کا رویہ بھی تھا لیکن وہ اسے قصوروار نہیں سمجھ رہا تھا بلکہ یہ اس کا بلال کی ذات سے والہانہ محبت کا اظہار تھا، وہ نہیں چاہتی تھی کہ بلال کسی ایسے راستے کا راہی ہو جائے جس کی نہ کوئی منزل ہوتی ہے اور راہ میں کوئی روشنی نہیں ہوتی۔ دادا کو بہرحال یہ خوشی تھی کہ اس کی نسل میں سے کوئی تو ایسا ہے جو اپنے دین پر پوری طرح کاربند ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ چاہتا تو ماہا کے رویے پر سخت ردعمل کر سکتا تھا لیکن ایسا کرنے کے بجائے اس نے تحمل سے کام لیا۔ اسے وہ دن یاد آنے لگے جب ماہا نے اسے بلال کے کمرے میں لے جا کر دلیلوں کے انبار لگا دیئے تھے اور وہ خاموشی سے سنتا رہا تھا۔ یہاں تک کہ صبح صادق ہو گئی اور موذن نے اذان فجر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دے دی۔ وہ اٹھے اور مسجد جانے کی تیاری کرنے لگے۔ اسے معلوم تھا کہ بلال بھی مسجد کا رخ کرے گا۔

وہ نماز پڑھ کر واپس آئے تو ساری رات کے جگ رتے کے باعث کافی تھکان محسوس کر رہے تھے لیکن اس وقت تلاوت کلام پاک ان کا معمول تھا۔ وہ جب کلام مجید کھول رہے تھے، اس وقت نجانے دل سے یہ کس طرح آواز اٹھی کہ آج تک وہ یونہی عربی متن پڑھتا چلا آ رہا ہے۔ بلاشبہ رسول عربی کی زبان مبارک میں پڑھنا عین سعادت وثواب ہے لیکن اس کا ترجمہ کیا ہوگا اور پھر ان کی تفصیل کیا ہوگی۔ ہر آیت کا ایک شان نزول بھی ہے، ایک جہان ہے جو وا ہو جاتا ہے۔ مجھے اس کی جانب بھی توجہ کرنی چاہئے۔ میں بلال سے کہوں گا، وہ مجھے ایسا کوئی نسخہ لا دے--- یہ سوچتے ہوئے وہ پڑھتے چلے گئے۔ آج انہیں تلاوت میں ایک خاص طرح کی لذت محسوس ہو رہی تھی، اس کے ساتھ ساتھ اک ذرا سے بے چینی بھی تھی کہ میں اس کلام الٰہی کو سمجھنے کی کوشش بھی کروں گا۔

اس وقت وہ تلاوت ختم کر کے دعا مانگ رہے تھے، جب انہیں احساس ہوا کہ کوئی ان کے کمرے میں آیا ہے۔ انہوں نے چہرے پر ہاتھ پھیرے اور مڑ کر دیکھا، ماہا دروازے میں کھڑی تھی۔ دادا اس کی طرف دیکھتے ہی چلے گئے۔ پورا جسم یوں ڈھکا ہوا تھا جیسے خود کو دوسروں کی نگاہوں سے محفوظ کر لیا گیا ہو۔ سر پر آنچل یوں تھا جس سے گردن بھی چھپی ہوئی تھی اور صرف چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اس وقت اتنی معصوم، اتنی مقدس اور اتنی پاکیزہ دکھائی دے رہی تھی کہ دادا کو اس پر ٹوٹ کر پیار آیا۔ اس کی آنکھوں میں جہاں سرخی تھی، وہاں ایک طرح سے احساس خطا بھی جھلک رہا تھا۔ وہ بالکل ہی بدلی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔

''آؤ، بیٹی! وہاں کیوں کھڑی ہو گئی ہو؟''

دادا نے بہت ہی پیار سے کہا تو وہ دھیرے قدموں سے چلتی ہوئی ان کے پاس قالین پر آ بیٹھی اور پھر اپنا سر ان کے گھٹنوں پر ٹکا دیا۔ وہ چند لمحوں تک یونہی بیٹھی رہی اور دادا اس کے بولنے کا انتظار کرتے رہے۔ تب وہ بھیگے ہوئے لہجے میں بولی۔

''دادا جی! مجھے اس پر کوئی شرمندگی نہیں ہے کہ میں بلال کے بارے میں غلط فہمی کا شکار تھی کیونکہ اس نے بھی تو مجھے مطمئن نہیں کیا کہ وہ کیا کرتا رہا ہے لیکن مجھے شرمندگی اس بات پر ہے کہ میں نے اتنی عمر گزار دی اور بہترین مسلمان نہ بن سکی--- میں ساری رات یہ سوچتی رہی ہوں، اس کی وجہ کیا ہے۔ میری تربیت میں کہیں خلا رہ گیا ہے یا پھر میری پرورش اس نہج پر نہیں ہو پائی یا پھر مجھے یہ ماحول ہی نہیں ملا یا پھر میری ذات ہی میں کہیں کمی کوتاہی ہے؟''

وہ دھیرے دھیرے یوں کہہ رہی تھی جیسے خود کلامی کر رہی ہو اور دادا اس کا سر دھیرے دھیرے تھپکتے رہے۔

''نہیں، بیٹی! یہ انسانی فطرت ہے۔ جب اس کے پاس کوئی شے بہت زیادہ ہوتی ہے تو وہ اس کی قدر زیادہ محسوس نہیں کرتا اور جو چیز نہ ہو، اس کے لئے بڑی تگ و دو کرتا ہے--- میں مانتا ہوں، بیٹی! کہ میں نے دوسری بہت ساری چیزوں پر زیادہ توجہ دی لیکن ایک بہتر سے بہترین مسلمان بننے کے لئے اپنے اردگرد ماحول نہیں بنایا۔ اب دیکھو، نا! زمین سے جو کونپل نکلتی ہے، وہ خود بخود زمین سے باہر نہیں آتی۔ اس کا بیج کسی نے بویا ہوتا ہے۔ اس کونپل کو خبر نہیں ہوتی کہ باہر ماحول کیسا ہے، وہ تو فطرت کے ہاتھوں مجبور ہے، اسے تو زمین سے باہر آنا ہی ہے۔ اب اگر اسے جس طرح کا ماحول ملے گا، اس کی نشوونما بھی تو ویسے ہی ہوگی۔ روشن دھوپ، صاف ہوا اور شفاف پانی جب اسے میسر آئے گا تو وہ فطری طور پر

بڑھے گا اور توانا پودے کی صورت اختیار کرے گا لیکن اگر ایسا نہیں ہوگا تو جو اسے ماحول دے گا، اس کے مطابق بڑھے گا۔'' دادا نور الٰہی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''اس میں میرا اتنا قصور تو نہیں ہے، نا!'' وہ تجسس بھرے انداز میں بولی۔

''ہاں، بیٹی! اس وقت ایک مسلمان کو جہاں اپنی آخرت بنانی ہے، وہاں اسے دنیا بھی بنانا ہوگی۔ جنگ بدر میں جب نبی رحمت نے دعا مانگی تھی، وہ بہت قابل غور ہے۔ آج ان تین سو تیرہ جانوں جیسا ایمان اور جذبہ چاہئے۔ یہ انہی کا صدقہ ہے کہ آج مسلمان اتنی تعداد میں ہیں لیکن صرف نام کا مسلمان ہونا نہیں---'' دادا جی نے حسرت سے کہا۔

''ہاں، دادا جی! ہم کیا ہیں اور ہم نے اپنا راستہ کون سا چنا ہوا ہے، اس پر ہم نے کبھی غور ہی نہیں کیا۔ آج جب احساس ہو رہا ہے تو---''

وہ مزید کہہ نہ سکی۔ اس کی آواز بھرا گئی تو دادا نے اس کے سر پر ہاتھ جما دیا۔ وہ ہچکیاں لے کر رونے لگی۔

''بیٹی! تمہاری یہ حالت بتا رہی ہے کہ تمہارے اندر جذبہ ایمان بہت زیادہ ہے۔ جس دل میں ذرا سا بھی اپنے ایمان کے بارے میں احساس پیدا ہو جائے تو وہ اللہ کے ہاں بڑی پسندیدہ ذات ہو جاتی ہے۔ ایمان میں پختگی تو اللہ کی توفیق سے ہوتی ہے نا! جیسے انسان اگر اس کی راہ پر ایک قدم آگے بڑھتا ہے تو وہ ستر قدم اس کی جانب آتا ہے۔ اصل چیز تو نیت ہے، نا!'' دادا نے اسے بڑے پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''دادا جی! میں نے جس زندگی کے خواب دیکھے تھے، وہ تو اتنا اہم نہیں ہے۔ یہ تو انسان کو تنہا کر کے رکھ دیتے ہیں۔ میں اس تجربے سے گزر چکی ہوں، بہت تلخ ہے یہ سب---'' وہ بھیگے ہوئے لہجے میں بولی۔

''جو گزر چکا، بیٹی! اسے بھول جاؤ اور اب ایک نئی زندگی کا آغاز کرو، میں تو یہی کہہ سکتا ہوں---'' دادا نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

''ایسے ہی ہوگا لیکن مجھے آپ کی بہت مدد چاہئے ہوگی--- میں نے جو اپنے رویے سے سب کے دلوں میں---''

اس نے کہنا چاہا لیکن دادا نے اس کی بات اچکتے ہوئے کہا۔

''نہیں، نہیں میری بیٹی! ان سب کے دلوں میں تمہارے لئے نفرت نہیں ہے۔ وہ سب تم سے محبت کرتے ہیں۔ تمہیں کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے، تم دیکھا سبھی تمہارے ساتھ کتنا پیار کرتے ہیں اور بلال--- وہ تو بچپن ہی سے تمہارے ساتھ بہت نرمی کرتا ہے۔ بس احساس کی بات ہوتی ہے، انسان کی زندگی بدل جاتی ہے۔''

انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا تو ماہا نے بھی اپنی بھیگی پلکیں صاف کر لیں، پھر بڑے پیار سے بولی۔

''میں آپ کے لئے چائے لیکر آتی ہوں---''

''ضرور لاؤ مگر تین پیالیاں لانا، میں بلال کو بھی یہیں بلوا رہا ہوں---''

دادا نے کہا تو مسکراتے ہوئے اٹھ گئی۔ دادا نور الٰہی کو یوں لگا جیسے زندگی اک نئے انداز سے شروع ہو گئی ہے۔

☆☆

میں حیران رہ گیا تھا کہ عائشہ یان نے ماہا پر کیا جادو کر دیا ہے کہ وہ ایک ہی رات میں بدل کر رہ گئی ہے۔ صبح جب دادا جی کے پاس بیٹھے ہم چائے پی رہے تھے تو وہ اتنی بدلی ہوئی، اتنی نکھری ہوئی لگ رہی تھی کہ پہلے میں نے اس کا یہ روپ نہیں دیکھا تھا اور اس روپ میں وہ مجھے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بہت ہی خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔ اسی تھوڑے سے وقت میں اس نے ایک بار بھی مجھ سے نگاہ نہیں ملائی لیکن جب وہاں سے جانے لگی تو اس قدر بھرپور نگاہوں سے دیکھا کہ میں جو اتنا لہولہان تھا، اس کی مسکان بھری نگاہیں مرہم ثابت ہوگئیں۔ ہمارے درمیان ایک فقرے کا بھی تبادلہ نہیں ہوا لیکن سارے گلے شکوے ختم ہو کر رہ گئے۔

دوپہر تک میں نے حویلی کی بہار ہی کچھ اور دیکھی، یوں جیسے ماہا کے اندر نئی روح آ گئی ہو۔ وہ ملازمین کے ساتھ کچن میں مصروف رہی اور امی ہمارے پاس ڈرائنگ روم میں بیٹھیں رہیں جہاں عائشہ یان اور علی یان کے ساتھ سب باتیں کر رہے تھے۔ میں بھی وہیں تھا۔ پھر جیسے ہی اذان ظہر کا وقت ہوا، سب اٹھ گئے۔ واپس آئے تو کھانا لگ چکا تھا۔ سب کھانے کی میز تک گئے تو ماہا نے وہی لباس پہنا ہوا تھا جو عائشہ یان نے تحفے میں بھیجا تھا۔ کھانے کی میز تکلفات بھری نعمتوں سے بھری پڑی تھی۔ پہلی بار مجھے حویلی میں سکون محسوس ہوا۔ احسان تایا اور ذکیہ تائی کے چہرے پر اطمینان بھری دمک تھی۔ ابا جی، امی اور رقیہ کے چہروں پر خوشی جھلک رہی تھی اور دادا جی سب کو دیکھ کر سرشار ہو رہے تھے، یہاں تک کہ بڑے خوشگوار ماحول میں کھانا کھالیا گیا۔

ہم سب پھر ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے تھے۔ تب دادا جی نے سب کی جانب دیکھا اور پھر بولے۔

"میں آج بہت خوش ہوں اور اس خوشی کے موقع کو یادگار بنانے کے لئے میں نے کچھ سوچا ہے---" یہ کہہ کر انہوں نے سب کی طرف دیکھا اور پھر بولے۔ "میں نے چودھری سرفراز سے بات کی ہے، وہ کل منگنی کے لئے آ رہے ہیں اور اس کے ساتھ میں نے علی یان اور عائشہ یان کے اعزاز میں ایک دعوت کا بھی اہتمام کیا ہے جس میں پورے علاقے کے لوگ آئیں گے۔ اس کے لئے سب ذہنی طور پر تیار رہیں۔"

انہوں نے کہا تو میں نے اس کا ترجمہ کر دیا۔

"یہ تو بہت خوشی کی بات ہے، ابا جی! لیکن اتنی بڑی دعوت کا بندوبست---"

ابا جی نے کہا تو احسان تایا بولے۔

"یار! مجھے کہا تھا ابا جی نے، میں نے نور پور میں ایک بندے کو کہہ دیا۔ کل ظہر کے بعد آپ کو سارا اہتمام ملے گا۔ ان کا کام ہی یہی ہے۔"

احسان تایا نے بتایا تو ابا جی نے علی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"احسان! میری یہ بات انہیں بتاؤ کہ ہمارے لئے اتنی دور سے تحفے لائے ہیں اور ہمیں بھی تو انہیں تحفہ دینا چاہئے، نا!"

"جی بالکل---"

تایا نے کہا اور پھر علی کو بتایا۔ اس پر وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"بزرگوں کے تحفے تو نصیب والوں کو ملتے ہیں۔ کیوں نہیں، مجھے قبول ہوگا۔"

علی نے ہنستے ہوئے کہا جو دادا نور الٰہی کو بتا دیا۔

"تو پھر میری طرف سے یہ دونوں اور ماہا کے ساتھ بلال عمرے کی سعادت کے لئے جائیں گے اور اگر مجھے بھی ساتھ لے جانا ہو تو ان کی مرضی ہوگی---" وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

علی اس تحفے پر بہت ممنون ہو رہا تھا۔ اس نے کہا۔

"میں نے اور عائشہ نے پروگرام بنایا تھا کہ عمرے کے لئے جائیں لیکن اس پاکستان ٹور کے باعث یہ ہم نے تھوڑے وقت بعد اور پھر حج ہی کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ میرے خیال میں اللہ پاک نے ہماری نیت قبول کر لی۔"

"دادا جی! اس سے بڑی اور کیا بات ہوگی کہ آپ ہمارے ساتھ جائیں۔ خوب جی بھر کر زیارتیں کریں گے۔" بلال نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"بس چند دنوں بعد--- آج شام میں نے ایک بندے کو بلوایا ہے، وہ پاسپورٹ وغیرہ لے جائے گا۔"

دادا جی نے کہا تو پھر اس حوالے سے باتیں ہونے لگیں۔

میں عشاء پڑھ کر واپس آیا تو حویلی میں سناٹا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ سب ڈرائنگ روم کے بجائے اپنے اپنے کمروں میں تھے۔ میں اپنے کمرے کی جانب بڑھ رہا تھا کہ سامنے سے عائشہ یان آ گئی، اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور مجھ پر لگی آنکھیں دمک رہی تھیں۔ مجھے اس کا یہ انداز بہت پراسرار سا لگا۔ وہ میرے قریب آئی اور میری کلائی پکڑتے ہوئے بولی۔

"آؤ--- ادھر آؤ۔"

"کیا مطلب، کیا کہنا چاہتی ہو تم؟" میں نے پوچھا۔

"آؤ، نا---!"

اس نے اصرار کرتے ہوئے مجھے اپنے ساتھ چلنے کے لئے کہا تو میں بادل نخواستہ اس کے ساتھ چل پڑا۔ وہ مجھے لیتے ہوئے ماہا کے کمرے کے سامنے آ گئی اور بہت جذباتی انداز میں بولی۔

"تمہاری رات تمہیں واپس لوٹا رہی ہوں--- میری دعا ہے کہ تم دونوں ساری زندگی خوش و خرم رہو۔"

اس نے کہا اور دروازہ کھول دیا۔ میں نے اندر قدم رکھا تو میرے پیچھے دروازہ بند ہو گیا۔ سامنے پھولوں سے سجی ہوئی سیج کے درمیان ماہا دلہن بنی سمٹ کر بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے سامنے وہ انگوٹھی اور کنگن دھرے ہوئے تھے۔ اس وقت مجھے ماہا سے زیادہ عائشہ یان پر پیار آیا--- میں نے انگوٹھی اور کنگن پہنائے اور اس کا گھونگھٹ اٹھا دیا۔ اس وقت ماہا مجھے کسی اور ہی دنیا کی مخلوق لگی۔ وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ مجھے یہ ماننا پڑا کہ مشرق کا وقار اس کے شرم و حیا ہی میں ہے۔

"مجھے معاف کر دینا، بلال! میں نے آپ کو بہت---"

اس نے کہنا چاہا تو میں نے اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

"معذرت وہاں کی جاتی ہے جہاں اعتماد نہ ہو اور میں نے تو کبھی تمہیں خود سے الگ نہیں سمجھا، نہ ہی سمجھوں گا۔" میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں نے اپنی سب سرگرمیاں ختم کر دی ہیں، صرف آپ کی ذات ہی میرا محور ہوگی۔ شاید اسی طرح میں اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر سکوں۔" وہ عزم سے بولی۔

"میں نے تمہیں منع تو نہیں کیا، تمہاری مراد ایزا جی

ناہنجار

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شمشاد مارکیٹ میں دو دوست پروفیسر سید زاہد حسین نقوی اور پروفیسر سید ساجد حسین نقوی دس سال کے بعد اور ایک دوسرے سے ان کا حال پوچھنے لگے۔

پروفیسر سید ساجد حسین نقوی نے بتایا۔

"میرے تو تین بیٹے ہیں۔ ایک ڈاکٹر سید محمد ذہین عباس نقوی ہے' دوسرا انجینئر سید محمد سبطین نقوی ہے اور تیسرا سید محمد حسنین نقوی ہے' جس نے تو خاندان کا نام مٹی میں ملا دیا ہے۔ ناہنجار نے فلمی سوویز کا کام سیکھ کر دکان کھول لی ہے۔"

"اچھا' ایسے بیٹے کو تو گھر سے نکال دیا ہوتا؟"

"باہر کیسے نکال دوں' وہی تو گھر کا خرچ چلاتا ہے۔"

پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی' کراچی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اوسے ہے، نا؟''

''جی، وہ اور باقی سب کچھ---'' اس نے کہا۔

''نہیں---تم این جی او چلاؤ گی لیکن اس میں صرف یہ دیکھو گی کہ کہیں میں ایسا کام تو نہیں کر رہی جس سے میرے اللہ اور رسولؐ نے منع فرمایا ہو۔ بس اتنا ہی کافی ہے۔ اس طرح تم نیکیاں بھی کما سکو گی، اللہ کی رضا اور نبی رحمت کی محبت کا راستہ تو خدمت انسانیت سے ہو کر جاتا ہے۔ کس نے منع کیا کہ تم ایسے ادارے بناؤ جہاں قرآن پاک کی تعلیم دی جاتی ہو، اسی کام کو سب سے اعلیٰ درجے پر رکھا گیا ہے۔ ایک عورت کو تعلیم دینا گویا پورے خاندان کو تعلیم دینا ہے اور یہاں پر اس کام کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ ضروری نہیں کہ ہم این جی او کا وہی تصور اپنائیں جو مغرب کا ہے۔ ہمارے دین کی بنیاد میں خدمت و فلاح انسانیت ہے، یہی ایک اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے چاہے تم پارلیمنٹ تک بھی جاؤ تو مجھے اعتراض نہیں ہوگا۔ نور پور سے لے کر گلاب نگر تک کے لوگ تمہاری دینی خدمات سے مستفید ہو جا'' ہیں۔ اس سے بڑی سعادت کیا ہوگی۔''

''ہاں، کبھی کبھی میں سوچتی ہوں، غیروں کو ہمارے نصاب تعلیم کی اتنی فکر کیوں ہے۔ ظاہر ہے، اسی پر نسل کے خدوخال مرتب ہوتے ہیں--- خیر، مجھ سے جو ہو سکا، میں کروں گی کیونکہ اب آپ کی مدد میرے ساتھ شامل رہے گی---''

اس نے کہا اور اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔

''کیوں نہیں، میں تمہارے ساتھ ہوں---''

میں نے کہا ہی تھا کہ ماہا کا سیل فون بج اٹھا۔ وہ چونک گئی، شاید وہ بند کرنا بھول گئی تھی۔ اس نے میری جانب دیکھا اور پھر فون اٹھا لیا۔ سکرین پر نمبر دیکھتے ہی اس کا چہرہ عجیب سا ہو گیا جیسے وہ بہت غصے میں ہو، پھر اگلے ہی لمحے خود کو نارمل کرتے ہوئے مجھے کہا۔

''پھوپھو نجمہ کا فون ہے۔ میں صبح سے اس کے فون کے انتظار میں تھی۔ آپ خاموش رہیے گا اور فقط سنیے گا۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے سپیکر آن کر دیا اور بولی۔

''پھوپھو! آپ نے اب فون کیا ہے، میں تو کافی دیر سے آپ کے فون کے انتظار میں تھی۔''

''کیا ہوا، خیریت تو ہے؟'' وہ تشویش سے بولیں۔

''یہاں بات فیصلے تک آ پہنچی ہے---'' اس نے کہا۔

''کیا مطلب---بلال نے تمہیں طلاق دے دی---؟''

''نہیں---لیکن ایک بہت بڑی بات ہو گئی ہے۔ دادا جی نے اپنے دونوں بیٹوں سے یہ لکھوایا ہے کہ ماہا اور بلال کی شادی اگر ٹوٹتی ہے تو جو بھی شادی توڑنے کا باعث بنے گا، اسے جائیداد میں سے کوئی حصہ نہیں ملے گا۔''

''کیا کہہ رہی ہو؟'' نجمہ پھوپھو نے چیختے ہوئے کہا۔

''جی، یہ دستاویز موجود ہے---مطلب، اگر میں چاہوں گی تو پاپا کو جائیداد نہیں ملے گی، وہ افضال چاچا کے پاس چلی جائے گی۔'' ماہا نے اپنا لہجہ مایوس کن بناتے ہوئے کہا۔

''یہ تو بہت بڑا ظلم ہے--- ابا جی یہ کیا شرطیں لکھوا رہے ہیں۔'' وہ مری ہوئی آواز میں بولی۔

''---اور سنیں، یہ بھی اس دستاویز میں لکھا ہے کہ میرے نام جو بنگلہ ہے، میرے قصوروار ہونے پر وہ بلال کو مل جائے گا اور اگر بلال قصوروار ہوتا ہے تو حویلی میرے نام ہو جائے گی۔'' ماہا نے بڑے تحمل سے کہا۔

''ارے، یہ کیا اول فول بک رہی ہو؟'' نجمہ پھوپھو پھر سے چیخ اٹھی۔

''جب ہماری شادی ہوئی تھی تو یہ طے پایا تھا۔ پاپا نے بنگلہ میرے نام کیا تھا اور دادا جی نے حویلی بلال کے نام کر دی تھی۔ آج شام یہ دستاویز میرے سامنے کر دی گئیں، اس وقت میرے سامنے پڑی ہیں۔ ان کا خیال یہی ہے کہ میں ساری زندگی حویلی میں پڑی سسکتی رہوں---'' ماہا روہانسے انداز میں بولی۔

''یہ تو سب کچھ ہی غلط ہو گیا۔ میں بھی کہوں کہ وہ سب اتنے مطمئن کیوں ہو رہے ہیں اور وہ زبیدہ اسی لئے اپنے منہ میں زبان لگوا آئی ہے۔ مطلب، ابا جی نے سارے ہی کام پکے کئے ہوئے ہیں۔''

نجمہ پھوپھو سوچنے والے انداز میں بولی تو ماہا نے پوچھا۔

''تو پھر آپ بتائیں نا، پھوپھو! میں کیا کروں، کیا فیصلہ کروں---؟''

''بیٹی! تم اپنا فیصلہ خود کرو'' وہ اچانک بولی۔

''آپ ہمیشہ یہی کہتی ہیں لیکن اس وقت تو میں خود اس پوزیشن ہی میں نہیں ہوں کہ خود فیصلہ کر سکوں۔ ظاہر ہے، میں اگر بلال کو نہیں مانتی تو پھر مجھے کچھ نہیں ملے گا۔ اب آپ ہی نے بتانا ہے کہ اس صورتحال میں کیا آپ مجھے قبول کر لیں گی، نہ قبول کرے گا؟''

ماہا نے کہا تو میں چونک گیا، یعنی بات یہاں تک پہنچی ہوئی تھی۔

''اب دیکھو، بیٹی! یہ تو فہد کا معاملہ ہوگا نا، میں نہیں چاہتی کہ تم سے یہ سب چھن جائے۔ اب تجھے بلال ہی کو اپنا مقدر سمجھ کر قبول کرنا ہوگا۔'' وہ بڑے تحمل سے بولیں۔

''میں یونہی حویلی میں پڑی سسکتی رہوں؟--- آپ کے پاس تو بہت کچھ ہے۔ اگر میرے پاس نہ بھی رہا تو کیا ہوا، میں اب حویلی میں نہیں رہ سکتی۔'' ماہا نے کہا۔

''یہ تمہاری قسمت ہے، بیٹی! اب اسے قبول تو کرنا پڑے گا۔ کل کو تمہارے والدین کے پاس کیا رہے گا، کیا اسے بھی فہد ہی پالے گا---نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔ تمہارے والدین نے تم پر ظلم کیا ہے، اب بھگتو---'' وہ بولی۔

''آپ تو کہہ رہی تھیں کہ مجھ سے محبت---''

ماہا نے کہنا چاہا تو وہ بولیں۔

''میں نے بھی دنیا کو منہ دکھانا ہے۔ تمہارے باپ کے پاس رہے گا کیا، صرف ایک نوکری---وہ تو اپنی جائیداد کے لئے مقدمہ لڑنے کا بھی اہل نہیں ہوگا۔''

''آپ تو ہمارا خون ہیں، ایسے وقت میں ہی تو دوسروں کے کام آتے ہیں--- میں بہرحال سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آپ کے پاس آ رہی ہوں---'' ماہا نے کہا۔

''نہ، بیٹی! ایسا مت کرنا۔ میری جو تھوڑی بہت عزت اباجی کے سامنے رہ گئی ہے، وہ بھی نہ ختم ہو جائے۔ تمہاری وجہ سے میں نے رقیہ کا رشتہ بھی چھوڑا۔'' وہ حسرت سے بولیں جس میں غصہ نمایاں تھا۔

''میں نے آپ کو نہیں روکا تھا، آپ نے خود ہی فیصلہ کیا۔ اب جبکہ میں ساری کشتیاں جلا چکی ہوں، اب آپ ایسے نہ کریں۔ مجھے قبول کر لیں ورنہ میں ساری زندگی---''

وہ بات مکمل بھی نہ کر پائی تھی کہ دوسری طرف سے رابطہ کٹ گیا۔ ماہا نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''اب یہ رقیہ کے پیچھے پڑ جائے گی۔''

''اب کچھ بھی نہیں ہوتا، میں ساری بات سمجھ گیا ہوں---''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے کہا تو وہ دادا جی کے نمبر ملانے لگی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے سیل فون پکڑ کر بند کر دیا۔ تب ماہا پہلے تو میری جانب اک ٹک دیکھتی رہی، پھر ایک دم سے رو دی۔

''بہت بھٹکی ہوں، بلال---!'' اس نے سسکیوں کے دوران کہا۔

''اللہ کا شکر ادا کرو جس نے نہ صرف تمہیں بچا لیا بلکہ ایک نئی زندگی کی توفیق دی۔''

میں نے کہا تو وہ بولی۔

''بے شک وہی کارساز ہے---''

اس نے کہا اور اپنا سر میرے کاندھے پر ٹکا دیا۔

☆☆

سہ پہر ہو رہی تھی۔ حویلی کے مکین لاہور ائیر پورٹ پر پہنچ گئے تھے۔ دادا جی کے ساتھ علی یان کھڑا تھا جبکہ عائشہ یان اور ماہا زبیدہ خاتون کے ساتھ کھڑی تھیں جبکہ بلال ان سب کا سامان سمیٹ رہا تھا، جو ملازمین وہاں رکھ گئے تھے۔ تبھی افضال نور نے بلال سے مخاطب ہو کر کہا۔

''ابا جی کا بہت خیال رکھنا۔ ممکن ہے، آب و ہوا کی تبدیلی سے ان کی صحت پر اثر پڑے۔''

''آپ فکر نہ کریں، میں سنبھال لوں گا۔'' وہ سعادت مندی سے بولا۔

''---اور خاص طور پر ان مہمانوں کا۔ ان کی ایک پائی بھی خرچ نہیں ہونی چاہئے۔'' زبیدہ خاتون نے کہا۔

''ٹھیک ہے، امی! آپ بس ہم سب کے لئے دعا کریں۔''

''تم بھی ہمارے لئے دعا کرنا، بیٹا!'' ذکیہ خاتون نے عاجزی سے کہا۔

''ایسے میں ذیشان وہاں آ گیا، اس کے پیچھے اس کی بیگم تھی۔ سب سے ملنے کے بعد اس نے دادا جی سے مخاطب ہو کر کہا۔

''دادا جی! یہ کتنی غلط بات ہے کہ یہ اکیلے ہی عمرے پر جا رہے، نہ اس نے بتایا جاتے ہوئے پوری بات بتائی اور نہ اب بتایا۔ اس کی نیت تو یہی ہے نا! کہ ہمیں ساتھ لے کر نہ جائے۔''

اس نے جان بوجھ کر انگریزی میں کہا تا کہ وہ بھی سن لیں تو بلال بولا۔

''تمہیں پتہ ہے کہ یہ دادا جی کا تحفہ ہے اور ظاہر ہے، سارا خرچ وہ کر رہے ہیں۔ ہاں، یہ میرا وعدہ رہا کہ اب جاؤں گا تو تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گا، چاہے عمرہ ہو یا حج---!'' بلال نے کہا۔

''مجھے تمہارے وعدے کی ضرورت نہیں ہے، میں خود جا رہا ہوں دادا جی کے خرچے پر۔''

یہ کہہ کر وہ ہنس دیا تو بلال نے اسے خوشگوار حیرت سے دیکھا تو دادا جی بولے۔

''اتنا حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ عمرے کے سفر کا سارا بندوبست اسی نے تو کیا ہے اس لئے یہ بھی تحفے میں شامل ہے۔''

''دادا ابو! ایسا کہیں کہ یہ تحفہ پیکج میں ہے---''

ماہا نے کہا تو سبھی مسکرا دیئے۔

''اسے کہتے ہیں قسمت---'' ذکیہ بیگم جذب سے بولی۔

کچھ ہی دیر بعد فلائٹ کا وقت ہو گیا۔ وہ سب ڈیپارچر لاؤنج کی جانب بڑھ گئے۔ اس وقت ان کے چہروں پر سنجیدگی بھرا تقدس تھا۔ وہ سب اللہ کے مہمان بننے جا رہے تھے۔

☆☆

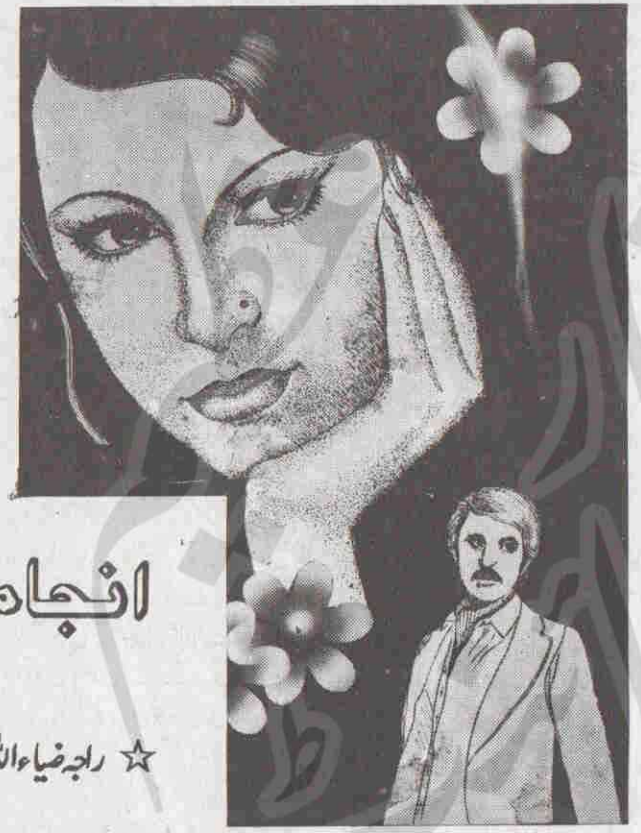

انجام

☆ راجہ ضیاء اللہ

جب آپ دوسروں کو فریب دے رہے ہوتے ہیں تو کوئی دیکھے یا نہ دیکھے، قدرت ہر لمحہ کی گواہ ہوتی ہے۔ ایسے انسان کی رسی ضرور دراز ہوتی ہے مگر جب گرفت ہو تو یہی دراز رسی گلے کا پھندا بن جاتی ہے اور اس لمحے کچھ بھی دسترس میں نہیں رہتا سوائے پچھتاوے کے ---ایک سبق آموز سچائی!

''جیکی نے آج خودکشی کر لی ہے۔''

میرے بھائی کے اِس افسوس ناک sms نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ مَیں کتنی ہی دیر سر جھکائے جیکی کی تصویر نظروں میں بسائے بیٹھا رہا۔ امریکہ میں جیکسن عرف جیکی کے ساتھ گزرا ہوا وقت' اُس کے ساتھ کی گئی تفصیلی گفتگو کا ایک ایک لفظ مجھے یاد آنے لگا۔ مجھے امریکہ سے آئے ابھی چھ ماہ ہی تو ہوئے تھے۔

امریکہ دُنیا کا سب سے بڑا اور سب سے طاقتور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ملک ہے۔ اس ملک کے عام حالات ہر بندہ نہیں جانتا اس لئے ہر بندہ امریکہ جانے کی کوشش کرتا ہے۔ گرین کارڈ کے حصول کی خواہش اور حسرت سب کو ہوتی ہے۔ گرین کارڈ حاصل کرنے کے لئے لوگ کیا کچھ نہیں کرتے۔ ایجنٹ حضرات اپنی پٹاری کے سارے گر آزماتے ہیں' دو نمبر کا کام کرنے والے اپنے فن کا لوہا منواتے ہیں۔ گرین کارڈ ہولڈر لڑکی یا لڑکے کے رشتے کے لئے دُنیا دیوانی ہو جاتی ہے۔ جو میرج بیورو والے ایسے اشتہار شائع کرتے ہیں' اُن کی چاندی ہو جاتی ہے اور یہ لوگ جان بوجھ کر ایسے جھوٹے اشتہار شائع کرتے ہی رہتے ہیں۔ ہر بندہ اپنا سب کچھ فروخت کر کے امریکہ جانے کی کوشش کرتا ہے اور جن کے پاس اتنی رقم نہیں' اُن کی بھی اللہ تعالیٰ نے سن لی تھی۔ امریکن ویزہ لاٹری کے ذریعے بھی لاکھوں لوگ امریکہ گئے ہیں۔ اُن دنوں امریکن ویزہ لاٹری کے لئے لوگوں کا پاگل پن عروج پر تھا۔ امریکہ جانے کا شوق جنوں میں بدل چکا تھا۔ اس موقعہ سے فائدہ اُٹھانے والے نام نہاد قانونی مشیر اور ماہرین کھمبیوں کی طرح زمین سے اُگ آئے تھے جو عوام کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے تھے۔ اُن ماہرین میں سے زیادہ تر امریکی قانون ہی نہیں جانتے تھے حتیٰ کہ [illegible] نہ جانتے تھے کہ گرین کارڈ کیا ہے۔ [illegible] نے گرین کارڈ کا نام سن رکھا ہے لیکن [illegible] حیرت ہوگی کہ امریکہ میں سرکاری سطح پر [illegible] کارڈ نام کی کسی چیز کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ یہ ایک عمومی اصطلاح ہے جو اے۔ آر۔ سی کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ Alien Reg Reciept Card سالوں پہلے یہ گرین رنگ کا ہوتا تھا' تب سے لوگ اُسے گرین کارڈ کہنے لگے حالانکہ اب یہ کارڈ گلابی رنگ میں ہے لیکن کہنے والے اُسے اب بھی گرین کارڈ ہی کہتے ہیں۔ گرین کارڈ ہولڈر کس طرح زندگی گزارتے ہیں' وہ یہ نہیں بتاتے۔ امریکہ کے بارے میں لوگ تفصیل سے نہیں بتاتے۔ امریکہ جو اب دُنیا کا گاڈ فادر ہے۔ پوری دُنیا کو ہڑپ کر جانے' پوری دُنیا کو ناکوں چنے چبوانے والے امریکہ کا اندرونی حال کیا ہے' یہ میں بتاتا ہوں۔ میری نظر میں اس ملک کی کوئی اہمیت نہیں ہے جس میں انسانیت ہی نہیں ہے۔ پوری دُنیا کو قرض کے جال میں جکڑنے والے امریکہ کا ہر بندہ قرض دار ہے۔ ہر ایک وہاں قرض پر گزارہ کر رہا ہے۔ وہاں جو بچہ بھی پیدا ہوتا ہے وہ کریڈٹ کارڈ پر ہی ہوتا ہے۔ وہاں کا پورا سسٹم ہی کریڈٹ پر چل رہا ہے۔ امریکہ بہت بڑا ملک ہے۔ ہر سٹیٹ میں بے شمار بنک اور انٹرسٹ کمپنیاں کام کر رہی ہیں۔ اُن سب کے اپنے اپنے کریڈٹ کارڈ ہیں۔ مختلف کمپنیاں مختلف فائدے مشتہر کرتی رہتی ہیں۔ کچھ کمپنیوں نے سالانہ فیس معاف کی ہوئی ہوتی ہے' کچھ نے انٹرسٹ ریٹ کم رکھا ہوتا ہے تاکہ لوگوں کو کریڈیٹ کارڈ کے جال میں پھنسایا جا سکے۔ جو ایک بار پھنس جاتا ہے' وہ ساری زندگی نہیں نکل سکتا۔ ان کارڈز پر گاڑی تک چارج کرائی جا سکتی ہے۔ ماہانہ اقساط میں پیسے ادا کرنے ہوتے ہیں۔ کمپنی اس رقم پر سود لگاتی رہتی ہے جو اتنا بڑھ جاتا ہے کہ بندہ سود در سود کے چکروں میں ہی پھنسا رہتا ہے۔ میں نے وہاں بڑے بڑے شاپنگ سنٹر دیکھے' مختلف قسم کے سٹورز میں گیا۔ وہاں صرف پانچ فیصد لوگ ہی کیش پے منٹ کرتے ہیں۔

کچھ عرصہ پہلے ہی مجھے امریکہ جانے کا اتفاق ہوا۔ امریکہ میں میرا چھوٹا بھائی نوشاد عرف نشی کمپیوٹر انجینئرنگ میں ماسٹر کر رہا تھا۔ اُس کی گریجویشن سریمنی تھی۔ اُس نے مجھے اپنی یونیورسٹی کی طرف سے اسپانسر لیٹر بھجوایا۔ اسپانسر لیٹر تو اُس نے ماں باپ کو بھی بھجوایا تھا لیکن وہ نہ جا سکے۔

مجھے تو اُس سریمنی میں شرکت کرنا ہی تھی کیونکہ مجھے بھی ہر آدمی کی طرح امریکہ دیکھنے کا شوق بھی تھا لیکن زیادہ شوق مجھے اپنے بھائی کی تقریب تقسیم اسناد میں شامل ہونے کا تھا۔ بھائی کو میں اپنے خون پسینے کی کمائی بھیج کر پڑھا رہا تھا۔ اب اُس کو دستار فضیلت ملنے کا وقت تھا۔ مجھے ابوظہبی امریکین ایمبیسی سے باآسانی ویزہ مل گیا۔ یونیورسٹی کی اسپانسرشپ بڑی اہم تھی۔ میری جاب بھی میرے لئے آسانیاں پیدا کر رہی تھی' لگے ہاتھوں میں نے انگلینڈ کا ویزہ بھی لگوالیا۔ میں ابوظہبی سے اتحاد ایئرویز سے لندن گیا۔ ہیتھرو ایئرپورٹ سے باہر آ کر میں نے مانچسٹر کی بس پکڑی۔ لوٹن Luton اور برمنگھم سے ہوتا ہوا چھ گھنٹے بعد مانچسٹر پہنچا۔ وہاں میرے ایک کزن کا ہوٹل ہوتا ہے' میں اُسے سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ میں اس کے ہوٹل پہنچا۔ وہ کچن میں برتنوں کے ڈھیر میں چھپا برتن صاف کر رہا تھا۔ کئی بار آنکھیں ملنے کے بعد اُسے یقین آیا کہ یہ میں ہی ہوں۔ تین چار دن بعد ہی میں نے اُس سے اجازت لے لی کیونکہ اس کے پاس مجھے سیر کرانے کی زیادہ فرصت ہی نہ تھی۔ دوبارہ ہیتھرو ایئرپورٹ آیا۔ یہاں سے امریکن ایئرلائن کے جہاز سے نیویارک کے لئے روانہ ہوا۔ تقریباً چھ گھنٹوں کے سفر کے بعد میں JFK جان ایف کینیڈی ایئرپورٹ پہنچا۔ بھائی میرا منتظر تھا۔ نوشاد عرف نوشی برج پورٹ یونیورسٹی میں ماسٹر کر رہا تھا۔ برج پورٹ امریکہ کی ریاست کنکٹی کٹ میں ہے۔ جے ایف کے ایئرپورٹ سے ڈیڑھ گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد ہم برج پورٹ پہنچ گئے۔ ابھی اُس کی گریجویشن سریمنی میں تین چار دن باقی تھے۔ وہ امتحانوں سے فارغ تھا' صرف کسی کسی رات پارٹ ٹائم جاب کرتا تھا۔ دن کو وہ مجھے سیر کراتا تھا۔ مجھے یونیورسٹی دیکھنے کا موقعہ ملا' ٹیچر سے ملنے کا موقعہ ملا۔ میرا بھائی وہاں اسکالرشپ پر پڑھ رہا تھا' بہت لائق اور قابل طالب علم تھا اس لئے سب اساتذہ سے اُس کے اچھے تعلقات تھے۔ سب اُستاد اُسے چاہتے تھے۔ بھائی کے ڈیپارٹمنٹ کے ڈین اور چیئرمین سے تفصیلی بات چیت ہوئی۔ اُنہوں نے مجھے یونیورسٹی کے بارے میں تفصیل بتائی۔ یہ یونیورسٹی پہلے ہائی سکول ہوتا تھا۔ یونیورسٹی بہت بڑی تو نہ تھی' پھر بھی یونیورسٹی کا خوبصورت کیمپس 83 ایکٹر رقبہ پر پھیلا ہوا تھا۔ لانگ لی لینڈ Long Leland کے کنارے بڑی خوبصورت جگہ پر واقع یہ یونیورسٹی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ مجھے یونیورسٹی کی کمپیوٹر لیب دیکھنے کا موقعہ ملا۔ تمام انجینئرنگ اور بزنس سکول دیکھے۔ سٹوڈنٹس کے ہاسٹل دیکھے جنہیں وہاں Dormetery کہتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ تین چار دن گزر گئے اور وہ دن آ گیا جب گریجویشن سریمنی تھی۔ یہ دن سب کے لئے ہی بڑی خوشی کا دن ہوتا ہے۔ طالب علموں کو تو اُن کی محنت کا صلہ میڈلز اور ڈگری کی صورت مل رہا ہوتا ہے اور طالب علموں کے خاندان والوں کے لئے تو یہ دن نہایت ہی اہم ہوتا ہے' اُن کی خوشیوں کا اندازہ تو کوئی کر ہی نہیں سکتا۔ خاندان والوں نے جو قربانیاں دی ہوتی ہیں' اُن کا پھل مل رہا ہوتا ہے۔ اس خوشی کے موقعہ پر نہ جانے کیوں آنسو اُمڈ آتے ہیں۔ میں نے اچھے بھلے سنجیدہ بزرگوں اور بڑی بوڑھی عورتوں کو بھی فرط مسرت سے روتے دیکھا ہے' خود میرے آنسو کنٹرول میں نہ تھے۔

اُس دن اتوار تھا۔ بڑا خوبصورت دن تھا' سورج اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا لیکن گرمی نہ تھی۔ آرٹس اینڈ سائنس کی بلڈنگ کے باہر ہزاروں کی تعداد میں گیسٹ موجود تھے۔ ہر ایک کے چہرے پر خوشیاں رقصاں تھیں۔ خوبصورت سٹیج سجا ہوا تھا جہاں سب سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آگے یونیورسٹی کا پریذیڈینٹ' بورڈ آف ٹرسٹی کے ممبر اور عام سکولوں (انجینئرنگ' بزنس) کے چیئرمین اور ڈین حضرات تشریف فرما تھے۔ یونیورسٹی کی روایات کے مطابق سب سے پہلے چار گارڈز سرمونیل ڈریس میں ملبوس آئے۔ ڈائیس پر یونیورسٹی فلیگ اور امریکن فلیگ لگائے۔ وہاں تلاوتِ قران پاک کا تو سوچا بھی نہ جاسکتا تھا۔ یونیورسٹی کے صدر نے مہمانوں سے خطاب کیا۔ یونیورسٹی کی تاریخ دُھرائی پھر مختلف شخصیات نے مختلف موضوع پر تقریریں کیں۔ دو تین طالب علموں نے بھی یونیورسٹی کی ایکٹیوٹی بارے بتایا۔ پھر باقاعدہ تقریب تقسیم اَسناد کا سلسلہ شروع ہوا۔ سب سے پہلے اُن طالب علموں کو ڈگری ملی جنہوں نے مختلف فیلڈ میں پی ایچ ڈی مکمل کیا تھا۔ پھر ماسٹر کرنے والوں کو ڈگریاں دی گئیں۔ میرے بھائی نے بھی کمپیوٹر انجینئرنگ میں ماسٹر کی تھی' پوزیشن بھی اچھی لی تھی اس لئے اُس کا نمبر شروع میں تھا۔ اُسے امریکہ سے ڈگری لیتے دیکھ کر میری آنکھوں میں خوشی کے دیے جھلملانے لگے۔ خوشی کے اِن دیوں کے جھلملانے سے نمکین پانی آنکھوں سے رواں ہوگیا۔ میں اپنی خوشی پر قابو پانے میں ناکام رہا تھا۔ میرے ساتھ میرے بھائی کا ایک اور امریکن دوست جیکسن عرف جیکی بیٹھا ہوا تھا جو اُس سے کافی بڑا تھا' وہ مجھے تھپک رہا تھا۔ میرے بائیں ہاتھ نوشی کے پاکستانی دوست تھے' وہ بھی خوشی سے چہک رہے تھے۔ ماسٹر کے سٹوڈنٹس کے بعد بیچلر اور پھر ایسوسی ایٹس کو ڈگریاں ملیں۔ تمام گریجویٹس اور اُن کے رشتہ داروں کی مشروبات اور ہلکے پھلکے کھانے سے عزت افزائی کی گئی۔ اس طرح یہ پُروقار تقریب اختتام کو پہنچی۔ جیکسن اپنے قیمتی وقت سے فرصت نکال کر ہماری خوشی میں شامل ہوا تھا اِس لئے ہم نے اُس کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔

سرمنی ختم ہونے کے بعد کنکٹی کٹ سٹیٹ کے مختلف شہر دیکھنے اور انڈین پاکستانی حضرات سے ملنے کا موقع ملا۔ بہت سے پاکستانی طالب علموں سے ملاقات رہی۔ پاکستان میں سنتے تھے کہ بچہ خراب کرنا ہو تو امریکہ بھیج دو۔ یہ بات سچ بھی ہے اور نہیں بھی کیونکہ اگر لڑکوں کو اچھی کمپنی مل جائے تو بگڑے ہوئے بچے بھی بہت اچھے طالب علم ثابت ہوتے ہیں۔ اِس یونیورسٹی میں کئی پاکستانی لڑکے کئی سال سے گریجویشن نہیں کر سکے تھے' لڑکیوں اور شراب میں مست ہو کر اپنے پچھلے لوگوں کو بھول چکے تھے۔ اِس ہی موضوع پر میری بات یونیورسٹی کی انٹرنیشنل سٹوڈنٹس افیئر کے ڈائریکٹر سے ہوئی تھی۔ اُس نے بتایا کہ لڑکے بغیر مشورہ کیئے سمسٹر چھوڑ دیتے ہیں' پھر نقصان اُٹھاتے ہیں۔ وہاں کئی پاکستانی طالب علم ایسے ہی تھے۔ اب اُن کے لئے سٹوڈنٹس سٹیٹس برقرار رکھنا مشکل ہو چکا تھا۔ اب وہ وہاں شادی کے چکروں میں ہیں یا پیپر میرج کر کے ہی گرین کارڈ لینے کی کوشش میں ہیں تاکہ پاکستان جا کر واپس آسکیں کیونکہ امریکن قانون کے تحت انٹرنیشنل سٹوڈنٹس کو اپنے ملک جانے سے پہلے ڈائریکٹر انٹرنیشنل سٹوڈنٹس افیئر سے اپنی آئی ٹوئنٹی کے پیچھے مہر لگوانی پڑتی ہے' سائن کروانے پڑتے ہیں اور جن کا سٹیٹس ہی ختم ہو چکا ہوتا ہے اُنہیں کوئی پرمیشن نہیں ملتی۔

امریکہ کے ہر بڑے شہر میں کرائم زوروں پر ہیں۔

• برج پورٹ' کنکٹی کٹ سٹیٹ کا سب سے بڑا شہر ہے۔ کرائم کے حساب سے نیویارک کے برابر ہی ہے۔ نیویارک' دُنیا بھر میں سب سے بڑا کریمنل شہر ہے' بدمعاشوں اور جرائم پیشہ لوگوں کا شہر ہے۔

نوشی کی گریجویشن سرمنی کی تیسری رات ہم دونوں بھائی برج پورٹ ڈاؤن ٹاؤن سٹی سنٹر سے کافی پی کر

واپس آئے۔ اپنی پارکنگ میں گاڑی کھڑی کی۔ باہر نکلے ہی تھے کہ ایک سیاہ فام امریکی جمپ لگا کر سامنے آ گیا اور جیکٹ کی دونوں جیبوں سے دو پسٹل نکال کر ہم پر تان لئے۔ ہمیں اپنے والٹ زمین پر رکھ کر پیچھے ہٹ جانے کی دھمکی دی۔ ہم نے ایسا ہی کیا تو اُس نے آگے بڑھ کر والٹ اُٹھائے اور ہماری طرف منہ کیئے وہ اُلٹے پاؤں چلنے لگا' پھر بھاگ کر مکانوں کے پیچھے غائب ہو گیا۔ اسی اثناء میں ایک پولیس کار وہاں آرکی' یہ اپنی روٹین کی گشت پر تھی۔ آفیسر نے ہم سے بات پوچھی۔ وائرلیس پر ہیڈ کوارٹر کو انفارم کیا۔ پانچ منٹ کے اندر اندر تین چار کاریں علاقہ کور کر چکی تھیں لیکن وہ کالا ڈاکو نہ ملا۔ میں تو حیران و پریشان دیکھتا ہی رہا۔ میں تو ابوظہبی سے گیا تھا اور یو اے ای دُنیا کا محفوظ ترین ملک ہے۔ یہاں تو ایسا نہ کبھی دیکھا' نہ سنا تھا۔ میں نے پولیس والے سے ان ہی خیالات کا اظہار کیا۔ تو اُس نے صرف ایک جملہ کہا۔

''اِٹز اے نارمل روٹین۔۔۔''

یہ کہہ کر وہ مسکراتا ہوا چلا گیا۔

''نارمل روٹین سے ایک بات یاد آئی ہے۔۔۔''

نوشی کہنے لگا۔ ''یونیورسٹی کیمپس کے قریب ہی البرستان سٹریٹ ہے۔ اس کے کونے میں کافی فلیٹ بنے ہوئے ہیں۔ وہاں زیادہ تر طالب علم رہتے تھے' میں بھی کچھ عرصہ وہاں رہتا رہا ہوں۔ ہر رات کچھ آدمی گاڑی چوری کر کے اِس پارکنگ میں لے آتے اور گاڑی کی ہر چیز نکال کر گاڑی اینٹوں پر کھڑی کر کے چلے جاتے تھے۔ کئی دفعہ پاکستانی لڑکوں نے پولیس کو 911 پر انفارم کیا لیکن رات کو پولیس والے نہیں آتے تھے' دوسری صبح سات آٹھ بجے آتے تھے اور گاڑی کا ڈھانچہ اُٹھا کر لے جاتے تھے۔ یہ کام بلاناغہ ہوتا تھا۔ یہ وہاں ''نارمل روٹین'' تھی۔

صبر

''کل رات میں سکون کی نیند سویا ہوں۔'' حمید نے اپنے دوست اعظم کو بتایا۔ ''اور ہاں میں نے کافی رقم اور وقت کی بھی بچت کرلی ہے۔''

''وہ کس طرح؟'' اعظم نے پوچھا۔

''جو شخص میرا دو سو روپیہ دبائے بیٹھا ہے' میں نے اُس پر مقدمہ کرنے کی بجائے دو سو روپے پر صبر کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔''

''لیکن سکون کی نیند کا کیا تعلق ہے اِس سے؟''

''بھائی میرے! میں ساری ساری رات سوچتا رہتا تھا کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں۔ کبھی مقدمہ کرنے کے بارے میں' کبھی صبر کرنے کے بارے میں۔۔۔''

میاں جاوید جالندھری

نوشی نے مجھے ایک پٹرول پمپ دکھایا۔ جہاں وہ کچھ عرصہ کام کرتا رہا تھا۔ امریکہ میں پٹرول پمپ کو گیس سٹیشن کہتے ہیں۔ نوشی نے بتایا کہ میں اُس رات ڈیوٹی پر تھا۔ گیس سٹیشن کے بالکل سامنے سگنل پر ایک بڑی سی گاڑی پنکچر ہوگئی۔ کار سے سفید فام نکلا' بظاہر بڑا اَمیر نظر آتا تھا۔ وہ میرے پاس گیس سٹیشن پر آگیا اور مجھ سے مدد کا طالب ہوا۔ کرائم کی وجہ سے رات کو سب دروازے بند ہوتے ہیں' ڈیلنگ کھڑکی میں بنے چھوٹے سے کاؤنٹر سے ہوتی ہے اور تمام پٹرول پمپ رات کو سیلف سروس ہو جاتے ہیں۔ اِس لئے میں اس سفید فام امریکی کی کوئی مدد نہیں کرسکتا تھا وہ میرے ساتھ باتیں کرتا رہا' ریکویسٹ کرتا رہا اور میں اُسے اپنی مجبوری بتاتا رہا۔ اتنے میں نزدیکی گلی سے دو کالے آئے۔ اُنہوں نے دس ڈالر کے عوض ٹائر تبدیل کرنے کی بات کی۔ سفید فام امریکی خوشی خوشی رضامند ہوگیا۔ اُنہوں نے میری نظروں کے سامنے اُس کی گاڑی سے جیک اور سپیئر ٹائر نکالا' ٹائر تبدیل کیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سفید فارم امریکی نے دونوں کو دس دس ڈالر دیئے مگر اُنہوں نے جیب سے پسٹل نکال کر اُسے کا والٹ چھین لیا۔ اُس کے گلے سے سونے کی چین اُتاری' اُس کی گھڑی اُتاری اور اُسی کی کار میں بھاگ گئے۔ مَیں دیکھ رہا تھا' مَیں نے پولیس کو فون کیا مگر پولیس کے آنے تک وہ نہ جانے کہاں پہنچ چکے تھے۔

برج پورٹ میں ایک سٹریٹ ہے جسے فیر فیلڈ ایونیو کہتے ہیں۔ وہاں بچہ بچہ ڈرگ فروخت کرتا ہے۔ امریکن پولیس کو پتہ ہے لیکن وہ اُن کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ امریکہ پوری دُنیا پر پابندیاں لگاتا پھرتا ہے لیکن اِس سٹریٹ پر اُس کا بس نہیں چلتا۔ مجھے وہاں لوگوں نے بتایا کہ پولیس والے عام لوگوں کو تلقین کرتے رہتے ہیں کہ جان بچانی ہے تو دس پندرہ ڈالر ہمیشہ جیب میں رکھو۔ جو مانگے' اُسے دے دو۔ ہیرو بننے کی کوشش نہ کرو۔ جیب سے پیسے نہ نکلیں تب بھی بدمعاش گولی مار جاتے ہیں اِس لیے اپنی جان کا صدقہ اپنی جیب میں رکھو۔

نوشاد ایک کنوینس سٹور پر پارٹ ٹائم جاب کرتا تھا۔ ایک رات مَیں بھی اُس کے ساتھ چلا گیا۔ سٹور میں دو آدمی اور بھی کام پر تھے۔ ایک تو سٹور کا مالک اور دوسرا ورکر تھا۔ نوشی کیش رجسٹر سنبھالتا تھا۔ مَیں نوشی کے پاس کھڑا گپ شپ لگا رہا تھا۔ رات ساڑھے نو بجے کے قریب تین سیاہ فام سٹور میں آئے۔ ایک تو دروازے کے نزدیک ہی سامان دیکھنے لگا' بقیہ دو پیچھے کولر کی طرف چلے گئے۔ کولر میں کوک' بیئر اور دوسرے ڈرنک بھرے ہوئے تھے۔ کوئی دو منٹ بعد ہی دروازے والے نے اپنے ساتھیوں کو آواز دی۔

''ہری اَپ' ہری اَپ مین---''

وہ دونوں اُسی وقت کاؤنٹر پہ آئے اور جیکٹوں کی جیب سے پسٹل نکال لئے۔ دروازے کے نزدیک والے نے نوشی کے سر پر پسٹل رکھ دیا۔ کیشن رجسٹر کھلوایا' سارا کیش نکال لیا۔ ہم چاروں سے پرس چھین لئے' گھڑیاں اُتروالیں۔ ٹیلیفون کی تار توڑی۔ کاؤنٹر کے نزدیک نوشی کی لیدر جیکٹ لٹکی ہوئی تھی' وہ بھی اُتار کر لے گئے۔ اُنہیں بھاگتے دیکھ کر کسی نے پولیس کو انفارم تو کیا لیکن وہ غائب ہو چکے تھے۔ یہ میرے ساتھ دوسری دفعہ ہوا تھا۔ وہاں رہ کر اپنے بے یارومددگار ہونے کا بہت شدت سے احساس ہوتا ہے' ہر دم اپنی جان بچانے کی فکر لگی رہتی ہے۔

ایک دِن مَیں کیمرہ کار کی سیٹ پر بھول گیا۔ کوئی ایک فرلانگ چلنے کے بعد نوشی کو یاد آیا تو اُس نے پوچھا۔

''کیمرہ کار میں ہی ہے---'' یہ میرا جواب تھا۔

''اوہ' مارے گئے پھر تو---'' وہ کار کی طرف بھاگتے ہوئے بولا۔

''وہ اتنا قیمتی کیمرہ نہیں ہے' کیوں پریشان ہوتے ہو---؟'' مَیں نے اُسے روکنا چاہا۔

''کیمرہ قیمتی ہو یا نہ ہو' میری کار کے شیشے میرے لئے قیمتی ہیں۔ کوئی شیشے بھی توڑ جائے گا' کیمرے کے ساتھ ساتھ ریڈیو بھی نکال کر لے جائے گا---''

یہ نوشی کا جواب تھا۔ یہ تو وہاں کی زندگی ہے' ہر وقت خوف وہراس دِل پر چھایا رہتا تھا۔

میرے چند دوست نیویارک میں تھے۔ جن سے فون پر رابطہ تو تھا' اب اُن کی دعوت پر ہم نیویارک گئے۔ برج پورٹ سے مین ہٹن کے لیے روانہ ہوئے۔ مین ہٹن میں ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ' یونائیٹڈ نیشن کی بلڈنگ اور ورلڈ ٹریڈ ٹاور کی جگہ دیکھی۔ اِس ورلڈ ٹریڈ ٹاور میں نائن الیون سے پہلے ایک دفعہ دھماکہ ہوا تھا' تب اس میں پچاس ہزار سے زیادہ لوگ موجود تھے۔ نائن الیون کے بعد تو اس بلڈنگ کی فوٹوز ہی رہ گئی ہیں۔ یہودیوں کی

پلاننگ سے وہ بلڈنگ دُنیا کے نقشے سے مٹ چکی ہے اور اِس کے بدلے میں مسلمانوں کے دو ملک تباہ و برباد ہو چکے ہیں۔ نیویارک میں بہت کچھ دیکھا اور سنا۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ وہاں جتنی بھی Cabs یعنی ٹیکسیاں ہیں' اُن میں اکثر انڈین اور پاکستانی ڈرائیور ہیں۔ ڈرائیور ہونا بُری بات نہیں ہے۔ محنت کسی بھی پیشے میں کریں' محنت تو محنت ہی ہے۔ افسوس اِس بات سے ہوا کہ زیادہ تر لڑکے یہاں سے وہاں پڑھنے کے لئے گئے تھے مگر پڑھائی چھوڑ کر ٹیکسیاں چلا رہے تھے۔ میرے دوست بھی ٹیکسی چلا رہے تھے حالانکہ یو اے ای میں بہت اچھی جاب پر تھے۔ دراصل نیویارک میں اگر کوئی پیسے کماتا ہے تو وہ ٹیکسی ڈرائیور ہی ہے ورنہ عام مزدوری کا ریٹ دس ڈالر فی گھنٹہ سے کم ہی ہے۔ چونکہ نیویارک میں رہائش بہت زیادہ مہنگی ہے اِس لیے ایک ایک کمرے کے اپارٹمنٹ میں چھ سات آدمی رہ رہے ہوتے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ سب کی ڈیوٹی کے اوقات ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہوتے ہیں۔ کوئی ڈیوٹی سے آ رہا ہے' کوئی جا رہا ہے۔ کسی کے جاگنے کا وقت ہے' کوئی سونے کو ہے۔ ایسے حالات میں پرسکون نیند ہی کہاں آتی ہے لیکن وہ لوگ اتنے تھکے ہوئے ہوتے ہیں کہ لیٹتے ہی بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ سینڈوچ یا برگر لیا' چلتے چلتے کھالیا۔ اگر کبھی اکٹھے کھانا کھانے کا اتفاق ہوتا تو اپنا اپنا بل ہر ایک خود ادا کرتا۔ اے امریکن سسٹم کہتے ہیں۔ کوئی مہر و مروت نہیں۔ کوئی یار نہیں' کوئی پیار نہیں۔ میرے دوستوں کا بھی یہی حال تھا۔ وہ پیسے تو زیادہ کما رہے تھے لیکن اُن کی زندگی آرام وسکون سے یکسر خالی تھی' صرف اور صرف مشین کا پرزہ تھے۔ وہ اپنی ٹیکسیوں یا لیموزین کا ایک پارٹ بن کر رہ گئے تھے۔ مَیں بددِل ہو کر برج پورٹ واپس آ گیا۔ اَب میری روانگی کے دِن قریب تھے۔ نوشی کو تو ابھی وہاں ہی رہنا تھا۔ اُس نے ڈگری لی تھی' اَب اُسے تیس دِن کے اندر اندر پریکٹیکل ٹریننگ کی پرمیشن لینی تھی۔ یہ امیگریشن سے ملتی ہے۔ جب یہ مل جاتی ہے تو بندہ ایک سال تک امریکہ میں کہیں

تصویر

میری یادوں کی کتب میں دو تصویر بھی محفوظ ہے جس میں دو مسلح باوردی سپاہی لاہور کے ایک کمرہ امتحان کے باہر دو اُستادوں کو مرغا بنا کر کان پکڑوائے ہوئے ہیں اور اپنے اِس کارنامے پر فخر کرتے ہوئے اپنی آئندہ نسلوں کے لئے یادگار تصویر اُتروا رہے ہیں۔ یہ تصویر دیکھا کر مَیں اپنے نوجوان اور نوآموز ساتھیوں اور صحافت کے میدان میں قدم رکھنے والے بچوں کو یہ بتایا کرتا ہوں کہ یہ تصویر اِس دور کی یادگار ہے جب قائداعظم سے بھی زیادہ مینڈیٹ لے کر وزیراعظم بننے والے میاں نواز شریف نے تعلیمی اداروں کے امتحانات میں کامیابی کے ناجائز ذرائع استعمال کرنے والے طلباء کی نگرانی اور احتساب کا کام فوج کے حوالے کرنے کی ''دانشمندی'' کا مظاہرہ کیا تھا اور اِن کی یہ ''دانشمندی'' اِن حالات کی ذمہ داری بھی ہو سکتی ہے کہ جن میں اپنے ملک کی اعلیٰ ترین عدالت کے فیصلے کے باوصف سابق وزیراعظم اسلام آباد کے ہوائی اڈے سے باہر قدم نہیں رکھ سکے تھے اور واپس ایک غیر ملک کی پناہ میں چلے گئے تھے--- میں اخبارات میں چھپنے والی ایک اور تصویر بھی کاٹ کر اپنی یادوں کی کتاب کے دردناک اور عبرت آموز باب میں چسپاں کر دی ہے جس میں لوگوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کے ذمہ دار ادارے کے کارندے ایک سیاسی کارکن کو زمین پر گرا کر اس پر اپنے بوٹ رکھے ہوئے ہیں جیسے شکار ہونے والے شیر کے ساتھ تصویر اُتروا رہے ہیں۔ انسانیت اور سیاست کی اِس تذلیل کے مظاہرے پر اِس کے دیگر ساتھی دانت نکال رہے ہیں۔ مین ممکن ہے بلکہ یقینی طور پر آنے والے حالات میں یہ تصویر تاریخ کے اس باب کا عنوان بن سکتی ہے جن کا عنوان ''جیسی کرنی ویسی بھرنی'' بھی ہو سکتا ہے۔

(منو بھائی کے کالم سے کشید)

محمد انتظار احمد' سرگودھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھی جاب کر سکتا ہے۔ اگر کسی اچھی کمپنی میں جاب مل جائے اور کمپنی والے بندے سے خوش ہوں تو P.T کا عرصہ ختم ہونے پر کمپنی کا وکیل H.1 ویزے کے لئے کوشش کرتا ہے اور عام طور پر یہ مل جاتا ہے۔ پھر بندہ وہاں کا ہی شہری ہو جاتا ہے---میں بات کر رہا تھا اپنی روانگی کی۔ نوشی نے اپنے یار دوستوں کو میری الوداعی پارٹی پر مدعو کر لیا۔ اِس کی ڈگری مکمل ہوئی تھی۔ اِس پارٹی میں اُس کا دوست جاکی' جیکسن بھی تھا۔ جیکسن سے میری دو بار پہلے بھی ملاقات رہی تھی۔ پارٹی میں اور بھی کئی امریکن تھے۔ نوشی کے کلاس فیلوز لڑکے لڑکیاں تھے' پاکستانی دوست تھے تو چند انڈین بھی تھے۔ کچھ پاکستانی جیکسن عرف جاکی کو عجیب عجیب نظروں سے دیکھ کر سرگوشیاں کر رہے تھے۔ نوشی کے روم میٹ عابد عرف عابی سے میں نے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ وہ بولا۔

''جیکی کے ساتھ ایک عجیب ٹریجڈی ہوئی ہے---خود اُس کی زبانی سن لینا میں اُسے رات روک لوں گا۔''

عابد نوشی سے بڑا تھا' میرا ہی ہم عمر ہو گا پارٹی کے اختتام پر وہ جیکی کو ساتھ لے آیا۔ جیکی کی اُن کے ساتھ اچھی دوستی تھی۔ عابی نے اُسے میرے ساتھ ایک کمرے میں بٹھا دیا۔ میں بمشکل ہی اپنا مدعا بیان کر سکا۔ وہ کہنے لگا۔

''میری کہانی سننے سے پہلے کہانی کے نشان دیکھ لو---'' اُس نے اپنی شرٹ اُتاری۔ اُس کی کمر پر تین جگہ ہارس شو جیسے نشان تھے' گوشت جلا ہوا تھا۔ یہ نشان اَنمٹ ہو چکے تھے۔ ''میری کہانی یہاں سب کو معلوم ہے' تم بھی سن لو۔''

وہ شرٹ پہن کر کہنے لگا۔

☆☆

وہ ایک گڈ فرائی ڈے تھا۔ میں اور میری بیوی وینڈی پب میں وِہسکی پی کر واپس آئے۔ میں بہت خوش تھا' وینڈی بھی بہت خوش تھی۔ بیڈ روم میں آ کر ہم دونوں پیار کرتے کرتے نیند کی وادیوں میں کھو گئے۔ مجھے کچھ پتہ نہیں' کیا ہوا۔ میں نے کوئی خواب دیکھا یا یہ حقیقت تھی لیکن میں ایک زوردار چیخ مار کر بستر سے اُچھل پڑا۔ میرے پیٹ سے لے کر رانوں تک اُبلتا ہوا موم میری کھال اُتار رہا تھا۔ میں چیختے ہوئے بستر سے اُٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ تب میری بیوی وینڈی نے ڈیپ ساس پان میرے سر پر مارا' وہ سمجھی کہ میں اُسے پکڑنے لگا ہوں۔ مجھے تو پتہ ہی نہیں تھا کہ میرے ساتھ ہوا کیا ہے اور کس نے کیا ہے؟ میں تو باتھ روم جانا چاہتا تھا' اِس کھولتی ہوئی موم پر پانی ڈالنا چاہتا تھا جو میرے ہاتھوں کو بھی جلا رہا تھا۔ میں موم کو ہاتھوں سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہوا باتھ روم کی طرف دوڑا۔ میری بیوی وینڈی باتھ روم تک جاتے جاتے وہ گرم ڈیپ ساس پان میری کمر پر مارتی رہی جس کے نشان تم دیکھ چکے ہو۔ یہ نشان اَنمٹ مہر کی طرح ساری زندگی میرے ساتھ رہیں گے--- میں کس طرح باتھ روم پہنچا' یہ میں ہی جانتا ہوں۔ میرے اُٹھ کر چلتے ہی میری کھال میرے پیٹ اور رانوں سے اُتر گئی۔ ہر طرف خون ہی خون پھیل گیا۔ وینڈی نے بیڈ روم میں ہر طرف خون ہی خون پھیلا ہوا دیکھا تو اُسے واردات کی سنگینی کا احساس ہوا۔ اُسے مجھ پر ترس آیا یا وہ ڈر گئی' اُس نے ایمبولینس کو فون کر دیا۔ چند منٹوں میں ایمبولینس آ گئی۔ یہ چند منٹ میری زندگی کے ناقابلِ فراموش اذیت ناک منٹ تھے۔ ایمبولینس والوں نے مجھے اُتری ہوئی کھال کے ساتھ خون میں ڈوبا دیکھا تو اُن کے بھی رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میرے پیٹ' رانوں اور نازک اعضا سے کھال اُتر چکی تھی۔ ہر طرف خون ہی خون

تھا۔ پیرامیڈیکل سٹاف والوں نے میرے زخموں پر سلائین لوشن بار بار سپرے کیا۔ جس سے مجھے جلنے کی اذیت سے ذرا سا افاقہ محسوس ہوا۔ مجھے ہسپتال میں اچھی ٹریٹمنٹ دی گئی۔ یورین کے لیے ایک کاتھرفٹ کر دی گئی۔ ہسپتال کے بیڈ پر پڑا میں سوچتا رہتا تھا کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا ہے؟---گزشتہ کچھ عرصے سے ہمارے تعلقات زیادہ اچھے نہ تھے۔ ہماری شادی کو اب تین سال ہو رہے تھے لیکن اب ہم دونوں ہر چیز پر بحث و مباحثہ کرنے لگے تھے اور جہاں تک میرا خیال ہے' میرا رویہ ہی کچھ زیادہ اچھا نہ تھا۔ غلطیاں اور زیادتیاں مجھ سے ہوئی تھیں' وینڈی برداشت کر جاتی تھی۔ اُس نے کبھی بھی زیادہ کچھ نہ کیا تھا لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ اِس پرسکون سی عورت کے دِل میں لاوا اُبل رہا ہے اور جب وہ آتش فشاں پھٹا تو اُس نے میری ہر چیز جلا کر راکھ کر دی۔ میرا سب کچھ تباہ و برباد ہو گیا۔ اِس پرسکون سی عورت نے جو منصوبہ بنایا' وہ بہت ہی ظالم اور دُور رَس تھا۔ اُس نے مجھے زندہ درگور کر دیا ہے۔ اگر وہ مجھے قتل کرنا چاہتی تو کر سکتی تھی۔ میں تو بے ہوش سویا ہوا تھا لیکن اِس طرح وہ بھی سزائے موت کی حقدار ٹھہرتی۔ اگر وہ مجھے جلانا چاہتی تو جلا بھی سکتی تھی لیکن اُس کا منصوبہ بہت سی لمبا اور خطرناک تھا۔ اُس نے مجھے میری زندگی کی آخری سانس تک سزا دی ہے۔ وہ میری بیوی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ میرے بدن پر بہت زیادہ بال ہیں۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اُبلتا ہوا موم بہت جلدی بالوں میں جم جاتا ہے اور اُترتے وقت سخت ترین اذیت کے ساتھ جسم کی کھال بھی اُتار لیتا ہے۔ وہ جانتی تھی کہ پانی سو سینٹی گریڈ پر اُبلتا ہے اور موم دو سو سینٹی گریڈ پر اُبلتا ہے اور یہ پانی سے دُگنا گرم ہوتا ہے۔ اُس نے سوچ سمجھ کر مجھ سے انتقام لیا ہے اور مجھے وہاں پہنچا دیا ہے جہاں وہ مجھے دیکھنا چاہتی تھی۔ اَب میں دیکھنے میں مرد ہوں لیکن میں کسی عورت کے قابل نہیں ہوں۔ ڈاکٹر مجھے تسلی دیتے ہیں کہ میں ٹھیک ہو جاؤں گا لیکن مجھے پتہ ہے' اَب میں کسی بچے کا باپ نہ بن سکوں گا۔

میں کئی مہینے ہسپتال میں رہا۔ مجھے دیکھنے نوشی' عابی اور اُن کے دوست جاتے رہے۔ میری رانوں اور پیٹ پر سکن گرافٹ کر دی گئی۔ جب ڈاکٹروں نے بنڈج کھولی تو وہ اپنا کام مکمل دیکھ کر خوش ہوئے۔ خوشیاں تو مجھ سے روٹھ چکی تھیں۔ میرے جسم کی جلد میں پھٹے کپڑے کی طرح پیوند لگے ہوئے تھے۔ جو مجھے بہت دُکھ دے رہے تھے۔ میرے بدن سے ناگوار بو پھوٹ رہی تھی۔ جس میں سانس لینا دوبھر تھا لیکن میں سانس لیتا رہا۔ نوشی اور عابی اِس ناگوار بو میں بھی میرے پاس بیٹھے رہتے تھے' مجھے حوصلہ دیتے تھے۔ مجھے نئے سرے سے زندگی شروع کرنے کا کہتے رہتے تھے' اُن کی مہربانی تھی ورنہ یہاں کسی کے پاس کسی کے لیے وقت ہی نہیں ہے--- وینڈی پولیس کسٹڈی میں تھی۔ وہ مجھے دیکھنے بھی نہ آئی' آتی تو دیکھ کر خوش ہی ہوتی۔ جب کیس چلا تب بھی ہمیں بات کرنے کی اجازت نہ تھی۔ اِس واقعہ کے بعد جب پہلی بار ہماری نظریں ملیں تو میرے دِل کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے' میرے آنسو اُمڈ اُمڈ آئے۔ اِس وینڈی کے لیے میں نے بہت کچھ کیا تھا لیکن اُس نے ایسا کیوں کیا' اُس نے مجھے اتنی سخت اور لمبی سزا کیوں دی؟ سزائے موت کے بعد یہ ہی سب سے سخت اور لمبی سزا ہے۔ عمر قید کی بھی ایک حد ہوتی ہے' میری سزا تو زندگی کی آخری سانس تک ختم نہیں ہوتی۔ کورٹ میں وہ قابلِ رحم حالت میں تھی۔ مجھے اُس پر ترس آ گیا۔ میں نے سوچا کہ اُس نے تو میری زندگی تباہ کر ہی دی ہے' میں اُسے تباہ نہیں ہونے دوں گا۔ میں اُسے ساری زندگی جیل میں نہیں گزارنے دوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گا۔ آخر اُس کے ساتھ مَیں نے کچھ سال گزارے ہیں اور یہ سال اُس نے مجھے سکون دے کر خوش بھی کیا تھا۔ مَیں نے ہر ایک کی مخالفت کے باوجود اُس کی مخالفت میں زیادہ سختی نہ دِکھائی لیکن سب کچھ تو سب کے سامنے تھا' پھر بھی اِس پر رحم کیا گیا۔ اُسے ایک سال اور آٹھ ماہ کی سزا ہوئی اور ڈیڑھ ہزار ڈالر جرمانہ سنایا گیا۔ یہ پیسے مجھے ملنے تھے لیکن میں پیسے لے کر کیا کرتا۔ مجھے تو پوری دُنیا کی دولت کے بدلے بھی وہ کچھ نہیں مل سکتا تھا جو وینڈی نے جلا دیا تھا۔ مَیں کسی عورت کی طرف دیکھنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔ میرے دِل میں ابھی جوانی کا جوش ہے' کبھی کبھی مَیں جوش میں پاگل بھی ہو جاتا ہے' کبھی کبھی مَیں بلبلا اُٹھتا ہوں' پھر صبر کے کڑوے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہوں۔ مَیں نے زندہ لوگوں میں ہوں' نہ مردوں میں ہوں۔ کبھی کبھی تو خودکشی کر لینے پر دِل چاہتا ہے۔

☆☆

جیکسن عرف جیکی نے اپنی بات ختم کی۔ وہ واقعی سسک رہا تھا۔ اُس کی حالت ناقابلِ بیان تھی۔ ایسا نہ دیکھا تھا' نہ سنا تھا۔ مَیں خود کانپ کر رہ گیا مگر مجھے بار بار ایک بات تنگ کرتی تھی کہ ایسا کیوں ہوا؟ میاں بیوی میں جھگڑے ہوتے ہی رہتی ہیں لیکن اِس کی بیوی اِس حد تک کیوں گئی' اِس کے پیچھے بھی تو کوئی خاص وجہ ہوگی اور وہ وجہ بہت خاص ہوگی ورنہ عورتیں رحم دِل ہوتی ہیں۔ جس مرد کے ساتھ اتنا عرصہ گزارا ہو' اُسے اِس حال تک نہیں پہنچاتیں۔ لازماً اس نے اپنی بیوی کو کوئی بڑا صدمہ دیا ہوگا' بڑا دُکھ دیا ہوگا جس کی وجہ سے نوبت یہاں تک آئی ہے۔ مَیں وہ بات وہ راز جاننا چاہتا تھا اور یہ بات اُس کی بیوی ہی بتا سکتی تھی اِس لئے مَیں اب اُس کی بیوی سے ملنا چاہتا تھا۔ مَیں نے یہ ہی بات عابی سے کہی تو اُس نے کہا۔

''وہ جیل میں ہے--- آپ کو اُس سے ملنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو آپ پوچھنا چاہتے ہیں' وہ مَیں پوچھ چکا ہوں۔''

''یہ تو اچھی بات ہے لیکن مَیں اُس ظالم عورت کی شکل بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔'' مَیں نے کہا۔

''وہ اتنی ظالم بھی نہیں ہے۔ جیکی نے خود اُسے اِس بات پر مجبور کیا تھا--- میرے پاس اُس کے فوٹو ہیں---''

عابد نے مجھے اُس کی تصویر بھی دِکھا دی۔ وہ کوئی تیس برس کی لگتی تھی۔ خوبصورت اور سمارٹ سی نظر آتی تھی' چہرے مہرے سے ایسی ظالم تو نہ لگتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے بعض چہرے بڑے معلوم بنائے ہوتے ہیں' اُن کے کرتوت اُن کے چہروں سے عیاں نہیں ہوتے۔ انگریز اور امریکن عورتوں کے چہرے تو ویسے بھی سپاٹ ہو چکے ہوتے ہیں۔ عابی سے مَیں نے اس سپاٹ سے چہرے والی کے بارے میں پوچھا تو اُس نے کہا کہ ہمارا صرف ملنا جلنا اور ہیلو ہائے نہ تھی بلکہ اچھے تعلقات تھے۔ اِس واقعہ کے بعد بھی ہم اُس سے ملنے گئے تھے۔ وہ پولیس کسٹڈی میں پچھتاوے کی آگ میں جل رہی تھی۔ یہاں کے مشینی دور میں کسی کو کسی سے ملنے کے لیے وقت زبردستی نکالنا پڑتا ہے۔ ہم تو طالب علم تھے' ایڈجسٹ کر لیتے تھے۔ وہ ہم سے مل کر بہت خوش ہوتی۔ ہم کچھ دیر اِس کے ساتھ رہتے۔ دو تین بار مَیں اور نوشی اُس سے ملنے گئے' ایک بار مَیں اکیلا ہی اُس سے ملنے گیا۔ مَیں نے اُس کی تعریفیں کیں۔ اُس کے ساتھ اچھے گزرے ہوئے وقت کو یاد کرتے کرتے مَیں موجودہ وقت تک آ پہنچا اور اُس سے اِس واردات کا پسِ منظر پوچھا۔ وہ ذرا سا گڑبڑائی لیکن پھر سب کچھ بتانے پر آمادہ ہوگئی۔

☆☆

مَیں اور جیکی بہت اچھے دوستوں کی طرح رہتے تھے۔ ہماری شادی کا دِن بہت ہی ناقابلِ فراموش تھا۔ مَیں نے شادی والے دِن خوبصورت سلکی ڈریس پہنا تھا' اُس کے کناروں پر انٹیک لیس کا کام کیا ہوا تھا۔ ہم نے شاندار ہنی مون منایا۔ پھر کچھ عرصے بعد ہم نے فیملی کے آغاز کا پروگرام بنایا جس کے لیے ہمیں مزید رقم کی ضرورت پڑنی تھی لہٰذا مَیں زیادہ شفٹوں میں کام کرنے لگی۔ ہمیں آپس میں ملنے کا وقت کم ملتا تھا لیکن جب بھی اکٹھے ہونے کا موقعہ ملتا' ہم ہنی مون کی طرح وقت گزارتے۔ ہم دونوں روشن مستقبل کے لیے کوشش کر رہے تھے۔ ہم ایک آرام دہ گھر' ایک چھوٹی سی فیملی اور سکیور فیوچر چاہتے تھے۔ ہم ایک شاندار زندگی گزارنا چاہتے تھے۔ ہمارے ہاں پہلا بچہ ہوا جس کا نام مَیں نے مائیکل رکھا۔ پھر ایک ویلنٹائن ڈے پر جیکی نے مجھے ایک خوبصورت کارڈ دیا جس پر لکھا تھا کہ تمہارے بغیر زندہ رہنا کوئی زندگی نہیں ہے--- ہم بہت ہی پیار بھری زندگی گزار رہے تھے۔ مَیں اَب بھی رات کی شفٹ میں کام کرتی تھی۔ جیکی نو سے پانچ والی عام ڈے روٹین میں تھا۔ دِن کو مَیں بچہ سنبھالتی' سارے کام ختم کرتی اور رات کو جیکی بچے کی دیکھ بھال کرتا۔ مَیں رات کو ایک دو بار فون کر کے بچے کے بارے میں پوچھ لیتی تھی۔ پھر اکثر ایسا ہونے لگا کہ جیکی رات کو فون نہ اُٹھاتا۔ اگلے دِن پوچھتی تو کہہ دیتا کہ مَیں جلدی سو گیا تھا۔ وہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا دیتا۔ رات کی شفٹ میں مجھے ایک دو بار ہی فون کرنے کا موقعہ ملتا لیکن ایک رات ہمارے پلانٹ میں خرابی ہوگئی' کئی بار کام روکنا پڑا اور مجھے کئی بار فون کرنے کا موقعہ ملا لیکن گھر سے کوئی فون نہیں اُٹھاتا تھا۔ میرے دِل میں کئی بُرے بُرے خیالات آنے لگے۔ مَیں بچے کی

اچھی باتیں

☆ موت کو ہمیشہ یاد رکھو مگر موت کی آرزو مت کرو۔
☆ ہر مسکراتا ہوا چہرہ اندر سے خوش نہیں ہوتا۔
☆ جو درخت پھل نہ دے سکے' وہ سایہ ضرور دیتا ہے۔
☆ کسی کو اتنا مت چاہو کہ اُس کی جدائی برداشت نہ کر سکو۔
☆ دوست کو نصیحت اکیلے میں کرو اور تعریف محفل میں۔

صفدر عباس ڈھون' نور پور تھل

وجہ سے سخت پریشان تھی۔ مَیں نے اِسی پریشانی میں پولیس کو فون کیا اور اُن سے ریکویسٹ کی کہ میرے گھر کا چکر لگائیں' دیکھیں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہے؟ پولیس والوں نے چکر لگایا' پھر مجھے کال کیا اور بتایا کہ گھر تو خالی پڑا ہے۔ گیراج میں کار بھی نہیں ہے۔ اب تو مَیں زیادہ متفکر ہوگئی۔ مَیں نے سخت پریشانی میں گھر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے شک تھا کہ کچھ ہوگیا ہے۔ میرا بچہ اور جیکی ہسپتال میں ہوں گے اِس لئے مَیں نے چھٹی لے لی اور گھر کی طرف ڈرائیو کرنے لگی۔ مجھے گھر آتے آتے بھی گھنٹہ لگ گیا۔ مَیں جب بیڈروم میں پہنچی تو جیکی بستر میں لیٹا ہوا سو رہا تھا۔ چہرے پر اُس نے چادر ڈال رکھی تھی۔ مجھے شک تھا کہ وہ بہانہ کر رہا ہے اِس لئے مَیں نے اُس کے چہرے سے چادر کھینچ لی۔ اگلے لمحے وہ بوکھلائی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا اور اچانک جاگ جانے کی ایکٹنگ کر رہا تھا۔

''ایسی ایکٹنگ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مَیں جانتی ہوں کہ تم گھر پہ نہیں تھے--- مَیں نے پولیس کو بھیجا تھا' وہ چیک کر کے گئے تھے۔''

''میری بات سن کر وہ بیڈ پر ایزی ہو کر بیٹھ گیا اور آرام سے کہنے لگا۔

''چلو' اچھا ہوا--- مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی ہے کہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بات سامنے آ گئی ہے۔''

''تم اِس سے پہلے بھی گھر نہیں ہوتے تھے' سو جانے کا تو بہانہ ہوتا تھا--- کہاں جاتے ہو تم' کس کے پاس رات گزارتے ہو تم---؟'' مَیں نے غصہ کنٹرول کرتے ہوئے پوچھا۔

''میری ایک کولیگ ہے' اچانک اُس سے ملاقات ہوگئی تھی۔ اِس وقت سے وہ مجھے بلیک میل کر رہی ہے۔ مجھے اپنے پاس رہنے پر مجبور کرتی ہے اور مَیں مجبوراً اُس کے پاس کچھ وقت گزارتا ہوں۔''

یہ سن کر مجھے تو سکتہ سا ہوگیا۔ ایسے لگتا تھا کہ میرے بدن میں خون ہی نہیں ہے یا خون کی گردش ہی رُک گئی ہے۔ چند منٹ بعد مجھے احساس ہوا تو مَیں نے رونا شروع کر دیا' چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ وہ مجھے چپ کرانے لگا اور مجھے کہنے لگا کہ مَیں نہیں جانتا' مَیں اُس سے کیسے جان بچاؤں۔ مَیں اُس کی بلیک میلنگ سے تنگ آ چکا ہوں لیکن میں مجبور ہوں۔''

''اگر ایسا ہے تو میری اِس سے بات کراؤ---''

مَیں نے کہا تو جیکی نے مجبور ہو کر اِس کا نمبر ملایا اور ریسیور مجھے تھما دیا۔

''مَیں جیکسن کی وائف بول رہی ہوں۔ مجھے آج ہی پتہ چلا ہے کہ تمہارا تعلق جیکسن سے ہے۔ مَیں نے بڑی مشکل سے فیملی لائف شروع کی ہے۔ تمہیں ہماری زندگیاں تباہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے' تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ مجھے اُمید ہے کہ تم ایک اچھی عورت ہونے کا ثبوت دو گی اور آئندہ جیکسن سے کوئی رابطہ نہیں رکھو گی۔''

مَیں نے بڑے ہی پیارے طریقے سے اُس سے بات کی اور اُس نے بھی مجھ سے کوئی تکرار نہیں کی۔ مجھے اُمید بندھی کی شاید اب وہ جیکسن کو بلیک میل نہ کرے۔

اب مَیں نے جیکی پر غصہ کرنا شروع کیا۔ اگر جیکی اچھا ہوتا تو مجھے بہت پہلے یہ بات بتا سکتا تھا' بات بڑھنے سے پہلے ہی ختم کی جاسکتی تھی لیکن بے وفائی جیکی کر رہا تھا۔ اِس عورت کے گھر یہ جاتا تھا' وہ تو یہاں نہ آتی تھی اِس لئے اِس ہی بات پر مجھے غصہ تھا۔ مَیں اپنے دِل کی بھڑاس نکال رہی تھی۔

''مجھے ایک چانس دو--- مَیں تم سے بہت زیادہ محبت کرتا ہوں' مَیں تمہیں کھونا نہیں چاہتا۔ ہماری گزشتہ پیار بھری زندگی کی خاطر مجھے گناہوں کی تلافی کرنے کا ایک موقعہ دو' پلیز---!''

جیکی التجا کر رہا تھا۔ مَیں نے بھی سوچا کہ اب ہماری ایک فیملی لائف ہے' اِسے تباہ نہیں ہونا چاہئے بلکہ اِسے مل کر مضبوط بنانا چاہئے۔ غلطی ہر اِنسان سے کبھی نہ کبھی ہو ہی جاتی ہے' یہ ہی سوچ کر مَیں نے جیکی کو معاف کر دیا لیکن وہ پھر بھی راہِ راست پر نہ آسکا۔ تنگ آ کر ایک دِن مَیں نے اُس عورت سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔ پھر ایک شام ہم دونوں اُس کے گھر جانے کو تیار تھے۔ مَیں نے اپنے بیٹے مائیکل کو بھی ساتھ لے لیا۔ مَیں اپنے بچے کی وجہ سے مغرور تھی اور مَیں اُسے یہ ہی دِکھانا چاہتی تھی کہ ہم بچے کی وجہ سے ایک مضبوط رشتے میں بندھے ہوئے ہیں۔ مَیں اُسے دِکھانا چاہتی تھی کہ ہمارے پاس جو کچھ ہے' اُس کے پاس نہیں ہے۔ اُس کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے مَیں نے جیکی سے پوچھا کہ اگر اور کوئی خاص بات ہے تو وہ بھی بتا دو' مَیں پوری تیاری سے اِس عورت کے مقابلے پر آنا چاہتی تھی۔

''--- اور کچھ نہیں' بس اُس کا چھوٹا سا بچہ بھی وہاں ہوگا۔''

''اُس بچے کا باپ کون ہے---؟'' مَیں نے پوچھا۔

''مَیں نہیں جانتا۔'' وہ بولا۔

''کیا وہ تم ہی ہو---؟''

مَیں نے ایک خدشے کے پیشِ نظر پوچھا۔ اِسی وقت اُس عورت نے ہی دروازہ کھولا اور مجھے دیکھ کر ذرا بھی حیران نہ ہوئی جس سے مجھے شک ہوا کہ جیکی نے اُسے سب کچھ بتایا ہوا ہے' جیکی اُس کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ وہ بڑی دلیری سے میرا مقابلہ کر رہی تھی۔ وہ جیکی کے ساتھ چمٹ کر کھڑی ہوگئی حالانکہ یہ میرا حق تھا لیکن مَیں نے غصہ نہ کیا۔ مَیں نے سوچا کہ ہمیں مدہم لہجے میں گفتگو کرنی چاہئے۔ وہ میچورڈ وومن تھی' کوئی سلی گرل نہ تھی۔ وہ سلم' سمارٹ اور پُرکشش تھی۔ جیکی کافی بنانے کے بہانے اُٹھ کر کچن میں چلا گیا۔ یہ میرے لیے بڑا دھچکا تھا۔ وہ ایسے پوز کر رہا تھا جیسے ہم نہیں بلکہ وہ عورت ہمارے گھر آئی ہوئی ہے۔ جیکی ایسے کر رہا تھا جیسے ہر بندہ اپنے گھر میں کرتا ہے۔ یعنی یہ بھی جیکی کا گھر تھا--- وہ جب کچن میں چلا گیا تو مَیں نے بات کا آغاز کیا' پیار سے اُسے سمجھاتی رہی پھر کہا کہ دیکھو' میرا بیٹا مائیکل کتنا خوبصورت ہے۔

''ہاں--- میرا بھی ایک بیٹا ہے۔'' وہ بولی۔

''اُس کا باپ کون ہے---؟'' مَیں نے پوچھا۔

''جیکسن---''

اُس نے صرف اتنا کہا اور مجھے اُس کی بات نے آسمان سے زمین پر لا پھینکا تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ تب وہ ایک فریم کیا ہوا برتھ سرٹیفکیٹ لے آئی' بچے کے باپ کا نام جیکسن ہی لکھا تھا۔ یہ دیکھتے ہی مَیں چکنا چور ہو گئی۔ میرا سارا غرور' میرا سارا مان ختم ہو گیا۔ جیکی نے میری دُنیا اندھیر کر دی تھی۔ اُس نے بغیر شادی کئے ایک بچے کو اپنا بچہ تسلیم کر لیا تھا جبکہ یہ صرف میرے بچوں کا حق تھا۔ مَیں اُس کی بیوی تھی' وہ میرے بچوں کا باپ ہی ہو سکتا تھا۔ مَیں ٹوٹ پھوٹ گئی' بے تحاشا رونے لگی اور روتے روتے باہر نکل آئی۔ پھر کسی انجانی طاقت مجھے دوبارہ اندر لے گئی۔ ایک ہاریبل ریزن کی وجہ سے میں نے بچہ دیکھنے کی خواہش کی۔ اُس عورت نے بیڈروم کا دروازہ کھولا۔ اُس کا چھوٹا سا بچہ سو رہا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی مجھے ایک اور جھٹکا لگا۔ بچے کو دیکھ کر بچے کے باپ کا نام پوچھنے کی ضرورت ہی نہ رہتی تھی' وہ بالکل میرے بچے جیسا تھا۔ اب وہاں ٹھہرنا فضول تھا۔ قصور اُس عورت کا اتنا زیادہ نہیں تھا جتنا جیکی کا تھا۔ مجھ سے بے وفائی جیکسن کرتا رہا تھا--- واپسی پر وہ کہنے لگا۔

''یہ ایک رات کا حادثہ ہے' ایک رات کی غلطی ہے---'' مَیں سن رہی تھی اور جانتی تھی کہ وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ ''مَیں شروع شروع میں اِس کی کال اگنور کر دیتا تھا لیکن جب وہ چار ماہ کی پریگننٹ ہوگئی تو وہ آفس

حالات

1965ء کی پاک بھارت جنگ میں مشرقی پاکستان کے کومیلا محاذ کے اگلے مورچوں پر ایک بوڑھی خاتون تمام خطرات کو نظرانداز کر کے مورچہ بند سپاہیوں کے لئے کھانا لے کر آئی تو اُس نے اپنے دوپٹہ کے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا تھا کہ میرے اپنے بچے بھوکے ہیں مگر میں آپ لوگوں کے لئے کھانا لے کر آئی ہوں کیونکہ آپ کی مائیں یہاں سے ہزاروں میل دُور مغربی پاکستان میں ہیں اور نہ جانے آپ لوگوں نے کب سے کھانا نہیں کھایا ہوگا--- 1971ء کی پاک بھارت جنگ میں حالات نے پلٹا کھایا اور اُس جیسی کئی ماؤں کے بیٹے ہمارے خون کے پیاسے بن گئے۔ ہندو کی مکاریوں نے چاہتوں کی تمام بنیادیں ہلا کر رکھ دی تھیں' درمندوں کے بیٹے کٹ کر رہ گئے تھے کیونکہ نفرتوں کی ہرزہ سرائی نے خون سے خون کو ٹکرا دیا تھا جس کی وجہ سے ہمارا پیارا ملک پاکستان دولخت ہو گیا تھا جس کی کسک اور تڑپ آج بھی حب الوطن لوگوں کے دلوں کو تڑپا رہی ہے۔

دوست محمد خان وٹو' لیہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں آ کر لڑنے لگی تب مَیں مجبور ہو گیا۔ اُسے ہفتے میں ایک دو بار ملنے جانے لگا' اُسے باہر گھمانے لے جانے لگا مَیں اُس کی بلیک میلنگ کی وجہ سے یہ سب کچھ کرتا رہا ہوں---''

جیکسن کے دلائل جھوٹے اور بے بنیاد تھے۔ وہ خود بے وفائی کا مرتکب ہوتا رہا۔ سارا قصور اُس کا تھا لیکن پھر بھی مَیں خاموشی سے شادی کو کامیاب بنانے کے جتن کرنے لگی۔ اِسی دوران ہماری شادی کی سالگرہ آ گئی۔ ہم نے ایک اچھے ہوٹل میں سالگرہ منائی لیکن انجام ہماری لڑائی تھا۔ گھر میں ہم اجنبیوں کی طرح ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ایک دوسرے کو گھور رہے تھے۔ یہ ہماری زندگی کا ٹرننگ پوائنٹ تھا۔ مَیں پھر بھی دَر گزر کر گئی' کچھ عرصہ مَیں نے پھر بھی برداشت کیا۔

ایک دِن چائلڈ سپورٹ ایجنسی کی طرف سے ہمیں نوٹس مل گیا۔ یہ جیکسن کی غیر قانونی بیوی کی طرف سے تھا۔ نوٹس میں لکھا تا کہ ہم جیکسن کی دوسری فیملی ہیں اور جیکسن کو ہمارا پورا خرچہ برداشت کرنا ہوگا---اب ہمیں اپنی جائنیٹ اِنکم کا پچاس فیصد اِس عورت کو دینا پڑے گا' اس بات نے میرا دِل چکنا چور کر دیا۔ جیکی اگر اچھا ہوتا تو نوبت یہاں تک کبھی نہ آتی۔ اُس کی بے وفائی نے مجھ میں غصہ بھر دیا اور مَیں جیکی پر چڑھ دوڑی۔ وہ کہنے لگا کہ مجھے بہت افسوس ہے لیکن مَیں اُن کا حق نہیں مار سکتا' یہ قانون ہے--- وہ قانون تھا تو میرے بچے کے لئے قانون نہیں تھا؟ وہ غیر قانونی بچے کو قانونی تحفظ فراہم کر رہا تھا۔ مَیں تو اِس کی لیگل وائف تھی۔ مَیں اپنی جان مار مار کر کماتی اور اپنی آدھی کمائی اُس حرامی بچے کو دے دیتی' یہ مجھ سے تو نہیں ہو سکتا تھا۔ میری محنت کی کمائی کا حقدار صرف میرا بچہ ہے۔ جیکسن جانے اور اِس کا حرام بچہ مَیں اِس بچے پر اٹھارہ سال تک اپنی محنت کی کمائی خرچ نہ کر سکتی تھی اور پھر کون جانے' کب وہ بچہ ہمارے دروازے پر آ جائے۔ مجھے یہ چیز سب سے زیادہ مشکل نظر آتی تھی۔ مَیں اپنے بچوں کو کیسے بتاؤں گی کہ یہ تمہارا آدھا بھائی ہے مَیں اُس عورت کو معاف نہیں کر سکتی تھی جس نے میری دُنیا اندھیر کر دی تھی مَیں جیکسن کو معاف نہیں کر سکتی تھی جس کی بے وفائی کی وجہ سے بات یہاں تک آ گئی تھی۔ مَیں شائد اپنی آدھی کمائی بھی اُس عورت کو دینے پر راضی ہو جاتی اگر جیکسن میرے پاس رہتا' میرا وفادار بن کر رہتا لیکن وہ مجھ سے زیادہ اُس کے پاس خوش تھا۔ وہ مجھ سے زیادہ اُس کے پاس سوتا تھا۔ اُسے میرے پیسے سے اور اُس عورت کے بدن سے غرض تھی۔ اُس عورت کے بدن کو تو جلانا میرے لیے مشکل تھا لیکن جیکی کے ساتھ مَیں سب کچھ کر سکتی تھی۔ تنگ آ کر ایک دِن مَیں نے پکا فیصلہ کر لیا' جیکی کو بے وفائی کی سزا دینے کا پکا فیصلہ--- پھر مَیں نے اپنے فیصلے پر عمل بھی کر لیا۔ اب وہ کسی قابل ہی نہیں رہا۔ اب وہ عورت بھی اُسے منہ نہیں لگائے گی۔ یہ خود کسی کو منہ دِکھانے کے قابل نہیں رہا۔ مَیں نے اُس عورت کو سمجھایا تھا' جیکی کو سمجھایا تھا وہ نہیں سمجھے تو مَیں نے ایسا کیا ہے۔ مجھے اپنی سزا کی فکر نہیں ہے۔ اِس کے بدلے مَیں نے جیکسن کو وہ سزا دی ہے کہ وہ زندگی کی آخری سانس تک یاد رکھے گا۔ وہ عورت کو دیکھ سکے گا' چھو سکے گا اور پھر اپنے ہی آنسوؤں کی برسات میں ڈوب جائے گا۔ ایک دِن وہ خودکشی کرے گا' ایک دِن وہ سسک سسک کر مرے گا۔

☆☆

وینڈی کی بات اب سچ ثابت ہو چکی ہے' جیکی نے آج خودکشی کر لی ہے۔

☆☆

مرحلے وفا کے

☆ ڈاکٹر نسیم جاوید سید

راہ کوئی بھی ہو، انسان پہلا قدم اٹھاتے ہوئے جھجکتا ہے، سوسوسے اور اندیشے اسے ہچکچاہٹ میں مبتلا کرتے ہیں۔ ان مرحلوں سے گزر کر اگر کوئی قطعی فیصلہ کر لے اور انجام سے بے پرواہ ہو کر اس راہ پر چل پڑے تو پھر آہستہ آہستہ ہر جھجک اور ہچکچاہٹ ختم ہو جاتی ہے۔ پھر کوئی عمل کیسا ہی مکروہ اور گھناونا ہو، وہ اس کے لئے معمول بن جاتا ہے اور شاید اب ایسی صورتحال سے توصیف دوچار ہے۔ اس کے سن کی سچائیاں اپنی جگہ لیکن وہ آگے سے آگے بڑھتا جا رہا ہے۔ انجام کی اسے بھی خبر نہیں۔ وفا کے مرحلے بھی اس نے ابھی طے کرنے ہیں لیکن کوئی نہ کوئی موڑ اسے پھر معاشرتی بدصورتیاں ختم کرنے کی خاطر بھٹکا دیتا ہے۔ توصیف کی زندگی کے حالات پر مشتمل ایک طویل حقیقت کی 111ویں کڑی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قسط نمبر 110 کا خلاصہ

شہزادی ایک دم سے مجھ سے لپٹ کر رونے لگی تھی۔ کبھی وہ میرا منہ چومتی اور کبھی میرے سینے سے سر رگڑتی۔ میرا سیالکوٹ سے رخصت ہونا اس سے گوارہ نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے علیحدہ کیا۔ وہ میرے ساتھ واپس جانا چاہتی تھی۔ آخر سمجھا بجھا کر میں نے اسے راضی کیا۔ نجمہ سیٹھی مجھے ویگن میں سوار کروا کے لوٹ گئی اور میں لاہور پہنچ گیا۔ اگلی شام ہم مسلح ہو کر اور ضروری سامان بیگ میں رکھ کر مرید کے پہنچ گئے۔ دادن کو میں میں نے چوہدری کا نام دیا اور خود حیدر آباد سندھ سے پھلوں کا بیوپاری ربانی بن کر ہم رات گیارہ بجے عشرت بیگم کے کوٹھے پر پہنچ گئے۔ قربان علی پانچ سو کا نوٹ لے کر خوشامد پر اتر آیا اور ہمیں ڈرائینگ روم میں بٹھا کر چائے پانی میں مصروف ہو گیا۔ عشرت بیگم نے مجھے ملکو کے بھتیجے کے طور پر پہچان لیا تھا مگر میں مکر گیا۔ پھر میں لیلیٰ کے ساتھ اوپر اس کے کمرے میں چلا گیا اور دادن رابی کے ساتھ--- میں نے لیلیٰ کو اعتماد میں لیا کہ ہم اسے اور اس کی مظلوم ساتھی لڑکیوں کو اس ظلمت کدے سے نکالنے آئے ہیں۔ میرے کہنے پر وہ دادن اور رابی کو بھی بلا لائی۔ ہم ابھی رابی کو یہاں سے نکلنے کے سلسلے میں سمجھا ہی رہے تھے کہ دروازے پر زور سے دستک ہوئی۔ وہ قربان علی تھا جو لیلیٰ کو گالی دے کر کہہ رہا تھا کہ وہ دروازہ کھولے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ ہم چوہے دان میں پھنس گئے ہیں۔

اب آپ آگے کے واقعات ملاحظہ فرمائیں۔

وہ کمرہ اتنا چھوٹا تھا کہ دادن اور لیلیٰ کو چھپایا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ ڈبل بیڈ، ایک چھوٹی ٹیبل، پلاسٹک کی دو کرسیوں اور ایک چھوٹے فریج کے بعد اگر کوئی جگہ بچتی تھی تو اس میں صرف گزرا جا سکتا تھا، چھپنا ممکن تھا۔

"ایک منٹ ٹھہرو، میں کھولتا ہوں---"

اس بار میں نے باآوازِ بلند کہا۔ دادن اس دوران ریوالور نکال چکا تھا جسے وہ دونوں لڑکیاں سہمی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ میں نے دادن کو اشارہ کیا کہ وہ ریوالور نیفے میں اُڑس لے، خود میں نے اپنا ریوالور بھی پینٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ کھونٹی پر ٹنگا کوٹ پہنا، پھر آمنہ کو لحاف میں لیٹنے کا اشارہ کر کے دروازے کی طرف بڑھا۔ رابی اور دادن کو میں نے کرسیوں پر بیٹھے رہنے کا کہہ دیا تھا--- چٹخنی کھلتے ہی وہ کسی اڑنے بھینسے کی مانند دروازے کو دھکیلتے ہوئے اندر گھس آیا۔ اس سے بھی زیادہ چونکا دینے والی چیز اس کے ہاتھ میں دبا ہوا پستول تھا جس کا سنٹی کیچ ہٹا ہوا تھا اور جس کے ٹرائیگر پر اُس کی انگلی تھی۔ دادن اور رابی کو دیکھ کر وہ چونکا، پھر تیزی سے میری طرف گھوم کر بولا۔

"اپنے ہاتھ اوپر اٹھالو، جلدی---تم بھی---"

اس نے پستول کی نال سے دادن کی طرف اشارہ کیا۔ اُس کے تاثرات دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ کمزور عورتوں پر اپنی بہادری اور بربریت کا سکہ جمانے والا یہ دلال اندر سے اتنا کمزور تھا کہ بے اختیار میرا جی چاہا کہ اُس کے ہاتھ سے پستول چھینوں اور یہیں الٹا لٹا کر اس کی تشریف پر اتنے جوتے ماروں کہ زندگی میں کسی پر پستول تاننا تو درکنار، وہ پستول ہاتھ میں لینے سے بھی خوف کھائے لیکن میں ابھی وہ پس منظر جاننا چاہ رہا تھا جس نے اُسے اپنے کوٹھے پر آئے ہوئے ایک "لکھ پتی" گاہک کے کمرے میں گھس کر، اس پر اسلحہ تاننے پر مجبور کیا تھا--- میں نے ہاتھ اٹھائے تو دادن نے بھی اُٹھا دیئے۔

"تو تم بھی ادھر ہی ہو؟---ٹھیک، بالکل ٹھیک---" اُس نے پنجابی میں فلمی ولن کے انداز میں مکالمہ ادا کیا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے---تمہارے کوٹھے پر آئے ہوئے گاہکوں سے یہی سلوک ہوتا ہے، کہاں ہے عشرت

بیگم، بُلاؤ اُسے--- میں ابھی اور اسی وقت یہاں سے جانا چاہتا ہوں---"

"اوئے، زیادہ ٹرٹر نہ کر، اوئے--- جانا چاہتا ہوں---" اس نے میری نقل اتاری۔ "تجھے جانے دوں گا تو جائے گا، نا!"

"کیا چاہتے ہو، صاف بات کرو۔ روپیہ پیسہ میرے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا، اصل قیمت جان کی ہوتی ہے۔ اگر پیسے کا مسئلہ ہے تو کھل کے بات کرو--- تمہیں پتہ نہیں کہ میرے تعلقات کہاں تک ہیں، پولیس تمہیں چھوڑے گی نہیں۔"

"ہا، ہا، ہا--- پولیس والوں کو ہم---" اس نے گالی دی۔ "وہ تیری ماں کے یار آئیں گے، نا! تو تجھے ہی اندر کر دیں گے لیلیٰ کو اغوا کرنے کے جُرم میں۔ تیرے جیسے موٹے شکار تو وہ خود بھی ڈھونڈتے پھرتے ہیں--- اور تو ابھی تک کمبل میں بیٹھی کیا اپنی ماں---" یہ گالی اس نے لیلیٰ کو دی تھی۔ "چل باہر نکل، حرامزادی---!"

لیلیٰ نے لحاف اُتار کر پھینکا اور بیڈ سے نیچے اُترنے لگی۔ مجھے اس کے لفظوں نے پریشان کر دیا تھا۔ اُسے کیسے اندازہ ہوا تھا کہ میں آمنہ عرف لیلیٰ کو اغوا کرنے یا ساتھ لے جانے آیا تھا۔ کیا ان لوگوں نے کوئی خفیہ کیمرہ، مائیک وغیرہ لگا رکھا تھا جس کی مانیٹرنگ عشرت بیگم اپنے کمرے میں کرتی تھی یا اُس نے مجھے چوہدری مجید کے کارندے یا ملکو کے بھتیجے کے طور پر پہچان لیا تھا؟--- میں نے خود سے سوال کیا۔ اگر ایسا تھا تو یقیناً اس نے چوہدری مجید کو یا تھانے میں ٹیلی فون کر دیا ہو گا۔ گناہ کی کوئی دوکان پولیس کی شراکت کے بغیر نہیں کھلتی۔ اگر ایسا تھا تو ہمارے لئے خطرات بڑھ گئے تھے۔ اُس دلال قربان علی پر قابو پانا مشکل نہیں تھا، اسے تو ٹھیک طرح سے پستول پکڑنا بھی نہیں آ رہا تھا۔ خطرے کی بات اُس کی کپکپاہٹ اور لرزتی ہوئی آواز تھی۔ وہ اندر سے بہت نروس تھا اور ایک نروس آدمی کے ہاتھ میں بھرا ہوا پستول کسی وجہ کے بغیر بھی چل سکتا ہے اور کسی کی بھی جان لے سکتا ہے۔

"کیا چاہتے ہو تم---؟" میں نے دوبارہ سوال کیا۔

"سب پتہ چل جائے گا---"

اس نے کہا۔ اس کی نظر ایک لمحے کے لئے اُس بیگ پر پڑی جو میں اپنے ہمراہ لایا تھا۔ لیلیٰ بیڈ سے نیچے اتر چکی تھی اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"یہ بیگ اُٹھا اور باہر نکل---" اس نے حکم دیا۔ "---اور تو بھی اُٹھ یہاں سے---" وہ رابی سے مخاطب ہوا۔

ایک دم سے مجھے سارا کھیل سمجھ میں آ گیا تھا۔ یہ کسی خفیہ کیمرے یا مائیک کا معاملہ نہیں تھا۔ صاحب اور صاحبہ کی رال وہ بیگ دیکھ کر ٹپک گئی تھی۔ حیدر آباد سے آیا ہوا "پھلوں کا یہ بیوپاری" جو ابھی کنوارا اور نوجوان تھا، عیاشی کرتے مرید کے کے ایک پرائیویٹ کوٹھے پر آ تو گیا تھا لیکن یوں کھلے اور دونوں ہاتھوں سے پیسے لُٹا کر وہ اپنے اناڑی پن کا ثبوت دے رہا تھا۔ عشرت بیگم اور قربان علی کو یقین تھا کہ اس بیوپاری کو لُوٹ لیا جائے تو وہ جان بچا کے نکل جانے کو بھی غنیمت سمجھے گا۔ بہت سے بہت وہ پولیس اسٹیشن جا کے روئے گا، گائے گا جہاں ان کے تعلق دار اے ایس آئی، ہیڈ کانسٹیبل اور دیگر وردی پوش اُلٹا اسے ہی کسی کیس میں دھر لیں گے۔ کاروباری آدمی اپنی بدنامی اور حیدر آباد سے اتنی دُوری پر ایک چھوٹے سے شہر میں اپنا تماشا بنوانا یا وقت ضائع کرنے کو افورڈ نہیں کر سکتا، یوں پیسہ گنوا کر میں اپنے دوست کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہمراہ جلد از یہاں سے نکل جانے کو ہی غنیمت سمجھوں گا۔ مجھے یقین تھا کہ اُن کا پلان یہی تھا۔ قربان علی نے زندگی بھر دلالی کی تھی اور شاید اس سے پہلے بھی پستول ہاتھ میں لے کر کسی مجھ جیسے نئے نئے شوقین اور اناڑی پنچھی کو ڈرا دھمکا کر وہ کوٹھے پر آنے والے کو لُوٹ کر خالی ہاتھ جانے پر مجبور کر دیا کرتا ہوگا--- مجھے پنجابی کی ایک مثال یاد آئی کہ آدمی کو زمین کے ہر سوراخ میں اُنگلی نہیں ڈالنی چاہئے، کبھی کبھی سوراخ میں بچھو بھی ہوتا ہے۔ قربان علی نے ایک ایسے ہی سوراخ میں اُنگلی ڈالنے کی غلطی کی تھی جہاں سے لگنے والا ڈنگ اُسے پانی مانگنے کے قابل بھی نہ چھوڑتا۔

لیلیٰ نے جھک کر بیگ اُٹھایا، رابی کانپتے ہوئے کرسی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر اگلے ہی لمحے جو کچھ ہوا، وہ قربان علی کے لئے ہی نہیں، میرے اور دادن کے لئے بھی حیران کن تھا--- شاید اُسے یقین آچلا تھا کہ قربان علی کے ہاتھ میں تھامے ہوئے پستول کے آگے صرف وہی زندگی کی آخری بازی نہیں ہار چلی، خرم اور اس کے دوست بھی ہارنے کو ہیں۔ اگرچہ ہمارے بارے میں اس کا اندازہ غلط تھا، نہ میں اتنا اناڑی تھا کہ اُسے شرافت سے کمرے سے نکلنے دیتا اور نہ ہی دادن نے کچی گولیاں کھیلی ہوئی تھیں۔ وہ میرے اشارے کے بغیر بھی ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں لوڈ ریوالور اور نکالتا اور قربان علی کے سوچنے سے پہلے ہی اُسے گولی مار دیتا لیکن لیلیٰ ہم دونوں سے بازی لے گئی تھی۔ بیگ ہلکا بھی نہیں تھا کہ وہ یہ سمجھتی کہ اس میں کرنسی نوٹوں کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ وہ بھانپ گئی تھی کہ بیگ میں کوئی وزنی چیز ہے جو کم از کم نوٹ نہیں ہو سکتے۔ اُس نے بیگ اُٹھایا اور یہ خیال کرتے ہوئے کہ قربان علی کی نظریں مجھ پر اور دادن پر ہیں، پوری قوت سے وہ بیگ اُس کے مُنہ پر دے مارا۔ قربان علی اس اچانک افتاد سے بچنے کے لئے غیر ارادی طور پر تیزی سے پیچھے کو ہٹا اور بیڈ سے ٹکرا کر اُلٹ کر شنیل کی رضائی پر جا گرا۔ اس نے سنبھل کر اُٹھنے کی کوشش تھی لیکن ہم دونوں کو وہ مہلت مل گئی تھی جس کا ہمیں انتظار تھا۔ دادن اور میں بیک وقت اُڑتے ہوئے اس پر جا گرے تھے۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ قربان علی کے پستول والے ہاتھ پر ہاتھ ڈال دیئے تھے۔ قربان علی کسی دیو کی طرح طاقت ور تھا۔ اُس کی کوشش تھی کہ کسی طرح پستول کو سیدھا کر کے فائر کر دے لیکن میرا ایک گھونسا کھا کر اُس کے کس بل نکل گئے تھے۔ دادن نے اُس کی کلائی اتنی طاقت سے مروڑی کہ وہ پستول نہ چھوڑتا تو اپنی کلائی کی ہڈی تڑوا بیٹھتا۔ پستول دادن کے ہاتھ میں آتے ہی اُس کے غبارے سے ہوا نکل گئی تھی۔ میں نے اپنا ریوالور نکال کر اس کی نال کا رخ اس کی طرف کر دیا۔

''ہاتھ اُٹھالو، اب ہماری باری ہے---''

معرفت ماہنامہ آداب عرض

31-F شمع پلازہ فیروز پور روڈ لاہور

خالد بھائی اور محترم قارئین!

اللہ آپ سب کو اپنی پناہ میں رکھے، آمین!

آپ کے آپریشن کا علم ہوا، خالد بھائی! دعا ہے کہ آپ جلد از جلد صحت یاب ہو جائیں تا کہ آداب عرض کی بروقت تدوین کر سکیں۔ اپنا خیال رکھا کیجئے۔ آپ سے زیادہ ہم سب کو آپ کی ضرورت ہے--- رخشندہ نیلوفر! ہمیں تو یاد بھی نہیں تھا، آپ کا 23 ستمبر کو یپی برتھ ڈے کا میسج ملا۔ بے حد شکریہ۔ آپ کی صحت اور خوشحالی کے لئے ہماری طرف سے ڈھیروں دعائیں--- ''ایک تھی میجر نائلہ'' کے لئے ابھی تک قارئین کے پیغامات موصول ہو رہے ہیں۔ کافی لوگوں نے تو اسے اپنی ہی فیملی کی کہانی بتائی ہے۔ سیالکوٹ کے اختر سیٹھی، کراچی کے الطاف محمود اور ملتان کی ماریہ ملک! آپ سب کا بہت شکریہ۔ آپ کے دکھ ہمارے لئے اجنبی نہیں ہیں۔ کہانی لکھنے کا مقصد بھی یہی تھا کہ وہ خواتین جو کمائی کے زعم میں شوہر اور سسرال کو حقیر سمجھ کر تنہا پرواز کی طرف نکل جاتی ہیں، کبھی نہ کبھی انہیں تھک کر گرنا پڑتا ہے۔ شوہر کی ضرورت نہ ہوتی تو مذہب شادی پر زور نہ دیتا۔ ایسی پرواز بچوں کے حق میں تباہ کن ہوتی ہے۔ محرومی ماں سے ہو یا باپ سے، دونوں صورتوں میں اولاد کے دل میں کسی ایک فریق سے نفرت انہیں ذہنی طور پر غیر متوازن کر دیتی ہے اور اس کا انجام انتہا پسندی یا تشدد اور خود اذیتی ہوتا ہے اور اگلی نسل تک منتقل ہو جاتا ہے۔ لڑکے جب ماں سے علیحدگی کے بعد نفرت لیکر جوان ہوتے ہیں تو اپنی بیویوں پر اعتماد نہیں کرتے۔ انہیں اپنی ماں کے خلاف ایسی گھٹیاں دی جاتی ہیں کہ عمر بھر ہر عورت انہیں مشکوک اور بدکردار نظر آتی ہے۔ وہم اور شک خود انہیں اپنی بیوی پر اعتماد نہیں کرنے دیتے، یوں زندگی بھر گھر میں تلخیاں بھری رہتی ہیں۔ اکثر اوقات طلاق تک نوبت پہنچ جاتی ہے اور پھر ان کے بچوں کی حالت بھی قابل رحم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح لڑکیاں جو ماں باپ کی علیحدگی کے بعد ماں کے ساتھ رہ جاتی ہیں تو باپ نفرت کا سمبل بن کر انہیں ہر مرد سے نفرت کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ شادی محبت کی ہو یا ارینجڈ، دونوں صورتوں میں لڑکی شوہر سے زیادہ دن سمجھوتہ نہیں کر پاتی، خاص طور پر اگر وہ خود کماتی ہو۔ اسے شوہر کی معمولی سی بات بھی برداشت نہیں ہوتی کیونکہ باپ کی صورت میں اسے مرد یا شوہر کی ذات کے دنیا کی بدترین ہستی ہونے کا سبق دیا جا چکا ہوتا ہے۔ نتیجہ علیحدگی یا طلاق کی صورت ہوا کرتا ہے--- لائبہ! تم غلط کر رہی ہو۔ اب بھی وقت ہے، ایسے فیصلے بالآخر تمہارے لئے عذاب بن جائیں گے۔ یاد رکھنا، ماں باپ ایک دن چلے جاتے ہیں۔ پھر بھائی اور بھابیاں کتے سے بھی بدتر سلوک کرنے پر آجاتے ہیں۔ شوہر ایک تحفظ کے احساس کا نام ہے، اگر تم محسوس کرو ورنہ جوتے کی نوک پر لکھنا بہت آسان ہے۔ علیحدگی کے بعد وقت کے جوتے کی نوک مرتے دم تک زخم دیتی ہے۔ ہم صرف مشورہ دے سکتے ہیں، اللہ آپ کو بہتر سمجھنے کی توفیق دے--- اقبال عامر! بھائی، آپ سے کیا کہیں۔ ایسے کردار تو آپ خود ہم سے ملوا چکے ہیں--- شاہد مشتاق! آپ نے بالآخر ہماری تحریر میں گیارہ سال بعد ایک تکنیکی غلطی پکڑ ہی لی۔ ہمیں اچھا لگا اور ہم اس کے لئے کوئی وضاحت اور توجیہہ پیش نہیں کریں گے، اعتراف کر رہے ہیں--- بھائی عاشق حسین ساجد لعوذرا ذرا سی بات پر یوں ناراض نہیں ہوا جاتا۔ دل بزار کھتے ہیں۔ اللہ آپ کو صحت دے--- ڈاکٹر طلعت! کچھ روز پہلے دنیا پور سے گزر ہوا تو آپ بہت یاد آئے۔ سوچا، آپ مصروف ہوں گے ورنہ ملنے کو بہت جی چاہ رہا تھا--- محمد احمد نعیم، عبد الغفار عابد، افشاں ریاض! آپ سب کے یاد رکھنے کا بہت شکریہ--- اعجاز حسین غفار! عمرہ کی ادائیگی مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے، آمین!--- پشاور کے بھائی اقبال جاوید! یہ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی تکلیف ختم کی۔ بہت تکلیف برداشت کی ہے آپ نے۔ دعا ہے کہ آپ جلد از جلد نارمل اور اپنے قدموں پر چلنے کے قابل ہو سکیں، آمین!--- سید وہاب، نعیم اختر آزاد اور ملک عاشق حسین ساجد! آپ کے تبصروں کا آئندہ بھی انتظار رہے گا--- ملک فرمان، کوٹلی کے ایم فاروق، کوہر، لیہ کے صغیر، عطاء الرحمٰن ذہنک، ارم اٹک اور ان سب قارئین کا شکریہ جو یہ ایس ایم ایس سے یاد رکھتے ہیں۔ قارئین! ایس ایم ایس کے ساتھ اپنا نام ضرور لکھا کریں ورنہ ہم جواب نہیں دے سکتے--- گمنام! ہم کسی سے نفرت نہیں کر سکتے۔ ان سے بھی نہیں جنہوں نے ہم سے نفرت کی یا ہماری محبت کو ٹھکرا دیا۔ نفرت کرنا ہماری فطرت میں ہی نہیں۔ پتہ نہیں، آپ کون ہیں اور آپ کو یہ وہم کیوں ہے کہ ہم آپ سے نفرت کرتے ہیں۔ ایس ایم ایس کریں تو اپنا نام بھی ظاہر کر دیا کریں--- قارئین! آپ کا رابطہ سر آنکھوں پر مگر از راہ کرم نہیں شعر و شاعری، غیر مصدقہ احادیث اور ایسے میسج نہ کیا کریں جس کی دس یا سو کاپیاں آگے بھیجنے پر ہمیں بہت بڑے فائدے یا نقصان کی خبر دی گئی ہو۔ نہ ہم ایسے پیغامات پر یقین رکھتے ہیں اور نہ ہی اس کی کوئی شرعی حیثیت ہے۔ ہم صرف اللہ کی وحدانیت پر ایمان رکھتے ہیں اور اس پر کہ اچھی اور بری تقدیر کا مالک وہی وحدہ لاشریک ہے۔ ایس ایم ایس کرنے سے کسی مہینے کی مبارکباد دینے سے جنت ملنے لگے تو گناہ و ثواب، اجر و عذاب کا نعوذ باللہ تصور ہی نہ رہے۔ از راہ کرم ایسے گناہ آلود میسج کرنے سے گریز کریں۔ اللہ ہم سب کی اصلاح فرمائے، آمین!

قارئین! ہمارے لئے مغفرت کی دعا کرتے رہئے گا۔

آپ سب کا ☆ ڈاکٹر نسیم جاوید سید

0300-5342497 (صرف sms کے لئے)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے ریوالور کی نال کو لہرایا۔ اُس نے بیڈ پر سیدھا بیٹھتے ہوئے بازو اوپر اٹھا لئے۔ ہمارے پاس ریوالور دیکھ کر اس کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں۔

''تجھے--- تجھے تو میں نہیں چھوڑوں گا، چھنال کی اولاد---!'' وہ لیلیٰ سے گویا ہوا۔

''اس کے منہ پر تھپڑ مارو، لیلیٰ! پوری طاقت سے اور دوبارہ گالی دے تو جوتا مارنا--- مارو---''

لیلیٰ نے پوراز ور لگا کر قربان علی کے بائیں گال پر طمانچہ مارا۔ کمرے کی محدود فضا میں ''چٹاخ'' کی آواز گونجی اور قربان علی کی آنکھیں حیرت اور بے بسی کے احساس سے کھلی رہ گئیں۔ میں نے دادن سے کہا۔

''چوہدری! یہ مرکھنا عورتوں کی کمائی کھا کھا کر پلا ہے، ذرا اس کے گلے میں رسی ڈالو۔''

دادن نے بیگ کی زپ کھولی اور نائیلون کی مضبوط رسی باہر نکالی۔

''بیٹھ جاؤ تم، ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کا واسطہ آج تک کمزور اور مظلوم عورتوں سے پڑا ہے، رابی! اسے ہم لُو لا لنگڑا کر کے جائیں گے تاکہ باقی زندگی یہ کسی نانگہ کے قدموں میں نہیں بلکہ مرید کے کی سڑکوں پر بھیک مانگ کے گزارے---''

دادن نے جلدی جلدی رسی کا کُچھا کھولا۔ قربان علی کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ اس مصیبت سے جان چھڑانے کی کوئی ترکیب سوچ رہا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ اس چھوٹے سے کمرے سے باہر نکلنے کا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ سامنے کی دیوار میں ایک کھڑکی ضرور تھی لیکن اس وقت سردی کی وجہ سے اُس کے پٹ بند تھے اور آگے پردہ پڑا ہوا تھا اور اگر کھلے بھی ہوتے تو لوہے کی مضبوط کھڑی سلاخوں کے درمیان سے شاید بلی ہی گزر سکتی تھی، انسان نہیں--- اُس رابی اور لیلیٰ کو باہر نکلنے کو کہا تھا، ہمیں نہیں جس کا مطلب تھا کہ وہ ہم دونوں کو اس کمرے نما چوہے دان میں پھنسا کر نکلنا چاہتا تھا تاکہ بعد میں اپنی مرضی سے سودے بازی کر کے ہمیں نکال سکے۔ ڈرائینگ روم یا گھر کے کسی اور حصے میں اُس کے لئے ایسا ممکن نہیں تھا اور اب وہ خود اسی چوہے دان میں پھنس گیا تھا۔ لیلیٰ جیسی دھان پان اور نازک سی لڑکی نے ہماری کسی پیش قدمی سے پہلے ہی وہ کام کر ڈالا تھا جس کا اُس بے غیرت دلال نے کبھی تصور بھی نہیں کیا ہوگا--- دادن نے اپنا ریوالور دوبارہ نیفے میں اڑس لیا تھا۔

''چل اُلٹا لیٹ جا، ٹیم نہیں ہے میرے پاس---''

اُس نے قربان علی کو بالوں سے پکڑا اور گھسیٹ کر اُلٹا کر دیا۔

''تم--- تم لوگ کون ہو؟--- دیکھو--- دیکھو، مجھے مت باندھو--- غلطی ہوگئی مجھ سے۔ تم--- تم---''

اُس نے کمزوری مزاحمت کرتے ہوئے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔ دادن اُس کی کلائی سے رسی باندھنے لگا تھا۔

''شرافت سے بندھوا لو خود کو، تم جانتے نہیں ہو چوہدری کو۔ پکا قصائی ہے۔ تم تو انسان ہو، یہ تو بیل اور بھینسے کی گردن مروڑ کے ایک سیکنڈ میں گرا دیتا ہے۔ ادھر ڈیرہ کوٹ میں بڑی عید پر اسے خاص طور پر بلوایا جاتا ہے، اتنی صفائی سے دستی اور پائے الگ کرتا ہے کہ خون کا ایک قطرہ بھی نہیں نکلنے دیتا---''

''تم کیا کرنا چاہتے ہو میرے ساتھ---؟'' اُس نے مزاحمت کرنا چھوڑ دی۔

''وہی جو تم ہمارے ساتھ کرنا چاہتے تھے--- یہ اب تم بتاؤ گے کہ کیا کرنے آئے تھے اس وقت اس

کمرے میں---؟''

''کچھ نہیں، عشرت بیگم نے بلایا تھا لیلیٰ کو---''

''ہا، ہا، ہا---'' میں دھیمی آواز میں ہنسا۔ ''چوہدری! یہ بھڑوا لطیفے بھی سناتا ہے، اسے تو انعام ملنا چاہئے اس بھانڈ گیری پر--- کیا خیال ہے؟''

''آپ جو حکم کرو، ربانی صاحب! اس کے کان کاٹ دیتا ہوں---''

دادن اُس کے بندھے ہوئے ہاتھوں پر رسی کی گرہ کستے ہوئے بولا۔ قربان علی اوندھا لیٹا ہوا تھا۔ اُس نے اپنی گردن موڑ کر چہرہ میری طرف کر لیا تھا تاکہ کوئی سودے بازی کر سکے۔

''نہیں---'' وہ کراہا۔ ''تم ایسا نہیں کر سکتے۔''

''کیوں--- کیوں نہیں کر سکتے، کیا کمزور لڑکیوں پر ظلم کرنے کا ٹھیکہ صرف تمہارے پاس ہے--- بہت طاقت ہے نا! تمہارے پاس، زندہ لڑکی کی ٹانگیں چیر کر مار سکتے ہو، نا! آج تمہاری ٹانگیں چیر کے دیکھیں گے کہ جب پیٹ سے آنتیں باہر نکل آئیں تو بندے کو تکلیف بھی ہوتی ہے یا وہ بے ہوش ہو کے مر جاتا ہے---''

''تم اُس لڑکی---''

وہ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔ شاید اُسے اندازہ ہو گیا تھا کہ جس راجپوت لڑکی نے کوٹھے پر بیٹھنے اور حالات کے آگے سر جُھکانے کی بجائے موت کو گلے لگایا تھا، اس کی ٹانگیں چیر کر قتل کرنے کا واقعہ ہمارے علم میں تھا۔

''تم ٹھیک سمجھے ہو۔ ہمارا تعلق اسی لڑکی سے ہے---''

''کون ہو تم---؟'' وہ سراسیمگی سے بولا۔

''بتایا ہے، نا! کہ یہ چوہدری، قصائی ہے۔ ڈیکوٹ میں اس کی دوکان ہے، بڑے گوشت کی اور میں سائنس دان ہوں--- سائنس دان سمجھتے ہو، نا! وہ جو تجربے کرتے ہیں۔ میں نے وہی تجربہ کرنا ہے جو تم نے اُس لڑکی کے ساتھ کیا تھا۔ تمہاری ٹانگیں اگر زور لگانے سے نہ چریں تو یہ چوہدری چھری سے---''

اُس کے اوسان خطا ہو رہے تھے۔ ٹانگیں بندھوانے میں لیلیٰ نے دادن کی پوری پوری مدد کی تھی۔ چند لمحوں بعد وہ ایک لحیم شحیم کینچوے کی طرح بیڈ پر الٹا پڑا ہوا تھا۔

''ہاں، تو اب بول دو فٹافٹ، کیا کرنا چاہتے تھے ہمارے ساتھ--- یہ پستول لا کر قتل کرنا چاہتے تھے؟''

میں نے سوال کیا۔ اُس کے بازو اور ٹانگیں اُس کی پشت پر بندھی ہوئی تھیں اور چہرے پر تکلیف کے آثار نمایاں تھے۔

''نہیں، خدا رسول کی قسم! میں تو تمہیں ڈرانا چاہتا تھا---''

''رابی! اِس کے منہ پر تھوکو، یہ گناہ کے گھٹیا کاموں میں خدا اور رسول کو گواہ بنانا چاہ رہا ہے---''

میں نے رابی سے کہا۔ وہ ڈری ہوئی تھی، یقیناً اس کے ذہن میں یہی تھا کہ ہم تھوڑی بہت مار پیٹ کر کے چلے جائیں گے اور اس کے بعد یہ جنگلی سور اس جُرم میں اس کی بھی ٹانگیں چیر ڈالے گا۔ اسے تذبذب میں دیکھ کر لیلیٰ آگے بڑھی اور قربان علی کے منہ پر تھوک کر بولی۔

''سالے--- کسی گشتی ماں کے حرامی پلے! بہت اکڑتا تھا نا! اپنی مردانگی پر--- زنخے کی اولاد! اب دکھا، نا! اپنی مردانگی ان جوانمردوں کے سامنے---''

دادن نے کھلے ہوئے بیگ میں سے جانور ذبح کرنے والی لمبی چھری نکالی اور ساتھ ہی ہڈیاں کاٹنے والا بغدا بھی۔ قربان علی کی آنکھیں خوف سے پھٹنے لگی تھیں۔

''کہاں سے شروع کروں، ربانی صاحب!''

دادن بستر پر بیٹھ گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''کانوں سے ---دونوں کان کاٹ کر اس کی دستیاں اور پائے الگ کردو۔ زیادہ خون نہ نکلے، بستر گندا ہوجائے گا---''

دادن نے چھری کی دھار کو بغدے کی دھار سے دو چار بار قصائیوں کے انداز میں اُلٹا سیدھا رگڑ کر تیز کیا اور قربان علی کے سر کو پکڑ لیا۔ اُسی وقت رابی کو چکر آ گیا اور وہ لہراتی ہوئی گرنے ہی والی تھی کہ لیلیٰ اور میں نے اسے سنبھال لیا۔ وہ کمزور اعصاب کی مالک تھی، یہ سب اُس کی برداشت سے باہر تھا۔ اس کی رنگت پیلی اور ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ میں نے سہارا دے کر اُسے کرسی پر بٹھایا اور لیلیٰ نے جلدی سے پانی کا گلاس بھر کر اُس کے مُنہ سے لگا دیا۔

☆☆

کچھ دیر اسے سنبھالنے میں لگ گئی۔ لیلیٰ بار بار اُس کے بالوں میں ہاتھ پھیر رہی تھی اور اپنے ساتھ لگا کر تسلی دے رہی تھی کہ دُکھوں کی یہ رات ختم ہو رہی ہے، اگلی صبح کا سورج اس گناہ آلود غلامی سے ان کی آزادی کا پیغام لے کر طلوع ہوگا۔ قربان علی نے ان لڑکیوں پر جتنے ظلم ڈھائے تھے، آج کی رات اس کے لئے ان ظلموں کی سزا کی رات ہے۔

''میں بھی تو تمہاری طرح ظلم اور گناہ کی اس چکی میں پسی ہوں، رابی! حوصلہ رکھو---اس بھڑوے کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے، ٹھیک ہو رہا ہے۔ یہ اسی سزا کو مستحق ہے---'' وہ اس کا ماتھا چومتے ہوئے بولی۔

رفتہ رفتہ رابی کے اوسان بحال ہونے لگے۔ میں اُسے کمرے سے باہر نکالنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا، بہت ممکن تھا کہ وہ کسی ہسٹیریائی کیفیت کا شکار ہو کر چیخنا چلانا شروع کر دیتی اور نتیجے میں آخر کار ہم دونوں کے ساتھ لیلیٰ بھی پھنس کر ماری جاتی۔ ہم جو قدم اُٹھا چکے تھے، وہاں سے واپسی ممکن نہیں تھی---دادن ایک بار پھر قربان علی کی طرف بڑھا تو وہ گھگھیانے اور رونے پر آ گیا۔

''مجھے مت مارو---میں---میں تمہیں سب کچھ بتا دیتا ہوں---''

''شروع ہو جاؤ---فوراً---''

''مجھے عشرت بیگم نے بھیجا تھا---''

''کیوں---؟''

''اُسے اندازہ ہو گیا تھا کہ آپ اناڑی ہو، پہلی بار کوٹھے پہ آئے ہو اور اپنی دولت کو سنبھال نہیں پا رہے---آج تک ایسا نہیں ہوا کہ سودا کئے بغیر کسی نے میری دلالی کے پانچ سو روپے پہلے ہی دے دیئے ہوں۔ پانچ سو تو کیا، لوگ پچاس بھی مشکل سے دیتے ہیں۔ زیادہ تر پانچ دس روپے ہی دیتے ہیں---آپ نے لڑکی کا سودا کئے بغیر ہزار روپے دیئے تو عشرت بیگم پاگل ہی ہو گئی تھی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ بیوپاریوں سے جو رقم آپ نے وصول کی ہے، وہ اسی بیگ میں ہے۔ یہ چھوٹا سا قصبہ ہے۔ لوگ آتے ہیں سو دو سو پر رات کی بکنگ کرتے ہیں اور دس بیس انعام میں دے جاتے ہیں، باقی کمائی لڑکی کی اپنی کوشش پر ہوتی ہے---''

''تو تم لوٹنے آئے تھے مجھے---ٹھیک---بیگ لے جانے کے بعد کیا کرتے؟''

''اللہ پاک کی قسم---''

اس نے پھر کچھ کہنا چاہا، میں نے آگے بڑھ کر اُس کے مُنہ پہ تھپڑ مارا۔

''غلیظ کاموں میں اُس مالک کا نام زبان پر مت لا، کُتے---!'' پھر میں نے لیلیٰ کو مخاطب کیا۔ ''یہ جب بھی قسم کھائے، اس کے مُنہ پہ چپل مارنا---اِدھر کھڑی ہو جاؤ جُوتا لے کر---''

لیلیٰ نے اپنی چپل اتاری اور اُس کے چہرے کے نزدیک کھڑی ہو گئی۔ دادن آرام سے کُرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

''ایک آدمی کے ہاتھ پیر باندھ کر تم اپنی مردانگی جتا رہے ہو؟ مرد ہو تو میرے رسیاں کھول کر ایک ایک کر کے آ جاؤ---''

لڑکیوں کے سامنے اور لیلیٰ کے ہاتھوں ہونے والی بے عزتی وہ برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔

''ہم مرد نہیں ہیں اس لئے نہ رسّی کھولیں گے، نہ ایک ایک کر کے آئیں گے---پاگل کُتے کو رسّی سے نہ باندھیں تو وہ کاٹ لیتا ہے۔ آگے بولو، کیا کرتے ہمارے ساتھ---میں ابھی نیچے جا کر عشرت بیگم سے تمہاری باتوں کی تصدیق کروں گا۔ ایک بھی جھوٹ پکڑا گیا تو تمہارا پہلے ایک کان، دُوسرے جھوٹ پر دوسرا کان، تیسرے پر ایک ہاتھ اور چوتھے پر دوسرا ہاتھ کاٹ کر اُس کا قیمہ بنا دے گا یہ چوہدری تاکہ جڑنے کے قابل نہ رہے۔ ہم تمہیں جان سے نہیں ماریں گے، بس لنگڑا لُولا کر دیں گے۔ دونوں ہاتھ، دونوں پاؤں اور کان کاٹ کے، اس سے بھیک ملنے میں آسانی ہو جائے گی اس لئے جو بھی جھوٹ بولو، سوچ سمجھ کر بولنا۔ میں قسموں پہ اعتبار نہیں کرتا، قسم مت کھانا---ہاں، پھر---؟''

''پھر تمہیں یہیں بند کرنا تھا، چھوڑنا اس وقت تھا جب تم اس کے لئے تیار ہو جاتے کہ چپ چاپ، شور کئے بغیر مرید کے چھوڑنے پر تیار ہو جاتے---''

''---اور اگر ہم باہر نکل کے شور مچاتے، پولیس سے رابطہ کرتے تو پھر کیا کرتے تم لوگ؟''

''پھر پولیس ہی تم سے نمٹ لیتی---وہ حوالدار مُشرف ہے وہاں، اِدھر آتا رہتا ہے مُنہ مارنے---ایسے چھوٹے موٹے کام کرتا رہتا ہے ہمارے لئے، ڈکیتی

دینیات

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ رات کے گشت پر تھے ایک گھر کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ ایک بچہ مچل مچل کر رو رہا ہے۔ آپؓ نے اُس کی ماں سے کہا کہ اس کو بہلائے، پھر دوسری جگہوں سے شب گشتی کرتے ہوئے جب واپس ہوئے تو دیکھا کہ بچہ ابھی تک روئے جا رہا ہے، فرمایا۔

''افسوس! میں تو یہ سمجھنے پر مجبور ہوں کہ تو بری ماں ہے۔''

اُس نے کہا۔ ''میں اس کا دودھ چھڑا رہی ہوں کیونکہ امیر المومنین کا حکم ہے کہ جب تک بچہ دودھ نہ چھوڑے اِس وقت تک اُس کا وظیفہ جاری نہ ہوگا۔ چونکہ میں پریشان حال ہوں اس لئے وظیفہ پانے کے خیال سے اس کا دودھ چھڑا رہی ہوں۔''

پوچھا۔ ''بچہ کتنے مہینے کا ہے؟''

اُس نے کہا۔ ''ابھی چند ماہ کا ہے۔''

حضرت عمرؓ پر اس صورتِ حال سے عجب رقت طاری ہوتی۔ نماز فجر میں اتنا روئے کہ شدت گریہ سے آپ کی آواز واضح نہ ہو سکی۔ صبح ہوتے ہی سرزمین خلافت میں منادی کرا دی کہ ہر بچے کا وظیفہ اس کے پیدا ہوتے ہی مقرر ہو جائے گا۔

محمد اکرم عابدی، گوٹھ آرائیاں آباد

کا پرچہ کاٹ کے تمہیں اندر کر دیتا اور تم بڑی مصیبت میں پھنس جاتے---''

''مُشرف سے بات کر لی ہے تیری بہن عشرت نے---؟''

''وہ میری بہن نہیں ہے---'' وہ بُرا مُنہ بنا کر بولا۔

''اوہ، غیرت جاگ پڑی ہے؟---چلو معشوق سہی، ایسی کُتی عورت ہی تجھ جیسے بھڑوے کی معشوق ہو سکتی ہے---بات کی ہے اس نے مُشرف سے؟''

''نہیں، بیگ نیچے پہنچنے اور مال گننے کے بعد ہی رابطہ کرنا تھا اُس سے، اُسے بھی حصہ دینا تھا---مرید کے سے باہر راوی پل تک تمہیں پولیس کی گاڑی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چھوڑ کر آتی یا پھر حوالات میں ہوتے، ڈکیتی کے جُرم میں---"

"اس سے پہلے کتنے بندوں کو لوٹ چکے ہو اس طرح؟"

"زیادہ نہیں، دو چار بندوں کو---سب اناڑی تھے اور پہلی بار کوٹھے پر آئے تھے۔عشرت کو دیکھ کر ڈر گئے، ہر کوئی اپنی عزت کا تماشہ بننے سے ڈرتا ہے۔انہیں حوالات لے جانے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔دو تو اسی شہر کے تھے، ہاتھ پیر جوڑ کر غائب ہو گئے۔ایک نے تڑی شروی دی تھی، اُسے مشرف راوی پل تک چھوڑ آیا۔"

"کتنی لڑکیوں کو قتل کر چکے ہو اب تک؟"

"صرف ایک کو جی---بہت سخت جان تھی۔مان ہی نہیں رہی تھی، اُلٹا مجھے مارنا چاہتی تھی---"

"جھوٹ بول رہے ہو تم---چوہدری---!"

میں نے دادن کو مخاطب کیا۔اُس نے چھری سنبھال کر قربان علی کو دیکھا۔

"میں---میں سچ کہہ رہا ہوں۔باقیوں سے صرف مار پیٹ کی ہے۔ایک کا بازو توڑا تھا، لڑکیاں زیادہ دیر انکار نہیں کر پاتیں۔دو چار تھپڑ، دو چار مکے اور دو چار ٹھوکروں کے بعد مان جاتی ہیں۔صرف وہی اڑ گئی تھی، عزت لُٹوا کر بھی دھندے کے لئے تیار نہیں ہو رہی تھی---اس نے قتل کرنے کے لئے حملہ کیا تھا مجھ پہ۔عشرت بیگم نے کہا، ٹانگیں چیر دو اس کی۔وہ ایسی خطرناک لڑکی کو رکھ کر بدنام نہیں ہونا چاہتی تھی۔"

"بدنام---ماشاء اللہ، یعنی ویسے نیک نام ہے، درس چلاتی ہے وہ گشتی---یتیم خانہ کھول رکھا ہے اس نے؟"

"اس دھندے میں بدنام وہ نانکہ ہوتی ہے جس کے پاس کام کی لڑکی نہ ہو---گاہکوں سے بدتمیزی کر کے کوٹھا بدنام ہو جاتا ہے---" اس نے اپنے طور پر میری تصحیح کی۔

میں نے وقت دیکھا، رات کے بارہ بج چکے تھے۔مجھے یہ بھی پریشانی ہو رہی تھی کہ قربان علی کو یہاں پھنسے ہوئے اتنی دیر ہو چکی تھی لیکن عشرت بیگم ابھی تک حالات کا جائزہ لینے اوپر نہیں آئی تھی۔اُصولی طور پر تو اسے پریشان ہو جانا چاہئے تھا کیونکہ بیگ پر قبضہ کر کے ہمیں چوہے دان میں پھنسا کر قربان علی کو دو چار منٹ میں ہی واپس نیچے اس کے کمرے میں پہنچ جانا چاہئے تھا---میں نے جیسے جیسے سوچنا شروع کیا، میری پریشانی بڑھنے لگی۔عشرت بیگم کو ذرا سا بھی شک ہو جاتا کہ قربان علی پھنس گیا ہے تو وہ سب سے پہلے حوالدار اور مشرف کو فون کرتی اور پھر خود کو محفوظ رکھنے کے لئے یا تو کسی کمرے میں بند ہو جاتی یا گھر سے نکل جاتی---میں نے دادن سے کہا۔

"اس کا خیال رکھنا، شور مچائے تو زبان اور ہونٹ کاٹ کے قیمہ تیار کر لینا---میں اس کی آپا عشرت بیگم کو دیکھ کر آتا ہوں---" پھر میں رابی سے مخاطب ہوا---"ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے، رابی! آرام سے بیٹھی رہو، باہر مت نکلنا۔میں لیلیٰ کو ساتھ لے کر جا رہا ہوں، بس دو چار منٹ میں آ جائیں گے---"

لیلیٰ نے میری بات سُنتے ہی ہاتھ میں پکڑی ہوئی چپل پیر میں پہن لی اور میرے ساتھ باہر آ گئی۔ہم نے اپنے پیچھے دروازہ بند کیا اور برآمدہ عبور کر کے دبے پاؤں سیڑھیاں اُترنے لگے۔

"دستک تم دینا، میری آواز سُن کر وہ ہوشیار ہو جائے گی---کہہ دینا کہ قربان علی کو اُلٹیاں آ رہی ہیں، پتہ نہیں کیا ہوا ہے اُسے---"

میں نے سرگوشی میں اسے سمجھایا۔اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

عشرت بیگم کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔لیلیٰ نے آہستہ سے دستک دی۔دوسری دستک پر اندر سے اُس کی آواز سنائی دی۔

"کون؟ قربان علی؟"

"میں ہوں باجی! لیلیٰ---" لیلیٰ نے جواب دیا۔دروازے کی درزوں میں سے روشنی آ رہی تھی جس کا مطلب تھا کہ وہ جاگ رہی تھی۔

"کیا بات ہے؟" اس بار آواز دروازے کے قریب سے آئی تھی۔لہجے سے پریشانی ہویدا تھی۔

"وہ---وہ قربان علی کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔اُلٹیاں کر---"

اس کے ساتھ ہی اندر سے چٹخنی گرنے کی آواز آئی اور دروازہ کھل گیا---میں اس دوران اپنا بے آواز ریوالور سیدھا کر چکا تھا۔وہ جیسے ہی سامنے نظر آئی، میں نے ریوالور کی نال اُس کے سینے سے لگا دی---

"آواز مت نکالنا---تم نے صرف پستول ہی دیکھا ہے، ریوالور نہیں۔اس پر سائلنسر لگا ہوا ہے، گولی چلنے کی آواز نہیں آتی اور بندہ اوپر پہنچ جاتا ہے---" میرا لہجہ سرد اور دھیما تھا۔

اس کے مُنہ سے آواز نہیں نکلی تھی۔خوف کے عالم میں اُس نے دونوں ہاتھ قدرے اُوپر اُٹھا دیئے تھے۔میں اُسے ریوالور کی نال سے دھکیلتا ہوا اندر کمرے میں لے گیا۔سامنے ڈبل بیڈ تھا جس کے دونوں جانب دراز والی چھوٹی ٹیبلز رکھی ہوئی تھیں۔سامنے والی ٹیبل پر دواؤں کی کچھ شیشیاں، ایک چھوٹا پرس اور ٹیلی فون رکھا ہوا تھا جس کا رسیور بیڈ پر پڑا تھا---اس کا ایک ہی مطلب تھا۔وہ کسی سے فون پر لمبی گفتگو کر رہی تھی اور اس وقت بھی رسیور ہولڈ پر تھا۔

☆☆

یہ بہت خطرناک بات تھی۔اگر دُوسری طرف حوالدار مُشرف تھا تو ہم زیادہ دیر یہاں رُکنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔

"آواز مت نکالنا---کون ہے فون پر؟" میں نے سرگوشی کی۔

"وہ---وہ میرا ایک قدر دان ہے، فیصل آباد سے بات کر رہا ہے---" اس نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔اُس کی بات کی تصدیق ضروری تھی۔یہ تصدیق لیلیٰ ہی کر سکتی تھی، میں نے اُس سے کہا۔"بات کرو اس سے، پتہ لگاؤ کہ کون ہے اور کہاں سے بات کر رہا ہے۔"

لیلیٰ نے آگے بڑھ کر رسیور اُٹھا لیا۔

"ہیلو---!"

وہ بولی دوسری طرف سے کچھ کہا گیا۔

"جی---میں رشیدہ بول رہی ہوں۔باجی ذرا واش رُوم تک گئی ہیں، مجھ سے کہہ گئی ہیں کہ تب تک میں آپ کا دل بہلاؤں---جی، ہم تو کنیز ہیں آپ کی---کبھی آیئے، نا! ایک بار خدمت کا موقع دیجئے۔پھر آپ کا یہاں سے جانے کو دل چاہے تو نام بدل دیجئے گا ہمارا---فیصل آباد آنا ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔آپ باجی سے پرمیشن لے لیجئے گا---پھر فیصل آباد کیا، دنیا کے آخری کونے تک بھی چلیں گے آپ کے ساتھ---"

لیلیٰ نے شوخ انداز میں جواب دیا۔پھر اُدھر سے کچھ سن کر بولی۔

"آپ بہت بے صبرے ہیں، کوئی فون پر ایسی بات کرتا ہے---قسم سے ہمیں شرم آ رہی ہے---"

یقیناً دوسری طرف سے کوئی کھلی کھلی واہیات

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بکواس کی گئی تھی۔

''جب آئیں گے تو خود ہی دیکھ لیجئے گا کہ ہم کیسے ہیں---باجی آرہی ہیں، رکھتی ہوں---''

اس کے ساتھ ہی اُس نے ریسیور واپس بیڈ پر رکھ دیا اور پیچھے ہٹ گئی۔

''تار توڑ دو اس کی---''

میں نے سرگوشی کی۔ اُس نے دوبارہ ریسیور اُٹھایا اور ایک جھٹکے سے اُس کی تار کھینچ کر توڑ دی۔ اس گفتگو سے مجھے تسلی ہوگئی تھی کہ عشرت بیگم واقعی کسی عیاش ٹھرکی سے ہی محوِ گفتگو تھی، ابھی حوالدار مشرف کو نمبر نہیں آیا تھا۔

''بیٹھ جاؤ شرافت سے---''

میں نے اُسے بیڈ کی طرف دھکیلا۔ وہ جہاں دیدہ عورت تھی، سمجھ گئی تھی کہ بازی الٹ گئی ہے۔ میرے کہنے پر بیڈ پر ڈھے سی گئی۔

''تلاشی لو اس کی---خفیہ جگہوں کی بھی، ایسی گشتیاں پتہ نہیں کہاں کہاں پستول چھپا کر رکھتی ہیں---''

لیلیٰ میرا مطلب سمجھ گئی تھی۔ چند لمحوں میں اُس نے عشرت بیگم کی جسمانی تلاشی لے ڈالی۔

''تجھے تو میں نے اپنی سگی دھی کی طرح رکھا ہے، لیلیٰ! تو بھی---تو بھی ان سے مل گئی ہے؟'' وہ رونے کے سے انداز میں بگڑا کر رہی تھی۔

''میری بات نہیں مانے گی تو لیلیٰ بھی ماری جائے گی۔ میں دو نمبر عورتوں پر بالکل ترس نہیں کھاتا---اب جو کچھ پوچھوں، جلدی جلدی بولتی جا---''

''قربان---قربان---؟'' وہ اتنی نروس تھی کہ پوری طرح بول نہیں پا رہی تھی۔

''کیا ''قربان قربان'' کی قوالی کر رہی ہے؟ مار دیا ہے اسے میں نے---لوٹنے آیا تھا مجھے، اوپر بھیج دیا ہے۔ ربانی ہے میرا نام، اصلی اور خاندانی پٹھان ہوں۔ دشمنوں کو معاف کرنا ہمارے خون میں نہیں ہے---کیوں بھیجا تھا اُسے، لوٹنے کے لئے نا؟''

''غلطی ہوگئی، معاف کردو---'' اُس نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

''ڈرامہ نہیں چلے گا---جو غلطی کرتا ہے، اُسے سزا بھی ملتی ہے---''

''کک---کیا---کیا کرو گے؟''

''تیری عزت تو لوٹنے سے رہا، وہ تو ہے ہی نہیں تیرے پاس---سیدھی بات ہے کہ تُو نے قربان کو بھیجا تھا ہم دونوں کو قتل کرنے کے لئے۔ بیگ میں موجود میرا سارا پیسہ تیرا ہو جاتا، کچھ ہڈیاں حوالدار مشرف کے حصے میں آجاتیں---''

اس کے چہرے پر حوالدار کا نام سُن کر ایک رنگ آکر گزر گیا اور وہ خشک لبوں کو زبان پھیر کر تر کرنے لگی۔

''ہم بچ گئے تو مطلب ایک ہی ہے کہ وہ مارا گیا جو ہمیں مارنے آیا تھا۔''

''میں نے اسے مارنے لئے نہیں، صرف ڈرا دھمکا کر بیگ چھیننے کا کہا تھا---''

''ایک ہی بات ہے---ہم یہاں چوڑیاں پہن کر دوپٹہ اوڑھ کر نہیں آئے تھے۔ ہمیں یا اُسے، کسی کو تو مرنا تھا۔ اُس کی پہلے آگئی تھی، وہ مارا گیا۔ اب تمہاری باری ہے۔''

''میں ہاتھ جوڑ رہی ہوں، آپ کے پیر پکڑ لیتی ہوں۔ مجھے معاف کردو، ساری زندگی دُعائیں دوں گی۔''

''دُعائیں---ولی اللہ ہو تم---گناہوں کی دوکان کھول کر بیٹھی ہو۔ پتہ نہیں کیسے کیسے شریف گھرانوں کی بیٹیوں کا جسم بیچ کر مال جمع کر رہی ہو اور بات دُعاؤں کی کر رہی ہو؟---نہیں، عشرت بیگم! تم اگر ان لڑکیوں کی طرح مجبوری میں گناہوں کا سودا کر رہی ہوتیں، اپنا جسم بیچ رہی ہوتیں تو معافی کے قابل تھیں۔ تم جیسوں کی وجہ سے ہی کوٹھے آباد ہوتے ہیں، لڑکیاں اغوا ہوتی ہیں اور پولیس والوں سے لے کر دلالوں اور بردہ فروشوں کا کاروبار چلتا ہے کیونکہ انہیں پتہ ہوتا ہے کہ وہ کسی بھی یتیم، لاوارث، حالات کی ستائی ہوئی لڑکی کو اغوا کریں گے تو تم جیسی حرافائیں اُن سے خرید کر اسے جسم فروشی پر لگا دیں گی اور ساری زندگی منافع کماتی رہیں گی۔''

''میں یہ کام چھوڑ دوں گی---وعدہ کرتی ہوں۔'' اُس نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔

''موت کے خوف سے کئے ہوئے وعدوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی---تمہیں مرنا ہی ہوگا---''

''مجھے مار کر آپ کو کیا ملے گا، پولیس آپ کو چھوڑے گی نہیں---''

''وہ میرا مسئلہ ہے۔''

''آخر آپ کیوں مارنا چاہتے ہو مجھے---جو آپ کو مارنے گیا تھا، وہ آپ کے ہاتھوں مر چکا ہے۔ سودا کر لو مجھ سے، اس میں آپ کا بھی فائدہ ہوگا۔ مجھے مار کر کچھ نہیں مل سکے گا، آپ کو---'' اس نے لالچ دینے کی کوشش کی۔ ''میں مر گئی تو یہ بچیاں بھوک سے مر جائیں گی۔ پھر کسی اور کوٹھے کا رُخ کریں گی جہاں شاید انہیں کوئی مجھ جیسی عورت نہ ملے۔ پھولوں کی طرح رکھا ہوا ہے میں نے انہیں، کسی اور تانگہ کے ہتھے چڑھ گئیں تو اس کا ظلم انہیں خودکشی پہ مجبور کر دے گا---مجھے چھوڑ دو اور اس کے بدلے پیسہ اور زیور، جو بھی میرے پاس ہے، لے جاؤ---''

اس کا خوف ختم ہو رہا تھا اور اب وہ خاصے پُرسکون انداز میں بات کر رہی تھی۔ شاید اسے یقین آچلا تھا کہ جنہیں کوئی مارنا ہوتی ہے، وہ وہ اتنی باتیں نہیں کرتے، بس گولی چلا دیتے ہیں---میں نے متذبذب ہونے کی اداکاری کی اور قدرے ٹھہر کر پوچھا۔

''کتنا پیسہ ہے تمہارے پاس---؟''

''کافی ہے---سونا بھی ہے۔ سب لے لو، قسمت میں ہوگا تو اور مل جائے گا---''

''باتیں کافی سمجھداری کی کرتی ہو---کتنا پڑھی ہوئی ہو---؟'' میرے ذہن میں ایک پلان سر اُٹھانے لگا تھا۔

''دسویں سے چھوڑا تھا---یہ دھندا میں نے پیدا ہوتے ہی شروع نہیں کر دیا تھا، غریبی اور بے بسی مجھے یہاں تک لے آئی---'' موقع ملتے ہی اس نے مظلومیت کا لبادہ اوڑھنے کی کوشش کی۔

''مجھے تمہاری فلمی کہانی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اپنی بے بسی اور غربت کا انتقام دوسروں کی غربت اور بے بسی

حدیث پاک

حضرت انس بن مالکؓ رسول پاک کا بیان نقل کرتے ہیں کہ'' کافر جو کوئی بھلائی کرتا ہے تو دنیا ہی میں اس کو اس کا اجر دے دیا جاتا ہے اور مومن کے لئے اللہ تعالیٰ اس کی نیکیوں کو آخرت کے لئے ذخیرہ بنا کر رکھ لیتے ہیں اور اس کی اطاعت پر دنیا میں اس کو رزق عطا فرماتے ہیں کہ''---ایک روایت یہ بھی ہے کہ'' اللہ تبارک تعالیٰ حق تلفی کسی کی نہیں کرتے۔ مومن جو نیکی کرتا ہے، اللہ رب العزت اس کا اجر اس کو دنیا میں بھی دیتے ہیں اور آخرت میں بھی اس کا اجر ملتا ہے۔ کافر جو نیکیاں کرتا ہے، اس کو دنیا میں ہی اللہ پاک اس کا اجر دے دیتے ہیں۔ جب وہ آخرت میں پہنچے گا تو اس کے پاس کوئی بھی نیکی باقی نہ ہوگی کہ اس کو اس کا اجر دیا جا سکے۔''

میاں جاوید جالندھری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے نہیں لیا جاتا۔ اپنے گناہ دھونے کے لئے دوسروں کو گناہ کی دلدل میں پھینکنے والا پارسا نہیں بن جاتا--- وقت ضائع مت کرو، کدھر ہے وہ پیسہ اور زیور---؟"

وہ آہستہ سے بیڈ سے اُتری اور ایک کونے میں کھڑی اسٹیل الماری کی طرف بڑھی، میں اس کے سر پر ہی رہا۔ الماری کی چابیاں بیڈ کے گدے کے نیچے رکھی تھیں۔ اُس نے گدا اُٹھا کر چابیوں کا گچھا اُٹھایا اور الماری کا ہضمی قفل کھولنے لگی۔

"ایک بات یاد رکھنا۔ ہوسکتا ہے، اندر تم نے بھرا ہوا پستول رکھا ہو تاکہ موقع ملتے ہی اسے اُٹھا کر مجھ پر فائر کردو--- میں تم جیسی عورتوں کی مکاریاں جانتا ہوں اس لئے بھروسہ نہیں کرتا۔ ایسی کوئی چالاکی تمہیں اگلا سانس نہیں لینے دے گی۔ اُدھر تم کوئی حرکت کرنے کی کوشش کروگی، ادھر گولی تمہاری کمر اور دل میں سوراخ کر کے نکل جائے گی---" میں نے ریوالور کی نال اس کی کمر میں چبھوئی۔

"نن---نہیں، میں کوئی غلط کام نہیں کروں گی---"

وہ جلدی سے بولی۔ الماری کی چھوٹی خفیہ دراز کھولنے میں چند ہی لمحے لگے تھے۔ اُس نے دراز باہر کھینچی تو میری آنکھیں چکاچوند ہوگئیں۔ دراز میں ہزار اور پانچ سو کی کئی گڈیاں ترتیب سے پچھلی جانب رکھی ہوئی تھیں، سو کے نوٹوں کی بھی دو گڈیاں موجود تھیں--- میری حیرانی کی اصل وجہ سونے کے وہ زیورات تھے جو فوری طور پر گنے بھی نہیں جاسکتے تھے۔ ان میں زیادہ تر مردانہ انگوٹھیاں اور گلے کی چین تھیں۔ کانوں کے رنگ، ٹاپس، جھمکے اور چوڑیاں اس کے علاوہ تھیں۔ اس کے علاوہ سونے کی چھوٹی اور بڑی نکیاں بھی تھیں جن کا وزن یقیناً پچاس اور سو گرام رہا ہو گا۔ میں سُنار نہیں تھا لیکن اندازاً کہہ سکتا تھا کہ یہ تمام سونا ایک کلو سے کچھ زیادہ ہی ہوگا۔

"یہ سب آپ کا ہے---؟" اُس نے ایک بار پھر لالچ دیا۔

"اس میں سے ہزار اور پانچ سو کی گڈیاں باہر نکالو اور سونے کی نکیاں بھی--- باقی زیور ادھر ہی رہنے دو---"

"ٹھیک ہے--- لیلیٰ! کچن میں خالی شاپر پڑے ہیں، لے کر آؤ---" اس نے چہرہ گھما کر لیلیٰ سے کہا۔ لیلیٰ باہر نکل گئی تو وہ سونے کی نکیاں چننے لگی۔ میں اس کی طرف سے پوری طرح چوکنا تھا، جان بچانے کے لئے آدمی کچھ بھی کرسکتا ہے، مال کی قربانی دینے سے لے کر دھوکے سے وار کرنے تک--- نکیوں کے بعد نوٹوں کی باری آگئی۔ اُس نے اپنا بایاں بازو پیٹ سے لگایا اور گڈیاں اُٹھا کر کلائی پر رکھنے لگی۔ بڑے نوٹوں کے بعد جب سو کے سرخ نوٹوں کی باری آئی تو میں نے اُسے روک دیا۔

"بس اب دراز بند کرو، یہ سب ادھر ہی رہنے دو---"

وہ سرد و گرم چشیدہ تھی، سمجھ گئی تھی کہ میں نے زیور لینے سے کیوں منع کردیا تھا۔ یہ سب زیورات اُن عیاشیوں کی نشانیاں اور تحفے تھے جو عشرت بیگم کی عشرت گاہ میں راتیں گزارنے آتے تھے اور نشے اور بے خودی کی کیفیت میں کسی رابی، کسی کومل اور کسی لیلیٰ کے جسم پر نچھاور کر جاتے تھے۔ لڑکیوں کو یہ تحفے رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ ان کا کام جال میں آئے ہوئے شکار سے نذرانے وصول کرنے کی حد تک تھا، ملکیت یہ عشرت بیگم کی ہی تھے جسے انہیں فروخت کرنے کا مکمل اختیار تھا--- میرے لئے یہ تمام زیور ٹھکانے لگانا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور

تھا، اس کے علاوہ میں اپنے بعد آنے والی پولیس کو بھی غلط رستے پر لگانا چاہتا تھا۔ نکیاں نکال کر نصف کلو سے زائد سونا اور نوٹوں کی گڈیاں اس واردات کو ڈکیتی کے روپ سے بھٹکا دیتیں۔ پولیس اُسے اُسی انداز میں لیتی جو میں چاہ رہا تھا۔

☆☆

نوٹوں کی گڈیاں اور سونے کی نکیاں ایک بڑے شاپر میں منتقل کروا کے میں نے عشرت بیگم کو دوبارہ بیڈ پر بیٹھنے کو کہا۔

"کاغذ اور بال پوائنٹ ہے تمہارے پاس---؟"

اُس کی نظر بلاارادہ سائیڈ ٹیبل کے دراز کی طرف اُٹھی۔ میں نے جواب کا انتظار کئے بغیر ریوالور تھامے بائیں ہاتھ سے دراز کھول دی۔ اندر کچھ دیگر کاغذات کے ساتھ ساتھ ایک کتابی سائز ڈائری پڑی ہوئی تھی۔ میں نے ڈائری نکالی، بال پوائنٹ اس کے اندر ہی موجود تھا۔ ڈائری کے آخری صفحات میں حسب رواج مختلف فون نمبرز اور نام لکھے ہوئے تھے۔ میرے پاس ڈائری پوری طرح کھول کے چیک کرنے کا وقت نہیں تھا، نہ ہی بائیں ہاتھ سے ایسا کرنا ممکن تھا۔ میں نے ڈائری اس کی طرف پھینکی اور کہا۔

"ایک خالی صفحے پر اعتراف لکھو---"

"اعتراف--- میں بھی نہیں---؟"

"یہ کہ تم نے قربان علی کو اپنے ہاتھوں سے قتل کیا ہے--- وہ تم پر تشدد کرتا تھا۔"

"مم---مگر--- اُسے تو آپ نے---"

"بحث نہیں--- جو کہا ہے، وہ لکھو---"

بال پوائنٹ ڈائری سے نکل کر بیڈ پہ جا گرا تھا۔ اُس نے بال پوائنٹ اُٹھایا اور خالی صفحات کھول کر ڈائری تھام لی۔

"لکھو--- میں عشرت بیگم اپنے پورے ہوش و حواس کے ساتھ لکھ رہی ہوں کہ قربان علی---"

میں لکھواتا چلا گیا۔ لبِ لباب یہ تھا کہ قربان علی ایک ظالم اور عیاش آدمی تھا، شراب پی کر اس پر بے پناہ تشدد کرتا تھا۔ وہ گناہوں کی زندگی سے تنگ آگئی تھی۔ بے گناہ، مظلوم اور مجبور لڑکیوں سے جسم فروشی کروا کر اس کا ضمیر ملامت کرنے لگا تھا۔ وہ یہ کوٹھا بند کرنا چاہتی تھی لیکن قربان علی اُسے ایسا کرنے دے رہا تھا چنانچہ اس کے پاس اس کے سوا کوئی رستہ نہیں تھا کہ وہ قربان علی کو ختم کردے، چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔

"آخر میں لکھو کہ میرا ضمیر مطمئن ہے کہ میں نے اسے مار ڈالا ہے جو مجھے اس پیشے میں لے کر آیا تھا لیکن میں اب خود بھی زندہ نہیں رہنا چاہتی اس لئے خودکشی کر رہی ہوں---"

وہ لکھتے لکھتے رُک گئی۔

"میں---نہیں--- آپ سودا کر چکے ہو کہ پیسوں کے بدلے مجھے کچھ نہیں کہو گے۔"

"میں واقعی کچھ نہیں کہوں گا---"

"لیکن--- یہ خودکشی---؟"

"آج نہیں تو کل، کبھی تو یہ کام تمہیں کرنا ہوگا--- اچھا، ٹھیک ہے۔ بس ایسے ہی ادھورا چھوڑ دو۔ کچھ سطریں چھوڑ کر اپنا نام اور دستخط کردو---"

"آپ اس کے قتل میں مجھے کیوں پھنسانا چاہتے ہو؟--- میں سمجھ گئی ہوں کہ یہ خط آپ پولیس کو دے دو گے۔"

"تم بچ جانا، کہہ دینا کہ قاتل نے زبردستی لکھوایا تھا تم سے، تمہاری کنپٹی پر رکھ کر--- تمہارا وکیل ثابت کردے گا کہ قربان علی جیسے جنگلی سور کو قابو کرنا تمہارے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بس کی بات ہی نہیں تھی۔ ہمارے یہاں سے جاتے ہی شور مچا دینا کہ ڈاکو آئے تھے تمہیں لوٹ کر اور قربان علی کو مار کر چلے گئے--- کوئی عدالت تمہیں سزا نہیں دے سکتی۔ یہاں عدالتیں سزا دیتیں تو تم جیسی نائیکاؤں اور تمہارے قربان علی جیسے دلالوں کو چوراہوں پر پھانسی دی جاتی--- چپ چاپ دستخط کر کے کاغذ نکال کے میرے حوالے کرو، جلدی---"

اُسے بچنے کی راہ نظر آئی تو اس نے جلدی جلدی اپنا نام لکھ کر دستخط کر دیئے۔ پھر کاغذ ڈائری سے علیحدہ کر کے میری طرف بڑھا دیا۔

"اب ایک صفحے پر اپنے دستخط دوبارہ کرو--- چار چھ بار---"

میں نے کاغذ خود تھامنے کی بجائے لیلیٰ کو اشارہ کیا کہ وہ پکڑ لے۔ عشرت بیگم میری بات سُن کر حیران ہوئی تھی لیکن پھر مُنہ سے کچھ بولے بغیر ایک صفحے پر دستخط کرتی چلی گئی۔ میں صرف یہ تصدیق کرنا چاہ رہا تھا کہ اعتراف نامے پر اس نے وہی دستخط کئے تھے، جو وہ کرتی تھی یا مجھے دھوکا دینے کے لئے الگ سے نئے دستخط بنائے تھے لیکن دوبارہ دستخط دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس نے چالاکی کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"یہ صفحہ بھی پھاڑ کر لیلیٰ کو دو---"

لیلیٰ خود بھی میری باتوں کو سُن کر حیران ہو رہی تھی۔ میں نے اُسے فالتو دستخطوں والا کاغذ کچن میں لے جا کر جلانے اور راکھ سینک میں بہا دینے کو کہا۔

"تم یہ شاپنگ بیگ، ڈائری، لکھائی والا کاغذ اور بال پوائنٹ لے کر اوپر آ جانا--- کسی کو اُٹھانے کی یا کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے ورنہ ماری جاؤ گی---"

"جی، سر---!"

لیلیٰ نے مصنوئی خوف ظاہر کیا اور باہر نکل گئی۔

"اب تم بھی شرافت سے اُوپر چلو---"

"میں--- میں--- مگر تم نے تو---"

"ٹھیک ہے۔ میں یہیں گولی مار دیتا ہوں تمہیں۔"

میں نے سیفٹی کیچ ہٹایا۔

اُس نے جلدی سے دونوں ہاتھ آگے پھیلائے۔

"نہ--- گولی نہ چلانا، میں چلتی ہوں---" وہ سُرعت سے نیچے اُتری اور سلیپر پہننے لگی۔

☆☆

کمرے کا منظر وہی تھا جیسا کچھ دیر پہلے ہم چھوڑ کر گئے تھے۔ قربان علی کا ہاتھ پاؤں بندھا جسم بیڈ پر تر چھا پڑا ہوا تھا اور دادن رابی کے سامنے کرسی پر بیٹھا ہوا تھا--- دروازہ اندر سے بند ضرور تھا لیکن چٹخنی لگانے کی ضرورت نہیں تھی چنانچہ عشرت بیگم نے دروازے کو دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ ہم دونوں آگے پیچھے اندر داخل ہوئے تھے--- دادن ہمیں دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیا حال ہے اس جنگلی سُور کا---؟"

"یہ مجھے غداری کا سبق دے رہا تھا، ربانی صاحب! کہہ رہا تھا کہ میں اس کے ساتھ مل جاؤں اور آپ کو گولی مار دوں تو یہ تین لاکھ دے گا مجھے---"

عشرت بیگم، قربان علی کو زندہ دیکھ کر حیران ہو گئی تھی۔ میں نے اُسے بیٹھنے کو کہا۔

"میں بھی اس کی بہن کو غداری کا سبق پڑھا کر آ رہا ہوں--- یہ نہ صرف اسے قتل کرنے کے لئے مان گئی ہے بلکہ لکھ کر بھی دے دیا ہے کہ یہ حرامی اس پر تشدد کرتا تھا اس لئے تنگ آ کر اس نے اس گینڈے کو مار دیا--- رابی! تم مجھے ایک بات بتاؤ، بالکل سچ، ڈرنا نہیں۔ اس کُتے نے تمہیں کتنی بار زدوکوب کیا تھا؟"

مجھے لگتا تھا جیسے ہمارے نکلنے کے بعد نے قربان علی کے سامنے ہی رابی کو تسلی دے کر اُس کا خوف دُور کر دیا تھا، شاید یہ بھی بتا دیا تھا کہ ہم انہیں اس قید سے ہمیشہ کے لئے نکالنے کو آئے ہیں--- وہ بولی تو اس کے لہجے میں خوف کی جگہ کسی حد تک اعتماد در آیا تھا۔

"کئی بار--- بہت ظلم شخص ہے یہ، مار مار کر نیل ڈال دیتا تھا۔ باجی کے شکایت لگاتے ہی جانوروں کی طرح مارتا تھا ہمیں---"

"کسی لڑکی کی ٹانگیں چیر کر بھی مارا تھا اس نے---؟"

"جی--- بہت بُری طرح--- اس کی آنتیں باہر نکل آئی تھیں اور وہ تڑپ تڑپ کر مر گئی تھی--- وہ منظر آج بھی نہیں بھول پائی میں، سر---!"

"عشرت بیگم نے کہا تھا؟"

"جی، انہوں نے کہا تھا--- اس ظالم نے فوراً ہی اُس کی ٹانگیں---" وہ جھرجھری سی لے کر چپ ہو گئی۔ میں عشرت بیگم کی طرف مڑا۔

"تمہیں معلوم ہے کہ قاتل کو کیا سزا ملتی ہے؟"

وہ چپ رہی، اس کا چہرہ اُترتا جا رہا تھا۔

"بتاتا ہوں--- موت کی سزا اور یہ سزا اسے تم دو گی--- پستول سے یا چھری سے، یہ فیصلہ تم نے کرنا ہے---"

اُسی وقت لیلیٰ اندر آ گئی۔ عشرت بیگم نے دادن کے ہاتھ میں چھری دیکھ لی تھی، قربان علی نے چھینا ہوا ریوالور میرے پاس تھا۔ میں اسے استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ گولی چلنے کی آواز رات کے سناٹے میں گونج اٹھتی اور پھر سب کچھ ختم ہو جاتا۔ لیلیٰ نے شاپنگ بیگ، ڈائری، بال پوائنٹ اور وہ صفحہ میز پر رکھ دیا۔

"اسے اس کے کمرے میں لے جاؤ، لیلیٰ---!"

میں نے رابی کی طرف اشارہ کیا۔ "---اور، رابی! تم نے پُرسکون رہنا ہے، شور شرابے کی آواز نہیں آنی چاہئے۔ ضروری نہیں کہ ہم انہیں مار ڈالیں، کچھ شرطیں ہیں جو یہ مان گئے تو انہیں زندہ بھی چھوڑا جا سکتا ہے اس لئے خوفزدہ مت ہونا---"

رابی اُٹھی اور لیلیٰ کے ساتھ باہر نکل گئی۔

☆☆

"اس کا مُنہ باندھو، چوہدری---!"

میں نے چند لمحے گزرنے پر کہا۔ دادن نے دیوار پر لگی کھونٹی سے لیلیٰ کا دوپٹہ اُتارا اور ایک دم سے قربان علی کے مُنہ پر لگا کر پیچھے سے کسنے لگا۔ قربان اچھل رہا تھا

روشنی

☆ جس قوم نے اپنے امور عورت کے سپرد کر دیئے، وہ قوم کبھی فلاح نہیں پائے گی۔ (حضرت محمدؐ)

☆ عمر کے کسی بھی حصے میں عورت کو اُس کی مرضی پہ نہیں چھوڑنا چاہئے۔ (حضرت یحییٰ برمکیؒ)

☆ نیک عورت اسباب آخرت سے ہے نہ کہ امور دُنیا سے۔ (امام غزالیؒ)

☆ اصلاح بچوں کی مکتب میں اور عورت کی گھر میں ہوتی ہے۔ (امام غزالیؒ)

☆ عورت کے کہنے پر کبھی عمل نہ کر، بلاؤں سے محفوظ رہے گا۔ (حکیم بقراط)

☆ جو شخص بُرائی کی بنیاد ڈالتا ہے، وہ اس بنیاد کو اپنی جان پر قائم کر لیتا ہے۔ (حضرت علیؓ)

☆ قرآن پاک کی تعلیمات علم کا سرچشمہ اور دلوں کی بہار ہیں، انہیں سمجھو۔ (حضرت عمر فاروقؓ)

☆ عقل جیسی کوئی دولت نہیں اور جہالت جیسی کوئی غربت نہیں۔ (حضرت لقمانؑ)

☆ جو شخص زبان سے، ہاتھ سے اور نہ ہی اپنے دل سے بُرائی کی روک تھام کرتا ہے، وہ ایک چلتی پھرتی لاش ہے۔ (حضرت سلیمانؑ)

ڈاکٹر منظور شاکر، لاہور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور اپنا سر اِدھر سے اُدھر پٹخ رہا تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ دادن اس کی گردن کی طرف سے گرہ نہ لگانے پائے لیکن وہ زیادہ دیر مزاحمت نہ کر سکا۔ دادن نے اُس کے شانوں کے درمیان گھٹنا رکھ کر زور لگایا اور گھوڑے کو لگام دینے کے انداز میں دوپٹہ کس دیا۔

''میں تمہیں ایک منٹ دے رہا ہوں، اس سُور کے گلے پر چھری پھیرنے کے لئے---زندہ رہنا ہے تو اسے مارنا ہوگا ورنہ ایک منٹ کے بعد میں دونوں کو گولی ماردوں گا---اٹھاؤ چھری---''

میں نے میز کی طرف اشارہ کیا جہاں قربان کا مُنہ باندھتے ہوئے دادن نے چھری رکھ دی تھی۔

وہ کبھی میری طرف دیکھتی تھی، کبھی قربان کی طرف اور کبھی چھری کی طرف---کسی کو ذبح کرنے کے لئے بہت دل گُردے کی ضرورت ہوتی ہے۔ حقیقت تو یہ تھی کہ یہ کام میرے بس کا بھی نہیں تھا، وہ تو پھر ایک عورت تھی---اس کی رنگت زرد ہو رہی تھی۔ ایک لمحے کے لئے اس نے چھری کی طرف ہاتھ بڑھایا اور پھر تیزی سے پیچھے کھینچ لیا، یوں جیسے چھری کی جگہ سانپ ہو۔

''میں---میں نہیں کرسکتی۔ اللہ کے واسطے، مجھے معاف کر دو۔ میں یہ کوٹھا، کاروبار، سب ختم کر دوں گی---چھوڑ دوں گی یہ شہر---''

اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ایک لمحے کو میرا دل نرم پڑنے لگا لیکن پھر وہ لڑکی یاد آ گئی جس کو اسی عشرت بیگم نے قربان کے ہاتھوں زندہ چِروا دیا تھا۔

''او کے---چوہدری! ختم کرو، وقت نکلا جا رہا ہے۔ ماردو گولی، اپنے کپڑے بچا کے---میں اِس گشتی کو سنبھالتا ہوں---''

دادن نے میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی ریوالور نکالا اور قربان کی کھوپڑی کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ مجھے عشرت بیگم کی طرف سے شک تھا کہ وہ ہسٹریائی کیفیت کا شکار ہو کر چیخ نہ پڑے چنانچہ فائر کرنے سے پہلے ہی میں نے کرسی کے پیچھے سے اُس کی گردن دبوچ لی اور پوری قوت سے اُس کے دہانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

قربان علی کے جسم کو بڑے زور کا جھٹکا لگا تھا۔ چٹ کی آواز کے ساتھ ہی اس کی کھوپڑی کا ایک حصہ چٹخ گیا اور خون کے ساتھ بھیجے کا کچھ حصّہ اُچھل کر بستر پر گرا۔ دو چار جھٹکوں کے ساتھ ہی اُس کا جسم بے جان ہو گیا۔ میرے کہنے پر دادن نے دوپٹے اور رسّی کی بندشیں کھول دیں۔ اُس کا خون کنپٹی سے گزر کر گال کو تر کرتا ہوا بستر کی چادر کو سُرخ کرنے لگا۔ کچھ چھینٹے تکیے اور سامنے کی دیوار پر بھی پڑے تھے، دوپٹہ بھی خون سے رنگین ہو گیا تھا---عشرت بیگم کے ہاتھوں پیروں سے جان نکل گئی تھی۔ شور مچانا تو درکنار، مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے جسم میں رُوح ہی باقی نہ رہی ہو۔ وہ بہت سخت جان اور ظالم عورت تھی جو مجبور لڑکیوں کی آبرو اور زندگیوں کو تماشا بنا کر محفوظ ہوتی تھی۔ اُسے اگر تھوڑی بہت اُمید تھی کہ ہم مال لے کر ان دونوں کی جان بخشی کر دیں گے تو قربان علی کے مرتے ہی یہ خوش فہمی ہوا ہو گئی تھی۔ وہ کُرسی کی پشت سے سر ٹکائے نیم جاں سی گھری ہوئی تھی---میز پر رکھے ہوئے صفحے کی تحریر ہنوز اُدھوری تھی۔ میں نے ڈائری، وہ صفحہ اور کاغذ اس کی طرف بڑھایا۔

''اس میں وہ جملہ بھی شامل کرو کہ ضمیر کی خلش سے مجبور ہو کر تم خودکشی کر رہی ہو---''

''آپ نے وعدہ کیا تھا---مجھے چھوڑ---چھوڑ دو گے۔'' وہ لرزتی ہوئی بولی۔

''میں وعدہ شکن ہوں---بحث نہیں۔ جو کہا، وہ کرو---''

وہ ڈائری کے صفحے کو ڈائری پر رکھ کر گود میں لئے

ی رہی، بال پوائنٹ اُس کے ہاتھ میں لرز رہا تھا۔ اُس ے مجھے پہچان لیا تھا۔ اُسے زندہ چھوڑنے کا مقصد، اُس ے بیان کے بعد پولیس کو اپنے پیچھے لگا لینا تھا۔ رائیونگ لائسنس بنوانے کے لئے میری تصویر ٹریفک لیس کے ریکارڈ میں موجود تھی۔ وہ جیسے ہی چوہدری مجید و یہ بتاتی کہ قربان علی کو مارنے والا ملکو کا بھتیجا اور اُس کا ا کارندہ تھا، وہ کڑی سے کڑی جوڑتا اور پولیس کو میری سویر تک پہنچا دیتا۔ جس کے بعد پورے پنجاب کی لیس میرے پیچھے ہوتی۔ اس کے باوجود نہ جانے کیوں س کے لفظوں پر یقین کرنے کو جی چاہتا تھا۔ شاید اس لئے کہ بنیادی طور پر میں ظالم یا دہشت گرد نہیں تھا۔ میری ک ظلم اور ظالم کے خلاف تھی، بلاوجہ کسی کی زندگی سے کھیلنا میری سرشت میں نہیں تھا---چند لمحے اسی عصابی کش مکش میں گزر گئے۔

''نہیں لکھو گی تو یہ چوہدری تمہیں اذیتیں دے ے کر مارے گا۔ پکا قصائی ہے یہ۔ تمہاری ناک، کان ور ہونٹ کاٹے گا، پھر انگلیوں کی باری آئے گی۔ بے وش نہ ہوئیں تو یہ ہاتھ اور پاؤں بھی کاٹ دے گا---بغدا دیکھ رہی ہو، نا! اس سے یہ پتہ نہیں کتنوں کی یاں جوڑوں سے الگ کر چکا ہے---''

میں نے بیگ کے اُوپر رکھے ہوئے بغدے کی رف اشارہ کیا۔ میں اُسے خوفزدہ کرنا چاہ رہا تھا---وہ ں سے مس نہ ہوئی تو میں نے دادن سے کہا۔

''ٹھیک ہے، چوہدری! شروع ہو جاؤ---''

دادن میری بات سنتے ہی بغدے کی طرف ھا۔ جبھی وہ بول پڑی۔

''میں---میں لکھ دیتی ہوں---''

پھر جلدی سے میرے کہے ہوئے الفاظ لکھنے لگی۔

''جو کچھ آپ نے کہا، ربانی صاحب! میں نے ویسا ہی کیا ہے۔ مجھے اپنے گناہوں کا احساس ہے۔ بہت ظلم کئے ہیں ساری زندگی میں نے، میں واقعی اس قابل ہوں کہ مجھے کڑی سے کڑی سزا ملے---ٹھیک ہے، میں تیار ہوں مرنے کے لئے---آپ ٹھیک کہتے ہو۔ مجھ جیسی نائکائیں لڑکیوں کو خرید کے کوٹھے آباد نہ کریں تو نہ بردہ فروشوں اور لڑکیاں اغوا کرنے والوں کو لالچ ہو، نہ کسی کی بیٹی اغوا ہو اور نہ کسی کا گھر برباد ہو---پتہ نہیں کتنوں کے گھر صرف میری وجہ سے برباد ہوئے ہوں گے---آپ مار ڈالو مجھے، میں ظلم اور گناہوں سے بھری یہ زندگی اب خود بھی نہیں جینا چاہتی---پلیز، دیر نہ کرو۔ مجھے مار دو---میری تو توبہ بھی قبول نہیں ہو گی۔ مار دو گولی مجھے---''

وہ سسکیاں لینے لگی۔ یہ یقین ہونے کے بعد کہ اب موت سے مفر نہیں، اس کے ذہن سے مرنے کا خوف نکل گیا تھا---میں نے اس کے عقب میں آ کر ریوالور کی نال اس کی دائیں کنپٹی سے لگائی اور ایک بار پھر سیفٹی کیچ ہٹایا۔ اُسے ہلکا سا جھٹکا لگا تھا۔ دادن غور سے ہم دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا---اسی لمحے عشرت بیگم کی آواز آئی۔

''یا اللہ! میرے گناہ معاف کر دینا---لا اِلٰہ اِلّٰہ للہ---''

اُس نے کلمہ پڑھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے ساتھ ہی میں پیچھے ہٹ گیا---یعنی موت چند لمحوں کے فاصلے پہ ہو اور آدمی کو پتہ ہو کہ اب زندگی کا اختتام ہوا چاہتا ہے تو پھر وہ سُود و زیاں شمار نہیں کرتا۔ زندگی سے محبت آسائشوں کی موجودگی کی وجہ سے ہو یا رشتوں کی وجہ سے، جب یہ بکھرنے پر آ جائے تو دو ہی باتیں ذہن میں رہ جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ اُس نے کہاں کہاں اور کس کس کے ساتھ زیادتی کی کس پر ظلم کیا اور کس کا حق چھینا اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دوسرے یہ کہ قبر میں جا کر اب حساب کیسے دے گا۔ آخری وقت میں کلمہ پڑھنے اور اپنے گناہوں کی معافی مانگنے والے کے دل میں بھی ایمان کی کیفیت ہوتی ہے۔ یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کس کو کس گناہ میں پکڑ لے اور کس کی کس بات پر معاف کر دے لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ ہے کہ موت کا یقین آ جائے اور گناہوں سے معافی مانگ کر اللہ سے رحم کی اُمید رکھنے والے کے اندر کی دُنیا ہی بدل جاتی ہے۔ زندگی کی بے ثباتی پر یقین اس قدر پختہ ہو جاتا ہے کہ پھر زندہ رہنے کے لئے غلط اور صحیح راستوں میں سے درست کا انتخاب کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

عشرت بیگم حالتِ نزع سے واپس آئی تھی اور نہ جانے کیوں مجھے یقین ہو چلا تھا کہ ان چند لمحوں میں اس پر جو کچھ بیت گیا تھا، اُس نے اُسے سرتاپا لرزا کر ہی نہیں، بدل کر رکھ دیا تھا۔ اُس نے کلمہ پڑھ کر مجھے اُس گناہ سے روک دیا تھا جو میں فائر کی صورت میں کرنے جا رہا تھا۔ مجھے کہیں پر پڑھی ہوئی ایک بات یاد آنے لگی کہ ”خلوص دل سے معافی مانگنے پر تو وہ غفور الرحیم عمر بھر کے گناہ معاف کر دیتا ہے“ ---تو میں کون ہوتا تھا کسی کو معاف نہ کرنے والا؟ معاف کرنا تو خدائی صفات میں سے ایک ہے اور اللہ معاف کرنے والے کے اپنے گناہ بھی معاف کرتا چلا جاتا ہے۔

ریوالور کی نال کنپٹی سے ہٹنے کے بعد ہی کچھ دیر اُس نے اپنی آنکھیں بند رکھیں۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور ریوالور جیب میں ٹھونس لیا---شاید اسے یہ یقین کرنے میں تامل تھا کہ میں نے اسے قتل کرنے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔ اُس نے آنکھیں بند ہی رکھیں۔ اُس کے لب ہل رہے تھے، یوں جیسے وہ کچھ پڑھ رہی ہو۔

”مار دو مجھے، ربانی صاحب! میں خود اس گناہ سے بھری زندگی سے تنگ آ گئی ہوں۔ نہیں جینا چاہتی اب اور گناہ سمیٹنے کی ہمت نہیں ہے مجھ میں۔ آپ کو خدا واسطہ مجھے ختم کر دو۔ زندہ رہوں گی تو اور گناہ سمیٹوں گی---“ اُس نے آنکھیں کھول کر میرا ہاتھ پکڑ لیا رونے لگی---”آپ کو اللہ کا واسطہ، مجھے مار دو، ربانی صاحب---!“

وہ میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے چہرے سے ملنے لگی۔ میری ہتھیلی کی پشت اُس کے اشکوں سے نم ہو گئی تھی، دا حیرت سے ہم دونوں کو دیکھے جا رہا تھا۔ عین آخری میں عشرت بیگم کو نہ مارنے کا فیصلہ خود دادن کے لئے حیران کن ثابت ہوا تھا۔

”اپنے آنسو پونچھ لو، کوئی نہیں مار رہا تمہیں---“ میں نے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔

”لیکن میں نہیں جینا چاہتی----زندہ رہنے کے لئے مجھے پھر یہی سب کچھ کرنا ہوگا، بھیڑ بکریوں کی طرح لڑکیوں کو خرید کر اُن کے جسموں کو بیچنا ہوگا۔ پھر کسی قربان علی اور پولیس والوں کے آگے بلیک میل ہونا ہوگا---پلیز، مجھے مار ڈالو، ربانی صاحب! ایک گنہگار کو مارنا کا کام ہے۔ وہ سب کچھ جو آپ سیف میں باقی چھ آئے ہو، وہ بھی لے جانا۔ دے دینا کسی کو---وہ سب گناہ کی کمائی ہے، میرے کام نہیں آئی تو کسی کے تو کا آ جائے---“

”یہ کام تم خود بھی تو کر سکتی ہو---چھوڑ دو کوٹھا۔ یہ لڑکیاں جو تم نے قید کر رکھی ہیں، آزاد کر دو انہیں اور خود کسی اور شہر جا کر گمنام اور نئے سرے سے زندگی آغاز کرو---اللہ غفور الرحیم ہے، سچے دل سے تو کرنے والوں کو معاف کر دیتا ہے۔ میں نے معاف کیا تمہیں، اگر تم اندر سے بدل گئی ہو تو اسی لمحے سے اپنی

کی شروع کرو---“

”نہیں، ربانی صاحب! آپ نے تو صرف لکھوایا نا! میں خود تھانے میں پیش ہو کر بیان دے دوں گی قربان کو میں نے قتل کیا ہے۔ پھانسی یا عمر قید، کچھ تو سزا چاہئے مجھے---آپ کا یا چوہدری صاحب کا نہیں کی کسی کو، نام بھی نہیں لوں گی---نہیں جینا مجھے میں مرنا چاہتی ہوں---“

اس کی آنکھوں سے لگاتار آنسو بہہ رہے رات نصف سے زیادہ ڈھل گئی تھی لیکن ہم میں سے کی آنکھوں میں نیند کا شائبہ تک نہ تھا۔

”تمہارا کوئی عزیز، رشتہ دار تو ہوگا۔ کوئی ایسا رشتہ تمہارے اس مکروہ دھندے کا عِلم نہ ہو---؟“

”سب مر کھپ گئے---برسوں گزر گئے، میں کسی نہیں ملی۔ میں نے خود ہی چھوڑ دیا تھا سب کو---مجھ ری ماں اور بہنوں پر بُرا وقت آیا تھا تو سب نے چھوڑ تھا ہمیں۔ باپ مر گیا تھا، بھائی کوئی تھا ہی نہیں۔ دو بھوکے رہ کر گزارے ہم نے، پھر ایک نے مدد بہانے میری عزت لُوٹ لی۔ وہی مجھے ان رستوں پر تھا---تب میں نے گناہ اور ثواب کے بارے میں چھوڑ دیا اور ساری جوانی یہی کچھ کرنے میں گزار عمر ڈھلنے لگی تو قربان علی کو ساتھ لے کر یہاں آ گئی کوٹھا بنا لیا۔ کبھی سوچا ہی نہ تھا کہ ایک دن موت بھی ہے۔ زندگی ایک دم سے ختم ہو جاتی ہے، یہ کبھی ذہن میں نہیں آیا تھا---ابھی کچھ دیر پہلے ہی یہ زندہ ---“ اُس نے قربان علی کی لاش کی طرف اشارہ ---”دیو کی سی طاقت تھی اس میں، کسی بے بس کی طرح مارا گیا---نفرت ہو گئی ہے مجھے خود سے اس مکروہ، گناہوں سے بھری زندگی سے---ربانی صاحب! مجھے مار ڈالو ورنہ میں خود اپنے آپ کو مار دُوں گی---“

”تم زندہ رہ کر بھی اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر سکتی ہو---دوسروں کے کام آ کر، انہیں بھٹکنے سے بچا کر---تمہاری بہنوں کا کیا بنا؟“

”سب نے اچھے اسکولوں میں پڑھا، اچھی جگہوں پر شادی ہو گئی۔ اُن کے سسرال والوں کو یہی پتہ ہے کہ میں ہانگ کانگ میں رہتی ہوں، کسی کمپنی میں کام کرتی ہوں جہاں مجھے بہت اچھی تنخواہ ملتی ہے۔ پاکستان کا بتاتی تو کوئی نہ کوئی سر ہو جاتا، پتے ٹھکانے کی تفصیل کے لئے---بھاری جہیز دیا تھا دونوں کو، اسی حرام کی کمائی سے---“

”اور ماں---؟“

”اُسے پتہ تھا سب کچھ لیکن وہ چپ کر گئی تھی۔ کیا کہتی، یہ سب حرام ہے۔ ناجائز ہے، بے غیرتی کی روٹی نہیں کھا سکتی وہ؟---بھوک آدمی سے حرام حلال کی تمیز

شگفتہ شگفتہ

شورکوٹ ریلوے سٹیشن سے رات نو بجے راوی ایکسپریس لاہور کے لئے روانہ ہونے والی تھی، تمام بوگیاں کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں۔ اچانک ایک شخص کے ذہن میں ایک ترکیب آئی اور اُس نے شور کرنا شروع کر دیا کہ اِس بوگی میں سانپ گھس گیا ہے۔ فوراً ہی ساری بوگی خالی ہو گئی۔ شور کرنے والا شخص اُس بوگی میں گھس کر آرام سے سو گیا۔ صبح جب اُس کی آنکھ کھلی تو اِس نے دیکھا کہ گاڑی ایک سٹیشن پر کھڑی ہے۔ اُس نے ایک قلی سے پوچھا۔

”بھائی صاحب! لاہور آ گیا ہے؟“

قلی نے جواب دیا۔ ”رات کو اِس بوگی میں سانپ گھس گیا تھا اِس لئے اِس بوگی کو ٹرین سے کاٹ دیا گیا تھا، یہ بوگی شورکوٹ ہی کھڑی ہے۔“

طارق نعیم بدر، شورکوٹ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چھین لیتی ہے، بے غیرتی اور غیرت کی روٹی میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ روٹی آٹے سے بنتی ہے اور آٹا پیسوں سے آتا ہے جو میری ماں کے پاس نہیں تھے---وہ بیٹیوں کی رُخصتی تک زندہ رہی۔ پھر ایک روز مرگئی، شاید زیادہ دن حرام اور گناہوں کی کمائی کھانا اُس کے لئے ممکن نہیں تھا---''

''مکان اپنا تھا---؟''

''پہلے کرائے کا تھا، پھر میں نے چار مرلے کا گھر خرید لیا گڑھی شاہو میں---دومنزلہ تھا۔ نیچے کرائے دار رہتے ہیں، اُوپر دو کمرے بنے ہوئے تھے۔ میری ماں وہیں رہتی تھی، کرایہ اُس کو مل جاتا تھا۔ وہ مرگئی تو کرایہ دونوں بہنیں لے جاتی ہیں، آدھا آدھا---اُوپر کے کمرے خالی ہیں۔ کبھی کبھی میں ہی جا کر ٹھہرتی ہوں وہاں۔''

''پھر تمہارے لئے کیا مسئلہ ہے---ہانگ کانگ چین کو واپس ملنے والا ہے، کمپنیاں بند ہو رہی ہیں، تمہاری بھی نوکری ختم ہوگئی ہے سو تم واپس آگئی ہو---کتنا کرایہ ہے؟''

''چار ہزار---'' وہ کافی حد تک نارمل ہوگئی تھی۔

''تمہارے اکیلی کے لئے کافی ہے---یہاں کسی کو تمہارے اُس ٹھکانے کا علم ہے؟''

''نہیں، قربان علی کو تھا---''

''یہ مر چکا ہے، پیچھے نہیں آسکتا تمہارے---سیف میں پیسے اور زیور پڑے ہوئے ہیں، ساتھ لے جاؤ۔ بیچ کر کوئی پلاٹ وغیرہ لے لینا یا کسی ماہانہ اسکیم میں ڈال دینا، تمہیں تنگی نہیں اٹھانا پڑے گی---یہ گھر کس کا ہے---تمہارا؟''

''کرائے کا ہے---''

''تالہ لگاؤ اور نکل جاؤ---بلکہ دوبارہ ایک تحریر لکھو، آخر میں تھوڑی سی تبدیلی کر کے۔ لکھو کہ قربان کو [...] کرنے کے بعد تم خود کو بھی ختم کرنے جا ر[...] ہو---تمہارا ارادہ نہر میں کود کر خودکشی کرنے کا ہے، کو[...] تمہیں تلاش نہ کرے---آخر میں اپنا نام لکھ کر دستخط کر[...] اور یہ کاغذ یہیں چھوڑ دو، اس کی لاش کے پاس۔ [...] ہوتے ہی نکل جانا۔ عبایہ یا بُرقعہ جو بھی پاس ہو، پہن[...] نکلنا---لاہور میں بھی کھلے مُنہ مت پھرنا ورنہ کوئی نہ کو[...] پہچان لے گا تو عذاب میں آجاؤ گی---''

وہ ڈائری اُٹھا کر ایک بار پھر نئے سرے [...] اعتراف نامہ لکھنے لگی۔

☆☆

دادن کرسی پر بیٹھ کر ری لیکس ہوگیا تھا۔ قربان کی لاش بیڈ پر اوندھے مُنہ پڑی تھی۔ اُس کا نچلا [...] شنیل کے لحاف کے اُوپر تھا۔ رسیاں کھل جانے کے [...] اس کی ٹانگیں واپس بیڈ پر آگئی تھیں اور بازو بھی اور [...] آڑے ترچھے پڑے ہوئے تھے۔ اُس کی لاش [...] شروع ہوگئی تھی، مُنہ اور آنکھیں بھیانک انداز میں رہ گئے تھے۔ دادن نے خون آلود دوپٹے کو اُس چہرے پر ڈال دیا۔

''اس کا کیا کرنا ہے، ربانی صاحب---؟''

''ایسے ہی چھوڑ جائیں بلکہ اس پر لحاف [...] دو، کوئی لڑکی دیکھ کے ڈر ہی نہ جائے۔ میں اتنے میں [...] سے مل کر آتا ہوں---''

''ان لڑکیوں کا کیا کروں، یہ کہاں جائیں یہاں سے نکل کر---؟'' عشرت بیگم کسی ممتا کی [...] ماں کے سے انداز میں بولی۔

مجھے لیلیٰ اور رابی کی فکر نہیں تھی، ان کے گھر [...] تھے۔ تھوڑی بہت کوشش کر کے انہیں دوبارہ ان گھروں میں پہنچایا جا سکتا تھا، اصل مسئلہ کومل کا تھا۔

مجبور ماں کی ناجائز اولاد تھی جسے خود بھی اس کے باپ کا پتہ نہیں تھا۔ اس نے ایک کوٹھے پر ہی جنم لیا تھا اور جوان ہونے پر مختلف گاہکوں اور کوٹھوں پر منتقل ہوتی ہوئی یہاں تک پہنچی تھی۔ دُنیا میں اس کا کوئی رشتہ نہیں تھا جو اسے سنبھال سکتا---مجھے عشرت بیگم کا خیال آیا جو اس گھناؤ کاروبار سے توبہ کرنا چاہتی تھی۔ کومل کے لئے اُس سے بہتر کوئی ٹھکانہ نہیں ہو سکتا تھا لیکن اس کے لئے ضروری تھا کہ میں پہلے کومل سے بات کرتا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ عشرت بیگم کومل کو ساتھ رکھنے سے کبھی انکار نہیں کرے گی---میں اُٹھا اور رابی کے کمرے کی طرف آگیا۔ لیلیٰ مجھے بتا چکی تھی کہ اگلا کمرہ چھوڑ کر اُس سے اگلا کمرہ رابی کا ہے۔ میں نے دروازے کو دھکیلا جو اندر سے مقفل نہیں تھا، اور اندر داخل ہوگیا۔

رابی کے کمرے کا سائز لیلیٰ کے کمرے سے قدرے چھوٹا تھا۔ تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ باقی ترتیب تقریباً وہی تھی۔ وہی ایک ڈبل بیڈ جس کے ساتھ دو کرسیاں اور درمیان میں ایک چھوٹی میز رکھی گئی تھیں۔ ایک کونے میں لکڑی کے اسٹینڈ پر چھوٹے سائز کی فریج اور دیواروں پر نیم عریاں اور ہیجان انگیز بڑی بڑی تصاویر---یہ چیز میں نے لیلیٰ کے کمرے میں نہیں دیکھی تھی۔

وہ دونوں شنیل کے لحاف میں لپٹ کر بیٹھی شاید موجودہ صورتِ حال کے بارے میں ہی گفتگو کر رہی تھی۔ مجھے اندر آتا دیکھ کر چپ ہوگئیں۔

''کیا ہوا---مار دیا اُس سُور کو---؟'' لیلیٰ نے بے چینی سے پوچھا۔

''نہیں، ابھی صرف بے ہوش کیا ہے۔ بہت ٹرٹر کر رہا تھا---'' میں نے رابی کو خوف کی کیفیت میں مبتلا ہونے سے بچانے کو کہا۔ ''کیا کہتی ہے تمہاری یہ پیاری

صبر

صبر اپنے وقت پر ہوتا ہے' مدت گزر جانے کے بعد تو ہر ایک کو صبر آ جاتا ہے لیکن وہ باعث ثواب نہیں ہوتا۔ صبر وہی باعث اجر ہوتا ہے جو ارادہ اور اختیار سے مصیبت کو دبانے کے لئے کیا جائے۔ حدیث شریف میں ہے کہ ایک بڑھیا کا جوان بیٹا مرگیا۔ حضرت محمدؐ اُدھر سے گزرے۔ بڑھیا واویلا' فریاد اور بین کر کے رو رہی تھی۔ آپؐ نے فرمایا۔

''صبر کر---''

وہ آپ کو پہچانتی نہ تھی' جواب دیا۔ ''ہاں' تمہارا جوان بیٹا مرگیا ہوتا تو پتہ چلتا۔''

آپ چل دیئے۔ کسی نے بڑھیا سے کہا کہ اللہ کے رسولؐ تھے۔ وہ دوڑی دوڑی آئی اور کہا کہ مَیں اب صبر کروں گی---آپؐ نے فرمایا۔

ترجمہ: ''صدمہ اور رنج پہنچتے ہی آدمی صبر کرے تو موجب اجر ہوتا ہے۔''

(خطبات حکیم اسلام جلد نمبر ۵ صفحہ ۲۸۰)

ایف اے شاکر' لاہور

فرینڈ، چلنا ہے---؟''

''جی، سر! بس ایک ہی خوف ہے۔ پتہ نہیں، میری ماں کا کیا بنا؟ اگر وہ زندہ ہوتی تو مجھے کوئی ڈر نہیں ہے لیکن خدانخواستہ اُسے کچھ ہو گیا ہوا تو---تو دوسرے رشتے دار مجھے جیتے جی مار دیں گے---''

''رابعہ!---یہی نام ہے نا تمہارا---؟'' میں کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''گناہوں کی اس منڈی میں تم اپنے شوق سے نہیں آئی تھیں۔ تمہارے ساتھ ظلم ہوا تھا، اغوا کیا گیا تھا تمہیں دھوکے سے۔ بے گناہی میں جو کچھ تم نے سہا ہے، اللہ بھی اُسے دیکھ رہا ہے۔ میری دعا ہے کہ تمہاری ماں سلامت ہو۔ ہم وہاں جا کر خود دیکھیں گے۔ اگر وہ ہوئیں تو رُک جانا ورنہ تمہیں کہیں نہ کہیں ایڈجسٹ کرانا میری ذمہ داری ہے۔ میں تمہیں بھٹکنے کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لئے نہیں چھوڑوں گا---اگر تم تیار ہو نکلنے کے لئے تو تیاری کرو۔کوئی بیگ، سُوٹ کیس وغیرہ ہو تو اس میں اپنے کپڑے اور جیولری وغیرہ رکھ لو۔بُرقعہ یا عبایا جو بھی ہو، وہی پہن کر نکلنا ہے اور اگر نہیں ہے تو چادر وغیرہ لپیٹ لینا۔چہرہ چھپا کر نکلنا ہے تاکہ مرید کے میں پہچانی نہ جاؤ---لیلیٰ! تم نیہا اور کومل کو بھی ادھر ہی بلا لاؤ---''

لیلیٰ اُٹھ کر باہر نکلی تو میں نے رابی کو سمجھایا۔

''نیہا اور کومل کے سامنے قربان علی کے ساتھ ہونے والے سُلوک کا ذکر مت کرنا---یہاں سے نکل کر ہر کوئی الگ الگ ہو کر ایک دوسرے سے بچھڑ جائے گا۔جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے، تم نے صرف یہ بات مدِ نظر رکھنی ہے کہ اللہ نے تمہاری مدد کی ہے اور اس گناہوں کے بازار سے نجات دِلا کر تمہیں ایک بار پھر اپنے اپنے گھروں کا رستہ دکھایا ہے۔''

اُس نے میری طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

''میں تو اتنی گنہگار ہوں کہ آپ کو بھائی بھی نہیں کہہ سکتی، سر! لیکن آپ جو کوئی بھی ہیں، ہمارے لئے فرشتے سے کم نہیں۔ناراض نہ ہو تو ایک بات پوچھ سکتی ہوں---؟''

''ضرور پوچھ---اور ہاں، مجھے بھائی کہنا چاہتی ہو تو کہہ سکتی ہو۔میں مصنوعی رشتے بنانے کا عادی نہیں ہوں لیکن ایسا بھی نہیں کہ کوئی مجھے کسی محترم اور مقدس رشتے سے پکارے تو میں اسے جھڑک دوں۔اگر بھائی کہہ کر تمہیں خوشی مل سکتی ہے تو میں یہ خوشی چھینوں گا نہیں۔ویسے میرا نام خرم ہے، چاہو تو نام بھی لے سکتی ہو---''

''اللہ آپ کو سلامت رکھے، خرم---!''

وہ چاہنے کے باوجود بھائی نہ کہہ سکی، شاید یہ اس کے اندر کا وہ احساس گناہ تھا جس میں حالات کے جبر نے اُسے غلاظت کی مانند لتھیڑ دیا تھا۔

''آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں، ہمارا تو کوئی رشتہ بھی نہیں آپ سے---لیلیٰ کہتی ہے کہ آپ نے اُسے ہاتھ تک نہیں لگایا، نہ ہی یہ کوئی عشق و محبت کا معاملہ ہے۔یہاں تو جو بھی آتا رہا ہے، کُتوں کی طرح ہمیں بھنبھوڑ کے اور اپنے خرچ کئے ہوئے ایک ایک پیسے کا عوض وصول کر کے جاتا رہا ہے---آپ کون ہیں، کیوں ہمیں یہاں سے نجات دلانا چاہتے ہیں؟''

''ان سوالوں کے جواب تو میرے پاس بھی نہیں، رابی! کون ہوں؟ تمہیں اپنا نام بتا چکا ہوں۔اس سے زیادہ تو میں خود بھی نہیں جانتا کہ میں کون ہوں، بس تمہاری طرح ہی ایک گنہگار انسان ہوں جو اس طرح کے کاموں میں سکون ڈھونڈتا ہے۔اس سے آگے اور کچھ مت پوچھنا، پلیز---ہاں، یاد آیا۔تمہیں ان دو افراد کے آفس کا نام یاد ہے جہاں کے لئے انہوں نے تمہیں جاب دلانے کا کہا تھا---''

''جی، وہ میں کیسے بھول سکتی ہوں۔اُسی جاب کے دھوکے میں ہی تو میں نے اپنا سب کچھ گنوا دیا لیکن مجھے شک ہے کہ انہوں نے سچ نہیں بولا تھا البتہ وہ گھر مجھے اچھی طرح یاد ہے جہاں بے ہوشی کی کیفیت میں وہ مجھے لے گئے تھے۔میں وہاں کافی دن قید رہی تھی۔وہ گھر کسی حنیف بٹ کا تھا جو انگلینڈ میں رہتا تھا اور کبھی کبھی لاہور آتا تھا۔میں نے ایک دن ان کی باتیں سُن کر اندازہ لگایا تھا---''

''کس علاقے میں---؟''

''علاقہ تو میں نہیں جانتی کیونکہ وہ مجھے بے ہوش کر کے لے گئے تھے البتہ جس کمرے میں انہوں نے مجھے بند کر کے رکھا تھا، اس کی ایک کھڑکی جس طرف کھلتی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھی، وہاں سے ایک عمارت کی پہلی منزل پر اسکول کا بورڈ لگا ہوا تھا ''ماڈل آف ایجوکیشن انگلش اسکول'' کا۔ صبح ہی صبح اسمبلی کی آوازیں بھی آتی تھیں۔ میں جس گھر میں تھی، وہ دومنزلہ تھا۔ کافی چوڑی گلی تھی---'' وہ یاد کرتے ہوئے بولی۔ ''سفید اور ہلکے چاکلیٹی رنگ کا پینٹ تھا دیواروں پر اور ہاں، گیٹ کالے رنگ کا تھا۔ جس روز جانی اور اسد نے مجھے اس دلال کے ساتھ بھیجا تھا، اس روز وہاں سے نکلتے ہوئے میں نے کوشش کی تھی کہ اس جگہ کو یاد رکھ سکوں۔ گلی سے باہر نکلتے ہی مین روڈ پر پیلے سے بورڈ والا ایک پیٹرول پمپ آیا، پھر یونائیڈ کرسچن ہاسپٹل اور پھر مال روڈ آ گیا--- میں اس گلی تک پہنچ جاؤں تو اس گھر کو فوراً پہچان سکتی ہوں---''

''تم ایک بار اپنی ماں تک پہنچ جاؤ، یہ میرا وعدہ ہے کہ اگر زندگی اور اللہ کی مدد شاملِ حال رہی تو اس جانی اور اسد کو ان کے کئے ہوئے ظلم کی سزا دے کر رہوں گا--- بس دُعا کرنا---''

''اللہ آپ کو ہر بُری گھڑی سے بچائے، خرم! مجھ گنہگار کے پاس تو صرف دُعائیں ہی ہیں، پتہ نہیں قبول بھی ہونگی یا نہیں لیکن اگر اللہ نے مجھے معاف کر دیا اور میری کوئی دُعا قبولیت تک پہنچی تو وہ آپ کی لمبی عمر اور سلامتی کی ہوگی---''

لیلیٰ، کومل اور نیہا کو بلا لائی تھی۔ ہم نے مختصر طور پر اُن کے سامنے صورتِ حال رکھی کہ اُن کے دُکھوں کا زمانہ اب ختم ہوا، اب کوئی انہیں جبری طور پر نہ گناہ پر مجبور کرے گا اور نہ ظلم و تشدد کر کے اس گھر میں زبردستی روکے گا۔ میں نے یہ بتانے سے گریز کیا تھا کہ قربان علی مارا جا چکا ہے--- کچھ دیر وہ میری اور لیلیٰ کی باتیں توجہ سے سنتی رہیں۔

''کوئی سوال---؟'' میں نے دونوں سے پوچھا۔ ''کومل! پہلے تم پوچھو---''

''میرا دنیا میں کوئی ٹھکانہ ہی نہیں ہے، سر! یہاں سے نکل کر کہاں جاؤں گی--- کوٹھے پر پیدا ہوئی تھی، کوٹھوں پر ہی آج تک ہر سانس لی ہے اور ایک دن کسی کوٹھے پر ہی مر جاؤں گی۔ مجھے تو یہ بھی علم نہیں کہ شریف گھرانے کیسے ہوتے ہیں، ان کی عورتیں کیسے زندگی گزارتی ہیں اور اُن کے گھر کا ماحول کیسا ہوتا ہے؟--- میں نے جہاں بھی وقت گزارا ہے، گھنگھرو، ہارمونیم، طبلے، سارنگی، ناچ گانا، واحیات گفتگو اور ننگا پن ہی دیکھا ہے۔ شرم و حیاء کیا ہوتی ہے، مجھے نہیں پتہ--- ادا اور سٹائل کیا ہوتے ہیں، ہر جگہ یہی سکھایا گیا۔ مرد کو کیسے بیوقوف بنانا ہے، کیسے اُسے خوش کر کے زیادہ سے زیادہ پیسے نکلوانے ہیں، مجھے اسی کی تربیت دی گئی ہے۔ مجھے نہیں پتہ، سر! کہ یہاں سے نکل کر میں جہاں بھی جاؤں گی، وہاں مجھے شرافت کی زندگی کون جینے دے گا۔''

''عشرت بیگم کیسی عورت ہے تمہاری نظر میں---؟''

''ویسی ہی جیسے ہر کوٹھے کی نائیکہ ہوتی ہے--- پیسے والوں کی خوشامد کرنے اور زرخرید لڑکیوں کو دبا کر رکھنے والی---''

''اگر میں کہوں کہ وہ بدل گئی ہے، توبہ کر کے اب شرافت سے جینا چاہتی ہے تو کیا اُس کے ساتھ رہ سکو گی؟--- وہ خود بھی گناہوں بھری اس ذِلت آمیز زندگی سے تنگ آ گئی ہے، نکلنا چاہتی ہے خاموشی سے یہاں سے۔ لاہور میں اس کا گھر ہے جس کی نچلی منزل کرائے پر دے رکھی ہے اس نے، اوپر کا گھر خالی ہے۔ باقی زندگی وہ ایک شریف عورت کی طرح چپ چاپ رہ کر گزارنا چاہتی ہے---''

وہ طنزیہ سی ہنسی ہنس دی۔ ''نو سو چوہے کھا کے بلی حج کرنا چاہتی ہے--- نہیں، سر! اگر اس نے ایسا کیا ہے تو جھوٹ بولا ہے۔ مچھلی بھی کبھی پانی سے دور زندہ رہ سکتی ہے---؟''

''اللہ جب کسی کو ہدایت دینے پر آ جائے تو دیر نہیں لگتی--- بہر حال، تم اسے مانوس بھی ہو اور تم دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت بھی ہے---''

لیلیٰ نے اس دوران بات سنبھال لی۔ بالآخر وہ اس لئے بھی مان گئی کہ اگر یہ کوٹھا بند ہو رہا ہے تو وہ اکیلی کیسے رہ پائے گی--- نیہا نے صرف اس خوف کا اظہار کیا تھا کہ اُس کے گھر والے اُسے قبول بھی کر سکیں گے یا غیرت کے نام پر قتل کر دیں گے۔ میں نے اسے تسلی دی کہ اگر اُس کے گھر کے دروازے نہ کھلے تو میں اس کے لئے کہیں اور انتظام کر دوں گا جہاں وہ عزت سے رہ سکے گی۔ اس کے بعد کے کام آسان تھے۔ سب اپنے اپنے کمروں میں جا کر نکلنے کی تیاری کرنے لگیں۔ سب کے پاس عبائے موجود تھے اور ہر ایک نے عبایا پہن کر ہی نکلنا تھا۔ میں نے سختی سے کہہ دیا تھا کہ سوائے کپڑوں اور جیولری کے کوئی بھی چیز ساتھ نہ لیں اور کپڑے بھی وہ جو اچھی حالت میں ہوں، بیکار کا وزن بعض اوقات سفر میں عذاب بن جاتا ہے--- میں نے انہیں لیلیٰ کے کمرے میں آنے سے روک دیا تھا، صرف لیلیٰ ہی میرے ساتھ اپنے کمرے میں واپس آئی تھی۔

عشرت بیگم کی ڈائری میں نے اپنے پاس رکھ لی تھی اور ڈھکے چھپے لفظوں میں یہ بتا دیا تھا کہ میں کسی بھی وقت اُس کے گھر، گڑھی شاہو آ کر چیک کروں گا کہ وہ اپنے وعدے پر قائم ہے یا پھر سے گناہوں کے کاروبار کی طرف پلٹ گئی ہے--- ڈائری میں بے شمار فون نمبر اور پتے موجود تھے۔ میں نے وہ ڈائری کسی مناسب وقت میں اس کے گھر آ کر لوٹانے کا کہہ دیا، ساتھ ہی یہ بھی کہ اُس کا قتل مجھ پر اُدھار ہے۔ وہ جس دن اپنے قول سے پھرے گی، اُس دن سے ریوالور کی اس گولی کا بھی اسے انتظار کرنا ہوگا جس پر اس کا نام لکھا ہوگا--- وہ بار بار رونے لگتی تھی، قسمیں کھاتی تھی اور میرا شکریہ ادا کرنے لگتی تھی جس نے اسے گناہوں کے کاروبار سے نکلنے کا موقعہ فراہم کیا تھا--- پھر وہ نیچے جا کر سفر کی تیاری کرنے لگی۔

میں نے دادن کے ساتھ مل کر ایک کپڑے سے اُن تمام جگہوں کو اچھی طرح صاف کر دیا جہاں جہاں میرے اور دادن کی انگلیوں کے نشان آنے کی توقع تھی۔ دروازے کا ہینڈل، چٹخنی، میز، کرسیاں، پھر نیچے ڈرائنگ رُوم میں جا کر صوفے اور بیرونی دروازہ۔ رابی کے کی کرسی، غرض کہ ہم نے کوئی بھی امکانی جگہ نہیں چھوڑی تھی--- میں نے عشرت بیگم سے تمام ضروری کاغذات ساتھ رکھنے کو کہہ دیا تھا۔ ہر ایسا کاغذ جو غیر ضروری تھا اور جس سے عشرت بیگم کے کسی پتے ٹھکانے کے ملنے کی اُمید تھی، فالتو لفافے اور پرانے خط، ہر ایسا کاغذ ہم نے کچن کے سنک میں رکھ کر جلا ڈالا اور راکھ کو پانی میں بہا دیا۔ چھری اور رسیاں میں نے واپس بیگ میں رکھ دی تھیں۔

فجر کی اذانیں ہو رہی تھیں جب ہم ساتوں افراد یہ گھر چھوڑنے کے لئے تیار تھے۔

☆☆

طے یہ ہوا تھا کہ دادن رابی اور نیہا کو ساتھ لے کر سب سے پہلے گھر سے نکل کر اسٹاپ پر پہنچے گا۔ وہاں سے وہ گوجرانوالہ جانے والی کسی بھی ویگن میں سوار ہو کر پہلے گوجرانوالہ جائیں گے۔ کسی اچھے ریسٹوران سے ناشتہ کریں گے اور واپس لاہور روانہ ہو جائیں گے۔ جنرل بس سے پہلے ہی یادگار کے موڑ پر اُتر کر وہ وہیں پارک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں بیٹھ کر میرا انتظار کریں گے۔ میں عشرت بیگم کو اکیلے گھر سے بھیجنے خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا، شیطان کو انسانی ذہن پر حاوی ہونے میں دیر نہیں لگتی۔ بہت ممکن تھا کہ گھر سے نکل کر تنہائی میسر آتے ہی وہ کومل کو لے کر اپنے یار حوالدار کے پاس پہنچ جاتی اور ہم مرید کے کے بس اسٹاپ پر ہی دھر لئے جاتے--- میں نے دادن کو گوجرانوالہ بھیجنے کا پروگرام بھی عشرت بیگم سے چھپا لیا تھا۔ میرا ارادہ عشرت بیگم، کومل اور لیلیٰ کے ساتھ ہی نکلنے کا تھا۔ اسٹاپ پر پہنچ کر میں اسے ناروال کی بس پر سوار کرا دیتا جہاں سے وہ لاہور کی بس میں واپس آتی اور اپنے گھر لاہور پہنچ جاتی۔ کومل نے اس کے ساتھ ہی ہونا تھا جب کہ ان کے سوار ہونے کے بعد میں لیلیٰ کے ساتھ گوجرانوالہ ہی جاتا اور وہاں سے ہم واپس لاہور پہنچ جاتے--- یہ ساری احتیاط میں نے اس لئے سامنے رکھی تھی کہ اگر پولیس کو کسی بھی طرح دو چار روز میں خبر ہو بھی گئی کہ قربان علی کی لاش اوپر کسی کمرے میں سڑ رہی ہے تو اسے گلی، محلے یا بس اسٹاپ سے کوئی بھی ایسا شخص نہ مل سکے جس نے ایک ساتھ سب کو گھر سے نکلتے یا لاہور کی طرف جاتے دیکھا ہو۔

ہم نے آخری بار وہیں کچن کے باہر سردی میں کھڑے ہو کر ایک ایک کپ چائے پی۔ اپنی انگلیوں کے نشان ان کپس سے صاف کئے اور پھر دادن، نیہا اور رانی کو خدا حافظ کیا۔ عشرت بیگم اُن کے نکلنے کے بعد دروازہ خود بند کر کے آئی تھی--- اُس کی لکھی ہوئی تحریر ہم نے قربان علی کی لاش کے ساتھ ہی لحاف کے نیچے چھوڑ دی تھی، ساتھ ہی اُس کا پستول بھی۔

اس وقت صبح کے آٹھ بجنے کو تھے۔ دادن کے جانے کے بعد ہم نے کم از کم آدھے سے پونا گھنٹہ انتظار کرنا تھا تاکہ وہ اس وقت تک مرید کے سے باہر جا چکے ہوں۔ لیلیٰ بار بار کلائی سے بندھی گھڑی کی طرف دیکھتی تھی اور کافی مضطرب تھی۔ ان چاروں لڑکیوں کو یہ خبر نہیں تھی کہ قربان مارا جا چکا ہے، انہیں یہی بتایا گیا تھا کہ وہ بے ہوش پڑا ہے۔ لیلیٰ اور کومل کو ہی فکر کھائے جا رہی تھی کہ کہیں وہ ہوش میں نہ آ جائے اور ان کے لئے مصیبت کھڑی نہ کر دے۔

اپنے اپنے بیگ اور بریف کیس اُٹھا کر ہم نکلنے ہی والے تھے کہ اچانک دروازے کی گھنٹی بجی۔ ہم چاروں ہی ایک دم سے یوں اُچھلے تھے جیسے دروازے پر بم پھٹ گیا ہو--- لیلیٰ نے جلدی سے اپنا عبایہ اُتارا اور بولی۔

''آپ لوگ رُکیں، میں دیکھتی ہوں---''

ہم تینوں دروازے کے سامنے سے ہٹ گئے تاکہ دروازہ کھلنے پر کوئی باہر سے ہمیں نہ دیکھ سکے۔ لیلیٰ دروازے تک گئی۔ چند لمحے گزرنے پر وہ واپس آئی تو اُس کا رنگ فق ہو رہا تھا، لگ رہا تھا جیسے گرنے ہی والی ہے۔ میں نے ایک دم سے اُسے تھام لیا۔ عشرت بیگم اور کومل بھی پریشان ہو گئی تھیں۔

''کون ہے دروازے پر---؟''

میں نے اور عشرت بیگم نے بیک وقت پوچھا۔

''پ--- پولیس--- پولیس والے---!''

وہ بمشکل اتنا ہی کہہ سکی۔ میرے پیروں سے جیسے زمین نکلنے کو تھی، لگتا تھا کہ طوائف نے دھوکا دے کر ہمیں پھنسا ہی دیا تھا۔

☆☆

○ توصیف کے دل میں کوئی کھوٹ نہیں تھا، وہ تو کسی کو نئی زندگی سے روشناس کروانے کی خاطر وہاں گیا تھا لیکن حالات یوں پلٹ جائیں گے، اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا--- آگے کیا ہوا، یہ جاننے کے لئے اس دلچسپ روداد کی 112ویں قسط پڑھنا نہ بھولئے گا۔

غم کے رنگ ہزار

☆ اعتبار ساجد

زندگی کے کینوس پر ہر کوئی ایسے رنگ بکھیرنا چاہتا ہے جو خوبصورت ہوں، دوسروں کو خوشنما دکھائی دیں لیکن سب کچھ تو اپنے اختیار میں نہیں ہوتا، نا! کچھ وجود دنیا میں آتے ہی اسی لئے ہیں کہ جیسے دکھ اور غم ان کے منتظر ہوں۔ اعتبار ساجد خوبصورت جذبوں کے اظہار کا ہنر رکھتے ہیں لیکن کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ زندگی سے وابستہ سچائیاں دکھی کر دیتی ہیں۔ آپ کے دل پر ایک دستک!

غم جن کے مقدر میں ہوں، خوشیاں انہیں کب راس آتی ہیں۔ آپ ہی بتائیے کیا اس کا فیصلہ غلط تھا؟--- کہتے ہیں، بیٹے پیدا ہوتے ہیں تو دیواریں لرزنے لگتی ہیں کہ ان کی کم بختی آ گئی۔ بیٹیاں پیدا ہوں تو گھر کے در و دیوار مسکرانے لگتے ہیں کہ انہیں سجانے اور سنوارنے والی آ گئیں۔ لیکن عابدہ ایسی بیٹی تھی کہ پیدا ہوئی تو گھر کی دیواریں سوگ میں ڈوب گئیں۔ اس کی پیدائش کے فوراً بعد ماں کا انتقال ہو گیا۔ وہ اپنے گھر کی پہلی اولاد تھی۔ باپ صادق علی چونگی میں محرر تھے۔ انہوں نے بیوی کی موت کے بعد بیٹی کو ماں بن کر پالا۔ عابد کسی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بات پر روتی تو ان کا دل پھٹنے لگتا۔ ایک لمحے کے لئے بھی وہ عابدہ کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ کہتے تھے کہ جب عابدہ روتی ہے تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے مرحومہ رو رہی ہے۔ پاکستان کے مختلف شہروں میں ان کے بہت سے عزیز تھے مگر انہوں نے سوائے عابدہ کے ماموں کے کسی اور سے تعلق نہیں رکھا۔ ماموں خود صاحب اولاد تھے مگر عابدہ سے انہیں اتنا پیار تھا کہ جب ان کی بہن کا انتقال ہوا تو وہ عابدہ کو گھر لے آئے اور اسی گھر میں اس کی پرورش ہوئی۔ صادق علی دل ہی دل میں عابدہ کی ماں کے غم میں گھلے جا رہے تھے۔ کئی مرتبہ دوستوں نے دوسری شادی کا مشورہ دیا مگر یہ کہہ کر وہ سختی سے انکار کر دیتے کہ اب انہیں شادی کی کوئی تمنا نہیں، وہ ساری زندگی عابدہ کی پرورش میں وقف کر دیں گے مگر موت نے اس عزم کو تکمیل تک نہ پہنچانے دیا۔ ایک دن شاید عید سے ایک روز قبل، چاند رات عابدہ کے کپڑے اور مٹھائیاں لا رہے تھے کہ راستے میں ایک ٹرک کی زد میں آ گئے۔ کپڑے اور دوسرے بنڈل لہو میں تر ہو گئے۔ گھر پر ان کی بجائے ان کی لاش آئی۔ عابدہ اس وقت گیارہ سال کی تھی اور ماموں زاد بہن رشیدہ باجی کے ہاتھوں پر مہندی لگا رہی تھی۔ ابا کی لاش دیکھ کر اس پر سکتہ طاری ہو گیا۔ گھر بھر میں کہرام مچ گیا۔ آنے والی عید کی خوشیاں آنسوؤں میں تر ہو گئیں۔ رو رو کر عابدہ کا بُرا حال ہو گیا۔ موت نے اس کا واحد سہارا چھین لیا تھا۔ باپ کی ناگہانی موت سے اسے ایسا صدمہ پہنچا کہ وہ بچپن کے چونچلے، قہقہے اور شوخیاں بھول گئی لیکن وقت بڑا ظالم ہے ہر زخم کو بھر دیتا ہے، ہر یاد کو بھلا دیتا ہے۔ عابدہ بھی بڑھتی ہوئی عمر اور گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ باپ کی ناگہانی موت کے صدمے سے سنبھلتی گئی لیکن ہر عید کی رات اس کے دل کی عجیب سی کیفیت ہوتی۔ آنسو تو خیر اس کا مقدر بن گئے تھے، ذرا ذرا سی بات پر اس کی آنکھیں چھلک پڑتیں۔ باپ کے انتقال کے بعد شروع شروع میں ماموں کے گھر والوں کا رویہ اس کے ساتھ اپنی بیٹی جیسا تھا لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا، رویہ بھی بدلتا گیا۔ ممانی تو سدا کی نک چڑھی اور تنک مزاج تھیں۔ بچوں کا سلوک بھی اس سے کچھ اچھا نہیں تھا۔ ماموں کے تین بچے تھے۔ رشیدہ، نویدہ اور جاوید، جاوید سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے گھر بھر کا لاڈلا تھا۔ نویدہ دسویں میں پڑھتی تھی اور رشیدہ بی اے میں کمپارٹمنٹ آنے کے بعد سے پڑھائی چھوڑ کر گھر میں بیٹھ گئی تھی مگر اس کا مزاج مہارانیوں جیسا تھا۔ ممانی فالج کے اثر کی وجہ سے ویسے ہی کسی کام کو ہاتھ نہ لگاتی تھیں۔ رہی نویدہ تو اسے اپنی سہیلیوں کو بلانے اور محفلیں جمانے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں تھا لہٰذا گھر بھر کا سارا کام عابدہ کو کرنا پڑتا تھا۔ یہ دو منزلہ مکان تھا۔ رشیدہ چونکہ ہر کام میں بڑی جدت اور انفرادیت چاہتی تھی لہٰذا اوپری منزل کا کمرہ اس کے نام وقف تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹی سی کوٹھڑی تھی جو پہلے تو کوئلے رکھنے کے کام آتی تھی بعد میں عابدہ کو رہنے کے لئے مل گئی۔ اس کمرے کی چھت کے شہتیر پرانے ہو چکے تھے، دیمک لگ چکی تھی۔ سردیوں میں چھت پر سے دیمک گرتی تھیں۔ اس قدر مچھر تھے کہ لحاف میں بھی گھس آتے تھے اور گردن، کنپٹی اور پاؤں پر اتنی زور سے کاٹتے تھے کہ سوتے سوتے عابدہ اچانک جاگ اٹھتی۔ کمرے کے ایک ٹوٹے ہوئے کارنس پر اس نے ابا کی تصویر سجا رکھی تھی۔ دن بھر میں کسی وقت جب ممانی ڈانٹتیں یا گھر کے کسی فرد سے اسے تکلیف پہنچتی تو وہ چپکے سے کوٹھڑی میں آ کر ایک بار ضرور ابا کی تصویر دیکھتی، روتے ہوئے دل اور بھیگی بھیگی آنکھوں سے وہ چپکے چپکے اپنی بپتا سناتی تو اسے ایسا لگتا جیسے ابا کی بڑی بڑی روشن

آنکھوں میں بھی آنسو اُمڈ آئے ہیں۔ جب کسی معاملے میں سچ مچ انصاف کی ضرورت پڑتی تو ماموں اپنی کاروباری دنیا کے بکھیڑوں سے نکل کر حقیقی آدمی بن جاتے اور بچوں کو ڈانٹتے کہ عابدہ کو تنگ نہ کیا کرو مگر بچے ان سے زیادہ ممانی کی سنتے تھے کہ وہ ازلی بدمزاج اور بدلحاظ تھیں۔ عید، بقرعید کے موقع پر جب سب بچوں کے کپڑے بنتے اور ماموں کو اپنی یتیم بھانجی کا خیال آ جاتا تو اس کے کپڑے بھی بن جاتے مگر ممانی کی عملی کوشش یہ ہوتی کہ کس طرح بھی وہ رشید اور نویدہ کی برابری نہ کرے لہٰذا اس کے لئے معمولی کپڑوں پر اکتفا کیا جاتا اور وہ رشیدہ، نویدہ اور جاوید کے لئے رنگ برنگے ملبوسات خریدے اور تیار کئے جاتے۔ کھانے پینے میں بھی یہی اُصول کارفرما تھا۔ ماموں پھلوں کے آڑھتی تھے گھر بھر میں موسمی پھلوں کی ریل پیل رہتی تھی مگر عابدہ کا حصہ نکالتے وقت ممانی کا یہ اندازہ ہوتا گویا وہ صدقہ یا خیرات نکال رہی ہیں۔ پہلے پہل عابدہ کو یہ سب باتیں بہت عجیب لگتیں مگر رفتہ رفتہ وہ ان چھوٹی چھوٹی زیادتیوں کی عادی ہوتی گئی اور یہاں تک بے نیاز ہو گئی کہ جب رشیدہ یا نویدہ کی سہیلیاں آتیں تو وہ اپنے میلے کچیلے کپڑوں میں ان کے لئے اس طرح چائے لے کر جاتی جیسے واقعی وہ اس کی گھر کی تنخواہ دار ملازمہ ہے۔ رشیدہ کا انداز ہمیشہ تحکمانہ ہوتا، تو اور تم کہہ کر عابدہ کو پکارتی تھی۔ جب اس کی کوئی سہیلی آ جاتی تو پھر تو اس کے تیور ہی بدل جاتے۔

''اے عابدہ کی بچی! کیا کر رہی ہے تو ادھر؟''

وہ سر جھکا کر آہستہ سے کہتی۔ ''استری کر رہی ہوں، باجی!''

''چھوڑ یہ استری وستری، پہلے چائے بنا کر لا اچھی سی۔''

اور عابدہ کو استری چھوڑ کر چائے بنانی پڑتی۔ اگر کبھی نقصان ہو جاتا تو تمام ذمہ داری اس پر عائد ہوتی۔

ابتدا میں تو ماموں اسے لے کر اس کے والدین کی قبروں پر فاتحہ پڑھنے، پھول چڑھانے اور اگر بتیاں جلانے جاتے تھے اور مہینے میں ایک آدھ مرتبہ ضرورت وقت نکالتے تھے۔ بعد میں ان کی مصروفیات بڑھ گئیں تو عابدہ خود جانے پر مجبور ہو گئی مگر گھر سے قبرستان تک کے راستے میں ایسے ایسے بیہودہ اور بدقماش لوگوں کے فقرے اسے سننے کو ملتے کہ اس نے گھر سے قبرستان تک تنہا جانے کا ارادہ ہی ترک کر دیا۔ ایک مرتبہ تو چند آوارہ لڑکوں نے اسے عین قبرستان میں گھیر لیا۔ ایک نے اس کا دوپٹہ کھینچا تو وہ رہ پڑی۔ اس کی آواز سن کر قبرستان میں رہنے والے گورکن ادھر ادھر سے نکل آئے اور یوں اس کی جان اور عزت محفوظ رہی۔ گھر آ کر اس نے رو رو کر ماموں کو حال سنایا تو انہوں نے آئندہ اس کے گھر سے نکلنے پر بھی پابندی لگا دی۔ اپنی بے بسی، مجبوری اور بیچارگی پر رو رو کر وہ کبھی کبھی سوچا کرتی کہ کاش، ابا دوبارہ جی اٹھیں اور وہ ان کی پناہ میں باقی زندگی گزار کر ان کے ساتھ ہی قبر میں جا سوئے۔۔۔ رفتہ رفتہ محفوظ زندگی گزارنے کے لئے اسے کسی محافظ کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ ٹی وی پر کبھی کبھار فلمیں اور ڈرامے دیکھ کر اس کے ذہن میں اپنے محافظ کا ایک بڑا اجلا اور پیارا سا نقشہ بن گیا تھا۔ یہ نقشہ اس نے اپنی روح میں چھپا کر بہت احتیاط سے رکھ دیا تھا۔ عملی زندگی میں بظاہر اس قسم کے انسان کے دور تک آثار نہیں ملتے لیکن اسے اُمید تھی کہ ایک نہ ایک دن ضرور وہ آئے گا اور کہے گا۔

''عابدہ! تم نے بہت دکھ اٹھائے، بہت تکلیفیں برداشت کی، اب میں تمہیں کوئی دکھ اٹھانے نہیں دوں گا اور تمہیں اس ماحول سے نکال کر ایک ایسی دنیا میں لے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جاؤں گا جہاں کوئی کسی سے نفرت نہیں کرتا اور کوئی کسی کا رلاتا نہیں، ستاتا نہیں---چلو آؤ، میرے ساتھ چلو۔"

وہ ماموں کے ہاں آنے والے کبھی کبھار کے عزیزوں میں فیشن ایبل لڑکوں کو دیکھتی۔ پیلے پیلے، زرد بیمار سے چہرے، بے تحاشہ بڑھے ہوئے بال، چائے اور سگریٹ کے رسیا، کھوکھلے قہقہے لگانے اور شکاریوں کی طرح تاکنے والے لڑکے اسے ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے مگر ممانی ان لڑکوں پر اس لئے صدقے دار جاتی تھیں کہ رشیدہ پچیس چھبیس سال کی ہوگئی تھی مگر کوئی ڈھنگ کا بر اس کے لئے نہیں ملا تھا۔ کہیں لڑکے والے شرائط منوانے پر زور دیتے، کہیں ماموں کو لڑکا ناپسند ہوتا، کہیں رشیدہ کے مزاج کے مطابق نہ ملتا، کہیں سماجی حیثیت کم ہوتی، کہیں تعلیم آڑے آجاتی۔ رشیدہ نے فلمیں دیکھ دیکھ کر اور طرح طرح کے فیشن میگزین پڑھ پڑھ کر خود کو آسمانی اپسرا سمجھنا شروع کر دیا تھا اور لباس کی تراش خراش اور خوشبوؤں کے انتخاب میں بچاری کی جوانی گزری چلی جارہی تھی۔ اس کے دیکھا دیکھی نویدہ بھی پر پرزے نکالنے لگی تھی اور اپنی باجی سے فلموں پر ایسی دھواں دھار بحث کرتی تھی کہ معلوم ہوتا وہ طالبہ نہیں، فلموں کی مبصر ہے۔

اس گھر میں سعید کی آمد بڑی ہنگامہ پرور ثابت ہوئی۔ سعید نے گاؤں سے ایف ایس سی کیا تھا اور کسی طرح میڈیکل سیٹ مل گئی تھی۔ وہ شہر آیا تھا کہ ماموں نے اسے دیکھ لیا۔ رشتہ داری کے ناطے ماموں نے اس کی رہائش کے لئے ہوسٹل کی بجائے گھر کا انتخاب کیا اور اسے گھر لے آئے۔ اس کا آنا ایسا ہی تھا جیسے کسی ممتاز لیڈر کی آمد، محلے کے بچوں، دو مزدوروں اور ماموں کے جلو میں جب وہ گھر میں داخل ہوا تو ایک بھونچال آگیا۔ رشیدہ کا کمرہ فوری طور پر خالی کرا کر سعید کے لئے وقف کر دیا گیا۔ رشیدہ کو نچلی منزل کا ایک چھوٹا سا کمرہ مل گیا۔ سعید نے آتے ہی جاوید سے دوستی گانٹھ لی اور نویدہ تو اس کے اردگرد یوں پھرنے لگی گویا وہ شہزادہ ہے اور نویدہ اس کی دربان۔ سعید کو دیکھ کر رشیدہ بھی یوں چھوئی موئی بن گئی گویا سعید کے ساتھ اس کی منگنی ہو چکی ہے۔ سعید اپنے والدین کے ہمراہ ایک آدھ مرتبہ پہلے بھی یہاں رہ چکا تھا مگر تب اس پر اتنی توجہ نہیں دی گئی تھی، کسی کو یقین ہی نہیں تھا کہ ایک دن میڈیکل کا طالب علم بن جائے گا اور جب سچ مچ وہ اس عالم میں آیا تو ماموں اور ممانی نے اسے ڈاکٹر صاحب کہنا شروع کر دیا۔

سعید کا رنگ گورا اور آنکھیں شربتی رنگ کی تھیں مگر کچھ دبلا تھا، بقول ماموں کے، پڑھ پڑھ کر بچارے کی صحت تباہ ہوگئی تھی، آنکھوں میں بلا کی بے قراری اور چمک تھی یوں لگتا تھا جیسے وہ مسلسل کوئی چیز ڈھونڈ رہا ہے، لامیں، زمین پر، کمرے کی چھت پر---عابدہ کو اس نے اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں دیکھ کر ممانی سے پوچھا۔

"آپ کی تعریف---؟"

عابدہ میز پر چائے کے لوازمات سجا رہی تھی۔ ممانی نے تنک کر کہا۔

"یہیں رہتی ہے، عزیزوں کی طرح سمجھو۔"

اس کی جی چاہا کہ فوراً کہے کہ عزیزوں کی طرح سمجھنے کا کیا مطلب، کیا میں آپ کی بھانجی نہیں ہوں؟---مگر ماحول کا رنگ دیکھ کر وہ اپنی عادت کے مطابق چپ ہی رہی۔ ممانی کا یہ مخاصمانہ رویہ روز کی بات تھی، یہ کوئی نیا مرحلہ نہیں تھا۔

سعید کے آنے سے پہلے گھر کی عملاً مہارانی رشیدہ تھی، اب یہ اعزاز سعید کو حاصل ہوگیا۔ تعلیم اس نے گاؤں میں حاصل کی تھی مگر بڑے باپ کا بیٹا تھا لہٰذا اس کے تمام چاؤ چونچلے بڑے لوگوں کے سے تھے۔ صبح نہار منہ وہ کینو یا سنگترے کے رس کا ایک گلاس پیتا۔ یہ پھل دستیاب نہ ہوتے تو سیب کا مربہ یا رس حاضر کیا جاتا۔ پھر وہ ضروریات سے فارغ ہوتا، غسل کرتا، شیو بناتا اور لباس تبدیل کرنے کے بعد نیچے آ کر سب کے ساتھ ناشتے میں شریک ہوتا اور اس رکشے میں کالج جاتا جو نویدہ کو لینے آتا تھا۔ دوپہر کو کھانے کے بعد وہ آرام کرتا تھا اور شام کو گھر سے نکلتا تو کبھی دس بجے لوٹتا اور کبھی گیارہ بجے گھر پر اس کا رعب و داب کچھ ایسا تھا کہ کوئی اسے دیر سے آنے کی شکایت نہ کرتا۔ نویدہ اور جاوید البتہ اس کے انتظار میں ٹی وی دیکھنے کے بہانے جاگتے رہتے اور دیر تک اس سے گپ شپ کرتے رہتے۔ ماموں اور ممانی اس کا چہرہ دیکھ کر کھل اُٹھتے۔ جب وہ اپنی شربتی آنکھیں شرارت سے چمکا چمکا کر لطیفے سناتا تو سمٹی سمٹائی رشیدہ بھی ریشم کی گٹھڑی کی طرح ہنس ہنس کر دوہری ہو جاتی۔ نویدہ کی تو مارے ہنسی کے سانس رکنے لگتی۔

"ہائے اللہ، بھائی جان! مت ہنسایئے اتنا---"

وہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو کر کہتی اور پھر ہنسنے لگتی۔

عابدہ کے ساتھ گھر کے دوسرے افراد کے برعکس سعید کا رویہ جارحانہ اور مخاصمانہ نہیں تھا۔ وہ بڑے نرم اور میٹھے انداز میں کوئی کام کہتا اور بولتے ہوئے اس کی شربتی آنکھیں مسلسل کھوج میں لگی رہتیں۔ وہ عابدہ سے لمبی بات نہیں کرتا تھا مگر جتنی بات کرتا تھا، نرمی اور شیرینی سے۔ آپ سے مخاطب ہو کر، مہذب انداز میں۔

"گلاس اس میز پر رکھ دیجئے---ذرا میری قمیض کا کالر اچھی طرح استری کیجئے گا، شکنیں پڑ جاتی ہیں---افوہ، میں نے آپ سے اخبار لانے کے لئے کہا تھا، پانی نہیں مانگا تھا---" "آپ نے ناشتہ لگا دیا؟ اچھا میں ابھی آتا ہوں پانچ منٹ میں۔"

ایک دن بڑی عجیب بات ہوئی۔ عابدہ حسب معمول اس کے لئے صبح کا مشروب لے کر گئی تو بے دھیانی میں اس کا ہاتھ سعید کے ہاتھ سے مس ہوگیا۔ وہ اتنا خائف ہوئی کہ شیشے کا گلاس اس کے ہاتھ سے پھسلا اور چھن سے چکنا چور ہوگیا۔ سنگترے کا رس سعید کے لباس پر گرا۔ پہلی مرتبہ عابدہ نے اسے غصے میں آتے دیکھا۔ پہلے تو اس کا رنگ سرخ ہوا، پھر اس نے گرج کر کہا۔

"اندھی کہیں کی، پتہ نہیں کس کے خیال میں کھوئی رہتی ہے۔؟"

عابدہ اس وقت تو آنچل سے آنسو پونچھتی ہوئی چلی آئی لیکن سعید کے کہے ہوئے الفاظ رہ رہ کر اس کے کانوں میں گونجتے رہے۔ تمام دن سعید کی گرج اس کے کانوں میں اور الفاظ کی تلخی اس کی روح میں پھیلتی رہی۔

اس روز سعید دوپہر کو نہیں آیا۔ شام کو آیا، آتے ہی اس نے طبیعت کی خرابی کا اعلان کیا اور اوپر چلا گیا۔ ممانی نے عابدہ کے ذریعے سر درد کی گولی اور دودھ کا ایک گرما گرم گلاس اسے بھیجا۔ اس کا جی تو نہیں چاہتا تھا کہ سعید کا سامنا کرے مگر مجبوری تھی، اس گھر میں رہنا جو تھا۔ وہ کمرے میں داخل ہوئی تو سعید بستر پر چادر اوڑھے لیٹا تھا۔

"یہ دودھ ہے---" اس نے گلاس میز پر رکھا۔

"اور یہ گولی، ممانی نے کہا ہے کہ ابھی کھا لیں اور آرام کریں۔"

سعید تیزی سے اٹھ بیٹھا۔ پہلی بار اس نے عجیب سے انداز میں اسے دیکھا اور عجیب سے لہجے میں کہا۔

"بیٹھو---"

وہ تذبذب کے عالم میں ایک خالی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"ناراض ہو مجھ سے---ایں؟"

"جی---" وہ گھبرا گئی۔ "نن---نہیں تو۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ہاں، تم ناراض ہو---'' سعید جیسے اپنے آپ سے مخاطب ہو کر بے چین لہجے میں بولا۔ ''مجھے معلوم ہے تم ناراض ہو--- مجھے معاف کر دو۔ اس گھر میں اکیلی تم ہی تو ہو جسے میں ناراض کرنے کی سوچ بھی نہیں سکتا---'' کچھ لمحے رک کر وہ چھت کی طرف دیکھتا رہا، پھر بولا۔ ''بولو بھی سہی، تم نے مجھے معاف کر دیا ہے یا نہیں؟''

عابدہ کی آنکھوں مین پیار بھرے بول سن کر آنسو آ گئے تھے، دوپٹے سے پونچھتی ہوئی بولی۔ ''جی---''

''اتنی پیاری آنکھیں آنسو بہانے کے لئے نہیں ہوتیں--- میری بات سن رہی ہو، نا؟''

وہ حواس باختہ ہو کر اٹھ بیٹھی۔ ''میں چلتی ہوں۔''

سعید بیتاب ہو کر بولا۔ ''سنو، میری بات ابھی ختم نہیں ہوئی۔''

مگر وہ سعید کی بات ختم ہونے کا انتظار کئے بغیر نکل آئی۔ اس کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا اور پیشانی پر پسینہ اُمڈ آیا تھا۔

اس رات سعید کے مختلف الفاظ اس کے کانوں میں گونجتے رہے۔ میٹھے میٹھے الفاظ، اتنے نرم کہ اس کے کانوں کی لویں جلنے لگیں مگر جب اس گھر میں وہ اپنی حیثیت پر غور کرتی تو اس کا رنگ فق ہو جاتا۔ رات میں کئی مرتبہ اس کی آنکھ کھلی۔ ایک بار اس نے مدھم بلب کی روشنی میں ابا کی تصویر کی طرف دیکھا تو اسے ایسا لگا جیسے ان کی آنکھیں بھیگی ہوئی ہیں اور وہ سرزنش کے لہجے میں کہہ رہے ہیں۔

''بیٹی عابدہ! اپنی کھال میں رہو۔ تم یتیم ہو، لاوارث ہو، تمہیں محبتیں اور چاہتیں زیب نہیں دیتیں۔ خدا کے لئے کوئی ایسی حرکت نہ کرنا کہ میری روح عذاب میں مبتلا ہو۔''

عابدہ نے اس روز کے بعد خود کو لئے دیئے رکھنا شروع کر دیا۔ وہ اگر کسی کام سے سعید کے کمرے میں جاتی بھی تو فوراً واپس آ جاتی۔ سعید نے ایک دو بار بڑے پیار سے اسے اپنے قریب بلانا چاہا مگر وہ سنی ان سنی ایک کر کے رہ گئی۔

ایک رات سعید کی درد میں ڈوبی آہ سن کر اس کی آنکھ کھل گئی۔ سعید کراہ رہا تھا۔ اس کا کمرہ عابدہ کی کوٹھڑی سے نزدیک ہی تھا لہٰذا اس کے کراہنے اور پہلو بدلنے کی آوازیں برابر آ رہی تھیں۔ پہلے تو وہ ڈر گئی، پھر دم سادھ کر چپ لیٹی رہی لیکن جب سعید کی کراہوں میں کوئی کمی نہ آئی تو اس سے چپ نہ رہا گیا۔ اس نے اٹھ کر سعید کے دروازے پر دستک دی۔ سعید نے دروازہ کھولا اور کراہتا ہوا پلنگ پر گر پڑا۔

''کیا ہوا آپ کو، ممانی کو جگاؤں؟'' وہ گھبرا کر بولی۔

''نن--- نہیں---'' سعید کو اہتا ہوا بولا۔ ''میرے سر میں سخت ٹیسیں اٹھ رہی ہیں۔ رات کے ڈھائی بجے ہیں، اس وقت کسی کو تکلیف نہ دیجئے--- اف، میرے خدا!''

''کوئی گولی لا دوں آپ کو؟'' وہ گھبرائے گھبرائے انداز میں پلنگ پر جھک کر بولی۔

''نہیں---'' سعید نے تیزی سے کہا۔ ''دو گولیاں کھا چکا ہوں، گولی سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ کاش، میں اپنے گھر میں ہوتا، کوئی میرا سر دبا دیتا۔''

''میں دبا دوں آپ کا سر؟'' بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

''آپ---؟'' سعید نے جیسے بے بسی کے عالم میں اسے دیکھا۔ ''دبا دیجئے---''

پھر اس نے عابدہ کے بیٹھنے کے لئے سرہانے جگہ

بھی بنا دی۔ وہ جھجکتی ہوئی پلنگ کے سرہانے بیٹھ کر لرزتے ہاتھوں سے اس کا سر دبانے لگی۔ سعید پہلے تو ہولے ہولے کراہتا رہا، پھر اس نے سکون کے گہرے سانس لینے شروع کئے۔

''کتنا سکون مل رہا ہے---'' وہ خواب آلود لہجے میں بولا۔ ''کاش، ساری عمر میرے سر میں درد رہے۔''

''خدا نہ کرے---'' وہ بے ساختہ بولی مگر اپنے ہی الفاظ جھینپ گئی۔

عابدہ کے دونوں ہاتھ سعید کے بالوں پر تھے۔ سعید نے اپنے دونوں ہاتھ عابدہ کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ عابدہ نے بے تحاشہ بوکھلا کر اٹھنا چاہا مگر گرفت مضبوط تھی۔

''عالی---!'' وہ اکھڑے اکھڑے سانسوں میں بولا۔ ''عالی! اس گھر میں تم واحد ہستی ہو جسے دیکھ کر جینے کو جی چاہتا ہے۔''

عابدہ اپنے ہاتھ چھڑاتے ہوئے بولی۔ ''اوہ، میرے ہاتھ چھوڑ دیجئے۔''

سعید نے اپنے ہاتھ ہٹا لئے۔ ''یہ لو، میں نے تمہارے ہاتھ چھوڑ دیئے۔ میں تمہاری بے بسی سے کوئی غلط نتیجہ نہیں نکالنا چاہتا۔ مجھے تم سے---''

عابدہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی، لرزتے ہونٹوں اور ہکلائی ہوئی زبان سے بولی۔ ''خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کیجئے۔ کسی نے سن لیا تو میں بے موت مر جاؤں گی، مجھے سر چھپانے کی جگہ بھی نہیں ملے گی۔''

سعید بیتابی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''اگر کسی نے تمہیں کچھ کہا تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا--- مجھے ایم بی بی ایس کر لینے دو، پھر میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تمہیں اپنا لوں گا۔''

عابدہ نے آج تک اپنی حمایت میں ایک جملہ نہیں سنا تھا، سعید کے پُر جوش الفاظ اس کے کانوں میں اترے

سنہرے موتی

☆اندیشہ آنے والے زمانے سے ہوتا ہے' اگر حال پر نظر رکھی جائے تو مستقبل کے اندیشے کم ہو جاتے ہیں۔

☆ہر بات جو ضرر سے خالی ہو' خاموشی جو فکر سے خالی ہو' سہو ہے۔ نظر جو عبرت سے خالی ہو' لہو ہے۔

☆اگر تمنا حاصل سے زیادہ ہو تو اضطراب پیدا ہوگا' انتشار ہوگا اور اگر حاصل تمنا سے زیادہ ہو تو باعث سکون ہوگا اسی لئے کم آرزو والے انسان مطمئن رہتے ہیں۔

☆دوسروں کو کثرت سے معاف کرو مگر اپنے آپ کو کبھی نہیں۔

☆ایک اچھے شوہر کو بہرہ اور اچھی بیوی کو اندھا ہونا چاہئے۔

☆نیکی کا بدلہ نیکی سے دینا' نیکی کا حق ادا کرنا ہے اور بُرائی کا بدلہ نیکی سے دینا' احسان ہے۔

☆کم بولنا دانائی' کم کھانا صحت' کم سونا عبادت اور عام لوگوں سے ملنا عافیت ہے۔

بلال سہو' کوٹ سلطانہ لیہ

تو خوف سے اس کی ٹانگیں کپکپانے لگیں، بے یقینی کے عالم میں اس نے سر جھٹک کر کہا۔

''نہیں، ایسا نہ کہیے۔ ایسا تو کبھی نہیں ہو سکتا--- کبھی نہیں۔''

''ہو کیوں نہیں سکتا---؟'' سعید نے بڑھ کر مضبوطی سے اس کے شانے تھام لئے۔ ''یہ ہوگا اور ضرور ہو کر رہے گا۔ آج تک سعید نے جس چیز کی طرف ہاتھ بڑھایا ہے، اسے حاصل کیا ہے۔''

وہ لرز کر پرے ہٹ گئی۔ ''مگر میرا دل ڈرتا ہے، میں نہیں چاہتی کہ کسی کے حق پر ڈاکہ ڈالوں۔ آپ کا بیاہ رشیدہ باجی سے ہوگا، مجھے معلوم ہے--- خدا کے لئے مجھے جانے دیجئے۔''

''یہ وقتی افواہیں ہیں---'' سعید زور دے کر بولا۔ ''جب میں ڈاکٹر بن جاؤں گا تو میں دوسروں کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فیصلے کا محتاج نہیں رہوں گا، فیصلے میرے تابع ہوں گے۔ میں جو چاہوں گا وہی ہوگا، چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے۔"

وہ کانپ کر اور دور ہٹ گئی۔ "ایسی باتیں نہ کیجئے خدا کے لئے، دنیا میں میرا کوئی بھی نہیں۔ میں نے جس گھر کا نمک کھایا ہے، اس سے نمک حرامی نہیں کرسکتی۔ آپ تو یہ باتیں کر کے کل گھر چھوڑ کر جاسکتے ہیں، میں کہاں جاؤں گی؟"

"افوہ، کتنی شکی مزاج ہو، عالی! تم ---" سعید الجھ کر بولا۔ "تم نے ابھی مجھے دیکھا نہیں، پرکھا نہیں، ابھی سے میرے بارے میں کوئی فیصلہ نہ دو۔ وقت اس بات کا فیصلہ کردے گا کہ میرے دل میں تمہارا کیا مقام ہے۔"

"اچھا میں چلتی ہوں ---"

عابدہ نے جلدی سے کہا اور کوٹھڑی میں آتے ہی جھٹ سے کنڈی لگالی۔ اس کا دل اتنی زور زور سے دھڑک رہا تھا جیسے وہ لاکھوں میل کی مسافت پیدل طے کر کے آئی ہو۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ جس گھر میں وہ برسوں ایک پیار بھرے بول کو ترستی رہی ہو وہاں اچانک پیار کا چشمہ پھوٹ پڑے گا۔ اس گھر میں اپنی حیثیت کا اسے پوری طرح احساس تھا۔ وہ اپنے لئے مسائل خریدنے سے گریز کرنے پر مجبور تھی اسی لئے اس نے فیصلہ کرلیا کہ چاہے کچھ بھی ہوجائے وہ اب سعید کے پاس تنہائی میں جانے سے گریز کرے گی اور اگر اس نے مجبور کیا تو وہ صاف صاف کہہ دے گی کہ وہ اسے سخت ناپسند کرتی ہے مگر یہ سب کچھ وہ عملاً نہ کرسکی۔ سعید کی آنکھوں میں جانے کیسا ساحرانہ کشش تھی کہ اس کے سامنے جاتے ہی وہ بت بن جاتی۔ سعید جانے کیا کچھ کہتا رہتا اور وہ چپ چاپ سر جھکائے یوں سنتی رہتی گویا کسی نے اس پر مسمریزم کردیا ہے --- اپنی بوکھلاہٹ میں آکر وہ سعید کے کہے ہوئے الفاظ پر غور کرتی تو انجام کا خیال کر کے اس کی روح کانپ اٹھتی۔ سعید کے سامنے جاتی تو جیسے زمین اس کے پاؤں پکڑ لیتی۔ وہ عجب کش مکش میں مبتلا تھی۔

ایک دن وہ رشیدہ کے کمرے کی صفائی کررہی تھی اور بے خیالی میں گنگنا بھی رہی تھی کہ اچانک رشیدہ دبے پاؤں اندر آگئی۔ آتے ہی اس نے خلاف معمول اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"ہائے، عابدہ! کتنی درد بھری آواز ہے تمہاری --- مجھے تو پتہ ہی نہیں تھا کہ تمہاری آواز اتنی پیاری ہے۔"

وہ ایک دم یوں گھبرا گئی جیسے چوری کرتے ہوئے پکڑی گئی ہو، ہکلا کر بولی۔ "نن --- نہیں تو --- وہ --- باجی! میں تو بس یونہی ---"

"میں تو اب ضرور سنوں گی ورنہ امی سے کہہ دوں گی کہ تم گاتی رہتی ہو۔"

اس کا رنگ فق ہوگیا۔ ممانی کے غصہ سے اس کی روح کانپتی تھی۔

"خدا کے لئے، باجی! ان سے نہ کہیے گا۔ ایمان سے مجھے پوری غزل یاد نہیں۔"

رشیدہ جھلا کر بولی۔ "جتنی بھی یاد ہے، اسی درد بھری آواز میں سنادو، نخرے نہ کرو۔"

اس نے جھاڑن ایک طرف رکھ دیا۔ وہیں فرش پر سر جھکا کے بیٹھ گئی اور دھیرے دھیرے جتنے شعر اسے یاد آتے گئے، سناتی گئی۔ غزل ختم کر کے اس نے سر اٹھایا تو رشیدہ کی آنکھوں سے آنکھیں چار ہوئیں۔ وہ اسے بڑی گہری نظروں سے دیکھ رہی تھی، ایک گہرا سانس لے کر بولی۔

"عابدہ! اتنی پیاری آواز، اتنی میٹھی آواز --- لگتا

تھا جیسے کوئی دیوی گا رہی ہے۔ یہ بتا، تو نے کبھی محبت کی ہے، عابدہ ---؟" عابدہ کا جھکا ہوا سر دیکھ کر وہ خود ہی بولی۔ "نہیں، تو نے کہاں کی ہوگی۔ تجھے کیا معلوم محبت کیا ہوتی ہے، کیوں ہوتی ہے۔" اتنا کہہ کر اس نے میز کی دراز میں سے ایک چھوٹی سی کاپی نکالی۔ ایک صفحے پر سعید نے اسے آٹوگراف دیتے ہوئے لکھا تھا۔

"رشیدہ کے لئے ---

سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر
اٹھتے نہیں ہیں ہاتھ میرے اس دعا کے بعد

رشیدہ وہ صفحہ عابدہ کے سامنے کرتی ہوئی بولی۔ "اسے کہتے ہیں محبت --- یا اللہ! جلدی جلدی وہ ایم بی بی ایس کرلیں، پھر --- پھر ---"

عابدہ کے دل کو ایک جھٹکا سا لگا لیکن رشیدہ پر اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا، مسکرا کر پوچھا۔

"پھر باجی! آپ کی شادی ہو جائے گی ڈاکٹر صاحب کے ساتھ؟"

"ہاں، شادی ہو جائے گی ---" رشیدہ نے ایک لمبا سانس لے کر جواب دیا۔ "لیکن کتنے عرصے بعد، کتنی صدیوں بعد، اللہ یہ چار پانچ برس ---"

"یہ بھی گزر ہی جائیں گے، باجی!" عابدہ نے سکون سے کہا۔

"یہی تو رونا ہے کہ وقت نہیں گزرتا۔ ایک دن یوں گزرتا ہے جیسے صدی گزر رہی ہو --- سچ، عابدہ! تجھے ایک بات بتاؤں کسی سے کہنا مت۔"

"بتایئے ---" وہ ہمہ تن گوش ہو کر یوں بولی گویا سینے پر دکھ کا کوئی نیا پہاڑ اٹھانے کے لئے تیار ہے۔

"جب تک میں دن میں دو تین بار ان کی صورت نہ دیکھ لوں، اس وقت تک مجھے قرار نہیں آتا ---" رشیدہ خوابناک لہجے میں بتاتی گئی۔ "ان کا بھی یہی حال ہے۔ کسی نہ کسی بہانے میرے کمرے میں آجاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ رشو! اگر تم مجھے نہ ملتیں تو میری زندگی راکھ کا ڈھیر ہوتی۔"

عابدہ کو یوں لگا جیسے کوئی چیز اس کے دل کو چھید رہی ہے --- اف، یہ دھوکے باز مرد! کتنے جھوٹے، کتنے چالاک، کتنے بھولے --- اس کا جی چاہا وہ رشیدہ کے سامنے سعید کا پول کھول دے مگر جانے کیوں خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔

اس روز دوپہر کے کھانے کے بعد وہ جوٹھے برتن دھو رہی تھی کہ سعید کچن میں آگیا۔

"افوہ، تم یہاں ہو؟" وہ کھوجتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

"جی ---" وہ چونک کر بولی۔

"آج بھی میرے سر میں سخت درد ہے ---" وہ شرارت آمیز انداز میں بولا۔ "اگر انسانی ہمدردی کی بنیاد پر کوئی میرا سر دبا سکے تو ---"

"رشیدہ باجی سے کہیے ---" بے ساختہ اس کے منہ سے نکل گیا۔ اسے خود بھی حیرت ہوئی کہ اتنے تلخ لہجے میں اس نے بات کیسے کہہ دی۔

"ہوں، تو یہ تیور ہیں --- سمجھا ---" سعید نے گہرا سانس لے کر کہا۔ "بہت بہتر، محترمہ! آپ کے حکم کی تعمیل کی جائے گی۔"

یہ کہہ کر وہ مڑا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

سعید کے کمرے کا دروازہ بند ہونے کی آواز آئی تو اسے یوں لگا جیسے کوئی اس کے دل پر گھونسے برسا کر کہہ رہا ہے۔

"زندگی بھر میں پیار کا ایک ہی دروازہ تیرے لئے کھلا تھا، تو نے وہ بھی بند کردیا --- پگلی کہیں کی!"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس روز شام ڈھلے تک نہ سعید باہر نکلا، نہ کھانا کھانے معمول کے مطابق نیچے آیا۔ بس دروازہ بند کیے اونچی آواز میں ٹیپ ریکارڈ پر پرانے گیت سنتا رہا۔ ممانی نے کھانے کے لئے اسے بلانے بھیجا مگر اس نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر دیا اور دروازہ تک نہیں کھولا۔ ممانی کو بتا کر وہ اپنی کوٹھڑی میں آ کر لیٹ گئی۔ اس نے بھی کھانا نہیں کھایا۔ خالی پیٹ اپنے بستر پر لیٹی کبھی ابا کی تصویر کو اور کبھی چھت کی شہتیروں کو گھورتی رہی۔ جانے اس عالم میں کب اسے نیند آ گئی۔ خواب میں اس نے دیکھا کہ شادی کا پنڈال سجا ہوا ہے، زور زور سے شہنائیاں بج رہی ہیں اور ابا اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے گلوگیر لہجے میں کہہ رہے ہیں۔

''میری چاند بیٹی! جا تجھے خدا کے سپرد کیا--- دیکھ، بیٹی! کبھی اپنے پیار کو دکھ نہ دینا، کبھی اسے ناراض نہ کرنا۔ شوہر تو مجازی خدا ہوتا ہے اور تو سدا سے صابر وشاکر بیٹی ہے۔ تو نے تو ساری زندگی دکھ جھیلے ہیں۔ اب تیرے دکھوں کا خاتمہ ہو رہا ہے۔''

اچانک اس نے دیکھا کہ سعید دولہا کے روپ میں اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس نے ایک خوبصورت شیروانی پہن رکھی ہے۔ سہرے میں اس کا روپ نکھر آیا ہے۔ پھر جانے کیا ہوا کہ سعید دھڑام سے گرا اور چاروں طرف خون ہی خون پھیل گیا۔ اتنا گاڑھا کہ ہر چیز رنگین ہوگئی۔ اس کے دوپٹے کا آنچل بھی اور سعید کے سہرے کے پھول بھی--- وہ چیخ مار کر اٹھ بیٹھی۔ کمرے میں زیرو کا بیمار سا بلب جل رہا تھا اور کوئی مسلسل اس کے دروازے پر آہستہ آہستہ دستک دے رہا تھا۔ کچھ لمحے تک خواب کے زیر اثر اس کے تمام جسم میں سنسنی دوڑتی رہی۔ پھر اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے سعید کھڑا تھا۔ سعید کو زندہ سلامت دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی۔

''خیر تو ہے---'' سعید گھبرائے ہوئے انداز میں اسے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ چیخ کیوں ماری تھی تم نے، کیا ہوا تھا تمہیں؟''

''مجھے---؟'' وہ سٹپٹا کر بولی، پھر جب اسے احساس ہوا کہ رات گئے سعید اس کی کوٹھڑی کے دروازے پر کھڑا ہے اور دور دور تک ڈھلتی رات کی خاموشی کے علاوہ اور کچھ نہیں تو وہ گھبرا کر پسینے میں شرابور ہونے لگی۔ ''مجھے کچھ نہیں ہوا۔'' اس نے جلدی سے دروازہ بند کرنا چاہا مگر اتنے میں سعید اندر آ چکا تھا۔

''عالی---!'' اس نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''تم جانے مجھے کیا سمجھتی ہو مگر آج فیصلہ ہو جانا چاہئے۔''

''دیکھئے---'' وہ لرز کر بولی۔ ''رات کے جانے کتنے بجے ہیں، کس نے ہماری آواز سن لی تو خدا جانے کیا ہو جائے۔''

''کچھ نہیں ہوگا---'' سعید پرسکون آواز میں بولا۔ ''ہماری آواز آسمانوں پر رہنے والے پاک فرشتے تو سن سکتے ہیں، زمین پر بسنے والے تنگ نظر لوگ نہیں سن سکتے۔ محبت کی آواز ہر کوئی نہیں سنتا اور مجھے لگتا ہے کہ شاید تم نے بھی اب تک نہیں سنی؟''

وہ دھیرے دھیرے لرز رہی تھی۔ ''آپ تو بس بولنے ہی لگتے ہیں، کچھ دیکھتے ہیں نہ سنتے ہیں۔ یہ بھی احساس نہیں کہ ہم دونوں کی عزت کا معاملہ ہے۔''

''تم کس سے ڈرتی ہو---؟'' سعید آ کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ ممانی سے، جو گھوڑے بیچ کر سوتی ہیں یا موں سے، جو صبح سے پہلے ہوش میں نہیں آتے یا کسی اور سے؟--- بہرحال، تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ کوئی شخص میرے معاملے میں مداخلت نہیں کر سکتا۔

میں خود مختار ہوں۔''

اس نے جب دیکھا کہ سعید کسی طرح اٹھنے پر آمادہ نہیں تو یکا یک اسے غصہ آ گیا۔ چھوٹی بڑی زیادتیاں سہ سہ کر اس نے اپنی عادات اور مزاج کو نرم ضرور کر لیا تھا لیکن زمانے بھر کی تلخیوں کا ذائقہ اس کی زبان پر آ ہی گیا، تیز لہجے میں بولی۔

''بے شک آپ مجھے کچھ بھی کہیے لیکن مجھے معلوم ہے اچھی طرح کہ آپ محض کھیل رہے ہیں مجھ سے بھی اور رشید باجی سے بھی--- رشیدہ باجی کی تو خیر آپ حاصل کر ہی سکتے ہیں لیکن مجھے بتائیے میں کہاں جاؤں گی، کس در جاؤں گی، کس گھر جاؤں گی؟''

رشیدہ کا نام سن کر پہلے تو سعید کا رنگ اُڑا، پھر وہ سنبھل بیٹھا اور دانت بھینچ کر بولا۔

''ہونہہ، تو یہ بات ہے؟ اب سمجھا--- دیکھو، عالی! رشیدہ سے مجھے رتی بھر بھی انس نہیں ہے۔ چونکہ میں اس گھر میں رہتا ہوں لہٰذا اخلاقاً میں نے اسے اتنی چھوٹ دے رکھی ہے کہ وہ اور اس کے والدین میرے بارے میں غلط فہمی کا شکار رہیں اور مجھے یہ گھر نہ چھوڑنا پڑے جس میں رہنے کے لئے تمہاری خاطر مجھے رشیدہ سے یہ ڈھونگ رچانا پڑا ہے، صرف تمہاری خاطر۔''

اس نے اپنی زندگی بڑے سیدھے سادھے انداز میں گزاری تھی، دھوکے فریب سے اس کا واسطہ نہیں پڑا تھا اور نہ کبھی اس نے دورخی پالیسی اپنائی تھی لہٰذا سعید کی باتوں سے اسے مکاری کی بو آئی اور اس نے برملا اظہار کر دیا۔

''یہ تو آپ دھوکا دے رہے ہیں۔ مجھ سے پوچھئے باجی رشیدہ کو آپ سے کتنی محبت ہے---'' اسے رشیدہ کی آٹو گراف بک یاد آ گئی، بے ساختہ معصوم بچوں کی طرح بولی۔ ''مجھے معلوم ہے وہ آپ کو دیکھ نہ لیں تو انہیں چین نہیں آتا۔ اتنی اچھی رشیدہ باجی کو ٹھکرا کر آپ میری طرف بڑھ رہے ہیں۔ کیا دھرا ہے مجھ میں، کیا دیکھ لیا ہے آپ نے مجھ میں؟ باجی تو مجھ سے ہزار درجہ اچھی ہیں۔ وہ جس چیز کو پسند کرتی ہیں، اسے حاصل کر لیتی ہیں اور میں نے آج تک جو کچھ مانگا، مجھے نہیں ملا۔''

یہ کہتے کہتے روہانسو ہو کر اس نے دوپٹے کے پلو سے اپنے آنسو پونچھے۔ سعید پر بھی رقت طاری ہوگئی، اچانک آگے بڑھ کر اس کے آنسو پونچھنے لگا۔

''آج تم تم نے محرومیوں میں زندگی بسر کی تھی، اب آج سے تمہاری زندگی کا نیا آغاز ہو گیا۔ اس کمرے کے در و دیوار گواہ ہیں کہ اب تم میری ہو، صرف میری--- مجھے معلوم نہیں تھا، عالی! کہ تم اتنی عظیم ہو۔ سچ میں ساری زندگی تمہارے قدموں میں گزار دوں گا۔''

سعید کے آنسو پونچھنے کا انداز، گفتگو کا لہجہ اور پیار بھری فضا نے پل بھر میں اس کے ذہن سے سارے وسوسے اور اندیشے نکال دیئے۔ زندگی میں پہلی بار کسی کی چاہت اسے ملی تھی۔ آخر وہ بھی انسان تھی، مداخلت

خوف

اچھے مسلمان کو چھ طرح کی خوف لاحق ہوتے ہیں۔

☆ اللہ تعالیٰ کا خوف کہ وہ اس سے ایمان کی دولت نہ چھین لے۔

☆ فرشتوں کا خوف کہ وہ اس کے گناہوں کو نہ دیکھ لیں۔

☆ شیطان کا خوف کہ وہ اسے اپنے جال میں نہ جکڑ لے۔

☆ موت کے فرشتے کا خوف کہ وہ اس کی روح اچانک قبض نہ کر لے۔

☆ دُنیا کا خوف کہ آخرت سے غافل نہ کر دے۔

☆ اہل و عیال کا خوف کہ انسان ان میں مشغول ہو کر اپنے اللہ پاک کو نہ بھول جائے۔

ڈاکٹر عمر فاروق ٹوبہ ٹیک سنگھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرتے کرتے اس نے ہتھیار ڈالنے ہی تھے۔ سعید کے بازوؤں میں سر ڈال کر اتنا روئی کہ سعید کی قمیض بھیگ گئی۔ ان آنسوؤں میں زندگی بھر کر دکھ تھے، تلخیوں کا احساس تھا، محرومیوں کی کسک تھی اور خود پر ہونے والے مظالم کی پکار تھی۔ سعید کی شربتی آنکھیں بھی آنسوؤں سے بھیگ گئیں

وہ رات اس کے لئے صبر وسکون کی ایک لاہوتی رات بن کر آئی البتہ زیرو بلب کی مدھم روشنی میں ابا کی تصویر اسے سرزنش کرتی رہی اور سمجھاتی رہی کہ اب بھی وقت ہے، وہ سعید کو بھلا کر زندگی کے اسی شب و روز میں لوٹ جائے جو اس کا مقدر بن چکے تھے مگر چاہنے اور چاہے جانے کا جذبہ اس کی روح کی گہرائیوں سے اتنی شدت کے ساتھ اُبھرا تھا کہ وہ بے اختیار ہو کر رہ گئی تھی۔ اب اس نے سوچ لیا تھا کہ چاہے کچھ ہو وہ سعید کو کسی حالت میں فراموش نہیں کرے گی اور جیسے ہی سعید کی تعلیم مکمل ہوگی، وہ اسے اپنا لے گی ورنہ اپنی جان دے دے گی۔

ابھی پیار کے سندر سپنوں کے نگر میں اس نے چند دن گزارے تھے کہ اچانک ایک دن سعید نے اعلان کر دیا کہ وہ ہوسٹل میں شفٹ ہو رہا ہے۔ یہ خبر اس پر بجلی بن کر گری۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ سعید کبھی جدائی کا تصور بھی کر سکتا ہے۔ بظاہر حالات پرسکون تھے۔ ایسا تو نہیں تھا کہ گھر کے کسی فرد کو ان دونوں کے بارے میں کسی قسم کا شک ہو پھر سعید کو اس گھر میں تکلیف بھی کوئی نہیں تھی۔ آخر یوں اچانک اس اعلان کا مطلب کیا تھا؟ جیسے ہی تنہائی میں موقع ملا، اس نے سعید کی بازو کو مضبوطی سے تھام لیا۔

''خدا کے لئے مجھے بتاؤ یہ سب کیا ہے، میرا دل ڈوب رہا ہے--- تم نے زندگی گزارنے کی قسم کھائی تھی، پھر اب---اب---''

سعید ہنس پڑا۔ ''میں اپنی قسم پر اب بھی قائم ہوں---'' کچھ دیر تک وہ چپ رہ کر غور سے اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ ''بات یہ ہے، عالی! کہ میں مستقبل کا ڈاکٹر ہوں۔ ایم بی بی ایس کا طالب علم ہوں، اس گھر میں رہ کر مجھ سے پڑھائی نہیں ہو سکتی۔ کتابوں میں میرا جی نہیں لگتا، ہر لمحہ جی چاہتا ہے کہ تمہیں دیکھتا رہوں۔ تم سے باتیں کرتا رہوں، اب تم خود ہی سوچو کہ اس عالم میں اپنی پڑھائی کے ساتھ کیا انصاف کر سکتا ہوں۔''

''اگر میری ذات تمہاری پڑھائی میں حائل ہو رہی ہے تو میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہارے سامنے نہیں آیا کروں گی لیکن تم یہاں سے مت جاؤ۔ یہاں سے چلے گئے تو پھر میرا دل کہتا ہے کہ میں تم سے باتیں کرنے اور تمہیں دیکھنے کو ترس جاؤں گی۔'' وہ سوچ سوچ کر بولی۔

''میں برابر آتا رہوں گا اور کوئی نہ کوئی موقع نکال کر تم سے باتیں بھی کر لیا کروں گا لیکن مجھے مجبور نہ کرو، عالی! یہ میرے مستقبل کا سوال ہے۔'' وہ پرجوش لہجے میں بولا۔

''تمہارا مستقبل مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے--- جاؤ، سعید! میں کچھ بھی نہیں کہوں گی، ایک لفظ بھی نہیں لیکن ان آنکھوں پر میرا کوئی اختیار نہیں۔''

یہ کہہ کر وہ پلو سے آنسو پونچھتی ہوئی سعید کے پاس سے ہٹ آئی۔

گھر کے سبھی افراد پر اس اعلان کا یکساں اثر ہوا تھا۔ سب نے سعید کی منتیں کی، پیار سے پوچھا مگر اس کی یہی رٹ تھی کہ ہوسٹل میں اس کے لئے بڑی وافر تعلیمی سہولتیں ہیں جو گھر میں حاصل نہیں۔ مجبوراً ماموں اور ممانی کو دل پر پتھر رکھ کر اسے الوداع کہنا پڑا۔ سعید مسکراہٹوں اور قہقہوں کے ساتھ آیا تھا آنسوؤں اور آہوں کے ساتھ

رخصت ہو گیا۔ نویدہ اور رشید تو رو رو کر بے حال ہو گئیں مگر اس کا عجب حال تھا، نہ رو سکتی تھی نہ کسی سے اپنے غم کا اظہار کر سکتی تھی جیسے بیری کے درخت کی شاخ جلے ہولے ہولے، دھیرے دھیرے، اسی طرح من ہی من میں سلگتی رہی۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے تو بھاگ کر اپنی کوٹھڑی میں چلی گئی اور خوب جی بھر کر روئی۔ سعید کا خالی کمرہ دیکھ کر رشیدہ بھی رو رہی تھی، اپنے دل کا غبار نکالنے کے لئے عابدہ سے بہتر ہمراز اور کون تھا لہٰذا اس کی کوٹھڑی کے دروازے پر دستک دی۔

اسے دیکھتے ہی رشیدہ حیران رہ گئی۔ اس کی آنکھیں سرخ سرخ اور بھیگی ہوئی تھیں جیسے وہ ابھی ابھی روئی ہے۔ رشیدہ نے پوچھا۔

''ہائے، عابدہ! یہ آنسو کیسے---تو کیوں رو رہی ہے؟''

''میں---'' اس نے جلدی سے اپنی آنکھوں پر ہاتھ پھیر کر باقی ماندہ آنسو ہتھیلیوں سے پونچھتے ہوئے کہا۔ ''نہیں تو، باجی! میں---میں تو یونہی، بس آج ابا کی یاد آ گئی تھی۔''

رشیدہ ایک گہرا سانس لے کر بولی۔ ''جن لوگوں کے کبھی ملنے کا یقین نہ ہو، ان کی جدائی کے زخم تو بھر ہی جاتے ہیں، عابدہ! مگر جو بچھڑ کر بھی ملتے رہیں، ان کی جدائی کے زخم کبھی نہیں بھرتے۔ کل تک کمرے کی دیواریں ان کی آواز سے گونجتی تھیں، کل تک اس کمرے میں ان کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی، ان کی سانسیں بکھری ہوئی تھیں اور آج---میں اپنا دکھ کس سے کہوں؟''

عابدہ کی آنکھیں پھر اُمڈنے لگیں، رقت آمیز لہجے میں بولی۔ ''نہ کرو، باجی! ایسی باتیں، مجھے اپنے غم یاد آتے ہیں۔''

اتنے میں ممانی نے عابدہ کو آواز دی۔ رشیدہ یہ کہتی ہوئی سعید کے خالی کمرے میں چلی گئی کہ امی اگر مجھے پوچھیں تو کہنا، آرام کر رہی ہے۔

☆☆

ہوسٹل میں جانے کے بعد کچھ عرصے تو سعید ہر روز شام کو باقاعدگی سے آتا رہا۔ نویدہ، جاوید اور ماموں ممانی کو بڑی گرمجوشی سے ملتا رہا، حسب سابق لطیفے سناتا کر ہنساتا رہا۔ پھر اس کی آمد و رفت کم ہونے لگی۔ جب سے وہ ہوسٹل گیا تھا ایک بار بھی اس نے تنہائی میں اس سے ملنے کی کوشش نہیں کی تھی حالانکہ سعید کی موجودگی میں کئی بار اس نے کچن اور برآمدے میں کھنکار کر سعید کو متوجہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں دوسروں کی موجودگی کی مجبوری ظاہر کرتا البتہ رخصت ہوتے ہوئے ممانی کو مخاطب کر کے بڑے معنی خیز انداز میں غالباً اسے سنانے کو کہتا۔

''یہاں تھا تو پریشانی نہیں ہوتی تھی، اب تو ہوسٹل میں پڑھ پڑھ کر سر درد ہونے لگتا ہے لیکن کوئی پرسان حال نہیں ہوتا، سب اپنی پڑھائی میں لگے رہتے ہیں۔''

ایک دن رشیدہ حواس باختہ اس کے پاس آئی۔ سعید کو ہوسٹل گئے آٹھ ماہ ہو گئے تھے، کہنے لگی۔

''عابدہ! میں نے ایک بہت عجیب سی خبر سنی ہے، مجھے یقین نہیں آتا۔''

''کون سی خبر، باجی؟'' وہ حیران ہو کر بولی۔

''خبر بہت بُری ہے---'' رشید رہ ہانسو ہو گئی۔ ''وہ میڈیکل کی ایک طالبہ کے ساتھ گھومتے پھرتے ہیں۔ پارکوں میں جاتے ہیں، سینما دیکھتے ہیں۔ یہ سب کچھ میری سہیلی عذرا نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، آج تک اس نے مجھ سے جھوٹ نہیں بولا۔''

اس کے دل پر جیسے آرے چل گئے، رگوں میں لہو سنسنانے لگا۔ ڈوبتی ہوئی آواز میں بولی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"پھر، باجی---؟"

"بہت دنوں سے وہ یہاں نہیں آئے۔ آتے بھی ہیں تو مجھ سے بات نہیں ہو پاتی، تو کسی طرح ان سے مل کر میرا پیغام دے دے۔"

اس کا دل ڈوبنے لگا تاہم خود پر قابو پا کر بولی۔

"پیغام--- مگر، باجی! میں کہاں جاؤں، کیسے جا سکتی ہوں۔"

"یہ سب کچھ مجھ پر چھوڑ دے۔ میں امی سے کہہ دوں گی کہ عابدہ کو لے کر میں ایک سہیلی کے گھر جا رہی ہوں۔ میں تو سچ مچ سہیلی کے گھر چلی جاؤں گی، تم سیدھی ان کے کالج جانا، دن کو کسی کو شک بھی نہیں پڑے گا۔ کسی چپڑاسی کے ذریعے انہیں بلوا لینا، پھر واپسی پر میری سہیلی کے گھر آ جانا، وہاں سے ہم اکٹھے گھر آ جائیں گے۔"

"مگر، باجی---!" اس نے جیسے کھوئے کھوئے سے انداز میں پوچھا۔ "میں کہوں گی کیا؟"

"ان سے کہنا---" رشیدہ لفظ سوچ سوچ کر کہنے لگی۔ "کہنا، آپ نے جس سے جیون باندھنے کے عہد کئے تھے، اسے بھلا کر نئے راستے تلاش نہ کیجئے، لوٹ آیئے---" پھر اچانک رشیدہ کے چہرے پر لہو کی سرخی اُمڈ آئی، اس کا بازو پکڑ کر بولی۔ "عابدہ، میری اچھی عابدہ! ان سے کہنا آپ کی تعلیم تو جانے کب ختم ہو گی البتہ آپ کی حرکتیں اب زیادہ دیر چھپی نہیں رہیں گی۔ میں سب کی نظروں میں ذلیل ہو جاؤں گی۔"

"باجی---" وہ سر سے پاؤں تک لرز گئی۔

رشیدہ نے سر جھکا لیا، مردہ آواز میں بولی۔ "ہاں، مجھ سے بھول ہو گئی۔ ان کی باتوں میں آ گئی، مجھ سے گناہ سرزد ہو گیا--- ہائے، میرے خدا!"

وہ عابدہ کے کاندھے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ عابدہ نے اسے گلے لگا لیا۔

"مت روئیے، باجی! آنسو میرے لئے رہنے دیجئے۔ یہ میرا مقدر ہیں، آپ کی آنکھوں میں آنسو اچھے نہیں لگتے۔ بس چپ ہو جایئے۔ میں کل جاؤں گی ان کے پاس---"

یہ کہہ کر اس کے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے اور وہ رشیدہ سے لپٹ کر سسکنے لگی۔

رشیدہ کی حالت دیکھ کر اس نے وعدہ تو کر لیا لیکن جب اگلی صبح طلوع ہوئی اور اس کے ساتھ باہر نکلی تو اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ سعید سے کیا کہے گی؟ اس کے سپرد ایک ایسے مقدمہ کی وکالت کی جا رہی تھی جس میں وہ خود ایک فریق تھی لیکن امید و بیم کی لہروں میں ڈوبتے ابھرتے وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچی البتہ رشیدہ کو اس کی سہیلی کے گھر چھوڑ کر وہ میڈیکل کالج ضرور پہنچ گئی۔ گیٹ میں داخل ہوتے ہی اسے سرسبز درختوں سے لدے پھندے لان میں سعید نظر ضرور آ گیا مگر وہ تنہا نہیں تھا، اس کے ساتھ ایک گوری چٹی تیکھے نقوش والی خوش لباس لڑکی بھی تھی۔ دونوں کیلے کے ایک درخت کے نیچے بیٹھے تھے۔ اس نے ایک لڑکے کے ذریعے سعید کو اپنی طرف بلوایا مگر وہ تنہا نہیں آیا، تیکھے نقوش والی لڑکی بھی اس کے ساتھ آئی۔ گھر سے وہ برقع پہن کر نکلی تھی کالج پہنچ کر بھی اس نے بدستور نقاب چہرے پر رکھی۔ سعید نے اسے دیکھا تو پہچان گیا، چونک کر بولا۔

"ارے، تم؟--- خیر تو ہے، ماموں جان کی طبیعت تو ٹھیک ہے، نا؟"

ہمراہی لڑکی اس کے برقع کو بڑی حقارت سے دیکھ چکنے کے بعد بڑی لاتعلقی سے دونوں کی گفتگو سن رہی تھی۔ عابدں نے دھڑکتے دل کو سنبھالنے کی کوشش کی مگر گلا رندھ گیا، آواز لرزنے لگی۔

"ہاں، وہ ٹھیک ہیں--- آپ اب کیوں نہیں آتے؟"

سعید کو احساس ہوا کہ اب تک اجنبیت کی فضا قائم ہے، تعارف نہیں ہوا لہٰذا وہ جھینپ کر بولا۔

"شمائلہ! یہ میرے انکل کے ہاں رہتی ہیں، عابدہ--- اور عابدہ! یہ ہیں شمائلہ، میری کلاس فیلو۔"

"آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی---" شمائلہ نے سرسری سے کہا حالانکہ خوشی کا نام و نشان بھی اس کے چہرے پر نہیں تھا۔ عابدہ کو ایسے رسمی اور جھوٹے الفاظ بولنے نہیں آتے تھے، چپ رہی۔

"ہاں، کوئی کام تھا کیا؟" سعید نے پوچھا۔

"تھا تو سہی، ڈاکٹر صاحب!"

"ہاں تو بتاؤ؟ نا---!" سعید نے خوش دلی سے پوچھا۔ "تم بہت گھبرا رہی ہو، یہ تو میری کلاس فیلو ہیں، ان سے نہ شرماؤ۔ اعتماد سے بات کرو۔"

اعتماد تو جانے کب کا شکستہ ہو چکا تھا تاہم وہ خود پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ "گھر کی کوئی بات ہے، آپ سے کہنی ہے۔"

شمائلہ اچانک منہ بنا کر مڑی۔ "بھئی، صاف کہو پہیلیاں کیا سنا رہی ہو، دوٹوک بات کرو کہ میری موجودگی یہاں غیر ضروری ہے--- او کے، سعید!"

"تم چلو، میں آتا ہوں۔" سعید نے خوشامدانہ انداز میں اس سے کہا۔

"او کے، او کے---"

شمائلہ نے جاتے جاتے جواب دیا اور تیز قدموں سے برآمدے کی طرف بڑھ گئی۔

"یہاں آنے کا مطلب---؟" سعید اس کے جاتے ہی بگڑے تیور کے ساتھ بولا۔ "خواہ مخواہ میری پوزیشن مشکوک کرنے کا فائدہ؟"

اس نے غور سے سعید کا چہرہ دیکھا۔ وہی شربتی آنکھیں تھیں، ہمیشہ پیار بھرے انداز میں دیکھنے والی مگر اب ان میں الجھن تھی، نفرت تھی، گہری مگر نظر نہ آنے والی نفرت۔

"مجھے معاف کر دو، مجھ سے غلطی ہو گئی--- ایک پیغام تمہیں پہنچانا تھا باجی رشیدہ کا۔"

"رشیدہ کا پیغام---" وہ ٹپٹا گیا۔ "میں کوئی لندن میں تو نہیں رہتا اسی شہر میں رہتا ہوں--- آ جاتا خود کسی دن، پیغام رسانی کی کیا ضرورت تھی اور پھر تم نے قاصد کا کام کب سے شروع کر دیا؟"

اس نے اُمڈتے آنسوؤں پر بڑی مشکل سے قابو پایا۔ "بس میں کسی کو دکھی نہیں دیکھ سکتی، یہی میری مجبوری ہے، یہی مجبوری مجھے یہاں لائی ہے۔"

"جلدی سے پیغام دو، آج کل میرے پیپر ہو رہے ہیں، میں رات دن مصروف ہوں۔" سعید کا لہجہ الجھا ہوا تھا۔

"پیغام تو کیا دوں---" وہ سعید کے لہجے کی تلخی فراموش کرتے ہوئے بولی۔ "بس ہاتھ جوڑ کر التجا کرتی

شگفتہ شگفتہ

ایک زمانہ میں اکبرالٰہ آبادی اپنے ایک دوست کے ہاں ہر شام جاتے۔ ان کے پہنچتے ہی اکبر کے دوست حقہ بھروا دیتے۔ ایک روز اکبرالٰہ آبادی پہنچے تو ان کے وہ دوست ایک شخص سے بحث کر رہے تھے۔ موضوع تھا کہ بندر کیا کر سکتا ہے اور کیا نہیں؟--- بحث کے انہماک میں اکبر کے دوست حقہ بھرنا بھول گئے۔ خاصی دیر تک وہ حضرت اپنے ساتھی سے بحث میں اُلجھے رہے۔ اچانک وہ اکبر کی طرف مڑے اور بولے۔

"قبلہ! آپ بھی تو بتائیں بندر کیا کر سکتا ہے اور کیا نہیں؟"

اکبرالٰہ آبادی نے کمال سنجیدگی سے جواب دیا۔ "بندروں کے بارے میں مَیں اور تو کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن اتنی بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ بندر حقہ ہرگز نہیں بھر سکتا۔"

محمد انور خان' لاہور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوں کہ مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہو تو مجھے معاف کر دیجئے اور جتنی جلدی ہو سکے، رشیدہ باجی سے نکاح کر لیجئے ورنہ ان کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔ آج سے میں آپ کو تم سے مخاطب نہیں کروں گی۔"

"میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا---" سعید نے بظاہر پریشان ہو کر جواب دیا۔ "ویسے بھی جب تک میری تعلیم مکمل نہ ہو، میری شادی کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔"

"مگر---" وہ کانپ کر بولی۔ "خدا کے لئے جلدی کیجئے، دو ایک ماہ کے اندر اندر۔"

"دو---ایک---ماہ---" سعید ایک لفظ چبا کر بولا۔ "بہر حال، اب تم جاؤ، میں پیپر وغیرہ ختم ہونے کے دو چار دن بھر گھر آؤں گا۔"

"مگر خدا کے لئے---" وہ جاتے جاتے زور دے کر بولی۔ "جلدی کیجئے۔"

"اچھا، بابا! بہرہ نہیں ہوں، ایک بار سن لیا ہے۔ اب مجھے ذہنی طور پر پریشان نہ کرو۔ جاؤ، میں آ جاؤں گا۔" یہ کہہ کر وہ مصنوعی مسکراہٹ چہرے پر طاری کر کے بولا۔ "اچھا، عابی! خدا حافظ، میں جلدی میں ہوں۔"

وہ ڈگمگاتے قدموں سے رشیدہ تک پہنچی۔ دونوں سہیلی کے گھر کچھ دیر بیٹھ کر روانہ ہوئیں تو رکشہ میں بیٹھتے ہی رشیدہ نے بیتابی سے پوچھا۔

"تم سے بات ہوئی، ملاقات ہوئی۔ کیا کیا انہوں نے؟"

"آپ کو پوچھ رہے تھے۔ آج کل ان کے پیپر ہو رہے ہیں، دو چار دن میں گھر آئیں گے۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"مگر میرے پیغام کے جواب میں کیا کہا؟" رشیدہ مضطرب تھی۔

اس کا جی تو چاہا کہ صاف بتا دے پر کچھ سوچ کر اس نے سر جھٹک دیا، آنسو پی کر کہا۔

"وہ ضرور کوشش کریں گے۔ انہیں بہر حال آپ سے شادی کرنی پڑے گی---ضرور، ہر حالت میں۔"

رشیدہ اس سے لپٹ گئی۔ "میری اچھی بنو! تجھے میرا کتنا خیال ہے۔"

دو چار دن کیا، پورا ہفتہ بیت گیا لیکن سعید کی صورت نظر نہ آئی البتہ ایک مرتبہ اس نے ماموں کو فون ضرور کیا کہ وہ مصروفیت کی وجہ سے آ نہیں سکا، فارغ ہوتے ہی آئے گا۔ اسی اثناء میں رشیدہ کو جب بھی موقع ملتا اسے اپنے پاس بلا کر گھنٹوں سعید کی باتیں کرتی اور وہ خشک آنکھوں سے خاموش تماشائی بنی سب کچھ دیکھتی رہتی، سب کچھ سنتی رہتی۔ رشیدہ ایک بڑی غلطی کر چکی تھی جو اپنی پرواخت کے مراحل میں تھی۔ آنے والے لمحوں کے خطرات سر پر منڈلا رہے تھے۔ سعید آنے کا نام نہیں لے رہا تھا اور خوف سے رشیدہ کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔

ادھر اس کے دل کا عجیب عالم تھا۔ ایک طرف رشیدہ تھی، ایک طرف اس کی پہلی اور آخری چاہت تھی اور ان دونوں کے مابین جیسے اس کا وجود خلاؤں میں جھول رہا تھا۔ سعید کی پیار بھری باتیں یاد آتیں تو ہچکیاں بندھ جاتیں، پہروں دل قابو میں نہ آتا۔ رشیدہ کی حالت دیکھتی تو انسانیت کا درد اس کے دل میں جاگ اٹھتا۔ وہ عجب کش مکش کے عذابوں میں تھی۔ دل اور دماغ میں ایک نہ ختم ہونے والی جنگ شروع ہوگئی تھی۔ اسی عالم میں مہینہ بیت چلا تھا کہ ایک دن اچانک گھر میں کہرام مچ گیا۔ کسی نے سعید کو چاقوؤں کے پے در پے وار کر کے بُری طرح زخمی کر دیا۔ ماموں اطلاع پاتے ہی ہسپتال پہنچے۔ واقعہ رات گئے ہوسٹل کے کمرے میں پیش آیا تھا۔ اس روز اتفاق سے سعید کا روم میٹ بھی موجود نہیں تھا۔ وہ

کئی دن سے اپنے گاؤں گیا ہوا تھا اور ساتھ والے کمرے والے بھی سینما دیکھنے چلے گئے تھے۔ کسی نے نامعلوم حملہ آور کو نہیں دیکھا تھا۔ سعید کی حالت نازک تھی۔ وہ کوئی بیان دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ ماموں نے پریشان حال میں آ کر جیسے ہی گھر میں یہ خبر سنائی، کہرام مچ گیا۔ رشیدہ رو رو کر بے حال ہونے لگی۔ آناً فاناً ٹیکسی میں سب ہسپتال پہنچے۔ عابدہ نے رشیدہ کو سنبھال رکھا تھا اور نوید ممانی کو سنبھالے ہوئے تھے۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ سعید کے جسم سے خاصا خون بہہ چکا ہے اور اب فوری طور پر خون کی ضرورت ہے۔ رشیدہ، نوید اور ماموں نے فوراً خون دینے کی پیش کش کر دی لیکن ٹیسٹ کے بعد ان کا خون مختلف گروپ کا نکلا۔ جس گروپ کے خون کی ضرورت تھی وہ بہت قلیل مقدار میں ہسپتال میں موجود تھا جو ناکافی ہوا۔ عابدہ نے فوراً خود کو پیش کر دیا۔ ماموں ہچکچائے، ممانی بھی اسی لمحے بول پڑی۔

"لو اور سنو، جب ہمارا خون اس کے کسی کام نہ آیا تو تمہارا خون کیا کرے گا؟"

ممانی کی بات وہ ان سنی کر کے رشیدہ کے ساتھ ڈاکٹر کی طرف بڑھی۔ اس کا بھی خون ٹیسٹ کیا گیا۔ نتیجہ سب کے توقعات کے برعکس نکلا، یعنی ٹیسٹ کامیاب رہا۔ خون لینے کا عمل شروع ہوا تو وہ رشیدہ کو دیکھ دیکھ کر مسکراتی رہی۔ اس کے لہو کی کرنیں سعید کی زندگی کی تیرگی کو اُجالے میں بدل سکتی تھیں۔ خون کی منتقلی سود مند ثابت ہوئی۔ سعید کے ستے ہوئے چہرے پر زندگی کی پرچھائیاں ناچنے لگیں۔ ڈاکٹر کی اجازت وغیرہ کر مرحلے سے فارغ ہو کر سب سعید کے کمرے میں آئے۔ ممانی نے بڑھ کر اس کا ماتھا چوما۔ وہ خاصا کمزور اور زرد ہو گیا تھا۔ پٹیوں سے ڈھکے ہوئے جسم کے اردگرد کھڑے ہوئے ڈاکٹروں اور نرسوں کے درمیان سے اچٹ کر اس

احتیاط

"کل بازار میں تم جس نوجوان، حسین اور اسمارٹ لڑکی کے ساتھ گھوم رہے تھے، وہ کون تھی؟"

"اگر تم وعدہ کرو کہ یہ الفاظ میری بیوی کے سامنے نہیں دُہراؤ گے تو بتا دیتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے، وعدہ رہا۔"

"وہ میری بیوی ہی تھی۔"

میاں جاوید جالندھری

کی نظر عابدہ پر نہ پڑ سکی جو زرد روسر جھکائے سب سے پیچھے کھڑی تھی۔ اس نے خون دینے سے قبل سب سے کہہ دیا تھا کہ اس کے نام کی تشہیر نہ کی جائے۔ سعید سے نظریں ملائے بغیر وہ سب کے ساتھ ہسپتال سے لوٹ آئی۔

ڈیڑھ دو ہفتے بعد صحت یاب ہونے پر ماموں سعید کو گھر لے آئے۔ جتنے دن وہ ہسپتال میں رہا سب قاعدگی سے اس کی عیادت کو جاتے رہے۔ ماموں نامعلوم حملہ آور کے سلسلے میں پولیس کی کارروائیوں سے باخبر ہو چکے تھے کہ اس پورے واقعہ کی تہہ میں رقابت کار فرما تھی۔ شمائلہ کے کسی پرستار نے سعید کا قصہ پاک کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ناکام رہا۔ وہ خون دینے کے بعد اور تمام حالات جان لینے کے بعد پُرسکون ہو کر گھر کے کام دھندے میں لگ گئی تھی اور دانستہ کسی روز سعید کی عیادت کے لئے ہسپتال نہیں گئی۔ سعید گھر آیا تو اس کا دل دھڑکنے لگا۔ کچھ ڈھونڈتی اور کھوجتی آنکھوں سے اس نے ادھر ادھر دیکھ کر نوید سے پوچھا۔

"عابدہ کہاں ہے، نظر نہیں آئی؟"

جاوید نے بتایا کہ اوپر اپنی کوٹھڑی میں ہوگی تو وہ تھوڑی دیر بعد اپنے کمرے میں جانے کا بہانہ کر کے اوپر آ گیا۔ عابدہ کی کوٹھڑی کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہ اپنی چارپائی پر لیٹی سامنے سجی ہوئی ابا کی گرد آلود تصویر کو بڑے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انہماک سے دیکھ رہی تھی۔ سعید اندر آ گیا۔

''مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ تم نے خون دے کر میری جان بچائی---'' سعید نے جذبات سے لرزتی آواز میں کہا۔ ''مجھے معاف کر دو، خدا کے لئے!''

وہ ہڑ بڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ایک پل کے لئے اس نے سعید کی طرف دیکھا اور پھر آہستہ سے بولی۔

''ایک شرط پر---''

سعید نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

''آپ اسی مہینے باجی رشیدہ سے شادی کیجئے۔'' وہ رک رک کر بولی۔

''مگر---'' سعید نے کچھ کہنا چاہا۔

''اگر مگر کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر آپ نے اسی مہینے کے اندر اندر اپنے والدین کے ذریعے پیغام نہ بھجوایا تو میں اس چھت سے گلی میں کود جاؤں گی اور مرنے سے پہلے خط میں پولیس کو لکھ جاؤں گی کہ آپ میری باجی کی عزت سے کھیلنے کے بعد ان سے منہ موڑ گئے ہیں۔ میں یہ صدمہ برداشت نہ کر سکی اور موت کو گلے لگا لیا---'' وہ تیز لہجے میں بولی۔ سعید سکتے کے عالم میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ ''یہ دھمکی نہیں ہے۔ یہ بات آپ اچھی طرح یاد رکھئے کہ میں نے اپنا خون اس لئے دیا تھا کہ آپ بچ سکیں اور باجی رشیدہ کی بدنامی نہ ہونے پائے۔''

''تم---'' سعید کھوئے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''عابی! تم---؟''

''میرا نام عابدہ ہے، عابی نہیں---آج کے بعد سے آپ کبھی مجھے عابی کہہ کر نہیں پکاریں گے، کبھی میرے کمرے کا رخ نہیں کریں گے، کبھی ماضی کو نہیں دہرائیں گے۔ ہر بات یوں بھول جائیں گے جیسے اس گھر میں میرا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ میں کبھی پیدا ہی نہیں ہوئی تھی---'' وہ گہرے گہرے سانس کے درمیان بولتی رہی۔

''جب میں نے کوئی سکھ دیکھا ہی نہیں تو مجھے پیار کرنے کا کیا حق ہے---مجھے کیا حق ہے مجھے کیا حق ہے؟'' سعید دم بخود اس کی طرف دیکھتا رہا۔ ''جائیے---'' وہ ہاتھ اٹھا کر بولی۔ ''آج کے بعد اس کوٹھڑی کا دروازہ آپ کے لئے بند ہو گیا۔ میں نے جن کا نمک کھایا ہے، جنہوں نے مجھے پالا ہے میں ان کے حق پر کوئی ڈاکہ نہیں ڈال سکتی۔ میں نے آپ کو ان کے حوالے کر دیا جن کا تعلق تھا اور میں---'' یکا یک اس کا دم بھر آیا۔ ''اور میں---میں تو بہت خوش ہوں مجھے کوئی غم نہیں---کوئی غم نہیں۔'' کہتے کہتے اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ چھلکے ہوئے آنسو دو لکیروں بناتے ہوئے اس کے گالوں پر ڈھلکنے لگے۔ ''جائیے---'' وہ کوٹھڑی کا دروازہ بند کرتے ہوئے بولی۔ ''میں جب تک جیوں گی، یہ ہونٹ چپ رہیں گے، یہ زبان خاموش رہے گی، یہ آنکھیں کچھ نہیں بولیں گی۔ کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ اس گھر میں کتنا بڑا طوفان آیا اور گزر گیا---جائیے، خدا حافظ!''

سعید لڑکھڑاتے قدموں سے باہر نکلا تو اس نے جلدی سے کوٹھڑی کا دروازہ بند کر لیا اور کوٹھڑی میں اس کی دبی دبی سسکیاں گونجے لگیں۔ نچلی منزل کی طرف جاتے ہوئے دیر تک یہ سسکیاں سیڑھیاں اترتے ہوئے سعید کا پیچھا کرتی رہیں۔ جاوید اپنی ہاکی ڈھونڈنے اوپر گیا تو وہ بدستور کوٹھڑی بند کئے سسکیاں بھر رہی تھی۔ نیچے آ کر اس نے ممانی کو بتایا۔

''امی! عابدہ رو رہی ہے۔''

ممانی نے نفرت سے ہونٹ سکوڑ کر کہا۔ ''اور کم بخت کو آتا ہی کیا ہے---باپ کو مرے زمانہ بیت گیا لیکن اب تک اس کے آنسو تھمنے میں نہیں آتے، بات بہانے رو پڑتی ہے منحوس کہیں کی!''

☆☆

آخری لڑکی

☆ احمد اعجاز

پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہم اسلامی معاشرے کی تشکیل میں ناکام رہے ہیں۔ یہاں جن کے پیٹ خالی ہوں، وہ پیٹ بھرنے کی خاطر گمراہی اختیار کرتے ہیں اور جن کے پیٹ بھرے ہیں، وہ صرف تفریح کے لئے گمراہی کے نت نئے بہانے تلاش کرتے ہیں۔ اس سچائی میں آپ کو آج کے دور کی ایک واضح تصویر دکھائی دے گی---احمد اعجاز کی ایک اور تیکھی تحریر کی تیسری اور آخری قسط!

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"یہ کہاں آ گئی ہیں آپ---؟"

ایک فائیو سٹار ہوٹل کے پارکنگ ایریا میں سارا نے اپنی لمبی سی چمکتی دمکتی، نئے ماڈل کی کار کو بریک لگائی تو حیرت زدہ ہو کر میں نے اس سے پوچھا۔

"تم نیچے اترو، بتاتی ہوں---"

اس نے میری سائیڈ والا فرنٹ ڈور بٹن سے کھول دیا۔ میں نیچے اترا تو اس نے گاڑی کو لاک کر دیا اور بولی۔

"آؤ---"

میں اس کے ساتھ ہوٹل کے مین گیٹ کی طرف چل پڑا اور پھر پوچھا۔

"یہاں--- کیوں؟"

"ایک اپائنٹمنٹ ہے---"

"مگر تم تو کہہ رہی تھی کہ منزہ کتابیں لئے گھر پر میرا انتظار کر رہی ہے؟"

"چلے جائیں گے گھر بھی، تھوڑی دیر بعد--- اتنی جلدی کیا ہے؟" وہ پُرسکون لہجے میں بولی۔

"مگر منزہ پریشان ہوگی---" میں نے پھر کہا۔

وہ میرا ہاتھ پکڑ کر زور سے دباتے ہوئے بولی۔

"تم منزہ کے صرف ٹیچر ہو جبکہ میرے فرینڈ--- منزہ میری بیٹی ہے اور تمہاری صرف سٹوڈنٹ۔ تم اس کی مدر اور اپنی فرینڈ کے ساتھ اس کے کہنے پر چل رہے ہو، یہی تمہارے لئے کافی ہے--- شرجیل! حوصلہ رکھو، میں تمہیں کسی بھی غلط جگہ نہیں لے جاؤں گی۔" اس کی آنکھوں میں شوخ و شنگ مسکراہٹ تھی۔

"میں نے یہ تو نہیں کہا---"

"تو گویا تمہیں مجھ پر ہنڈرڈ پرسنٹ بھروسہ ہے؟" وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔

"وہ تو ہے---" میں بھی مسکرا دیا۔

"تو پھر میں تمہیں کہیں بھی لے جا سکتی ہوں، نا----؟" اس نے آنکھیں مٹکائیں۔

"ٹھیک ہے--- جہاں مرضی، لے چلو۔"

میں نے دانستہ ہتھیار ڈال دیئے کیونکہ اس کے بغیر اب کوئی دوسرا چارہ کار نہ تھا۔

ہوٹل کے گارڈ نے دروازہ کھولا اور تو ہم دونوں نے اکٹھے اندر قدم رکھے۔ وہ ایک طرف کو چل دی۔ کشمیر ڈائننگ ہال میں داخل ہو کر اس نے دروازے پر کھڑے بیرے سے پوچھا۔

"بیس نمبر ٹیبل کدھر ہے؟"

اس بیرے کے ساتھ کھڑا ہوا دوسرا بیرا ہمارے ساتھ ہو لیا اور ہمیں ہماری مطلوبہ ٹیبل پر چھوڑ آیا۔

"پہلے کیا پیو گے---؟" سارا نے میرے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ کر پوچھا۔

"مجھے تو کوئی طلب نہیں اس وقت---"

"مگر کچھ تو لینا ہی پڑے گا۔"

"تمہاری تو کسی سے یہاں اپائنٹمنٹ ہے---؟"

میں نے اسے یاد دلایا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس دی اور ہنستے ہنستے بولی۔

"بالکل ہے--- اپائنٹمنٹ ہے---"

"مگر کس سے، کہاں ہے وہ---؟"

"وہ---" سارا میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ "وہ میرے سامنے بیٹھا ہوا ہے اس وقت---"

"سامنے بیٹھا ہوا ہے--- کیا مطلب ہے تمہارا، سارا---؟"

"جو میں نے کہا ہے، وہی میرا مطلب ہے۔"

"تو گویا میں--- مجھ سے تم نے اپائنٹمنٹ لی

ہے؟"

"ہاں، ایسا ہی ہے آج--- کتنی مشکلوں سے اور کہاں کہاں سے اس وقت نکال کر لائی ہوں تمہیں میں--- یہاں اس جگہ---"

"مگر میں--- مجھے اپنی حیثیت معلوم ہے۔ میں تو تمہارا تنخواہ دار ملازم ہوں---"

"کیا کہا--- کیا کہا تم نے، شرجیل! تم--- تم ملازم ہو میرے---؟"

"تو اور کیا--- مجھ سے اپائنٹمنٹ لینے کی بھلا تمہیں کیا ضرورت ہے؟"

"دیکھو، شرجیل---!" وہ مصنوعی غصے بھرے لہجے میں بولی۔ "دیکھو، ابھی جو تم نے یہ ملازم وغیرہ کا انتہائی انسلٹنگ لفظ استعمال کیا ہے، دوبارہ پھر کبھی بھی، زندگی بھر، اس لفظ کو زبان پر مت لانا ورنہ--- ورنہ بہت بُری طرح پیش آؤں گی، ہاں---"

یہ کہہ کر وہ ہونٹوں میں مسکرا دی۔ مجھے بھی مذاق سوجھا چنانچہ میں نے ہنستے ہوئے اس سے پوچھا۔

"اچھا، سارا! یہ بتاؤ کہ بُری طرح تم کیسے پیش آؤ گی؟"

یک لخت اس کی آنکھوں میں خمار آلود ڈور سے تیرنے لگے۔

"یہ سوال، شرجیل! تم نے یہاں پوچھا ہے اس لئے--- اس لئے یہاں تو میں فی الحال اس سوال کا جواب نہیں دے سکتی مگر کاش! تم نے یہ سوال کبھی میرے گھر پر پوچھا ہوتا تو---تو---"

وہ دانت پیسنے لگی اور شدت جذبات سے اپنی دونوں مٹھیاں بھینچ لیں۔

"تو کیا--- بتاؤ نا، سارا---؟"

"یہی--- یہی کہ مجھے اپنا کہنا نہ ماننے والوں کو کچا چبانا بھی آتا ہے۔"

اس وقت بیرا ہاتھ میں ٹرے لئے ہمارے سر پر آن کھڑا ہوا اور پھر لنچ کا سامان ٹیبل پر رکھنے لگا۔ لنچ سارا نے بڑا ہی پُرتکلف ارینج کیا تھا۔ بہت مزہ آیا اور خوب جی بھر کر کھایا، بعد میں کافی بھی بڑی مزیدار تھی جسے میں اور سارا چسکیاں لے کر پیتے رہے۔

ہوٹل سے نکل کر گاڑی کو مین روڈ پر لاتے ہی سارا نے مجھ سے پوچھا۔

"میرے گھر چلو گے نا، اب تم---؟"

"نہیں---"

"کیوں---؟"

"تم سے ملاقات ہو گئی، لنچ بھی تم نے کروا دیا۔ اب---"

"منزہ سے نہیں ملو گے؟"

"اب اس سے کل ملوں گا، فی الحال میں اپنے گھر جانا چاہتا ہوں۔"

"گھر--- یعنی، اپنے کمرے میں---؟"

"ہاں---"

"مگر، شرجیل---! گرمی دیکھ رہے ہو، کتنی زیادہ ہے--- میرے ساتھ چلو، میرے گھر۔ کمرے میں اے سی لگا کر سو جانا، اکیلے---" یہ کہہ کر اس نے معنی خیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"نہیں، میں اپنے گھر ہی جاؤں گا۔" میں بضد رہا۔

"مگر وہاں تو ایک لاش پڑی ہوئی ہے، تم وہاں آرام کیسے کر سکو گے؟"

"دیکھا جائے گا کہ آرام کرنا ہے یا نہیں مگر میرا وہاں جانا ضروری ہے۔"

"اتنا ضروری بھی نہیں ہے، شرجیل! سب دنیاوی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

باتیں ہیں، رکھ رکھاؤ کے مختلف طریقے ہیں۔ مصنوعی ہمدردی، بناوٹی اور دکھاوے آنسوؤں کے پردے میں لپٹی ہوئی دوہری، نوکیلی سوچ ہے ہمارے اس دوغلے معاشرے کی--- میت والے گھر عورتیں اور کچھ مرد بھی فل بناؤ سنگھار کر کے، زرق برق لباس پہنے یوں پہنچ جاتے ہیں جیسے کسی کی موت پر نہیں بلکہ کسی فنکشن پر جارہے ہیں اور پھر سارا وقت میت کی روح کو ایصال ثواب پہنچانے کی بجائے، فیشن یا زیور، کپڑوں اور اس طرح کی دوسری دنیاوی باتوں میں گزارا جاتا ہے۔ اکثر اوقات عورتیں میت والے گھر بھی بیوٹی پارلر سے باقاعدہ تیار ہو کر جاتی ہیں--- اب تم ہی بتاؤ، شرجیل! ایسے افسوس کرنے کا کیا فائدہ؟''

''باتیں تو تم نے ایک دم صحیح کی ہیں، سارا---!'' میں نے مختصر جواب دیا۔

''اچھا، شرجیل! یہ بتاؤ کہ وہ لڑکی جو چیخ مار کر بے ہوش ہوگئی تھی، اس مرنے والی کی بیٹی ہے، نا---؟''

''ظاہر ہے، اس نے امی کہا تھا تو یقیناً مسز شیرازی کی ڈاٹر ہی ہے۔''

کتنا جانتے ہو تم اس کے بارے---؟''

اس کے اس اچانک سوال پر میں حیران و ششدرہ گیا اور اس سے جواباً کہا۔

''میں--- میں سمجھا نہیں، سارا! کہ تم اس سوال کے ذریعے مجھ سے کیا پوچھنا چاہتی ہو؟''

''میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں تم سے، شرجیل---'' وہ کہنے لگی۔ ''--- کہ تم جوان کے کرائے دار ہو، آخر ان کی فیملی کے بارے میں کچھ تو معلومات رکھتے ہی ہوگے؟''

''نہیں--- میں کچھ زیادہ نہیں جانتا ان کے بارے میں، مجھے تو صرف اس سے غرض ہے کہ انہیں کرایہ ٹائم پر مل جایا کرے۔''

''تو تم واقعی ان کے--- میرا مطلب ہے، اس لڑکی کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے---؟''

''میں نے کہا نا، سارا! نہیں--- پلیز، یقین کرو میرا۔''

''مگر میں جانتی ہوں، اس لڑکی کے بارے میں---''

اس کا یہ انکشاف سن کر میری حیرانی کی انتہا نہ رہی لہٰذا میں نے فوراً ہی اس سے پوچھا۔

''تم--- تم، سارا! کیسے جانتی ہو، اس لڑکی کے متعلق؟''

''میں--- بس جانتی ہوں--- ساجدہ نام ہے نا، اس کا؟''

''ہاں---''

''کالج میں پڑھتی ہے؟''

''ہاں---''

''بی اے فائنل ایئر میں ہے؟''

''ہاں---'' میری حیرانی اپنے عروج پر پہنچ رہی تھی۔

سارا نے میری طرف چبھتی ہوئی نگاہوں سے دیکھا اور بولی۔

''مگر تم تو، شرجیل! کہتے تھے کہ تم اس لڑکی کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے اور اب ہر بات پر ہاں کہتے جارہے ہو؟''

اس دفعہ میں واقعی سٹ پٹا سا گیا اور بغلیں جھانکنے لگا--- سارا پھر بولی۔

''پریشان یا حیران ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، شرجیل! میں تمہیں بتائے دیتی ہوں کہ میں اسے کیسے جانتی ہوں۔ آخر اب تم میرے اور میں تمہاری فرینڈ

ہوں، ہم میں کوئی بات اب پوشیدہ یا راز میں نہیں رہنی چاہئے--- سٹور والے کو تو جانتے ہی ہو، تم---؟''

''ہاں---''

''دوستی ہے نا، تمہاری اس سے؟''

''ہاں، بھی اس کا جواب ہوسکتا ہے اور نہیں بھی---''

''یہ کیا ذومعنی باتیں کررہے ہو تم، شرجیل! دوستی یا فرینڈ شپ ہوتی ہے یا پھر نہیں ہوتی---؟''

''میرے کہنے کا مطلب یہ تھا اصل میں کہ میری اور اس کی دوستی کی عمر کچھ زیادہ طویل نہیں ہے۔''

''اس سے کیا ہوتا ہے، شرجیل! جب ایک دفعہ کسی کو فرینڈ کہہ دیا تو بس کہہ دیا--- اب میری اور تمہاری فرینڈ شپ کی ایج بھی تو چند دنوں پر محیط ہے، تو کیا ہم آپس میں فرینڈ نہیں ہیں؟''

''ہیں، بالکل ہیں--- اچھا تم بتاؤ، آگے کیا کہنا چاہتی تھیں؟''

''اس سٹور والے نوجوان سے میری ایک فرینڈ کی فرینڈ شپ ہے، بہت اچھی اور گہری فرینڈ شپ۔ جیسی--- جیسی میری اور تمہاری اس وقت ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ، بہت زیادہ، بہت آگے بلکہ شائد میں نے غلط لفظ استعمال کیا ہے، فرینڈ شپ--- اس سے بھی اگلی منزل، اس سیڑھی کے آخری زینے کو وہ دونوں عبور کر چکے ہیں--- تم سمجھ گئے ہوگے کہ ان کے تعلقات کتنے گہرے ہیں--- آتا رہتا ہے وہ نوجوان میری اس فرینڈ کے گھر، جب بھی وہ اسے بلاتی ہے۔ یہ جو ظالم جوانی ہے نا، شرجیل! یہ بڑی منہ زور ہے، بے لگام گھوڑے کی طرح سرپٹ دوڑنا چاہتی ہے یہ--- اس کی ضرورتیں، اس کی خواہشات، اس کی توقعات اگر ٹھیک ذرائع سے پوری نہ ہوں تو پھر یہ منفی ذرائع ڈھونڈنے پر مجبور ہوا کرتی ہے--- میری وہ فرینڈ بھی اس مجبوری، اس تنہائی کا شکار ہے اور وہ آخر کار اس سٹور والے نوجوان سے اپنی خواہشات کی تکمیل کرتی رہتی ہے--- دو تین بار میں اپنی اس فرینڈ کے ساتھ اس نوجوان کے سٹور پر شاپنگ کے لئے گئی تو اس لڑکی، یعنی ساجدہ کو وہاں پہلے سے موجود پایا۔ مجھے ان دونوں کی حرکات مشکوک اور کچھ کچھ قابل اعتراض بھی لگیں تو میرے استفسار پر میری اس فرینڈ نے اس لڑکی کے متعلق کافی سارے انکشافات کئے۔ سب کا ذکر کرنے کی اس وقت کوئی ضرورت نہیں ہے، پھر کبھی سہی کیونکہ تم خود بھی جوان ہو اور جوانی کے تقاضوں کو اچھی طرح سمجھتے ہو--- اچھا، چلو، یہ سب کچھ تو میں نے تمہیں بتا دیا ہے، اب اپنے گھر کا راستہ تم مجھے بتاؤ---؟''

میں نے اسے گائیڈ کرنا شروع کر دیا۔ چند منٹوں میں اس کی نئی نویلی کار میرے گھر کے سامنے کھڑی تھی۔ میں اگلا دروازہ کھول کر باہر نکلا تو وہ جلدی سے بولی۔

''شرجیل! بڑے بے مروّت ہو تم--- مجھے اپنا گھر، یعنی اپنا کمرہ نہیں دکھاؤ گے؟''

میں چند لمحوں کے لئے ہچکچاہٹ اور کسی قدر تذبذب کا شکار ہوگیا کیونکہ شیرازی صاحب کے گھر مردوں اور عورتوں کا تانتا بندھا ہوا تھا، گھر کے اندر سے رونے، دھونے کی آوازیں آرہی تھیں--- میری اس پریشانی کو وہ اچھی طرح بھانپ گئی اور بولی۔

''تم نے بتایا تھا کہ تمہارا کمرہ اوپر ہے--- یہ سامنے والی سیڑھیاں غالباً تمہارے کمرے کی طرف ہی جاتی ہیں؟''

یہ کہہ کر وہ کار سے اُتر آئی۔ اسے لاک کیا اور میرے ساتھ گھر کے کھلے ہوئے مین گیٹ سے گزر کر اوپر سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میرے کمرے میں پہنچ کر اس نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ادھر ادھر دوڑائی، یقیناً میرے کمرے کی حالت زار پر غور کر رہی ہوگی۔ میں اسے کہیں بیٹھنے کو بھی نہیں کہہ سکتا تھا کیونکہ کوئی کرسی، حتیٰ کہ بنچ وغیرہ بھی موجود نہ تھا چنانچہ ہم دونوں کھڑے رہے۔ کچھ لمحات ایک دوسرے کی طرف تکتے رہے، پھر میری حیرانی کی انتہا نہ رہی جبکہ سارا نیچے فرش پر بچھے ہوئے بستر پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ کتنی اچھی سوچوں کی مالک ہے سارا--- میرے ذہن میں اس خیال نے انگڑائی لی اور اس کی قدر و منزلت میرے دل میں دو چند ہوگئی۔

''اچھا تو، شرجیل! تم یہاں رہتے ہو؟'' آخرکار اس نے سکوت توڑا۔

''میں کہاں رہتا ہوں یہاں--- یہاں تو میری مجبوریاں رہتی ہیں۔''

اس نے میری آنکھوں میں گہرائی تک جھانکنے کی کوشش کی اور بولی۔

''انسان ساری عمر مجبوریوں کے حصار میں جکڑا رہتا ہے، شرجیل! مگر عقل مند اور ذی شعور انسان وہ ہوتا ہے جو فسٹ چانس کے ملتے ہی ان مجبوریوں کے چنگل سے اپنے آپ کو آزاد کرا لیتا ہے۔''

''لیکن اگر کسی کو یہ چانس ملے ہی نہ، تو---؟''

''نہیں، شرجیل! بالکل نہیں--- ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہر انسان کی زندگی میں آگے بڑھنے کے لئے کوئی نہ کوئی چانس بلکہ بعض اوقات تو چانسز ملتے ہی رہتے ہیں۔ خوش قسمت ہوتے ہیں وہ جو ان چانسز سے فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔''

''مگر بات پھر وہیں پہ آ کے ٹکتی ہے، سارا! کہ یہ چانس کب، کہاں اور کیسے کسی کو ملتا ہے--- میں کم از کم، اپنے متعلق تو وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ مجھے تو ایسا برائٹ چانس ابھی تک نہیں ملا۔''

''اگر تمہیں یہ برائٹ چانس، شرجیل! مل جائے تو--- تو تم کیا کرو گے؟'' فوراً اس کی آنکھوں میں معنی خیز چمک عود کر آئی۔

''جب ملے گا تب دیکھوں گا۔'' میں نے فوراً جواب دیا۔

''اچھا، شرجیل! یاد رکھنا، اب بھول نہ جانا میری یہ بات---'' اس کی آواز سے خوشی چھلک رہی تھی۔ ''چانس تو تمہیں ضرور ملے گا، مایوس ہونے والی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ گو کہ میں کوئی نجومی نہیں مگر یہ بات دعوے سے کہہ سکتی ہوں اور--- اور شرجیل! اگر تم نے اس گولڈن چانس سے فائدہ اٹھا لیا تو پھر تمہاری قسمت کے موجودہ بادل برس برس کر تمہیں نہال کر دیں گے---'' ایک لمحے کو رُک کر وہ پھر بولی۔ ''اب میں چلتی ہوں۔''

پھر وہ یک لخت اٹھ کھڑی ہوئی، میں بھی اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ سیڑھیاں اُتر کر وہ اپنی کار میں بیٹھی تو میں الوداعی ہاتھ ہلا کر اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔

☆☆

مسز شیرازی کی میت کو دفنانے کے بعد میں نے ٹائم دیکھا، رات کے ساڑھے بارہ سے اوپر ہو چکے تھے۔ میرے روم میٹس واپس آتے ہی لمبی تان کر سو چکے تھے مگر نیند مجھ سے گویا روٹھ چکی تھی۔ میں آنکھیں بند کر کے جتنا نیند کے قریب جا کر سونے کی کوشش کرتا، اتنی ہی تیزی سے نیند مجھ سے دُور ہو جاتی۔ دراصل میرا ذہن اس وقت مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ صبح سے لے کر اب تک کے تمام واقعات کسی کی فلم کی طرح میرے ذہن کی سکرین پر مسلسل چل رہے تھے۔ ساجدہ اگر اپنی امی کی موت کی ذمہ دار تھی تو خود ساجدہ کو حالات کے اس اندوہ ناک موڑ پر لانے کا محرک کون تھا؟--- خود ساجدہ، اس

کے والدین، وہ سٹور والا نوجوان یا پھر یہ پورا معاشرہ جو اس وقت اخلاقی، معاشرتی، سماجی، تہذیبی اور مذہبی زوال پذیری اور انحطاط کی آخری منزل پر پہنچ گیا ہے جس سے آگے مکمل تباہی اور بربادی ہے--- اب ساجدہ کا کیا بنے گا؟ کیا وہ اس سٹور والے نوجوان کو خود سے شادی کرنے پر قائل کرنے میں کامیاب ہو جائے گی، کیا وہ سٹور والا نوجوان واقعی اس سے شادی کر لے گا؟--- اپنی امی کی موت کے بعد ساجدہ کا واسطہ اب براہ راست اپنے ابو سے پڑے گا تو اس بدلے ہوئے ماحول میں وہ اپنے ابو کا سامنا کس طرح کر سکے گی؟--- کافی دیر تک میرا ذہن ساجدہ کے ان مسائل کی بھول بھلیوں میں بھٹکتا رہا مگر کوئی قابل عمل حل نہ پا کر پھر سے میری سوچوں کا رخ سارا کی طرف پھر گیا۔ اس کی آج کی ایک ایک حرکت اور گفتگو کے ہر ایک لفظ پر غور کرنے لگا۔ پھر کافی غور و خوض کے بعد مجھے سارا کا رویہ مجموعی طور پر کچھ انوکھا، اچھوتا اور ایک حد تک شدید جذبات میں ڈوبا ہوا محسوس ہوا۔ آج اس کی توجہ میری طرف کچھ زیادہ ہی مبذول رہی اور غیر متوقع طور پر اس نے میرے زیادہ قریب آنے کی کوشش کی تاہم اس کی یہ ساری حرکات اور بات چیت آنے والے وقت میں میرے لئے کس صورت حال کی نشان دہی کر رہی تھی، اس کا تجزیہ کرنے کے باوجود میں کسی حتمی نتیجے پر پہنچنے میں ناکام رہا--- پھر جانے رات کے آخری پہر کس وقت میری آنکھ لگ گئی۔

☆☆

گہری نیند سے گویا کوئی مجھے جگانے کی لگاتار کوشش کر رہا تھا۔ کانوں میں مسلسل جیسے کوئی سیٹیاں بجا رہا تھا۔ ان سیٹیوں کی آوازیں کبھی کم ہوتیں تو کبھی کانوں کے پردے پھٹنے لگتے۔ شعور اور لاشعور آپس میں گتھم گتھا تھے، خواب اور حقیقت ایک دوسرے سے دست و گریبان تھے اور آخر میں بادل نخواستہ گہری نیند سے عالم بیداری میں لوٹ آیا۔ میرے موبائل کی گھنٹی بجتی ہی جا رہی تھی۔ میں نے ہاتھ آگے بڑھا کر اسے اٹھایا۔ سکرین پر نمبر دیکھا۔ یہ وہی نمبر تھا جو اکثر راتوں کو مس کال کر کے مجھے نیند سے بیدار کیا کرتا تھا تاہم میں ایک لمحے کے لئے ٹھٹک گیا کیونکہ خلاف معمول ایک یا دو گھنٹی کے بعد یہ نمبر بند ہونے کی بجائے اس وقت مسلسل بج رہا تھا۔ مطلب صاف ظاہر تھا کہ وہ جو کوئی بھی تھا، اس وقت رات کے تین بجے مجھ سے بات کرنا چاہتا تھا اور پھر عین ممکن تھا کہ شائد

خواہش

1971ء کی پاک بھارت جنگ میں چھمب جوڑیاں سیکٹر کے اگلے مورچوں سے جب ہم نے انڈیا کے کئی قیدی پکڑے تو اِن میں ایک حوالدار دربار سنگھ بھی تھا جس کی تین جوانی بیٹیاں تھیں اور گرفتاری کے وقت اُسے اُن بیٹیوں کا غم کھائے جا رہا تھا۔ ہم نے اُسے تسلی دی اور اپنے مگ میں اُسے چائے بھی پلائی جس پر وہ خوش ہو گیا اور ہمارا شکریہ ادا کیا۔ اُن ہی قیدیوں میں مرہٹہ نائیک امرناتھ تھاپہ بھی تھا جو کہ زخمی حالت میں تھا۔ جب ہم نے اُس کی تلاشی لی تو انڈین کرنسی کے علاوہ اُس کے پاس ایک تصویر تھی۔ جب ہم نے وہ تصویر جو کہ ایک لڑکی کی تھی' بٹوہ سے نکالی تو اُس نے دل گرفتہ ہو کر درخواست کی۔

''سر! آپ میرا سب کچھ لے لیں مگر یہ تصویر جو کہ میری پتنی کی ہے' مجھے واپس کر دیں کیونکہ میں آپ کی قید میں رہتے ہوئے اپنی پتنی کی تصویر دیکھ دیکھ کی قید و بند کی صعوبتیں اور تنہائی کے خون آشام لمحات کاٹ لوں گا ورنہ پتنی کے غم میں ہلکان ہو کر اپنے آپ کو ختم کر لوں گا۔''

دشمن کے سپاہی کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے ہم نے اُس کی پتنی کی تصویر واپس کر دی اور اُسے دوسرے قیدیوں کے ہمراہ لائلپور جیل بھیج دیا تھا۔

دوست محمد خان وٹو' لیہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہ پتہ بھی چل جائے کہ وہ کون ہے؟---چنانچہ میں نے ریسیونگ بٹن آن کیا اور موبائل کان سے لگالیا مگر میرے ''ہیلو'' کہتے ہی فون بند ہوگیا۔ میں دل ہی دل میں بڑے شدومد سے اسے کوسنے لگا جس نے اس وقت میری نیند خراب کی تھی۔ ذہن بہت بوجھل تھا مگر اب پھر کوشش کے باوجود نیند نہ آئی تاہم میں آنکھیں بند کئے فرشی بستر پر لیٹا رہا اور اس فون کرنے والے کے متعلق سوچنے لگا کہ کیوں یہ مجھے اکثر راتوں کو تنگ کرتا ہے؟ اس شہر میں چچا کے علاوہ میرا کوئی رشتے دار یا جاننے والا بھی نہیں تھا اور ویسے بھی میرا موبائل نمبر تو کسی کے پاس نہیں تھا---ابھی میں اس بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ موبائل کی بیل پھر بجنے لگی۔ وہی نمبر تھا چنانچہ میں نے فوراً اسے کان سے لگایا اور ''ہیلو'' کہا۔ فون اس بار بند تو نہ ہوا مگر میرے بار بار ''ہیلو، ہیلو'' کہنے کے باوجود دوسری طرف سے کوئی بھی آواز نہ آئی۔ چنانچہ میں غصے میں بولنے لگا۔

''اے، بھائی! کیوں تنگ کرتے ہو راتوں کو، اپنی نیند بھی خراب کرتے ہو اور میری بھی۔ کیوں نہیں سوتے تم اور مجھے بھی کیوں بے آرام کرتے ہو---تمہارا مسئلہ کیا ہے، کچھ مجھے بھی تو پتہ چلے۔ اتنے عرصے سے تم کالز کر رہے ہو، اب تک تمہیں بخوبی پتہ چل گیا ہوگا کہ یہ نمبر کسی لڑکی کا نہیں بلکہ ایک مرد کا ہے۔ میری آواز تو اب تم اچھی طرح پہچان ہی چکے ہو تم---تم کیوں نہیں بتاتے کہ تم کون ہو؟---اب بولو بھئی نا، بتا بھی دو کہ تم کون ہو؟ اپنی شناخت کروا دو تو تمہاری بڑی مہربانی ہوگی ورنہ آج کے بعد میں ہاتھ باندھ کر تم سے درخواست کرتا ہوں کہ پلیز، آئندہ مجھے کم از کم راتوں کو مس کالز کر کے تنگ مت کرنا۔ اُمید ہے، میری گزارشات پر تم ضرور کان دھرو گے اور---اور---''

ابھی میں اپنی دھن میں بولے جا رہا تھا کہ دوسری طرف سے رونے کی آوازیں آنے لگیں مگر یہ کیا، میں ٹھٹک کر رہ گیا کیونکہ رونے کی یہ آوازیں تو بظاہر نسوانی معلوم ہو رہی تھیں۔ میں فوراً چپ ہوگیا مگر رونے کی آوازیں مسلسل میرے کانوں سے ٹکرا رہی تھیں اور میں فرطِ حیرت میں ڈوبا یہ سوچ رہا تھا کہ رونے والا یا والی کون ہو سکتی تھی؟---ادھر رونے کے ساتھ ساتھ اب سسکیوں کی آوازیں بھی شامل ہوگئی تھیں اور یہ بات بھی کنفرم ہو چکی تھی کہ یہ آواز نسوانی ہی تھی۔ اب مجھ سے نہ رہا گیا اور میں بول اُٹھا۔

''کون ہو تم، کیوں رو رو کر ہلکان ہو رہی ہو، کیا دکھ ہے تمہیں---کیا مجھ سے کوئی شکایت ہے یا پھر مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہو---بتاؤ نا! کس مشکل میں ہو تم، کیا پریشانی ہے تمہیں؟ کیا کسی نے تمہیں قید یا اغوا کیا ہوا ہے۔ بولو نا، کچھ تو بتاؤ۔ صرف رونے سے تو کچھ حاصل نہیں ہوگا تمہیں---کھل کر بتاؤ، کیا کہنا چاہتی ہو تم؟ آج مجھے بھی تو پتہ چلے کہ مجھے راتوں کو تنگ کرنے والی کو کیا مسئلہ درپیش ہے---دیکھو---دیکھو تم مجھ پر اعتبار کرتی ہو تبھی تو مجھے فون کرتی ہو۔ اگر اعتبار اور اعتماد ہے تو بتا دو کہ تم کون ہو اور کیا چاہتی ہو مجھ سے---پلیز! میں کوئی اتنا بڑا آدمی نہیں، معمولی سا شخص ہوں بلکہ معمولی سے بھی گیا گزرا---میں تو خود زمانے کا ستایا ہوا ہوں، اوپر سے تم مجھے کیوں ستا رہی ہو۔ کیا ملے گا تمہیں اس طرح خاموش رہ کر، اپنے ہونٹوں کو سی کر---رونے دھونے سے کسی مسئلے کا حل نہیں نکلا کرتا۔ جب تک اپنی زبان نہیں کھولو گی، میں تمہارے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتا---''

اتنا کہہ کر میں خاموش ہوگیا کیونکہ اس سے زیادہ اور کیا کہا جا سکتا تھا، ایک اجنبی اور فون کے پردے کے پیچھے چھپی ہوئی عورت یا لڑکی سے---میں خاموش ہوا تو

ساتھ ہی اس کے رونے دھونے کی آوازیں بھی تقریباً بند ہوگئیں۔ مجھے کچھ حوصلہ ملا، میں نے پھر کہنا شروع کیا۔

''غالباً آپ پر میری باتوں کا اثر ہوگیا ہے۔ اگر ایسا ہے تو آپ مجھ پر اعتماد کر سکتی ہیں، بتا سکتی ہیں آپ کہ کون ہیں اور کیا مسئلہ درپیش ہے؟---آپ نے مجھے اتنے عرصے سے راتوں کو پریشان کر رکھا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آج یہ معاملہ کھل کر سامنے آجائے اور آپ اپنی شناخت کروا ہی دیں مجھے---اور ہاں، آپ یہ بھی ضرور بتائیے کہ آپ رُو کیوں رہی تھیں۔ دیکھیں، میں صحیح کہہ رہا ہوں کہ مجھ سے عورت کے آنسو اور اس کا رونا دھونا برداشت نہیں ہوتا۔ آپ رو رہی تھیں تو مجھے ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے میں آپ کا گنہگار ہوں، مجرم ہوں آپ کا کیونکہ عورت جب کسی کے سامنے روتی ہے تو یہ بات طے ہے کہ اس نے اسے کوئی نہ کوئی دُکھ یا تکلیف پہنچائی ہوتی ہے یا پھر وہ اس سے مدد کی طلب گار ہوتی ہے مگر---مگر میں تو آپ کو جانتا تک نہیں۔ آج پہلی بار آپ کی آواز سنی ہے اور وہ بھی رونے کی آوازیں---اب آپ مہربانی کر کے اپنے ہونٹوں کو جنبش دیں اور کچھ تو بولیں---؟''

چند لمحات تک دوسری طرف سے کوئی بھی آواز نہ آئی مگر پھر یک لخت دوبارہ رونے کی آوازیں اور زیادہ زور زور سے میرے کانوں سے ٹکرانے لگیں۔ اپنی کوششوں میں ناکامی محسوس کر کے میں ذہنی طور پر زچ ہو چکا تھا اور سوچ رہا تھا کہ فون بند کر دوں مگر اچانک دوسری طرف سے سسکیوں کے درمیان آواز ابھری۔

شر------شر---''

اسی لمحے فون بند ہوگیا---ٹوٹے پھوٹے اور دھورے سے یہ الفاظ چند لمحوں کے لئے میرے ذہن کی سلیٹ پر کوئی واضح سمت متعین نہ کر سکے مگر پھر مجھے یہ احساس ہو ہی گیا کہ ان الفاظ کے پیچھے غالباً میرا ہی نام چھپا ہوا تھا---''شر'' سے تو ظاہر ہے کہ شرجیل ہی بنتا تھا اور میں شرجیل ہی تھا۔ تو کیا یہ لڑکی مجھے جانتی ہے---اگر ایسا ہے تو پھر کون ہو سکتی ہے یہ؟---اس ''کون'' کے لفظ پر آ کر میری سوچوں کی ڈور الجھ گئی اور میرا ذہن مختل ہوگیا۔ کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کون لڑکی یا عورت تھی اور وہ مجھے کیونکر جانتی تھی---دماغ سوچ سوچ کر عاجز آ گیا اور پھر اچانک ہی ذہن میں ایک چھپاکا سا ہوا۔ ماضی کے دھندلے نقوش جن پر وقت کی دھول نے دبیز تہیں جما کر ذہن کی سلیٹ سے تقریباً دھو دیئے تھے، اچانک دوبارہ اُجاگر ہونے لگے۔ میری سوچوں کی گرہیں کھلنے لگیں اور پھر میری یادداشت نے یادوں کے اندھے کنوئیں سے اس نام کو ڈھونڈ ہی نکالا۔ کافی دیر تک میں اپنے اس غالب گمان پر حیران و پریشان ہو کر بیٹھا رہا تاہم جب میں نے اپنے دل کو ٹٹولا تو اسے اس نام سے وابستہ ہر قسم کے جذبات و احساسات سے بالکل مبرا پایا۔ بچھڑنے والے کو اس وقت رو لینا چاہئے جب وہ بچھڑ کر جا رہا ہو مگر جب وہ جدا ہو کر دور، کہیں دور چلا جائے تو پھر اسے پکارنے، آوازیں دینے یا رونے دھونے سے کیا حاصل؟---وہ دل جو کبھی اس کے لئے، صرف اسی کے لئے دھڑکا کرتا تھا، آج اسی دل میں اس کے رونے دھونے کی آوازیں سننے کے باوجود کوئی ہلچل، کوئی تحریک پیدا نہ ہو سکی۔ ماضی کی یادیں اب قصہ پارینہ بن چکی تھیں اور پھر بھولی بسری داستانوں کے سیاق و سباق کو نئے سرے سے، نئی ترتیب دیکر رقم طراز کرنا قریب قریب میرے لئے اب ناممکن تھا---رافعہ اب تشنہ مضراب کا وہ ساز بن چکی تھی جسے کوشش کے باوجود اب دوبارہ گنگنانا میرے لئے ممکن نہیں تھا۔

☆☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"آج کون سی تاریخ ہے، شرجیل---؟"
میرے ساتھ پُرتکلف ڈنر کرنے کے بعد موٹے فوم والے صوفے پر میرے انتہائی قریب بیٹھ کر سارا میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔
چند لمحے سوچنے کے بعد، سر کے گھنے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے میں نے جواب دیا۔
"اکیس تاریخ ہے آج---"
"تو آج تمہیں پورا ایک مہینہ ہو گیا، منزہ کو ٹیوشن پڑھاتے ہوئے۔"
"رئیلی---میں تو بھول ہی گیا تھا۔"
میں جان بوجھ کر سر کھجا کر کہا حالانکہ مجھے علم تھا۔
"تمہارے یہ بھولنے کے الفاظ سن کر، شرجیل! مجھے بہت ہی خوشی محسوس ہو رہی ہے۔" وہ اپنی ایک ٹانگ کو دوسری ٹانگ پر چڑھا کر بولی۔
"میں کچھ سمجھا نہیں، سارا! میرے تاریخ بھولنے سے تمہیں خوشی ملنے کا کیا تعلق ہے بھلا---؟"
اس کی آنکھوں میں آتشیں جذبات کے چراغ جھلملانے لگے۔ پھر اس نے بار بار آنکھیں جھپکیں اور بے خودی سے، مخمور لہجے میں بولی۔
"یہی تو فرق ہے تم میں اور مجھ میں، شرجیل! کہ مجھے سب کچھ یاد ہے--- سٹور پر ٹیوشن پڑھانے کے سلسلے میں تم سے پہلی ملاقات اور پھر تم منزہ کے ٹیچر بن گئے۔ پھر ٹیچر کی سیڑھی کے پہلے سٹیپ سے اٹھا کر میں نے---ہاں، میں نے تمہیں اپنا فرینڈ بنایا اور اب، اس وقت تم میرے ساتھ، میرے بالکل قریب یوں بیٹھے ہوئے ہو کہ تمہاری سانسوں کی بھینی بھینی خوشبو مجھے صاف محسوس ہو رہی ہے--- آج میں خوش ہوں، بہت ہی خوش شرجیل! اتنی خوش کہ تمہیں میری اس خوشی کا اندازہ شائد نہ ہو سکے مگر، شرجیل! کیا تم مجھ سے میری اس قدر زیادہ خوشی کی وجہ نہیں پوچھو گے---؟" مگر میرے کوئی جواب دینے سے قبل ہی اس نے اپنے مرمریں ہاتھوں میں میرا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے آہستہ آہستہ سہلانے لگی۔
"شرجیل! تم یونہی بھول جاؤ نا، سب کچھ---یہ بھی بھول جاؤ کہ تم منزہ کے ٹیچر ہو، یہ بھی بھول جاؤ کہ تم صرف یہاں پڑھانے ہی آتے ہو۔ یہ بھی بھول جاؤ کہ تم منزہ کی امی سے باتیں کر رہے ہو---اور یہ بھی بھول جاؤ کہ اس حوالے سے ہمارے، یعنی میرے اور تمہارے درمیان کسی قسم کی اجنبیت، رکھ رکھاؤ یا تکلفات کی کوئی دیوار ضرور حائل ہونی چاہئے۔ فراموش کر دو ہر اس بے وقعت، بے نام جذبے کو جو تمہارے اور میرے راستے کی تھوڑی سی بھی رکاوٹ بن سکتا ہے---ہاں، شرجیل! اگر تم یاد رکھنا چاہتے ہو تو صرف اور صرف یہ یاد رکھو کہ تم ایک مرد ہو اور میں صرف ایک عورت ہوں جو اس وقت، اس بند کمرے میں ایک دوسرے کے انتہائی قریب ہیں--- شرجیل! تم سمجھتے کیوں نہیں، سمجھ بھی جاؤ نا!---دیکھو، شرجیل! میری طرف دیکھو۔ میری آنکھوں میں جھانک کر کچھ تلاش تو کرو۔ کیا تمہیں ان آنکھوں میں سلگتے جذبات کی پھلجھڑیاں پھوٹتی ہوئی نظر نہیں آ رہیں---شرجیل! تم اتنے قریب ہو کر بھی مجھ سے اتنے دور کیوں ہو؟ میرے قریب آؤ نا، آ جاؤ نا!---اپنے اس کٹھور دل کو بھی میری طرف مائل کر لو، اپنے اس دل کی دھڑکنوں کو میرے دل کی "دھک دھک" سے ہم آہنگ کر لو --- کر لو نا، پلیز--- شرجیل! مت سوچو، مت اپنے ذہن پر زور ڈالو۔ ہر پریشانی کو اپنے ذہن سے نکال دو--- کچھ نہیں، کچھ نہیں ہو گا تمہیں، شرجیل! دیکھو، میری طرف دیکھو، میں اپنے دل کی گہرائیوں اور جسم کی مکمل لطافتوں کے ساتھ تمہیں پکار رہی ہوں--- مٹا دو ان دوریوں کو جو مجھے تڑپائے

جا رہی ہیں۔ اس سلگتی آگ پر اپنی محبت کی بارش برسا دو، اب مت ستاؤ مجھے، مت تڑپاؤ مجھے تم---- آگے بڑھو، آگے بڑھو بھی، شرجیل! کس بات کی رکاوٹ ہے تمہیں، کیوں تم آگے نہیں بڑھ رہے؟ میری یہ آنکھیں اور سلگتا ہوا جسم کیا تمہیں دعوت نظارہ دے دے کر تمہارے جذبات و احساسات کی بھٹی میں آگ نہیں لگا رہا---؟"
وہ یک لخت خاموش ہو گئی اور میرے ہاتھ کو چھوڑ دیا۔ اس کی آنکھوں میں جہاں پہلے تمتماتے نشیلے ڈورے تیر رہے تھے، یک لخت بے زاری اور غصیلے جذبات کی لکیریں دوڑنے لگیں۔ پھر وہ ایک جھٹکے کے ساتھ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ قد آدم آئینے میں اپنے نیم برہنہ سراپے پر بھرپور نظر ڈال کر بولی۔
"نہیں، شرجیل! ایسے نہیں، بالکل ایسے نہیں--- یہ نہیں ہو سکتا۔ تم مجھے مسلسل نظر انداز کرو، میرے بھڑکتے جذبات کے سامنے اپنی سرد مہری کے برفانی تیر برساؤ، یہ سب کچھ اب میری برداشت سے باہر ہے۔ یہ بند کمرہ، یہ رات کا وقت، یہ تنہائی اور اس میں تم اور میں، ایک نوجوان مرد اور ایک بھرپور عورت جسے اب تک تم مسلسل ٹھکرائے جا رہے ہو---تمہاری اس بے حسی اور بے رخی نے میرے جسم میں لاوا سا بھر دیا ہے۔ ہاں، شرجیل! یوں لگتا ہے، میں آتش فشاں کی طرح گویا پھٹ پڑوں گی۔ میں نے الفاظ کے حصار میں تمہیں جکڑنے کی بہت کوشش کی، ایک ایک لفظ کے ذریعے تمہیں ترغیب دی مگر تم---تم، شرجیل! ٹس سے مس نہ ہوئے۔ کیا چیز ہو تم، کس مٹی سے بنے ہو تم۔ کتنا سخت اور کٹھور دل ہے تمہارا، کیسے مرد ہو کہ ایک عورت کی طرف اس بند کمرے کی تنہائی میں بھی راغب نہیں ہوئے تم---مگر میں، شرجیل! ہار ماننے والی نہیں ہوں، شکست کا لفظ میں نے اپنی کتاب

احترام حدیث

امام مالکؒ ایک دن درس حدیث دے رہے تھے کہ ایک بچھو نے آپ کو کاٹ لیا لیکن آپؒ نے درس حدیث منقطع نہ کیا۔ بچھو نے سترہ مرتبہ ڈنگ مارا لیکن آپؒ نے کوئی اقدام نہ کیا۔ جب درس حدیث ختم ہوا تو لوگوں نے دوران درس آپ کی بے چینی کی وجہ دریافت کی۔ آپؒ نے فرمایا۔
"وہاں بچھو نے کاٹ لیا تھا لیکن صرف احترام حدیث کی وجہ سے میں نے درمیان میں بولنا مناسب نہ سمجھا۔"

صائمہ سلمان

زندگی سے مٹا رکھا ہے۔ مانا کہ الفاظ کی جنگ میں ہار چکی ہوں مگر، شرجیل! اب میں جو کچھ کروں گی، تم اس سے قطعاً اپنے آپ کو بچا نہ سکو گے---ہاں، شرجیل! یہ میرا دعویٰ بھی ہے اور وعدہ بھی ہے تم سے، بس تم دیکھتے رہنا میری طرف۔ اب میں تمہیں عورت بن کر دکھاؤں گی، ایک ایسی عورت جس کی بھرپور اور دلکش جوانی دیکھ کر تم پتھر سے موم بن جاؤ گے---شرجیل! تمہیں شائد بلکہ یقیناً اندازہ ہی نہیں ہے کہ عورت کا سب سے بڑا ہتھیار کون سا ہوتا ہے---اب جبکہ تم نے مجھے مکمل طور پر زچ کر دیا ہے تو اب تیار ہو جاؤ، تمہاری آنکھیں خیرہ نہ ہو جائیں تو میرا نام سارا نہیں۔ تم یقیناً پگھل جاؤ گے، تمہیں اپنے اوپر قابو نہیں رہے گا، شرجیل! تمہارے سرد جذبات کی راکھ میں سے چنگاریاں ضرور شعلہ زن ہو جائیں گی۔ بچا سکتے ہو تو بچا لینا اب تم اپنے آپ کو---لو، اب دیکھو میری طرف۔ دیکھو، اپنی ان آنکھوں سے میری طرف اور اب نظر مت ہٹانا میرے جسم سے، تم شرجیل---!"
یہ کہتے کہتے اس نے اپنے جسم سے نام نہاد لباس آناً فاناً اُتار پھینکا۔ اب وہ مختصر ترین لباس میں تھی۔ کمرے کی فضا میں جذبات کا آتش فشاں گویا یک لخت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پھٹ پڑا، میری کنپٹیاں چلنے لگیں۔ میری ظاہری دگرگوں حالت کا اندازہ لگا کر سارا نے فوراً ہی آگے بڑھ کر ہمارے درمیان تھوڑے سے فاصلے کو بھی یکسر ختم کر دیا۔ میرا پورا جسم گویا آگ کی بھٹی میں جھلسنے لگا، جذبات کی تپش میرے دل اور دماغ دونوں کو جلانے لگی۔ میرے تن بدن میں گویا اک آگ سی لگ گئی۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ مجھے اپنے اوپر کنٹرول ختم ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ میری حالت، اس وقت گویا کسی بے بس، مقید پرندے کی سی تھی جس پر سارا پوری طرح ذہنی، جسمانی اور کسی حد تک روحانی طور پر بھی قابو پا چکی تھی--- میری اس فطری بے بسی کو محسوس کرتے ہوئے سارا نے مجھے، اپنی بانہوں کے حصار میں جکڑے اور بیڈ کی طرف لے جانا شروع کر دیا۔ اب فرار ناممکن نظر آ رہا تھا۔ اس کی بانہوں کی گرفت میری گردن کے گرد مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جا رہی تھی۔ ہم بیڈ کے بالکل قریب پہنچ چکے تھے۔ اس سے چھٹکارہ حاصل کرنے کی بظاہر تمام اُمیدیں میرے ذہن میں دم توڑ چکی تھیں مگر اسی ایک لمحے میں، میں نے ایک فیصلہ کر لیا جس کے نتیجے میں میری ٹیوشن بھی ختم ہو سکتی تھی اور یوں میرا تابناک مستقبل پھر تاریکی میں ڈوب بھی سکتا تھا تاہم میں وہ سب کچھ نہیں کر سکتا تھا جس کی سارا اس وقت مجھ سے متمنی تھی--- اگلے ہی لمحے میں اپنے فیصلے پر عمل کرنے ہی والا تھا کہ دفعتاً تپائی پر پڑا ہوا میرا موبائل چیخنے لگا۔ ڈوبتے کو جیسے تنکے کا سہارا مل گیا، میری نظریں فوراً موبائل کی طرف پلٹیں مگر سارا عین اس لمحے چیخ کر بولی۔

"پلیز، شرجیل! مت دیکھو موبائل کی طرف--- ان سرکتے لمحوں سے فائدہ اٹھاؤ، آج ان لمحوں کو صدیوں کی مسافت طے کر لینے دو۔"

"مگر میری کال---"

وہ مجھے فوراً ٹوک کر تیزی سے بولی۔ "کال اٹینڈ نہیں کرو گے تو کوئی قیامت نہیں آ جائے گی--- چھوڑو اس فضول موبائل کو، کم بخت وقت کی نزاکت کو بھی نہیں سمجھتا۔ ادھر میری طرف دیکھو۔ کیوں، کر لیا نا! میں نے تمہیں اپنے دامِ عشق میں گرفتار؟--- آؤ، ان لمحات کو اک نئی زندگی دیں، اک نئی منزل کی طرف ہم دونوں آگے بڑھیں۔ آج سے اپنے دو جسموں کو ایک کر دیں--- یاد ہے تمہیں، میں نے تم سے کہا تھا کہ چانس تو تمہیں ملے گا ضرور اور--- اور، شرجیل! اگر تم نے اس گولڈن چانس سے فائدہ اٹھا لیا تو پھر تمہاری قسمت کے بادل برس برس کر تمہیں نہال کر دیں گے اور اب یہی وہ موقع ہے جو تمہیں حاصل ہو چکا ہے--- میں تو برسوں کی پیاسی ہوں اور میری روح اور میرا یہ جسم بھی اس وقت تمہارے قبضے میں ہے--- ابھی تمہیں خود ہی اندازہ ہو جائے گا کہ میں ایک عورت نہیں ہوں بلکہ ابھی تک--- ایک تازہ کلی ہوں، ایک کنواری لڑکی ہوں۔ میرا بڈھا کھوسٹ شوہر جس سے میں نے اس کی دولت کے لئے شادی کی تھی، ختم ہو گیا وہ اب، مر چکا ہے، اپنی پہلی بیوی کی نشانی منزہ میرے پاس چھوڑ کر--- تمہیں، شرجیل! بس اب تم میری برسوں کی پیاس بجھا دو۔ جلدی کرو، شرجیل! اب مجھ سے مزید انتظار نہیں ہو سکتا۔"

ایک لمحے کے لئے اس کے اپنے متعلق ان انکشافات نے مجھے حیران کر کے رکھ دیا مگر دوسرے ہی لمحے میں نے اپنے پہلے کئے گئے فیصلے پر عمل درآمد کا دوبارہ فیصلہ کر لیا مگر شائد قسمت کو میرا یہ فیصلہ منظور نہ تھا کیونکہ اگلے ہی لمحے دوسری تپائی پر پڑا ہوا سارا کا اپنا موبائل مترنم گھنٹیاں بجانے لگا۔ میں نے فوراً ہی سارا کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ دیں، یہ دیکھنے کے لئے کہ وہ اس خمار آلود، نشیلی اور شدید جذباتی کیفیت سے نکل کر

اپنے موبائل کی طرف دیکھتی ہے یا نہیں مگر میری توقع کے بالکل خلاف سارا نے نظریں گھما کر اپنے موبائل کی طرف دیکھا۔ میری گردن کے گرد اس کی مرمریں بانہوں کے حصار کی فولادی قوت میں نمایاں حد تک کمی میں نے محسوس کی تاہم وہ مجھے اپنے ساتھ چمٹائے ہوئے تپائی کی طرف بڑھی۔ تھوڑا سا نیچے جھک کر اس کی سکرین پر نمبر دیکھا اور پھر مایوس کن لہجے میں بولی۔

"اس کال کو میں اس وقت نظر انداز نہیں کر سکتی، نہیں تو میری یہ فرینڈ میرے گھر پہنچ جائے گی۔ شرجیل! لگتا ہے، ہمارے ملاپ میں چند لمحوں کی دیر ہونا قسمت میں ہی لکھا ہوا ہے--- چلو، تم اپنا موبائل اٹینڈ کر لو، میں ادھر دیکھتی ہوں۔ مجبوری ہے، شرجیل---!"

اس نے اپنا بایاں بازو آگے بڑھا کر اپنا موبائل اٹھا لیا اور یوں مجھے بھی اپنی بانہوں کے حصار سے آزاد کر دیا۔ میں نے بیڈ کے دوسری طرف جا کر دیوار کی طرف رخ کر کے اپنا موبائل اٹھایا۔ نمبر جانا پہچانا تھا، وہی جو مجھے راتوں کو تنگ کیا کرتا تھا۔ میں نے "ہیلو" کہا۔ دوسری طرف میری توقع کے عین مطابق رافعہ ہی تھی۔ میری آواز سن کر وہ تیزی سے بولی۔

"شرجیل--- شرجیل---! پلیز، فون مت بند کرنا۔ پہلے میری پوری بات سن لینا---" وہ چند لمحوں کے لئے رُکی، شائد میری طرف سے کوئی مثبت جواب سننے کی توقع تھی اسے تاہم میں خاموش رہا۔ ایک لمحے کے لئے میرے جی میں آئی بھی کہ فون بند کر دوں مگر اگلے ہی لمحے میری چھٹی حس نے مجھے ایسا کرنے سے روکا۔ ذہن میں جانے کیوں یہ خیال اُبھرا کہ شائد اس طرح میں سارا کی شاطرانہ چالوں سے نجات حاصل کر سکوں--- رافعہ میری خاموشی کو غنیمت سمجھ کر پھر بولی۔ "شرجیل! تم ناراض ہونا، مجھ سے--- ہاں، تمہیں ہونا بھی چاہئے۔ مرد ہو نا! قصوروار مجھے، ایک عورت کو ہی سمجھو گے۔ اچھا، شرجیل! میں مانتی ہوں کہ غلطی میری تھی مگر مجھے کم از کم اتنا تو بتا دو کہ جب ابو تمہیں گھر سے نکال رہے تھے تو آخر میں کرتی کیا۔ ابو کو روکتی، ان کے سامنے دیوار بن کر کھڑی ہو جاتی ہے، تمہاری سائیڈ لیتی یا--- یا پھر تمہارے ساتھ میں بھی گھر سے نکل پڑتی؟ مجھے بتاؤ، شرجیل! تم تو خود اس وقت تہی دامن تھے۔ میں اگر ابو سے ٹکر لیتی تو کیا میں اور تم جیت جاتے--- نہیں، شرجیل! نہیں۔ ابو کی آنکھوں پر دولت کی ہوس کی جو پٹی پڑی ہوئی تھی، اسے میں کیسے ہٹا سکتی تھی؟ تم ایک مرد ہو کر کچھ بھی نہ کر سکے ابو کے سامنے تو میں بھلا عورت ہو کر کیا کر سکتی تھی چنانچہ میں نے جو کیا، وہی وقت کا تقاضہ تھا کیونکہ دوسری صورت میں تباہی اور بربادی کے سوا کچھ بھی حاصل نہ ہو سکتا تھا--- مگر، شرجیل! تمہارا کیا خیال ہے کہ تمہارے جانے کے بعد، تم سے جدا ہو کر کیا میں سکون سے رہی ہوں--- اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بتاؤ، اگر تم تڑپتے رہے تو تڑپتی میں بھی رہی ہوں۔ اگر تم مجھے بے وفا سمجھتے رہے ہو تو تم نے اس وقت کون سا تیر مارا تھا جو مجھے بے وفائی کا طعنہ دے سکتے ہو--- ہم ایک دوسرے سے جتنا عرصہ جدا رہے ہیں، اتنا ہی عرصہ میں تڑپتی، سسکتی، بلبلاتی رہی ہوں تمہاری یاد میں۔ میرا دن کا چین اور راتوں کی نیند حرام ہو گئی تھی--- پتہ نہیں، تمہیں میری باتوں کا یقین آئے، نہ آئے مگر، شرجیل! تم جانتے تو ہو کہ میں تم سے فون پر مسلسل رابطے میں رہی ہوں۔ میرے مسلسل تڑپتے رہنے کا یہ ثبوت تمہارے لئے کافی نہیں ہے کیا؟--- اور تم نے کون سی خبر لے لی میری، پلٹ کر پتہ بھی نہیں کیا کہ تمہاری رافعہ کیسی ہے، کس حال میں ہے۔ زندہ بھی ہے یا مر گئی--- کیا یہی محبت ہے، شرجیل! کیا اس کو پیار کہتے ہیں؟ کیا ہم نے بچپن، جوانی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اسی لئے اکٹھے گزار رہی تھی کہ تم --- ایک مرد، پاروفل ہستی مجھے --- اپنی رافعہ، اپنی محبت، اپنے پیار، اپنی چاہت، اپنی منگیتر کو یوں چھوڑ کر بے تعلق ہو جاؤ گے؟ مجھے بتاؤ --- بتاؤ نا، شرجیل! اگر میں غلط کہہ رہی ہو تو بے شک ابھی فون بند کر دینا اور میں پھر تمہیں کبھی بھی فون کروں گی، نہ ہی کوئی تعلق رکھوں گی۔ بس جان دے دوں گی، تمہارے لئے --- میں جواب تک زندہ ہوں، تمہارے لئے زندہ ہوں مگر اب --- اب اگر تم نے مجھے ٹھکرا دیا تو میں یہ زندگی ختم کر لوں گی، مر جاؤں گی میں تمہارے بغیر اور، شرجیل! --- تم بولتے کیوں نہیں، خاموش کیوں ہو آخر، کیا ابھی تک مجھے ہی قصوروار ٹھہراتے ہو؟ --- اچھا، شرجیل! چلو مان لیا کہ میں ہی قصوروار سہی اور اگر ایسا ہی ہے تو اپنے قصور کی تلافی بھی تو میں نے ہی کی ہے --- ہاں، شرجیل! اب جو کچھ میں تم سے کہنے والی ہوں، شاید تمہیں اس کا یقین نہ آئے مگر شرجیل! سنو، جب ابو نے تمہیں گھر سے نکالا، اس دن سے، اس وقت سے وہ کون کون سے مظالم تھے جو مجھ پر ڈھائے نہیں گئے۔ کتنی صعوبتیں اور کٹھن حالات میں میں نے یہ وقت گزارا ہے، شرجیل! تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے ہو۔ وہ کون کون سی جسمانی اور روحانی اذیتیں تھیں جو مجھے نہیں دی گئیں اس لئے، شرجیل! کہ میں تمہارا نام لیتی تھی، تمہیں یاد کرتی تھی --- صبح شام، دن رات، ہر لمحہ، ہر پل، ہر گھڑی، چوبیس گھنٹے --- مگر آخر کار شرجیل! میں، میری محبت، میری چاہت، میری دیوانگی، میرا پاگل پن جیت گیا اور --- ابو نے میرے صبر و استقلال کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے، مان گئے وہ کہ انہوں نے زیادتی کی تھی تمہارے ساتھ۔ تمہیں گھر سے نکال کر، مجھ سے جدا کر کے۔ میرے عشق کی سچائی جیت گئی آخر، شرجیل! اپنی بیٹی کے سامنے بالآخر ایک باپ ہار گیا۔ میں نے انہیں راضی کر ہی لیا، شرجیل! --- اور سنو، ابو اب راضی ہیں تمہاری رافعہ کو تمہارے سپرد کرنے کے لئے اور ہاں، جس مکان سے انہوں نے تمہیں نکالا تھا، اسے وہ دوبارہ تمہارے حوالے کرنے پر بھی تیار ہیں --- تمہیں میری اس بات کا یقین نہ آئے، نہ آئے مگر یہ حقیقت ہے، شرجیل! کہ ابو نے تمہیں ڈھونڈ نکالا ہے۔ سب کچھ انہوں نے معلوم کر لیا ہے اور، شرجیل! پتہ ہے، یہ فون بھی میں ابو کے کہنے پر ہی کر رہی ہوں۔ انہوں نے ہی مجھے کہا ہے کہ میں تم سے رابطہ کروں --- شرجیل! ابو بہت پشیمان ہیں کہ انہوں نے تمہارے ساتھ اتنی زیادتی کی۔ اب وہ اس کا ازالہ کرنے کے لئے بھی راضی ہیں، وہ خود تم سے بات کرنا چاہتے تھے بلکہ تمہیں ملنا بھی چاہتے تھے مگر پھر انہوں نے کافی سوچ بچاؤ کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ میں اس سلسلے میں تم سے بات کروں اور حالات کے نارمل ہونے کی اطلاع تمہیں دے --- شرجیل! تم سن تو رہے ہو، نا! ناراضیاں، رنجشیں، غلط فہمیاں کس خاندان میں نہیں ہوتیں مگر میرے اب تم غصہ تھوک دو، راضی ہو جاؤ، مان بھی جاؤ، نا! ابو شرمندہ ہیں، میں شرمندہ ہوں۔ ابو خود تم سے مل کر معافی مانگنے چاہتے ہیں۔ وہ خود تمہارے پاس آ کر تم سے پچھلی زیادتیوں پر معذرت کریں گے، معافی مانگیں گے تم سے --- دیکھو، وہ تمہارے چچا ہیں۔ اب تم خود بتاؤ، شرجیل! کہ ابو کب تمہارے پاس آئیں معافی مانگنے کے لئے اور پھر تم کب آؤ گے میرے پاس، مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنانے --- دیکھو، میں تڑپ رہی ہوں تمہارے لئے، تم سے ملنے کے لئے، تمہاری ایک جھلک دیکھنے کے لئے۔ جتنا عرصہ میں نے تمہارے بغیر کاٹ لیا، سو کاٹ لیا۔ اب تو تم بن ایک پل نہیں رہا جاتا۔ میں سراپا انتظار ہوں، شرجیل! ایک ایک پل اب صدیاں بن کر گزر رہا ہے۔ وہ

سورج کس دن طلوع ہوگا جس کی روشنی میں تمہیں دیکھ سکوں گی میں، وہ کون سی مبارک گھڑی ہوگی جس دن تم میرے سامنے ہو گے اور میں تمہیں دیکھ سکوں گی ان آنکھوں سے ---"

وہ خاموش ہو گئی، میں بھی خاموش رہا۔ چند لمحات یونہی اس بے نام کیفیت میں گزر گئے۔ آخر کار رافعہ پھر بولی۔

"تم خاموش کیوں ہو، شرجیل! بولتے کیوں نہیں، آخر تم نے چپ کیوں سادھ رکھی ہے؟"

"کیا بولوں ---؟" میں صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

"کیا بولوں --- شرجیل! یہ تم کہہ رہے ہو، تم --- تم جو مجھ سے گھنٹوں باتیں کرتے تھکتے نہ تھے۔ کیا تمہیں یقین نہیں آیا جو کچھ میں نے تم سے اتنی تفصیل سے کہا ہے؟"

"میں نے کب کہا کہ مجھے یقین نہیں آیا؟"

"تو پھر بتاؤ نا! کہ ابو کب تمہارے پاس آئیں؟"

"انہیں کیسے پتہ چلا کہ میں کہاں رہتا ہوں؟" میں نے اس کا جواب ٹالنے کے لئے یہ سوال کر ڈالا۔

"شرجیل! تم خود ہی ان سے پوچھ لینا --- ویسے یہ دنیا اتنی زیادہ بڑی نہیں ہے اور پھر تم کون سا سات سمندر پار چلے گئے تھے --- اچھا، اب بتاؤ، نا ---؟"

"بتا دوں گا، سوچ کر ---"

"سوچ کر --- شرجیل! یہ تمہیں ہو کیا گیا ہے آخر، تم بدلے بدلے سے لگتے ہو؟"

"یہ تم نے ٹھیک کہا، رافعہ! واقعی زمانہ کافی بدل گیا ہے۔ وقت بدل گیا ہے، حالات بدل گئے ہیں۔ اس تمام عرصے میں سورج کتنی دفعہ مشرق سے طلوع ہوا ہے اور مغرب میں جا کر ڈوبتا رہا ہے، سمندر کی بے کراں وسعتوں میں کتنے اَن گنت طوفان آئے ہیں۔ زمین نے کتنی کروٹیں بدلی ہیں اس دوران، گھڑی کی سوئیاں سینکڑوں، ہزاروں لاکھوں میل کا سفر طے کر چکی ہیں اس تمام عرصے میں ---"

"مگر، شرجیل! میں نے تو تمہارے متعلق کہا تھا اور تم زمانے کی بات لے بیٹھے ہو؟"

"ہم چاہیں نہ چاہیں مگر ہم بھی تو اس زمانے کے محتاج ہیں --- اس کی گرم سرد ہم پر بھی ضرور اثر انداز ہوتی ہے، نا!"

"شرجیل! تم کن فضول باتوں کی بھول بھلیوں میں مجھے پھنسانا چاہتے ہو، الفاظ کے گورکھ دھندوں میں الجھا کر اصل بات سے ہٹنا چاہتے ہو --- چھوڑو بھی اب اس زمانے کی چیرہ دستیوں کو، میرا سورج تو اس دن نمودار طلوع ہوگا جب تم مجھے اپنی آغوش میں لو گے اور پھر پہلے کی طرح ہی کہو گے کہ رافعہ! تم کتنی خوبصورت ہو ---"

میں خاموش رہا، وہ پھر بولی۔

"اچھا تو بتاؤ نا! کہ تم کب آ رہے ہو میرے پاس، مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنانے ---؟"

"میں نے کہا نا، میں سوچوں گا اس بارے میں ---"

"شرجیل ---!" اس کی آواز روہانسو ہو گئی۔ "تم واقعی بدل گئے ہو ---"

پھر خاموشی کی دبیز تہہ نے ہمارے دونوں موبائلز کو ڈھانپ لیا مگر پھر جلد ہی میرے کانوں میں رافعہ کو سسکیوں اور آہوں کی آوازیں آنے لگیں جو آہستہ آہستہ رونے دھونے میں تبدیل ہو گئیں۔ اب رافعہ اونچی اونچی آوازیں رو رہی تھی --- میں عجیب مخمصے میں پھنس کر رہ گیا۔ میں نے یہ کال اس لئے اٹینڈ کی تھی تاکہ سارا کی خواہشات اور جنسی حربوں سے کسی نہ کسی طرح چھٹکارہ حاصل کر سکوں۔ میں اتنی دیر سے رافعہ کی باتیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سن رہا تھا اور میرا چہرہ ابھی تک دیوار کی طرف تھا۔ آپ یقین کریں یا نہ کریں، رافعہ کی باتیں سننے کے دوران میں اس قدر کھو گیا تھا کہ سارا کو ذہن سے تقریباً بھلا ہی بیٹھا تھا۔ اب جب رافعہ نے فون پر رونا شروع کیا تو پتہ نہیں اور کس طرح مجھ سے موبائل کا لاؤڈ سپیکر والا بٹن پریس ہوگیا۔ فوراً ہی کمرے میں رافعہ کے رونے دھونے کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ میں نے شدید بدحواسی میں بٹن بند کرنے کی بجائے تیزی سے گردن پیچھے کی طرف گھما کر کمرے میں نگاہیں دوڑائیں۔ میری حیرت اور پھر شدید پریشان کی انتہا نہ رہی، یہ نوٹ کر کے کہ سارا کمرے میں موجود نہ تھی۔ اس کی غیر موجودگی پر آناً فاناً دل ہی دل میں خوش ہونے کے ساتھ ساتھ یہ سوچ بھی پریشان کر رہی تھی کہ وہ کمرے سے غائب کیوں تھی، کیا وہ کوئی نئی چال تو اس طرح میرے ساتھ نہیں چلنے والی تھی؟--- پھر اچانک میری نظر جو بالکل سامنے کی طرف اٹھی تو باتھ روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ سامنے سارا پہلے والی حالت میں ہی نہا رہی تھی۔ میری نگاہیں اس سے ملیں تو فوراً ہی اس نے پانی کے چند چھینٹے میری طرف پھینکے، ساتھ ہی اس کے ہونٹوں پر شوخ اور شرارت بھری دلکش مسکراہٹ اُبھری۔ پھر اس نے مجھ آنکھ ماری اور گردن کو خم دے کر گویا اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ میں بھی باتھ روم میں آ جاؤں---میرے ہاتھ میں موبائل تھا جس کے لاؤڈ سپیکر سے ابھی تک رافعہ کی اونچی اونچی رونے دھونے کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ ظاہر ہے، نزدیک ہونے کی وجہ سے سارا نے بھی یہ آوازیں سن لی ہوں گی، یہ سوچ کر میں اور زیادہ حواس باختہ ہوگیا۔ اس دوہری بدحواسی کے عالم میں سپیکر بند کرنے کی بجائے میں نے پھر کمرے کے چاروں طرف نظریں دوڑائیں، گویا بے خیالی میں میں کسی نادیدہ قوت کی مدد کا منتظر تھا۔ میری یہ حواس باختگی کی کیفیت ظاہر ہے کہ سارا کی شاطرانہ نگاہوں سے چھپی تو نہ رہ سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے مجھے چیخ چیخ کر آوازیں دینا شروع کر دیں۔

''شرجیل---شرجیل! آؤ نا، اندر آؤ---اُف، کس قدر ٹھنڈا پانی ہے۔ قسم سے، مجھے تو بڑا مزہ آ رہا ہے اس ٹھنڈے ٹھنڈے پانی کے گرنے سے۔ جلدی کرو، اندر آ جاؤ۔ پہلے ہم نہا لیں، پھر بعد میں---مگر، شرجیل! میں تو فون اسی وقت سن کر یہاں باتھ روم میں گھس آئی تھی تا کہ تمہارے فون سننے تک اپنے آتشیں جذبات کو کچھ نہ کچھ تو ٹھنڈا کر سکوں مگر اس ظالم ٹھنڈے پانی نے تو میری آگ کو اور بھڑکا دیا ہے---شرجیل! تم اس فون کال کو تو جلدی ختم کرو اور یہ رونے دھونے کی نسوانی آوازیں کس کی ہیں۔ خیر، یہ میں بعد میں تم سے پوچھوں گی۔ پہلے تم اندر تو آؤ نا! کپڑوں کی کوئی فکر نہ کرو---''

اس نے نہاتے نہاتے ایک توبہ شکن انگڑائی لی۔ اس وقت میری کیفیت ''نہ جائے رفتن، نہ پائے ماندن'' والی تھی۔ میری نظروں کے سامنے شاور کا پانی سارا کے مرمریں جسم پر پھوار کی صورت میں یوں گر رہا تھا کہ اس کے جسم کا ہر ایک عضو، انگ انگ اور زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آ رہا تھا۔ اس حالت میں اس کا سڈول جسم نفاست سے تراشتے ہوئے کسی پتھر کا بت لگ رہا تھا۔ وقت کی ہتھیلی سے لمحات بڑی تیزی کے ساتھ سرک رہے تھے اور ان دوڑتے ہوئے لمحوں میں میرے ہوش و حواس بھی تیزی سے شل ہو رہے تھے۔ اچانک مجھے یوں محسوس ہوا گویا میرا اور سارا کا درمیانی فاصلہ بڑی تیزی سے سکڑ رہا ہو۔ یقیناً عورت کا حسن اور وہ بھی اس حالت میں، بڑے سے بڑے زاہدوں اور پارساؤں کے پائے استقلال میں لغزش پیدا کر دیا کرتا ہے۔ اس دلکش اور

ہوشربا حسن کی تراش خراش دیکھ کر میرا ایمان متزلزل ہو رہا تھا، اس کے جسم کی رعنائیوں نے میرے ہوش و حواس پر ایک جادوئی کیفیت طاری کر دی تھی۔ آخر تو میں بھی ایک انسان تھا، میری نگاہیں سارا کے جسم سے ہٹتی ہی نہیں تھیں---اب میرے قدم خود بخود سامنے کھڑی ہوئی سارا کی طرف اٹھ رہے تھے کہ اچانک موبائل کی گھنٹی بجنے کی آواز آئی۔ میرے قدم جامد ہو گئے اور جادوئی غبار میں لپٹا ہوا دماغ واپس ہوش و حواس کی دنیا میں لوٹ آیا۔ غیر ارادی طور پر میں نے گردن گھما کر پیچھے کی طرف دیکھا، یہ سارا کا موبائل تھا جو بج رہا تھا اور تپائی پر پڑا ہوا تھا۔ یک لخت سارا زور دار اُونچی آواز میں بولی۔

''چھوڑو شرجیل، تم میرے موبائل کو۔ جلدی کرو، اندر آ جاؤ اب اور زیادہ نہ تڑپاؤ مجھے---'' اسی لمحے میری نظر اپنے ہاتھ میں پکڑے موبائل پر پڑی۔ یہ نوٹ کر کے میری حیرانی کی انتہا نہ رہی کہ میرے موبائل میں رافعہ کے رونے دھونے کی آوازیں بالکل بند ہو چکی تھیں اور اب وہ بالکل خاموش تھا۔ پھر فوراً ہی اس کی سکرین پر میری نظر پڑی تو وہ آن تھا، پاس ہی سارا کھڑی تھی۔ وہ اس کی سکرین دیکھ کر بولی۔

''تمہارا موبائل تو آن ہے، شرجیل!---اچھا چلو تم اس فون کال کو ختم کر لو، میں بھی اس دوران دیکھتی ہوں کہ کون پاگل مجھے اس وقت تنگ کر رہا ہے۔''

وہ تیزی سے باتھ روم سے باہر نکلی، تپائی سے موبائل اٹھایا اور بولی۔

''ارے، یہ تو وہی عینی ہے---اب اسے کیا تکلیف ہوگئی ہے، میں نے اسے سب کچھ بتایا بھی تھا کہ میں اس وقت انتہائی مصروف ہوں مگر یہ دوبارہ کیوں کال کر رہی ہے مجھے--- دیکھتی ہوں اس سٹوپڈ کو میں---''

سماجیات

کراچی میں ہلکا سا ہندو مسلم فساد ہو گیا۔ ہمارے ہندو مالک مکان نے کچھ سامان بیچ باچ کر ڈھائی لاکھ روپیہ نقد جمع کیا ہوا تھا۔ اُسے خدشہ محسوس ہوا کہ اگر مسلمانوں نے اس کے مکان پر حملہ کیا تو نقدی بھی لٹ جائے گی۔ حفظ ماتقدم کے طور پر وہ یہ پونجی ماں جی کے پاس امانت رکھنے کے لئے آ گیا۔ وہ روپے گن کر دینا چاہتا تھا لیکن ماں جی کو دس کے بعد گنتی بھی نہیں آتی تھی اس لئے مجھے سامنے بٹھا کر اس نے ڈھائی لاکھ روپیہ دو بار گنا اور اسے ایک چمڑے کی تھیلی میں تالا لگا کر ماں جی کے حوالے کر دیا۔ مجھ سے اس کی رسید لکھوا کر اپنے پاس محفوظ کر لی۔ ماں جی نے اس امانت کی بڑی حفاظت کی۔ رات کو وہ اس تھیلی کو اپنے تکیے کے نیچے رکھ سوتی تھیں۔ نماز کے لئے بھی وہ اسے اپنے گھٹنے کے ساتھ لگا کر بیٹھتی تھیں۔ دو تین روز میں امن قائم ہوگیا۔ بڈھے مالک مکان نے مجھے پھر سامنے بٹھا کر ڈھائی لاکھ روپیہ دو بار گنا، رسید مجھے لوٹائی اور اپنی امانت بغل میں دبا کر اوپر والی منزل میں واپس چلا گیا---میرا خیال تھا کہ ہماری اس خدمت گزاری کے عوض مالک مکان بجلی اور پانی کے سلسلے میں شاید اب ہمارے ساتھ کسی قدر نرمی کا برتاؤ کرے گا لیکن این خیال است و محال است و جنوں۔ اس کی وہی واہیات کل کل بدستور جاری رہی۔ کئی بار تو وہ بجلی کا مین سوئچ سرِ شام ہی بجھا کر بیٹھ جاتا تھا اور ہم موم بتی جلا کر اپنا کام چلاتے تھے۔ رات کو پنکھا چلا کر سونا تو بڑی دور کی بات تھی۔ ایک دو بار میں نے ارادہ بھی کیا کہ اس نامعقول بڈھے سے اس بارے میں جھگڑا کروں لیکن ماں جی نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ بیچارا دُکھی ہے۔ بے گھر ہو کر بمبئی جا رہا ہے اس وقت اس کا دِل بالکل نہیں دُکھانا چاہیے---مالک مکان نے ایک طوطا بھی پال رکھا تھا جسے اُس نے سندھی زبان میں پاکستان کے خلاف چند گالیاں بڑے شوق سے سکھا رکھی تھیں۔ باہر جاتے وقت وہ طوطے کا پنجرہ اماں جی کی رکھوالی میں دے جاتا تھا۔ جب کوئی گھر والا طوطے کے سامنے سے گزرتا تو وہ بڑی بے تکلفی سے اُسے اپنی مخصوص گالیاں سنا دیتا تھا۔ اپنے کام کاج سے فارغ ہو کر جب بڈھا گھر واپس لوٹتا تھا تو ماں جی اکثر اسے چائے یا شربت بنا دیتی تھیں۔ اس کے بعد وہ طوطے کا پنجرہ لے کر اوپر چلا جاتا تھا اور تازہ دم ہو کر پھر ہمیں بجلی اور پانی سے محروم کرنے کے عمل میں مصروف ہو جاتا۔

(شہاب نامہ کے انتخاب)

عبداللہ بن ضیاء لاہور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سارا فون اٹھا کر باتھ روم میں چلی گئی اور میں نے باتھ روم کی طرف کمر کر کے پہلے لاؤڈ سپیکر والا بٹن ڈی پریس کیا، پھر موبائل کان سے لگا کر ''ہیلو'' کہا تا کہ رافعہ میری طرف متوجہ ہو سکے۔ فوراً ہی اس کی تیز تیز آواز آئی۔

''شرجیل! یہ کون عورت ہے جو تم سے اتنی گندی گندی باتیں کر رہی ہے، کچی کچی کچی--- ابو کے کہنے کے مطابق تم ایک کرائے کے کمرے میں تین اور لڑکوں کے ساتھ رہ رہے ہو، پھر رات کے اس وقت یہ کون عورت ہے اور تمہارے پاس کیا کر رہی ہے--- مجھے بتاؤ نا، شرجیل! کون ہے یہ---؟''

''کوئی بھی نہیں ہے یہاں اس کمرے میں میرے پاس، رافعہ---!'' میں نے ٹالنے کی انداز میں جواب دیا۔

''جھوٹ--- جھوٹ، شرجیل! تم بالکل جھوٹ بول رہے ہو۔ وہ تم سے نہانے کو کہہ رہی تھی، اب بھی تم کہو گے کہ تمہارے پاس کوئی عورت نہیں ہے؟''

''میرا خیال ہے، رافعہ! اگر ہمارے موبائلز کی لائن کسی اور موبائل سے مل گئی تھی---'' میں نے اپنی طرف سے بڑا انھوں بہانہ گھڑا۔

''مگر، شرجیل! وہ عورت تو تمہارا نام لے کر بار بار تمہیں بلا رہی تھی اور تم کہہ رہے ہو کہ ہماری لائن کہیں اور مل گئی ہے--- کیوں مجھے بے وقوف بنا رہے ہو تم، اور کچھ سننا چاہیے ہو تو سنو۔ وہ عورت ایسی کھلم کھلا باتیں تم سے کر رہی تھی جو ایک کال گرل بھی نہیں کر سکتی--- آتشیں جذبات، ظالم ٹھنڈا پانی، میری بھڑکتی آگ کو ٹھنڈا کرو، مت تڑپاؤ مجھے اور جلدی کرو، آجاؤ نا! چھی چھی--- اب بتاؤ، شرجیل! ہماری لائن کسی اور فون سے مل گئی تھی--- تم بولتے کیوں نہیں، بتاؤ نا! مجھے کہ یہ عورت کون ہے اور کیا لگتی ہے تمہاری---؟'' رافعہ کی آواز اور زیادہ بلند ہو گئی۔ ''ایسی ننگی باتیں تو صرف اور صرف ایک وائف ہی کر سکتی ہے مگر--- مگر شائد میں غلط لفظ کہہ گئی ہوں، شریف بیویاں بھی تو ایسی باتیں اور حرکات نہیں کر سکتیں--- میری عقل جواب دے رہی ہے، شرجیل! میرا دماغ ماؤف ہو رہا ہے، میرے اعصاب شل ہو رہے ہیں، میں پاگل ہو جاؤں گی--- کچھ تو بولو، کچھ تو کہو، کچھ تو بتاؤ کہ یہ عورت اس وقت تمہارے پاس کیا کر رہی ہے اور کون ہے؟--- شرجیل! کیا تم بھول گئے کہ میں تمہارے بچپن کی ساتھی ہوں، منگیتر ہوں میں تمہاری، ہونے والی بیوی ہوں اور سب سے بڑھ کر میں تمہارا پیار ہوں، محبت ہوں تمہاری---''

وہ خاموش ہو گئی مگر اس کے زور زور سے سانس لینے کی آواز مجھے صاف سنائی دے رہی تھی۔ میرے پاس اس کے ان سب سوالات کا کوئی جواب نہ تھا اور جواب کوئی دیتا بھی کیسے اور کس منہ سے، وہ جو بچپن سے لے کر جوانی تک میری زندگی کی ساتھی رہی تھی، بھلا کیسے مطمئن ہو سکتی تھی، میرے کسی بھی جواب سے کیسے قرار آ سکتا تھا اسے اور اب جبکہ اس نے سارا کی ساری باتیں سن لی تھیں اور اس پر کافی حد تک سارا معاملہ عیاں ہو چکا تھا، میں کن الفاظ سے اور کیسے اس کی تسلی و تشفی کراتا--- میں اپنے آپ کو الفاظ کا بڑا ماہر سمجھتا تھا، ایک زمانے میں رافعہ مجھے الفاظ کا جادوگر کہا کرتی تھی۔ وہ میری بانہوں میں ہوتی تو میں اس کی تعریف میں ایسی ایسی تشبیہات اور استعارات استعمال کیا کرتا کہ وہ حیرانی سے میری طرف دیکھتی رہ جاتی، پھر میرے گھنگھریالے بالوں میں انگلیاں پھیرتی ہوئی گویا ہوتی۔

''شرجیل! مانا کہ تم افسانہ نگار ہو، کہانی نویس ہو،

الفاظ پر تمہیں عبور حاصل ہے، بادشاہ ہو تم الفاظ کے--- مجھے بانہوں میں لیتے ہی تمہارے منہ سے ایسے ایسے انوکھے الفاظ اور ناقابل یقین استعارے نکلنے لگتے ہیں کہ یوں لگتا ہے جیسے تم نے اُردو کی ڈکشنری ہضم کی ہوئی ہے---''

یہ تب کی بات تھی جب عشق کی مئے کے خم کے خم لنڈھایا کرتے تھے ہم دونوں، اب اسے مجھ سے دور ہوئے عرصہ ہو چکا تھا۔ لکھنا لکھانا بھی اب میں نے تقریباً ترک کیا ہوا تھا، ذہنی آسودگی حاصل نہ ہو تو قلم ہاتھ میں پکڑا نہیں جاتا تھا۔ اس وقت بھی جب کہ رافعہ مجھ سے اس عورت، یعنی سارا سے متعلق استفسار کر رہی تھی، میں کم لفظی کا شکار ہو گیا تھا یا پھر یوں کہہ لیجئے کہ میرے ذہن سے الفاظ کی ڈکشنری کے سارے اوراق سفید ہو چکے تھے لہٰذا میں نے خاموش رہنے ہی میں عافیت سمجھی مگر میری خاموشی سے رافعہ کی جستجو مزید بڑھ گئی--- اب کی بار وہ رندھی آواز میں بولی۔

''شرجیل! اب تم بتاؤ یا نہ بتاؤ، میں سمجھ گئی ہوں کہ اس وقت تم کہاں ہو اور کیا کر رہے ہو--- شرجیل! تم جس عورت کے پاس بھی ہو، وہ کال گرل ہے اور نہ ہی تمہاری بیوی، وہ ایک ہوس زدہ اور عیاش عورت ہے۔ ایسی عورتیں پیار کے نام سے واقف نہیں ہوتیں اور، شرجیل! تم ٹھیک کہہ رہے تھے، واقعی زمانہ بدل گیا ہے۔ وقت بدل گیا ہے، ماحول بدل گیا ہے، حالات اور واقعات سب کچھ بدل چکے ہیں اور تم بھی، شرجیل! بدل چکے ہو۔ تم وہ شرجیل نہیں ہو جو کبھی میرے ہوا کرتے تھے، جس کے دل کی دھڑکن کے ساتھ میرے دل کی دھڑکن ہم آہنگ ہوا کرتی تھی۔ میں ابھی تک غلطی پر تھی جو تمہیں اپنا پہلے والا شرجیل سمجھ کر تمہارا پیچھا کرتی رہی۔ اب میں اس غلطی کو کبھی نہیں دہراؤں گی، کبھی تمہارا پیچھا نہیں کروں گی، کبھی تمہیں آج کے بعد فون نہیں کروں گی، کبھی کوئی تعلق نہیں رکھوں گی تم سے میں--- ہاں، شرجیل! میرا کہا سنا معاف کر دینا، معافی مانگتی ہوں میں تم سے اپنے کردہ اور ناکردہ گناہوں کی۔ آج سے میرا وہ شرجیل مر گیا--- ہاں، مر گیا وہ اور اس کے ساتھ اس کی رافعہ، اس کی منگیتر، اس کی محبت بھی مر گئی۔ شرجیل! میں بھی مر گئی--- مر جاؤں گی میں، نہیں چاہئے مجھے یہ زندگی جو تمہارے بغیر گزرے--- آج سے سب کچھ ختم، یہ زندگی بھی---''

میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا مگر فون بند ہو گیا۔

''شرجیل---!'' اسی لمحے کمرے میں سارا کی آواز گونجی۔ ''ادھر میری طرف دیکھو---''

میں نے موبائل تپائی پر رکھ کر گردن گھما کر پیچھے کی طرف دیکھا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ سارا جینز کی پتلون اور شرٹ پہنے بیڈ کے دوسری طرف کھڑی مسکرا رہی تھی۔ کہاں تھوڑی دیر پہلے وہ باتھ روم میں شاور کے نیچے برہنہ کھڑی مجھے دعوت عیش دے رہی تھی اور کہاں اب فل ڈریس پہنے چہرے پر مسکراہٹ سجائے ہوئے تھی۔

''فون ختم ہو گیا تمہارا---؟'' اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''تم نے نہا لیا---؟''

میں چونکہ فون کے بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا لہٰذا میں نے الٹا سوال داغ دیا۔

''ہاں--- اکیلے ہی---'' اس کے ہونٹوں پر شرارت بھری مسکراہٹ اُبھری۔ ''تم نے ساتھ نہیں دیا، تمہاری مرضی مگر ہم تو تمہارا ساتھ دیتے رہیں گے، زندگی بھر---'' وہ ایک لمحے کو رُک کر پھر بولی۔ ''کس کا فون تھا---؟''

''تھا کوئی بس---''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس مرتبہ مجھے جواب دینا ہی پڑا کیونکہ وہ ٹلنے والی نہیں تھی۔

''تھا---'' وہ تھوک نگل کر، آنکھیں مٹا کر بولی۔ ''تھی کہو، نا---!''

''چلو، جیسے تمہاری مرضی---''

''کون تھی، سچ سچ بتانا اور--- اور میری مرضی تو تم نے پوری نہیں کی لہٰذا مجھے ڈریس پہننا ہی پڑا---''

اس نے اپنے سراپا پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی۔ اس کی شرٹ کے اوپر کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور ٹائٹ پتلون جسم کو اور زیادہ نمایاں کر رہی تھی۔

''چھوڑو اس فون کو---'' میں نے پھر اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

''چھوڑ دیتی، ضرور چھوڑ دیتی اگر میں اس عورت کے رونے کی آواز نہ سنتی تو--- سچ سچ بتاؤ، کیوں رو رہی تھی اور کون تھی وہ---؟''

''کون تھی وہ--- اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا تعلق میرے ماضی سے ہے اور کیوں رو رہی تھی، کا جواب یہ ہے کہ میرا ماضی چند تلخ اور دل خراش حقائق پر محیط ہے---'' مجھے اب سچ بولنا ہی پڑا کیونکہ اس کے بغیر کوئی چارہ کار نہ تھا۔

''مگر تم نے تو، شرجیل! مجھے بتایا تھا کہ تمہارا کوئی نہیں ہے اس دنیا میں، تنہا ہو تم---؟''

''سچ بتایا تھا سارا، میں نے تمہیں--- تنہا تو میں ہوں اس وقت اور اس میں کوئی شک نہیں ہے مگر ہر ایک کا ماضی تو ہوتا ہے نا! جو کبھی کبھی اس کا تعاقب بھی کرتا رہتا ہے---''

''مگر تمہارا ماضی کیا ہے آخر، کیا میں پوچھ سکتی ہوں تم سے کیونکہ ماضی تو بہرحال ماضی ہوتا ہے، جس کی خالی خولی یادیں ہی باقی رہ جاتی ہیں--- تمہارے بقول تمہارا ماضی تو تمہارا تعاقب کر رہا ہے تو اس کا مطلب صاف ظاہر ہے کہ تم اپنے ماضی سے جان بوجھ کر یا نہ چاہتے ہوئے بھی پیچھا نہیں چھڑا سکے---؟''

بڑی ذہین تھی وہ تبھی تو میرے ایک ایک لفظ پر بڑے فلسفیانہ انداز میں تبصرہ کر رہی تھی چنانچہ میں نے چند لمحے غور کیا، پھر بولا۔

''بات یہ نہیں ہے کہ میں خود اپنے ماضی سے پیچھا نہیں چھڑا سکا۔ کبھی کبھی یوں بھی تو ہوتا ہے کہ انسان کا ماضی جسے وہ بھلا چکا ہوتا ہے، خود اس کی جان چھوڑنے کو تیار ہی نہیں ہوتا، کمبل کی مانند--- میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہے ہی، سارا! میں اپنے ماضی کو مکمل بھلا کر اپنے مستقبل کا آغاز کر چکا تھا، اس سے قطع نظر کہ مستقبل ماضی سے بہتر ہوگا یا بدتر مگر وہ جو کہا کرتے ہیں نا! کہ ہر انسان کا ماضی اس کا پیچھا ضرور کرتا رہتا ہے سو ایسا قدرتی طور پر میرے ساتھ بھی ہو رہا ہے۔''

میں نے اپنی طرف سے اس موضوع پر مزید کوئی بات چیت نہ کرنے کا عندیہ دے دیا جسے بالآخر وہ سمجھ ہی گئی۔

''اچھا، شرجیل! مان لیا کہ ماضی تو آخر ماضی ہی ہوتا ہے، تمہارا ہو یا میرا--- کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم دونوں آج سے اپنے اپنے ماضی کو فراموش کر دیں۔ نہ تم مجھ سے میرے بارے میں پوچھو، نہ ہی میں تمہارا ماضی کریدوں گی۔ آؤ، آج سے ہم ایک نئی زندگی کا آغاز کریں، ایک نئے سفر پر روانہ ہوں۔ ہم جو ابھی تک زندگی کی گاڑی کے دو پہیوں میں علیحدہ علیحدہ سفر کر رہے تھے، اب اکٹھے ایک دوسرے کے نشانہ بشانہ، ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے نئی منزلوں، نئے مستقبل کی طرف روانہ ہوں۔''

وہ خاموش ہوگئی اور اپنی آنکھوں میں ایک فاتحانہ

چمک لئے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں اس کی ان آخری باتوں کا مطلب کچھ سمجھا، کچھ نہ سمجھا لہٰذا مجھے یہ کہنا ہی پڑا۔

''میں تمہاری باتوں کا مطلب صاف سمجھ نہیں سکا، سارا! پہلے میں صرف ایک ٹیچر تھا منزہ کا۔ پھر تم نے مجھے دوست بنا لیا اپنا، میں نے بھی تمہاری اس فرینڈ شپ کو قبول کر لیا اس لئے کہ تم ایک اچھی لڑکی ہو اور میری زندگی میں آنے والی دوسری لڑکی ہو تم مگر سچ پوچھو تو تمہارے آج کے رویے نے مجھے بہت ہی زیادہ مایوس کیا ہے۔ مجھے تم سے ایسی اُمید نہ تھی، میں تو اپنی اور تمہاری فرینڈ شپ کو صاف ستھری رکھنا چاہتا تھا---''

سارا نے فوراً مجھے ٹوک دیا۔ ''شرجیل---!'' وہ اٹھ کر میرے بالکل قریب آ کر بیٹھ گئی۔ ''یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں صاف ستھری فرینڈ شپ نہیں چاہتی تمہارے ساتھ--- شرجیل! تم بھی بہت بھولے ہو---''

یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگی، پھر فوراً ہی اس کی ہنسی قہقہوں میں تبدیل ہوگئی۔ اب وہ قہقہے مار مار کر ہنستی جا رہی تھی۔ پھر اس پر بے خودی کی سی کیفیت طاری ہوگئی، اس نے میری گردن میں اپنے ریشمی بازو حمائل کر دیئے۔ اگلے ہی لمحے وہ بے تحاشہ میرے بوسے لینے لگی۔ لگتا تھا اسے اپنے آپ پر قابو نہ رہا تھا اور شاید جذباتی اور وارفتگی کے عالم میں اس نے بوسوں کی بوچھاڑ کر دی۔ میں اس کی ہر لمحہ بدلتی ہوئی کیفیت کا سامنا کرنے کے لئے بالکل تیار نہ تھا۔ مجھے کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ آخر اسے بیٹھے بیٹھے یہ کیا ہو گیا ہے۔ کافی دیر تک اس پر شدید جذباتی کیفیت طاری رہی، پھر دھیرے دھیرے وہ پُرسکون ہونے لگی۔ اب اس کی ہنسی اور قہقہے بھی دم توڑ گئے، اس نے مجھے چھوڑ دیا اور پرے ہو کر شدید جذباتی لہجے میں تیز تیز بولنے لگی۔

''میں جیت گئی، شرجیل! تم ہار گئے آج--- نہیں، تم جیت گئے اور میں ہار گئی آج--- لیکن اس ہار، جیت کو چھوڑو۔ جو بھی ہارا، جو بھی جیتا اس بارے میں کچھ کہنا ابھی قبل از وقت ہے لیکن یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ میرا ڈرامہ یہ ڈرامہ نہایت کامیاب رہا ہے---''

''ڈرامہ--- کون سا ڈرامہ---؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''شرجیل! یہ ڈرامہ ہی تو تھا---'' وہ پھر کھلکھلا کر ہنس دی۔ ''صرف ایک ڈرامہ--- یہ آج کا ڈنر، یہ رات کا وقت، یہ تنہائی، تم اور میں اس بیڈ روم میں اکیلے، میرا تمہیں مختلف حیلوں بہانوں سے اپنی طرف راغب کرنا، پھر میرا باتھ روم میں جانا، اپنی ہر ناز و ادا سے تمہیں اپنے طرف مائل کرنے کی کوشش کرنا مگر یہ سب کچھ، یہ تمام حرکات ایک ڈرامہ ہی تھیں---''

''مگر، سارا! تم نے یہ سب کچھ، اتنا بڑا اسٹیپ آخر کیوں اٹھایا---؟''

''بتاتی ہوں میں تمہیں--- اچھا، ابھی جاننا چاہتے ہو تو سنو۔ یہ ڈرامے بازی میں نے اس لئے کی کیونکہ میں تمہیں آزمانا چاہتی تھی--- تمہارے جذبات کو برانگیختہ کرنے کے لئے میں نے ہر وہ قدم اٹھایا جو میں اٹھا سکتی تھی حتیٰ کہ میں نے اپنے جسم کو بھی تمہارے سامنے بالکل عیاں کر دیا، یہ دیکھنے کے لئے کہ تم ایک عام سے مرد ہو جو عورت کے متوجہ کرنے پر اس کی طرف دوڑتا چلا آتا ہے یا پھر عام مردوں سے الگ تھلگ ہو اور مجھے یہ کہنے میں اب کوئی عار نہیں کہ تم ان تمام مردوں سے بالکل الگ تھلگ ہو۔ میرے نسوانی ہتھکنڈوں سے متاثر یا راغب ہونے کی بجائے تم نے اپنے کردار کی پختگی کا جو ثبوت پیش کیا ہے، آج اس نے تمہیں میری نظروں میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک عظیم ترین انسان بنا دیا ہے، ایک ایسا انسان جس پر میں جتنا بھی فخر کروں، کم ہے۔ ایک ایسا انسان جو عام انسانوں سے بالکل ڈفرنٹ ہے--- تم وہ انسان ہو جس کی پوجا کی جاسکتی ہے، جسے اپنے دل میں بسایا جا سکتا ہے، جسے اپنایا جاسکتا ہے--- تم انسان نہیں ہو، شرجیل! تم تو انسان کے روپ میں فرشتہ ہو۔ پتہ نہیں تم کس مٹی سے بنے ہو، کیا چیز ہو تم؟ تم پر جتنا فخر کیا جائے، کم ہے۔ تم اس قابل ہو کہ تم پر اعتبار کیا جائے، تمہیں اپنے دل کے اندر سمو لیا جائے--- آج میں بہت خوش ہوں، شرجیل! اتنی خوش کہ تم تصور نہیں کر سکتے---" اس نے اپنے دونوں بازو وارفتگی کے عالم میں پھیلا دیئے۔ "مجھے اس قدر مضبوط انسان ملا ہے جس کے پائے استقلال میں ذرہ برابر بھی لغزش نہیں آئی۔ مجھے آج فخر ہے کہ زندگی میں تم جیسے انسان سے میرا پالا پڑا ہے۔ میں تمہاری فرینڈ ہوں نہیں بلکہ یہ کہنا چاہئے مجھے کہ تم میرے فرینڈ ہو، یہ اعزاز تم نے مجھے بخشا ہے اور پلیز، اگر تم بُرا نہ مانو تو ایک اور بات بھی تم سے کہنی ہے---" وہ یہ کہہ کر اور قریب آ گئی۔ "کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ہماری باہمی فرینڈ شپ کا یہ سلسلہ مزید مضبوط اور گہرا ہو جائے؟"

"مزید مضبوط اور گہرا--- کیا مطلب ہے تمہارا سارا---؟" میں نے قدرے حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں، شرجیل! فرینڈ شپ کا رشتہ کوئی اتنا مضبوط تو نہیں ہوتا! کہ ساری زندگی اسی کے بل بوتے پر گزار دی جائے۔ فرینڈ شپ تو کسی بھی وقت ختم ہو سکتی ہے---"

"تو پھر کیا چاہتی ہو تم مجھ سے---؟"

"بس چاہتی ہوں---" اس نے میرے کندھے پر اپنی ٹھوڑی ٹکا دی۔ "کہ اس فرینڈ شپ وغیرہ کو ختم کر دیا جائے---"

"ختم کر دیا جائے--- تو پھر کیا ارادے ہیں تمہارے، میں تو پہلے ہی بہت کنفیوزڈ ہوں---؟"

وہ پھر بولی۔ "اس کی بجائے ایک ایسا رشتہ، ایک ایسا نیا ریلیشن شپ ہم دونوں آپس میں قائم کریں جو کبھی نہ ٹوٹنے والا ہو، اس کی عمر بے انتہا لمبی ہو---"

"سارا! کیا تم نہیں جانتی کہ فرینڈ شپ کا رشتہ بہت ہی گہرا ہوا کرتا ہے، اچھے دوست پر تو ہر کوئی فخر کیا کرتا ہے؟"

"مگر، شرجیل! میرا مطلب ہے کہ ہم صرف ایک فرینڈ شپ کے رشتے پر تو ساری عمر نہیں گزار سکتے--- میری خواہش ہے یہ بلکہ میرا فیصلہ ہے کہ ہم دونوں ایک اس سے بھی بڑے رشتے میں بندھ جائیں مگر اس کے لئے تمہاری مرضی بھی تو ضروری ہے نا، شرجیل---!"

"تم--- تم کہنا کیا چاہتی ہو، صاف صاف کیوں نہیں کہتی--- کہہ دو جو تمہارے دل میں ہے---؟"

"میں--- شرجیل---!" اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "یہ چاہتی ہوں کہ ہم دونوں--- یعنی میں اور تم ہسبنڈ اور وائف بن جائیں، اگر تم قبول کر لو مجھے زندگی کے ساتھی کے روپ میں--- بس، یہی میری خواہش ہے۔"

"مگر یہ سب کچھ کیسے ممکن ہے، میں تو ایک ٹیچر ہوں--- میں ایک تہی دامن انسان ہوں، کچھ نہیں ہے میرے پاس دنیاوی لحاظ سے۔ کہاں میں اور کہاں تم---"

"تم نے جو باتیں کی ہیں، شرجیل! مجھے ان سب کا احساس ہے اور علم بھی ہے اس لئے تو میں چاہتی ہوں کہ ہم ایک پاکیزہ اور مقدس رشتے میں بندھ جائیں۔"

"رشتے---" اچانک میرے منہ سے طنزیہ انداز میں یہ الفاظ نکلے۔ "میرے رخسار حیات پر انہی رشتوں

کے وہ طمانچے مارے ہیں۔ ان کی ٹیس ہر لمحہ، ہر پل میری روح کو گھائل کرتی رہتی ہیں۔ رشتوں کے یہ بندھن مجھے کبھی راس نہیں آتے---"

"مگر تم مجھ پر تو اعتبار کر کے دیکھو، پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں--- شرجیل! میں تمہارے دامن میں خوشیوں کے ڈھیر لگا دوں گی، میں تم سے تمہارا ماضی چھین کر تمہیں ایک دلکش مستقبل کی سیڑھیوں پر سوار کراؤں گی۔ پلیز، تم میری اس آفر کو مت ٹھکراؤ، میں تمہیں کھو نہیں سکتی--- پلیز، شرجیل! مان جاؤ نا، میرے پاس سب کچھ تو ہے۔ اتنا بڑا عالی شان محل، کاریں، بینک بیلنس، ہر دنیاوی آسائش یہاں میسر ہے۔ صرف اور صرف ایک مخلص، پاک باز، مضبوط کردار کے حامل انسان کی مجھے تلاش تھی جو تمہارے روپ میں مجھے آج مل گیا ہے ورنہ جو کچھ آج اس کمرے میں ہوتا رہا ہے، کوئی بھی شخص تمہارے علاوہ ہوتا تو کبھی بھی مجھے سپر نہ کرتا مگر ایک تم ہو جو میرے معیار، میری سوچ پر پورے اُترے ہو--- پلیز، شرجیل! تم بھی تنہا ہو، تمہارے بقول اس دنیا میں، میں بھی تمہاری طرح ہی ہوں۔ ہم دونوں کی جوڑی خوب رہے گی۔"

وہ چپ ہو گئی اور میری طرف استفہامیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ میں کچھ حیرانی اور پریشانی کی کیفیت میں ڈوبا ہوا تھا، ذہن صحیح طور پر میری رہنمائی نہیں کر رہا تھا--- مجھے خاموش دیکھ کر وہ پھر بول پڑی۔

"زیادہ مت سوچو، شرجیل! میں یہ نہیں کہتی کہ ایسے چانس زندگی میں بار بار نہیں ملتے اور یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ تمہاری زندگی سنور جائے گی مگر اتنا تو ضرور میں کہوں گی اور مجھے کہنا بھی چاہئے کہ مجھے تم جیسے انسان کی ضرورت ہے۔ بس تم زیادہ مت سوچو، اپنے ذہن پر زیادہ زور مت ڈالو۔ میں تم سے مخلص ہوں، تم مجھ سے مخلص ہو۔ تم میری خاطر اس پروپوزل پر ہاں کہہ دو--- اچھا، تو میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں، ان بندھے ہوئے ہاتھوں کی لاج رکھ لو اور مجھے عمر بھر کے لئے اپنی بنا لو---" یک لخت اس کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ چند لمحے رُک کر وہ پھر اندھی ہوئی آواز میں بولی۔ "اگر تم زخم خور

سیاسیات

ایمنسٹی انٹرنیشنل نے امریکہ سے کہا ہے کہ اُس نے جو ہتھیار پاکستان کو دیئے ہیں وہ ہتھیار پاکستان میں ان پرامن مظاہرین کے خلاف استعمال نہیں ہونے چاہئیں جو ملک میں ایمرجنسی کے نفاذ کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں کیونکہ پرامن مظاہرین پر ان ہتھیاروں کا استعمال انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے مترادف ہے۔ امریکہ سے یہ بات ایمنسٹی انٹرنیشنل کے ایشیا بحرالکاہل کے ڈائریکٹر ٹی کمارنے کہی ہے۔ یہ صاحب واشنگٹن میں ہوتے ہیں اور وہاں بیٹھ کر اُنہوں نے اپنے تئیں پاکستان کے نہتے اور مظلوم عوام کا مقدمہ پیش کیا ہے۔

کمار صاحب تو بہت ہی سادہ آدمی ہیں۔ موجودہ امریکی صدر بش تو کیا بلکہ اُن کے والد صاحب یعنی بش سینئر بھی اس بات کو یقینی نہیں بنا سکتے کہ پاکستان کو امریکہ کی طرف سے فراہم کردہ اسلحہ نہتے اور بے بس لوگوں پر استعمال نہ ہو۔ ایمنسٹی کے کمار صاحب کے جذبات کا بھی ہم احترام کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ ان کی یہ خواہش پوری ہو اور نہتے لوگ آتشیں اسلحہ کی زد میں نہ آئیں۔ صدر بش اگر ایمنسٹی انٹرنیشنل کی اپیل پر کوئی اقدام بالفرض محال کر بھی لیں تو وہ زیادہ سے زیادہ پاکستانی حکمرانوں سے یہی کہہ سکتے ہیں کہ بھئی! لوگوں کو مارنے کے لئے ہمارا دیا ہوا اسلحہ استعمال نہ کرو بلکہ اس کام کے لئے اپنا بنایا ہوا اسلحہ اور ہتھیار مظاہرین پر استعمال کرو۔ ویسے بھی اپنے لوگوں کو مارنے کے لئے اپنا ہی اسلحہ استعمال کیا جانا چاہئے تاکہ غیر ملکی دوسروں پر خواہ مخواہ کا الزام نہ آئے۔ جمہوریت اور بنیادی حقوق کے لئے اُٹھنے والی تحریکوں اور احتجاجی مظاہروں کو کچلنے کا پاکستان کے اصل حکمرانوں کے پاس ایک وسیع تجربہ ہے۔ امریکی اسلحہ اور ہتھیار ہی سب کچھ نہیں ہیں۔

(عباس مہکری کے کالم سے کشید)

ملک عرفان احمد، خوشاب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہو تو اس کا رزارِ حیات میں آبلہ پا میں بھی رہی ہوں۔ کتنا عرصہ، کتنے سال اس کا اندازہ تم نہیں لگا سکتے۔ یہ جو سارا تمہارے سامنے موجود ہے نا! اس کی زندگی بھی دکھوں، غموں، مصیبتوں سے عبارت رہی ہے۔ اس پُرآشوب زندگی کا ایک ایک پل، ایک ایک لمحہ میں نے آزمائش کی سولی پر لٹک کر گزارہ ہے۔ یہ جوانی جو تم اپنے سامنے آج دیکھ رہے ہو، جانے کتنی بار لٹ چکی ہوتی، اگر میں نے اس کی حفاظت قدرت کا ایک مقدس تحفہ سمجھ کر نہ کی ہوتی۔ تم تو جانتے ہو یا شاید نہیں جانتے کہ یہ دنیا مردوں کی دنیا ہے، یہ معاشرہ مردوں کا معاشرہ ہے۔ عورت کو یہ مرد کا معاشرہ کتنی عزت اور توقیر دیتا ہے، تم بخوبی جانتے ہوگے۔ باقی باتوں کو چھوڑو، یہ مردوں کا معاشرہ کتنی عزت اور توقیر دیتا ہے ایک عورت کو، تم بخوبی جانتے ہوگے۔ مرد کی آنکھیں ہی عورت کے اندر جانے کیا کیا تلاش کرتی رہتی ہیں۔ عورت کی طرف اس کی اٹھتی ہوئی ہر آنکھ اسے خیالوں ہی خیالوں میں عریاں دیکھتی رہتی ہے--- شرجیل! سمجھ جاؤ نا! جو میں تم سے کہنا چاہتی ہوں، پلیز--- تم نہیں ملے تھے تو اور بات تھی، اب تم مل گئے ہو تو میں تمہیں کبھی بھی نہیں چھوڑ سکتی۔ آخر میں کیا کروں، کس طرح تمہیں راضی کرلوں کہ ہم دونوں ایک ہو جائیں، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے---"

وہ خاموش ہوگئی مگر اس کی دونوں آنکھوں سے آنسوؤں کے دو موٹے موٹے قطرے اس کے رخساروں پر آ کر ٹھہر گئے۔ میرے لئے فیصلہ کن لمحہ آن پہنچا تھا اور اسی اضطراری کیفیت اور اچھلتے لمحوں میں میری زبان سے خود بخود یہ الفاظ پھسل گئے۔

"مجھے تمہاری پروپوزل منظور ہے، سارا---!"

اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ حیرت زدہ ہو کر میرے چہرے کی جانب جانے وہ کتنی دیر دیکھتی رہی، پھر فرطِ مسرت سے اس کی گویا چیخ نکل گئی۔

"شرجیل! تم ایک عظیم انسان ہو۔ میں تمہارا شکریہ ساری عمر ادا کرتی رہوں گی، اندر جاتی اور باہر اس سانس کے ساتھ---" اگلے ہی لمحے اس نے مجھے اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔

☆☆

میرے تینوں ساتھی سو چکے تھے مگر میں جاگ رہا تھا۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی حالانکہ آج کی رات میرے لئے تابناک مستقبل کی نوید نو لے کر آئی تھی مگر جانے کیا بات تھی کہ نیند مجھ سے کوسوں دور تھی۔ میں کمرے کے فرش پر بچھے ہوئے بستر پر کروٹیں بدل بدل کر سونے کی بے انتہا کوشش کر رہا تھا مگر نیند تھی کہ مجھ سے گویا روٹھ گئی تھی۔ جب میں نے اپنے ذہن پر زور دیا تو یہ عقدہ کھلا کہ نیند نہ آنے کی وجہ کوئی اور نہیں بلکہ رافعہ تھی۔ ایک وقت تھا جب میں اس کی جدائی میں تڑپا کرتا تھا۔ راتوں کو رویا کرتا تھا، اس سے دوری کے غم میں دیواروں سے باتیں کیا کرتا تھا، نیم پاگل سا ہوگیا تھا میں اس سے بچھڑ کر۔ پھر ایک وقت وہ بھی آیا کہ میں سنبھلتے سنبھلتے بالآخر سنبھل ہی گیا۔ میرے دل بے قرار کو آخر قرار آ ہی گیا، اس بوجھل زندگی کو جوں توں کر کے اس کے بغیر ہی جینے کا میں نے حوصلہ اور ارادہ اپنے اندر پیدا کر ہی لیا تاہم رافعہ نے فون پر آج رات اپنے متعلق جو باتیں اور انکشافات کئے، ان پر کافی حد تک یقین کر لینے کے باوجود میں اپنے آپ کو دوبارہ اس بندھن میں بندھنے کے قابل نہیں پا رہا تھا۔ اس دنیا میں ایسا ہوتا ہی رہتا ہے کہ کبھی محبت کرنے والے آپس میں مل جایا کرتے ہیں اور کبھی یوں بھی تو ہو جاتا ہے کہ کسی کی وجہ سے وہ دونوں مل نہیں پاتے۔ میرے اور رافعہ کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا تھا۔ فون کے دوران میری غلطی یا بدحواسی کی بنا پر رافعہ جس غلط فہمی کا شکار ہوگئی

تھی، اس کی وجہ سے بس ذہنی طور پر آپ سیٹ ہو گیا تھا اور مجھے نیند نہ آنے کی اصل وجہ بھی یہی تھی۔ رافعہ کا یہ سمجھ لینا کہ میں کسی بھی طریقے سے کسی عورت کے ساتھ ناجائز طور پر ملوث تھا اور یہ سوچ سوچ کر میرا ذہن مختل ہو رہا تھا، دماغ میں جھکڑ چل رہے تھے کہ رافعہ غلط طور پر اس غلط فہمی کا شکار ہوئی اور اسی وجہ سے اسے شدید صدمہ پہنچا۔ ظاہر ہے، میرے کردار سے متعلق شکوک و شبہات نے اسے شدید جذباتی کر دیا تھا اور وہ رونے دھونے اور چیخ و پکار کرنے پر مجبور ہوگئی تھی۔ میں جس صورت حال میں گھرا ہوا تھا، اسی وقت اس کو اپنی صفائی اور حقیقت حال سے آگاہ بھی نہ کر سکا تھا جس کے باعث اس کی غلط فہمی دو چند ہوگئی۔ اب بھی کئی دفعہ ذہن میں خیال آیا کہ اس وقت فون کر کے اسے حقیقت حال سے آگاہ کر دوں مگر پھر یہ سوچ کر کہ رات کے اس وقت اس سے رابطہ کرنا مناسب نہیں تھا۔ میں نے اپنے ارادے کو ہر بار ملتوی کر دیا۔ کافی دیر تک میرا ذہن اس قسم کی بھول بھلیوں میں کھویا رہا، طرح طرح کے خیالات رافعہ کے بارے میں دماغ میں آتے رہے۔ فجر کی اذان شروع ہوتے ہی میری آنکھ لگ گئی۔

"شرجیل صاحب--- شرجیل صاحب---!"

شائد میں کوئی خواب دیکھ رہا تھا، مجھے نیند میں یہی محسوس ہوا۔ چند لمحے سکوت رہا، پھر وہی نسوانی آواز اور زیادہ زور سے اُبھری۔

"شرجیل صاحب! اٹھیئے نا، پلیز--- نیچے کوئی آپ سے ملنے آیا ہے۔"

اس زوردار نسوانی آواز پر میں نیند سے ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا کیونکہ یہ خواب نہیں بلکہ حقیقت تھی۔ میں نے آنکھیں ملتے ہوئے سامنے دروازے کی طرف دیکھا، سامنے ساجدہ کھڑی تھی۔ وہ پھر بولی۔

"بڑی دیر سے کھڑی آپ کو آوازیں دے رہی ہوں، شرجیل صاحب! پلیز، اٹھ کر دیکھیئے، کوئی آپ سے ملنے آیا ہے۔"

میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ چپل پہنی اور سیڑھیاں اُتر کر نیچے مین گیٹ پر آ گیا۔ بغلی دروازہ کھولا تو سامنے چچا کو کھڑا دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میرے منہ سے عالم بے اختیاری میں نکلا۔

"انکل، آپ---؟"

"ہاں، بیٹا شرجیل---!" یک لخت ان کی آواز بھرا گئی۔ "مجھے معاف کر دو بیٹا! کہ میں نے تمہارے ساتھ زیادتیاں کی، میں شرمندہ ہوں اپنی سب غلطیوں پر---"

ان کی اس اچانک آمد اور پھر فوراً ہی غلطیوں کے اعتراف نے مجھے شرمندہ سا کر دیا۔ میں کتنا ہی گیا گزرا سہی مگر بڑوں کو اپنے سامنے یوں شرمندہ ہوتے دیکھ کر مجھ پر رقت آمیز کیفیت خود بخود طاری ہوگئی۔ میری اپنی آواز بھرا گئی اور بولا۔

"چچا! آپ میرے بڑے ہیں۔ جو کچھ ہوا، میں اسے فراموش کر چکا ہوں۔"

"مگر، بیٹا! ہم تو تمہیں فراموش نہیں کر سکتے، نا---!" یہ کہتے کہتے اچانک ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ اس ڈبڈبائی کیفیت میں وہ پھر بولے۔

"بیٹا! رافعہ نے رات کو بھاری مقدار میں خواب آور گولیاں کھالی تھیں، ہمیں کافی دیر بعد پتہ چلا۔ اسے ہسپتال لے گئے مگر وہ ابھی تک ہوش میں نہیں آ رہی--- تم چلو گے میرے ساتھ، بیٹا---؟"

وہ میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ میں فوراً بولا۔

"جی، چلتا ہوں میں آپ کے ساتھ--- میں ابھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آیا۔"

یہ کہہ کر میں تیز تیز سیڑھیاں چڑھتا ہوا اپنے کمرے میں اوپر آ گیا۔ جلدی سے کپڑے تبدیل کئے، دروازے کو کنڈی لگائی اور نیچے آ گیا۔

چچا کی گاڑی میں ہسپتال پہنچے۔ ایمرجنسی وارڈ کے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچے تو سامنے انتہائی نگہداشت کا وارڈ تھا۔ چچا میرا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئے۔ سامنے بیڈ نمبر تین پر رافعہ لیٹی ہوئی تھی۔ ہاں، یہ رافعہ ہی تھی۔ اتنے عرصے بعد جب میں نے اسے دیکھا تو فوراً پہچان لیا مگر یہ پہلے والی رافعہ تو ہرگز نہیں تھی، یہ وہ رافعہ نہیں تھی جسے میں نے آخری بار اس وقت دیکھا تھا جب چچا مجھے گالیاں دے کر اور دھکے مار کر گھر سے باہر نکال رہے تھے۔ یہ رافعہ جو اس وقت مجھے بیڈ پر نظر آ رہی تھی، یوں لگتا تھا جیسے صدیوں سے بیمار ہو۔ محبت جہاں انسان کو اندھا کر دیتی ہے، وہیں محبوب سے دوری بھی نہ صرف انسان کو اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہے بلکہ اکثر اوقات یہ میٹھا زہر انسانی جسم کو بھی دیمک کی طرح کھا جایا کرتا ہے۔ لٹی ہوئی محبت کی یہ جیتی جاگتی تصویر رافعہ کی شکل میں ایک انسانی ڈھانچے کی صورت بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی---

چچا نے مجھے آہستہ سے بتایا کہ رافعہ نے خواب آور گولیوں کی پوری شیشی کھالی تھی اور وہ پچھلے کئی گھنٹوں سے مسلسل بے ہوش تھی۔ ڈاکٹر اسے ہوش میں لانے کی سرتوڑ کوششیں کر رہے تھے مگر انہیں کامیابی نصیب نہیں ہو رہی تھی۔ ہم دونوں بیڈ کے قریب پڑے ہوئے بنچ پر بیٹھ گئے۔ میری نگاہیں رافعہ کے سُتے ہوئے اور ویران چہرے پر مرکوز تھیں۔ سچ پوچھیں تو اس وقت اس کی اس دگرگوں حالت کو دیکھ کر میرا دل دہل کر رہ گیا۔ کبھی وہ وقت تھا کہ اس کا چہرہ تازہ پھولوں کی طرح شگفتہ اور شاداب ہوا کرتا تھا۔ اس کی بڑی بڑی گول آنکھیں اس کے چہرے کی خوبصورتی میں چار چاند لگایا کرتی تھیں، ہنستے وقت اس کے رخساروں میں گڑھے پڑا کرتے تھے اور موتیوں جیسے سفید دانت چاندنی کی طرح چمکا کرتے تھے مگر سامنے پڑی ہوئی رافعہ اس وقت ہڈیوں کا ڈھانچہ نظر آ رہی تھی--- رافعہ کی موجودہ حالت اور پہلے والی حالت کا تقابلی جائزہ لیتے لیتے ماضی کے جھروکوں سے اس کی آوازیں، تصور ہی تصور میں میرے کانوں میں بلند ہونا شروع ہو گئیں۔ مجھے وہ سہانی رات یاد آ گئی جب چودھویں رات کا چاند پوری آب و تاب کے ساتھ آسمان پر چمک رہا تھا۔ ہم دونوں گھر کی چھت پر منڈیر سے ٹیک لگائے، ایک دوسرے میں مگن بیٹھے تھے۔ میرا سر رافعہ کی گود میں تھا اور وہ اپنی پتلی پتلی انگلیوں سے میرے گھنگھریالے بالوں سے کھیل رہی تھی۔ ہم دونوں پر مدہوشی کا عالم دوچند ہونے لگا تو رافعہ بڑے پیار سے سرگوشی کے انداز میں بولی۔

"شرجیل---!"

"ہوں---" میں مدہوشی کے عالم میں ڈوبی ہوئی جوابی سرگوشی کے انداز میں بولا۔

"کتنی محبت کرتے ہو تم مجھ سے---؟"

"اپنے دل سے پوچھو، رافعہ---!"

"اپنے دل سے کیوں پوچھوں میں--- تم بتاؤ نا! خود ہی اپنے دل سے پوچھ کر۔"

"مگر میرا دل--- میرا دل تو میرے پاس ہے ہی نہیں۔"

"تو کہاں ہے، شرجیل! اس وقت تمہارا دل---؟"

اس نے میرے گال پر پیار سے چٹکی بھری، میں نے بھی جواباً اس کے رخسار پر انگلیاں پھیریں۔

"میرا دل اس وقت کسی اور کے پاس ہے۔" میں

نے شوخ و شنگ لہجے میں جواب دیا۔

"کس کے پاس ہے، شرجیل---!" اس کی مترنم آواز جذبات ڈوبی ہوئی تھی۔

"بتا دوں---؟"

میں نے اس کے سیاہ بالوں کی ایک موٹی لٹ اپنی ایک انگلی کے گرد لپیٹتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں، بتاؤ نا! جلدی بتاؤ---"

"میرا دل تمہارے پاس ہے، رافعہ! تم نے اسے چرا لیا ہے مجھ سے--- اب تم خود ہی اس سے پوچھ لو کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔" میں نے مدہوش آواز میں کہا۔

اس کے دونوں ہونٹ شدت جذبات سے کانپنے لگے۔ اس کے ہونٹوں کی کپکپاہٹ محسوس کر کے میرے جسم میں بھی بجلیاں سی دوڑنے لگیں۔

"اب تمہیں پتہ چل گیا، رافعہ! کہ میں کتنی محبت کرتا ہوں تم سے---؟"

اس کے سرخ و سفید چہرے پر شرم و حیا کی شفق مزید گہری ہو گئی۔

"آپ بڑے "وہ" ہیں---" یہ کہتے ہوئے اس کے رخساروں کے گڑھے مزید گہرے ہو گئے۔

"وہ--- وہ کیا---؟" میں نے شوخی بھرے لہجے میں پوچھا۔

"شرارتی---"

"صرف شرارتی---؟"

"اب میں جا رہی ہوں، نیچے---"

وہ مجھ سے اپنا دامن بمشکل تمام چھڑا کر سیڑھیاں نیچے اتر گئی۔

☆☆

میری یادوں کی ڈور فوراً ٹوٹ گئی اس لئے کہ رافعہ کے بیڈ پر ڈاکٹر اور نرسز آ کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ ڈاکٹر نے رافعہ کی نبض دیکھی، پھر اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار امڈ آئے۔ اس نے فوراً پاس کھڑی ہوئی ایک نرس کو کچھ کہا، نرس نے فوراً ہی ٹرالی میں سے ایک انجکشن بھر کر ڈاکٹر کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ڈاکٹر نے وہ انجکشن رافعہ کے بازو میں لگا دیا۔ میں اور چچا، رافعہ کے بیڈ کے گرد کھڑے ہو گئے۔ ہماری خوشی کی انتہا نہ رہی جب تھوڑی دیر بعد رافعہ نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ فوراً ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی، اس کے جسم میں یک لخت حرکت پیدا ہو گئی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ مجھے دیکھ کر اٹھ بیٹھنا چاہتی تھی مگر وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکی کیونکہ نرس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے ایسا کرنے سے روک دیا۔ میری اور رافعہ کی نگاہیں چار ہوئے بمشکل چند سیکنڈ ہی گزرے تھے کہ یک لخت رافعہ کی آنکھیں پھر بند ہو گئیں۔ فوری طور پر ڈاکٹر رافعہ کی نبض محسوس کرنے لگا۔ کتنی دیر تک اس نے رافعہ کی کلائی پکڑے رکھی، پھر اس نے سٹیتھوسکوپ سے رافعہ کو چیک کرنا شروع کر دیا۔ کافی دیر تک ڈاکٹر رافعہ کو چیک کرتا رہا بالآخر اس نے تمام ٹولز ٹرالی میں رکھ دیئے اور مایوسی سے بولا۔

"سوری، سر! ہم کوشش کے باوجود آپ کی بیٹی کو بچا نہیں سکے۔"

☆☆

میری کتاب ماضی کے تمام صفحات رافعہ کے ساتھ ہی اس کی قبر میں دفن ہو گئے۔ یادوں کا وہ باب جسے رافعہ نے دوبارہ کھولنے کی کوشش کی تھی، اب بالکل بند ہو چکا تھا۔ رافعہ کی لاش کو دفنانے کے بعد قبرستان میں ایک طرف کھڑے ہو کر چچا نے مجھ سے ڈھیروں باتیں کی جن میں معذرت، اپنی زیادتیوں اور ناروا سلوک کی تلخ و ترش یادیں شامل تھیں۔ انہوں نے مجھے اپنے ساتھ اپنے گھر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لے جانے کی کوشش میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا مگر میں نے اثبات میں جواب نہیں دیا۔ انہوں نے وہیں قبرستان میں کھڑے کھڑے اشاروں سے کہا کہ اگر میں چاہوں اور مان جاؤں تو رافعہ سے چھوٹی بہن سے شادی ہو سکتی ہے۔ انہوں نے مجھے یہ بھی یقین دلانے کی سر توڑ کوشش کی کہ وہ میرا چھینا ہوا مکان فوراً میرے نام کروانے کے لئے تیار ہیں مگر ان کی بے شمار یقین دہانیوں اور معافیاں مانگنے کے باوجود اب میرا دل گویا پتھر کا ہو چکا تھا یا یوں سمجھ لیجئے کہ ان کی تمام تر کوششیں بے کار تھیں، میرے ذہن کے کسی بھی گوشے میں ان کے لئے ہمدردی کا کوئی عنصر موجود نہیں تھا کیونکہ ایک طرف تو رافعہ جس سے میں محبت کرتا تھا، اب منوں مٹی تلے دفن ہو چکی تھی اور دوسری طرف میں اپنے تلخ اور کڑوے ماضی کی ساری یادوں کو بھلا کر شاہراہ زیست کی نئی منزل کی جانب قدم رکھ چکا تھا۔ جس شیریں اور اندوہناک ماضی کو میں نے اپنے کندھوں سے نیچے جھٹک دیا تھا، اسے دوبارہ اپنے ذہن پر کسی صورت مسلط نہیں کر سکتا تھا چنانچہ میں چچا سے معذرت کر کے ان سے جدا ہو گیا۔

☆☆

کمرے میں پہنچ کر میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا، اب مجھے کیا کرنا چاہئے کہ اس دوران باہر سڑک سے کسی گاڑی کے ہارن بجنے کی مسلسل آوازیں کانوں میں گونجنے لگی۔ کوئی لگاتار ہارن بجائے جا رہا تھا چنانچہ میں نے کھڑکی کھول کر نیچے جھانکا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ یہ سارا تھی۔ اس کی نگاہیں پہلے ہی اوپر کی جانب تھیں۔ مجھے دیکھا تو اس نے ہارن بند کر دیا اور اس سے پہلے کہ میں اس کے پاس نیچے جاتا، وہ آناً فاناً گاڑی بند کر کے اوپر میرے کمرے میں آ گئی۔ اس کے چہرے سے غصے کی پرچھائیاں جھلک رہی تھیں مگر مجھے دیکھتے ہی اس کا شکن آلود ماتھا نارمل ہو گیا---اندر آ کر وہ بولی۔

"کہاں تھے تم، شرجیل! صبح سے---؟"

"میں---بس کہیں گیا ہوا تھا---"

میں نے آہستگی سے جواب دیا مگر میری آواز میں شکستگی کے عنصر کو وہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکی اور بولی۔

"شرجیل! کہاں گئے تھے تم---تمہاری طبیعت تو ٹھیک نہیں لگتی مجھے---؟"

ایک دم اس نے دو سوال کر دیئے اور میرے چہرے کو تکنے لگی۔

"تمہارے پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ ایک دوست فوت ہو گیا تھا صبح سویرے--- پہلے اس کے جنازے پر شرکت کی، پھر اس کی تدفین میں بھی شریک ہونا پڑا۔"

یہ کہہ کر کہ میں چپ ہو گیا۔ وہ پھر بولی۔

"---اور طبیعت تمہاری---؟"

"تم تو جانتی ہو کہ ایسے موقعوں پر انسان کی طبیعت ایسی ہو ہی جایا کرتی ہے۔"

"او کے، شرجیل! ٹھیک ہے---تم نے نیکیاں کمائی ہیں جنازے وغیرہ میں شریک ہو کر مگر اب اپنا موڈ تو ٹھیک کرو، میں تمہارا اُترا ہوا چہرہ نہیں دیکھ سکتی۔"

میں جواباً مسکرا دیا۔ وہ خوش ہو کر بولی۔

"یہ ہوئی نا، بات---اب اب تم چلو میرے ساتھ---" اس نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"مگر---کہاں---؟"

"میرے ساتھ، میرے گھر، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے---اب بھی بھلا سوال و جواب کی کوئی گنجائش رہ گئی ہے۔ اب تم اور میں ایک ہیں نا! میں تمہاری ہو چکی، تم میرے ہو چکے۔ اب میں تمہیں یہاں نہیں رہنے دوں گی، کبھی نہیں---چلو، ابھی میرے ساتھ---"

وہ ضدی بچے کی طرح منہ بسورنے لگی۔ میرے لئے اب مزید کچھ کہنے کو رہا ہی کیا تھا تاہم میں نے ہمت کر کے اتنا کہا۔

"اچھا، میں اپنا سامان وغیرہ تو لے لوں۔"

"چھوڑو اس سامان کو، سب کچھ تمہیں وہیں ملے گا---اب اور کچھ سمجھاؤں یا پھر---"

اس نے مزید کچھ کہنے کی گنجائش نہیں چھوڑی تھی لہٰذا میں کمرے کے دروازے کو تالا لگا کر اس کے ساتھ چل پڑا۔ ابھی ہم آخری سیڑھی پر تھے کہ سامنے ساجدہ کھڑی نظر آئی۔ ہم دونوں وہیں رُک گئے۔ ساجدہ نے پہلے میری طرف دیکھا، پھر سارا کے پورے جسم کا نیچے سے اوپر تک جائزہ لیا۔ چند لمحات کی خاموشی کے بعد وہ بولی۔

"شرجیل صاحب! آپ کہیں جا رہے ہیں کیا---؟"

میری بجائے جھٹ سارا نے جواب دیا۔ "ہاں، یہ میرے ساتھ جا رہے ہیں---ہمیشہ ہمیشہ کے لئے، اس گھر کو چھوڑ کر---"

"میں آپ دونوں کی اونچی اونچی آوازیں نیچے صحن میں کھڑی، سن چکی ہوں۔ آپ دونوں کو نئی زندگی کی نئی شروعات مبارک ہوں---ویسے آپ خوش قسمت ہیں---" اس نے سارا کی طرف دیکھ کر کہا۔ "کیونکہ آپ نے اپنے لائف پارٹنر کے لئے شرجیل جیسے انسان کا انتخاب کیا ہے---" یہ کہتے کہتے ساجدہ کا چہرہ حسرت و یاس کی تصویر بن گیا۔

سارا بولی۔ "اپنی اپنی قسمت کی بات ہے---جو صبر کرتا ہے، اسے میٹھا پھل آخرکار مل کر ہی رہتا ہے---"

سارا کے کاٹ دار لہجے میں چھپی ہوئی تلخی کو میں محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس سے پہلے کہ ساجدہ بھی سارا کو کوئی جواب دیتی، میں نے چابی ساجدہ کی طرف بڑھائی۔

"یہ کمرے کی چابی ہے۔ میرے روم میٹس آ جائیں تو انہیں دے دیجئے گا---اور ہاں، اپنے ابو کو میرا اسلام کہیئے گا۔ میں ان سے ملنے بعد میں ضرور آؤں گا۔"

ساجدہ نے میرے ہاتھ سے چابی لے لی۔ سارا جلدی سے بولی۔

"چلیں---"

ہم ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے باہر نکل گئے۔

☆☆

ماں

جنگ ختم ہونے کے بعد میں گاؤں پہنچا تو خبر مشہور ہو گئی کہ کپتان محمد خان آیا ہے۔ ہم نے پہلے دو دن میں کوئی ایک ہزار معانقے کئے' اتنی ہی ہمارے گاؤں کی مردانہ آبادی تھی۔ چھاتی دُکھنے لگی لیکن دل کو ایک عجیب سا سکون ملا۔ مہینے بھر میں چند دن اپنے گھر میں کھانا کھایا وہ بھی والدہ کے اصرار پر کہ مجھے اپنے بیٹے کو جی بھر کے دیکھ لینے دو' جب وہ بہت دیر دیکھ چکی تو وہی کہا جو صرف ماں کہہ سکتی ہے۔

"بیٹا! اب ساری فوج میں تم ہی بڑے افسر ہو' نا؟"

میں والدہ کو دیکھتا اور سوچتا کہ اگر اس پیکر محبت کا وجود نہ ہوتا تو کیا مجھے وطن واپسی کا یہی اشتیاق ہوتا؟---میں نے کسی جھجک کے بغیر جواب دیا کہ ہاں' ماں! ایک آدھ کو چھوڑ کر سبھی میرے ماتحت ہیں---ماں کی دُنیا آباد ہو گئی' ویسے سچ یہ تھا ایک آدھ نہیں' ایک لاکھ چھوڑ کر بھی ہمیں اپنے ماتحت ڈھونڈنے کے لئے چراغ تو کیا سرچ لائٹ کی ضرورت تھی مگر اس سچ کا کیا فائدہ جس سے ماں کا دل دُکھے۔

(کرنل محمد خان کی "بجنگ آمد" سے انتخاب)

طلال احمد

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اگلے چند دنوں میں سارا نے نہ صرف مجھ پر بے انتہا پیار نچھاور کر دیا بلکہ ضروریات زندگی کی ہر چیز میرے کمرے میں مہیا کر دی۔ وہ روزانہ مجھے اپنے ساتھ گاڑی میں بیٹھا کر شہر کی بڑی بڑی مارکیٹوں میں نکل جاتی اور سارا دن شاپنگ کر کے بعد ہم شام کو واپس لوٹتے۔ ڈنر ہم کبھی گھر پر تو کبھی کسی فائیو سٹار ہوٹل میں کرتے۔ ویسے ایک بات تھی کہ سارا کوکنگ میں کافی ایکسپرٹ تھی۔ پاکستانی، چائنیز، فرنچ، امریکن، برٹش سب کھانے اسے پکانے آتے تھے۔ اس کے کھانے کھا کر میں انگلیاں چاٹتا رہ جاتا۔ میں اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھ رہا تھا کہ جسے اللہ پاک نے بغیر مانگے، بیٹھے بٹھائے نہ صرف حرام کاری سے بچا لیا تھا بلکہ ایک خوبصورت اور خوب سیرت بیوی عطا کرنے جا رہا تھا۔ میری زندگی کی نئی شروعات ہو چکی تھی۔ ماضی کی سب یادوں کو میں نے یکسر فراموش کر دیا تھا اور ایک تابناک مستقبل کی طرف گامزن تھا۔

جیسے جیسے دن گزر رہے تھے، سارا جلد از جلد مجھ سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ میں بھی ذہنی طور پر شادی کے لئے تیار تھا۔ روزانہ رات کو ڈنر کے بعد ہم گھنٹوں بیٹھے آپس میں اس موضوع پر بات چیت کرتے رہتے اور فیوچر کی پلاننگ کرتے رہتے۔ شادی کے بعد ہنی مون منانے سے متعلق سارا یہ کہتی تھی کہ کسی خوبصورت ملک کا انتخاب کر لیا جائے مگر کس کا، اس کا فیصلہ اس نے مجھ پر چھوڑ دیا تھا--- ایک اور قابل ذکر بات جس کا تذکرہ یہاں کرنا چاہوں گا، وہ یہ تھی کہ آپ شائد حیران ہوں مگر یہ حقیقت تھی کہ سارا اور میرا کمرہ الگ الگ تھا۔ رات کو ہم دونوں اپنے اپنے کمروں میں علیحدہ سویا کرتے۔ میں نے جب ایک دفعہ اس سے اس سلسلے میں بات کی تو اس سے کہا۔

''کیا تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں ہے--- اب تو ہم دونوں میاں بیوی بننے جا رہے ہیں؟''

اس کا جواب اس نے انوکھے انداز میں دیا تھا۔

''شرجیل! یہ بات نہیں کہ مجھے تم پر اعتماد نہیں بلکہ مجھے اپنے آپ، اپنی ذات پر اعتماد نہیں ہے۔ شادی سے پہلے کے یہ ایام بڑے صبر آزما ہوتے ہیں اور جو لوگ ان ایام میں اپنے آپ کو بچا کر رکھتے ہیں، سہاگ رات کو حقیقی معنوں میں وہی انجوائے کرتے ہیں۔ میں جب بھی راتوں کو تمہارے خواب دیکھتی ہوں تو مجھے اپنے آپ پر قابو نہیں رہتا، بے خود ہو جاتی ہوں میں اس وقت۔ یہی وجہ ہے کہ شادی سے پہلے تک میں نے اپنا اور تمہارا کمرہ جدا رکھا ہوا ہے--- ہاں، اس رات، اس کچھ اور ہی کیفیت تھی جب میں پوری ڈھٹائی اور کس قدر بے حیائی کے ساتھ تمہیں دعوت نظارہ دے کر اپنی طرف مائل کر رہی تھی مگر تم اس وقت اس کٹھن امتحان میں پورا اُترے۔ اس پل صراط کو تم نے بڑے صبر، حوصلے اور مثالی بن کر پار کیا۔ مجھے خوشی ہے کہ میں نے اپنی زندگی کے ساتھی کا فیصلہ خوب سوچ سمجھ کر اور اچھی طرح پرکھ کر کیا ہے۔ میں نے اپنے ذہن میں اپنے ہونے والے شوہر سے متعلق جو شبیہہ بنا رکھی تھی، تم اس معیار پر پورے اُترے ہو--- شادی سے پہلے کہ یہ دن بڑے کٹھن اور صبر آزما ہوتے ہیں۔ میں اپنی بات کر رہی ہوں کہ اگر میرے پائے استقامت میں ذرا بھی لغزش آ گئی تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کر سکوں گی---''

غرض سارا کی اس طرح کی باتیں اور اس کے خیالات سن سن کر میرے دل میں اس کی قدر و منزلت دوچند ہو جاتی۔

☆☆

میں اپنے کمرے میں بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ سارا

میرے قریب آ کر بولی۔

''کوئی پروگرام پسند آیا، شرجیل---؟''

میں نے ریموٹ کو سامنے تپائی پر رکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''نہیں، سارا! کہنے کو تو ٹی وی پر چینلز کی بھرمار ہو گئی ہے مگر معیاری پروگرامز کی کمی ماضی کی نسبت اب زیادہ شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔''

''تو پھر چلو میرے ساتھ---''

اس نے خود ہی تپائی سے ریموٹ اٹھایا اور ٹی وی بند کر دیا۔ میں نے پوچھا۔

''کہاں چلنا ہے، سارا---؟''

''کچھ شاپنگ وغیرہ کرنی ہے--- گھر کے لئے، کچن کے لئے۔''

''ٹھیک ہے---'' میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ''چلو، جدھر مرضی لے چلو---''

میں مسکرا دیا، اس کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ دوڑنے لگی۔ ہم باہر گیراج میں آ گئے۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی، میں اس کے ساتھ اگلی سیٹ پر تھا۔ تھوڑی دیر میں گاڑی سڑک کے سینے پر دوڑنے لگی۔ گاڑی مین روڈ پر فراٹے بھرنے لگی تو میں نے اس سے پوچھا۔

''کہاں سے شاپنگ کرنے کا ارادہ ہے؟''

''کچھ چیزیں مین مارکیٹ سے ملیں گی مگر کچھ تمہارے اس جنرل سٹور والے نوجوان سے لوں گی۔''

اس کے منہ سے نوجوان کا ذکر سنتے ہی میرے ذہن میں اس کا چہرہ گھوم گیا۔ اس سے ملے ہوئے کافی دن گزر چکے تھے۔ اچانک یونہی میرے دل میں آئی کہ اس سے چھوٹی سے نشست کی جائے، اس کا حال احوال پوچھا جائے کہ لڑکیوں سے اس کی فرینڈ شپ کہاں تک پہنچی۔ اس نے میرے لئے ٹیوشنز ڈھونڈنے میں میری بے انتہا مدد کی تھی اور اسی کی وجہ سے آج میری زندگی ایک نیا موڑ لے چکی تھی۔ یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل تھی کہ میرے موجودہ حالات کی یہ نئی کروٹ میری تقدیر میں لکھی ہوئی تھی مگر اس میں اس نوجوان کی کوششوں کا حصہ بہرحال بدرجہ اتم موجود تھا۔ آج جب موقع ملا تو میں اسے گذشتہ دنوں کے بدلتے ہوئے حالات اور سارا سے اپنی ہونے والی شادی کے متعلق خوشخبری سنانا چاہتا تھا مگر یہ سب کچھ سارا کی میرے ساتھ موجودگی سے ممکن نہیں تھا چنانچہ چند لمحے سوچ کر میں نے سارا سے کہا۔

''تم یوں کرو، سارا! کہ پہلے مین مارکیٹ سے چیزیں لے آؤ، تسلی سے اور مجھے اس نوجوان کے سٹور پر اُتار دینا۔ کافی دن ہوئے ہیں اس سے ملے ہوئے۔ میں تھوڑا اس کے پاس بیٹھوں گا، پھر واپسی پر تم یہیں آ جانا اور مجھے لیتی جانا۔''

سارا سوچ کر بولی۔ ''اوکے، جیسے تمہاری مرضی---''

تھوڑی دیر بعد اس نوجوان کا سٹور آ گیا۔ سارا نے گاڑی ایک طرف کھڑی کی۔ میں اُترا تو اس نے گاڑی کو گیئر لگایا اور کار سڑک پر فراٹے بھرنے لگی۔ میں سٹور کی طرف بڑھا، سائڈ والے دونوں شٹر بند تھے، درمیان والا بڑا شٹر ہاف ڈاؤن تھا۔ شائد وہ نوجوان آرام کر رہا ہو گا تاہم میں پرواہ کئے بغیر گردن نیچی کر کے سٹور کے اندر داخل ہو گیا۔

سٹور کی تمام لائٹیں آف تھیں۔ تھوڑا آگے بڑھا تو میں نے دیکھا کہ سٹور کے آخر والے کمرے کی لائٹ جل رہی تھی اور اندر سے آوازیں آ رہی تھیں۔ تھوڑا اور قریب گیا تو وہ ایک لڑکی کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ میں نے فوراً ہی اس لڑکی کو آواز سے پہچان لیا۔ وہ ساجدہ تھی اور کہہ رہی تھی۔

''تو پھر بتاؤ، نا---؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''بتا تو دیا ہے---'' نوجوان کہہ رہا تھا۔

''مگر یہ تو تم نے کل بھی مجھے کہا تھا--- روز یہی کہتے ہو بلکہ کئی مہینوں سے یہی کہہ رہے ہو؟''

''تو کیا تمہیں مجھ پر اعتبار اور اعتماد نہیں ہے؟''

''اعتبار بھی ہے مجھے اور اعتماد بھی اسی لئے تو روزانہ آتی ہوں تمہارے پاس--- سب کچھ تو حوالے کر چکی ہوں۔ اپنی عزت، اپنی عصمت، سب کچھ تو تمہیں سونپ چکی ہوں میں۔ اب میرے پاس رہ ہی کیا گیا ہے؟''

''تمہارے پاس سب کچھ تو ہے۔ یہ جوانی، یہ حسن، یہ شباب، سب کچھ ویسا ہی تو ہے، ساجدہ! جس طرح تم مجھے پہلے دن ملی تھی، آج بھی ویسی ہی ہو---''

''صحیح کہا تم نے، ویسی ہی ہوں میں مگر وہ گوہر عصمت تم نے لوٹ لیا ہے میرا جو عورت کا زیور ہوتا ہے۔''

''مگر، ساجدہ! میں نے تمہارے ساتھ کوئی زبردستی تو کبھی نہیں کی؟ میرے ہر فعل میں، ہر حرکت میں تمہاری مرضی شامل ہوتی تھی--- ساجدہ! تم بھی میرے ہر عمل میں برابر کی شریک ہو۔ تم صرف اور صرف مجھے ہی موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتی---''

''ٹھیک کہا تم نے--- مگر مرد جب قول و قرار اور وعدے کرتا ہے عورت سے تو عورت کو اس پر اعتبار کرنا ہی پڑتا ہے۔ یہی تو عورت کی کمزوری ہوتی ہے جس کا مرد فائدہ اٹھاتا ہے--- مگر تم کن باتوں میں الجھا رہے ہو۔ یہی سب کچھ تو تم نے کل بھی بلکہ روزانہ ہی مجھے کہا کرتے ہو۔ اب اصل بات کی طرف آؤ، پلیز---!''

''آ جائیں گے تمہاری اصل بات کی طرف، پہلے تو ادھر تو آؤ میرے پاس--- میرے گلے سے لگ جاؤ، ہم دلوں کی پیاس تو پہلے بجھالیں۔''

''چھوڑو، چھوڑو مجھے---''

''مگر--- مگر کیوں، آج کوئی نئی بات تھوڑی کر رہا ہوں تم سے، یہ تو ہم روزانہ کرتے ہیں---''

''مگر آج یہ کام بالکل نہیں ہوگا۔''

''آخر کیوں، کیا قباحت ہے آج---؟''

''میں نے کہہ دیا نا! کہ آج تم مجھے ہاتھ نہ لگانا--- چھوڑو، چھوڑو مجھے---'' ساجدہ کی آواز میں درشتگی تھی۔

''اچھا، بابا! تم تو واقعی ناراض ہوگئی--- لو، چلو چھوڑ دیتے ہیں تمہیں---''

چند سکینڈ خاموشی کے بعد ساجدہ کی آواز پھر اُبھری۔

''آج تم میرے ساتھ فیصلہ کرو، آخری فیصلہ کہ کب کر رہے ہو تم مجھ سے شادی---؟''

''شادی--- کہہ تو چکا ہوں کہ جلد کروں گا تم سے شادی---'' نوجوان کی آواز میں کھوکھلا اور دوغلا پن صاف مترشح تھا۔

''یہ تو تم روز ہی کہتے ہوں، آج مجھے کوئی ڈیٹ بتاؤ---؟''

ساجدہ کا لہجہ روہانسو ہوگیا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے رونے کی آوازیں آنے لگیں۔ اب وہ اونچی اونچی آواز میں رو رہی تھی۔ میں دروازے کے اس پار کھڑا اس کے رونے دھونے کی آوازیں سن رہا تھا۔ ایک لمحے کے لئے میرے جی میں آیا کہ کمرے کے اندر جا کر نوجوان کو پہلے تو بے نقط سناؤں اور پھر مار مار کر اس کا بھرکس نکال دوں تاہم پتہ نہیں کس چیز نے میرے پاؤں جکڑے رکھے۔ ساجدہ مسلسل روئے جا رہی تھی مگر حیرت انگیز طور پر اس نوجوان کی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ نہ ہی اسے چپ کرانے کی اور نہ ہی کسی قسم کی تسلی و تشفی دینے کی---

روتے روتے ساجدہ کی رندھی ہوئی آواز پھر ابھری۔

''تم بہت سخت دل ہو، بہت ظالم ہو تم۔ تمہارے سینے میں گوشت پوست کا نہیں، لوہے کا دل ہے--- کتنا عرصہ ہوگیا، میں تمہارے ہاتھوں لٹ رہی ہوں اور تم ہو کہ مجھے ٹالتے ہی جا رہے ہو۔ ابو نہیں مان رہے، امی نہیں مان رہی، کبھی کوئی بہانہ اور کبھی کوئی اور--- تمہیں صرف ایک ہی کام سے غرض ہے---'' وہ اور زیادہ شدت سے رونے لگی۔ پھر روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی۔ ''میری امی کو ہارٹ اٹیک ہوگیا۔ جانتے ہو میری وجہ سے، صرف میری وجہ سے۔ ان کی موت کی ذمے دار میں ہوں--- ہاں، میں نے اپنی ماں کو مار ڈالا۔ ان کی قاتل میں ہوں میں، صرف میں---'' ساجدہ پاگلوں کی طرح ہنسنے لگی۔ پھر ہنستے ہنستے دیوانوں کی طرح چیخنے چلانے لگی۔ ''مجھ سے ٹوٹ کر پیار کرنے والی میری امی مجھ سے بچھڑ گئیں۔ میری حقیقت کا صدمہ وہ برداشت نہ کر سکیں--- ہائے، میری امی---!'' وہ اور زیادہ چیخیں مار مار کر رونے لگی۔ ''مگر تمہیں کیا، تمہیں تو اپنے مطلب سے غرض ہے۔ تم اپنے دماغ کے فتور سے باہر نکلو تو تمہیں پتہ چلے نا! کہ میری کیا حالت ہے اس وقت، کن کربناک حالات سے گزر رہی ہوں میں آج کل۔ تم مرد ہو نا! اور مرد تو صرف وعدے کرنا اور قسمیں اٹھانا جانتا ہے، نبھانے کی اسے کوئی پرواہ نہیں ہوتی--- تم نے جب پہلی دفعہ میرے جسم کو ہاتھ لگایا تھا تو ڈھیروں قسمیں کھائی تھیں بلکہ خدا اور رسول کو گواہ بنا کر وعدہ کیا تھا کہ تم مجھ سے شادی کرو گے، کبھی مجھے دھوکہ نہیں دو گے مگر تم تو اول نمبر کے دھوکے باز نکلے۔ فریبی ہو تم، بہت بڑے فراڈیے ہو تم جسے صرف لڑکیوں کے جسموں سے غرض ہے۔ آج تک میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتی رہی کہ تم میرے ہم سفر بننے والے ہو مگر آج مجھے یقین ہوگیا ہے کہ تمہارے سب

ایک پریشان حال شخص ایک ماہر نفسیات کے پاس گیا۔

''معاملہ کیا ہے؟'' ماہر نفسیات نے پوچھا۔

''میرا ایک رشتہ دار پچھلے سے پچھلے ماہ مرا۔ اُس کے ترکے سے مجھے 5 لاکھ روپے ملے۔ ایک اور رشتے دار گزشتہ ماہ مرا اُس کے ترکے سے مجھے 10 لاکھ روپے ملے۔'' مریض نے بتایا۔

''تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟'' ماہر نفسیات نے حیرانی سے پوچھا۔

''اس ماہ مجھے کچھ نہیں ملا---؟'' مریض نے جواب دیا۔

اختر عباس قریشی، ملتان

وعدے جھوٹے ہیں، سب قسمیں دھوکہ ہیں۔ تم ایک مکار اور عیار شخص ہو جسے صرف لڑکیوں کا جسم چاہیے، تم جسموں کے پجاری ہو--- اب بولتے کیوں نہیں، چپ کیوں سادھ لی ہی تم نے مگر تم کیا بولو گے؟ کچھ بولنے کو ہے ہی نہیں تمہارے پاس۔ تم کچھ بھی نہیں بول سکتے، تمہارا بند ہونٹ اب نہیں کھلیں گے--- اچھا، تو اگر تم نہیں بولو گے تو میں---'' اس کی آواز شدت جذبات سے تھرتھرا رہی تھی۔ ''اب تم بس دیکھتے جانا کہ میں کیا کرتی ہوں، کیا کر سکتی ہوں میں--- تم مجھے چھونا نہیں، مجھے ہاتھ مت لگانا، میرے قریب مت آنا۔ میری جس جوانی کو تم نے بار بار اور بے شمار بار داغ دار کیا ہے، اسے اب میں اس دنیا میں ہی نہیں رہنے دوں گی۔ ختم کرلوں گی میں اپنی زندگی کو---''

اچانک میرے ذہن میں بجلی کا کوندا لپکا۔ یہ ساجدہ کیا کہہ رہی تھی، کیا کرنے جا رہی تھی وہ--- میری چھٹی حس نے اگلے ہی لمحے مجھے اندر جانے پر مجبور کر دیا۔ میرے عین سامنے ساجدہ کھڑی تھی اور اس کے ہاتھوں میں ایک شیشی تھی جس کا ڈھکن کھلا ہوا تھا۔ ساجدہ اور نوجوان مجھے اس طرح اچانک کمرے میں کھڑا دیکھا کر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہکا بکا رہ گئے مگر میرے پاس ان کی حالت کو دیکھنے اور جانچنے کے لئے لمحات نہیں تھے۔ ساجدہ اس دوران منہ کھول کر سلیپنگ پلز کی پوری شیشی حلق میں اُتارنے ہی والی تھی کہ میں نے لپک کر شیشی کو اپنے ہاتھ میں اُچک لیا۔ وہ اس اچانک حملے کے لئے بالکل تیار نہ تھی، اس کا جسم لڑکھڑا گیا اور وہ قریب بچھے ہوئے بیڈ پر جا گری۔ پھر اس نے اونچی اونچی آواز میں چیخنا چلانا شروع کر دیا۔

''شرجیل صاحب! آپ کیوں پرائے معاملے میں ٹانگ اڑاتے ہیں--- مجھے اس زندگی کی ضرورت نہیں ہے، مجھے مرجانے دیجئے---''

وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اٹھی اور میرے ہاتھ سے وہ شیشی چھیننے کی بھرپور کوشش کرنے لگی۔ میں نے فوراً اسے زوردار دھکا دیا اور وہ دوبارہ بیڈ پر گرا دیا۔ وہ پھر زور زور سے چیخنے چلانے لگی۔

''شرجیل صاحب! مجھے مرجانے دیں، کیوں بچا رہے ہیں آپ مجھے--- میں اب جینا نہیں چاہتی۔ نہیں چاہئے مجھے یہ زندگی اب--- ہائے، میری امی کو میرے غم میں ہارٹ اٹیک ہوگیا۔ میں بھی اب زندہ نہیں رہنا چاہتی، مرنا چاہتی ہوں۔ مجھے چھوڑ دیجئے آپ میرے حال پر، آپ کو مجھ پر ترس کھانے کی ضرورت نہیں ہے---''

وہ مسلسل چیخ وپکار کر رہی تھی تاہم میری حیرت کی انتہا نہ رہی یہ دیکھ کر کہ وہ نوجوان ابھی تک اپنی جگہ پر ساکت وجامد کھڑا ہوا تھا۔ بادی النظر میں یوں لگتا تھا کہ جیسے اس پر ساجدہ کی خودکشی کی کوشش کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ ساجدہ کو بچانے کی کوشش میں، سچ پوچھیں تو میں خود بھی اپنے ہوش وحواس خطا کر بیٹھا تھا اور لاشعوری طور پر مجھ پر بس ایک ہی دھن سوار تھی کہ کسی طرح ساجدہ کی زندگی بچ جائے۔ اب اچانک میری نظر جو سامنے اٹھی تو کیا دیکھتا ہوں کہ سامنے دروازے پر سارا کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ شدید جذباتی کیفیت میں ڈوبا ہوا تھا۔ ادھر ساجدہ بیڈ پر گری مسلسل آہ وزاری اور چیخ وپکار کر رہی تھی۔ سارا فوراً آگے بڑھی اور بیڈ پر بیٹھ کر ساجدہ کا سر اپنی گود میں لے لیا، اسے پیار کرنے لگی اور بچوں کی طرح پچکاریاں بھرنے لگی۔

''ساجدہ--- ساجدہ! کیا ہوگیا ہے یہ تمہیں، کیوں اتنی دل برداشتہ ہو رہی ہو تم--- ہمت کرتے ہیں، حالات کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اس طرح زندگی کے مسائل سے ہار مان جانا عقل مندوں کی شیوہ نہیں ہے۔ زندگی تو ہے ہی مسلسل جدوجہد کا نام۔ اس میں کبھی خوشیاں ہیں تو کبھی غم، کبھی دکھ ہیں تو کبھی سکھ۔ ہاں، یہ ممکن ہے کہ کبھی یہ دکھ اور تکالیف دوسروں کے دیئے ہوئے ہوتے ہیں تو کبھی انسان ناسمجھی میں خود اپنے ہاتھوں سے اپنے اوپر ظلم کر بیٹھتا ہے اور جب اسے احساس ہوتا ہے تو وہ خود، اپنے آپ کو ہی مورد الزام ٹھہراتا ہے--- اور پھر جوانی تو ہے ہی بے لگام، منہ زور گھوڑے کی مانند۔ جوانی میں اکثر انسان بھٹک جایا کرتے ہیں، لغزشیں اور خطائیں ہو ہی جاتی ہیں انسان سے اور لڑکیاں تو ویسے بھی موم کی گڑیاں ہوتی ہیں۔ مرد حضرات اسے اپنی مرضی سے، اپنی خواہش کے مطابق میں جیسے چاہے سانچے میں ڈھال سکتا ہے--- مانا کہ تم سے بھی کوئی نہ کوئی غلطی ہوئی ہوگی مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس غلطی، اس لغزش کے پاداش میں اپنی اس انمول زندگی کو ہی ختم کر دیا جائے اور پھر، ساجدہ! تم دنیا کی اکیلی پہلی اور آخری لڑکی نہیں ہو جس سے جوانی میں یہ جرم سرزد ہوا ہے۔ یہاں تو ہر روز ہزاروں لڑکیاں مرد کی ہوس کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں، پھر تم اکیلی ہی کیوں اپنے آپ کو سزا دے رہی ہو؟ مانتی ہوں میں کہ تمہارے ساتھ

دھوکہ ہوا ہے، بہت بڑا دھوکہ مگر اس کا یہ مطلب تو ہرگز نہیں کہ تم دھوکہ دینے والے شخص کو سزا دینے کی بجائے اپنے آپ کو، اپنی زندگی کو ہی ختم کر ڈالو--- ساجدہ! کیوں رو رو کر ہلکان ہوتی جا رہی ہو، آخر ہوا کیا ہے؟ کوئی قیامت تو نہیں ٹوٹ پڑی، صرف ایک مرد نے ہی تو دھوکہ دیا ہے تمہیں۔ وہ شادی کا وعدہ کر کے تمہاری عزت سے کھیلتا رہا اور تم نہیں جانتی کہ مرد اپنا وعدہ ایفا کرنے کے لئے کیا کیا کرتا ہے سوتم جھانسے میں آگئیں اور اب اس جرم کی سزا اپنے آپ کو، صرف اپنے آپ کو دینا چاہتی ہو تو یہ تو صحیح نہیں ہے--- اچھا، اب یہ رونا دھونا بند کرو۔ اپنے آنسو پونچھ ڈالو، اپنے دل کو قابو میں کرو۔ شاباش، ساجدہ! تم بہت اچھی لڑکی ہو۔''

سارا کی تسلی بھری والی باتیں آخرکار رنگ لے آئیں اور ساجدہ کا رونا دھونا دھیرے دھیرے بند ہوگیا۔ پھر آہستہ آہستہ وہ نارمل ہوگئی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ میں اپنی جگہ پر کھڑا سارا کی ساری باتیں غور سے سن رہا تھا۔ کتنی اچھی تھی وہ، عین موقع پر اس نے کتنا اچھا رول ادا کیا تھا اور ساجدہ کو کس قدر خوش اسلوبی سے ہینڈل کر رہی تھی--- ساجدہ کے آنسو اب خشک ہو چکے تھے گو چہرہ ابھی تک مسلسل رونے کی وجہ سے سوجا ہوا تھا تاہم اس وقت کمرے کے ماحول پر حالات کی تلخی اور شدید قسم کی گھٹن چھائی ہوئی تھی۔ وہ نوجوان جو ابھی تک پتھر کے بت کی طرح اپنی جگہ کھڑا ہوا تھا، اچانک اس کے جسم میں جنبش پیدا ہوئی۔ پھر وہ تیزی سے آگے بڑھا اور ساجدہ کے قدموں سے لپٹ گیا۔

''ساجدہ! پلیز، مجھے معاف کر دو--- مجھے معاف کر دو، میں نے تمہارے ساتھ بہت زیادتیاں کی ہیں۔ میں قصوروار ہوں تمہارا لیکن اب مجھے احساس ہوگیا ہے کہ تم کتنی عظیم لڑکی ہو، کتنی محبت کرتی ہو مجھ سے--- پلیز، ساجدہ! مجھے معاف کر دو۔ آج سے میں وعدہ کرتا ہوں کہ کبھی تمہیں دھوکہ نہیں دوں گا، کبھی تم سے بے وفائی نہیں کروں گا، ہمیشہ تمہارا ہی بن کر رہوں گا۔ میں خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ آج سے بلکہ ابھی سے میری زندگی میں آنے والی تم آخری لڑکی ہو۔ میں صرف اور صرف تمہیں ہی اپنا جیون ساتھی بناؤں گا، تم سے ہی شادی کروں گا۔ میں کل ہی اپنے ابو کو ساتھ لے کر تمہارے ابو سے تمہارا رشتہ مانگنے جاؤں گا--- میں سو فیصد سچ کہہ رہا ہوں، ساجدہ! پلیز، تم مجھے معاف کر دو۔ آج میری آنکھیں کھل گئی ہیں، میں تمہاری محبت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہوں۔''

وہ نوجوان خاموش ہوگیا اور ٹکٹکی باندھ کر ساجدہ کے سُتے ہوئے چہرے کو دیکھنے لگا۔ ساجدہ خاموش بیٹھی تھی مگر اس کے چہرے کا رنگ ہر لمحہ بدل رہا تھا، صاف ظاہر تھا کہ وہ گومگو کی کیفیت میں الجھی ہوئی ہے۔ جن کیفیات سے وہ ابھی ابھی گزری تھی، وہ نوجوان کی ان باتوں پر یقین کرنے میں تامل سے کام لے رہی تھی۔ نوجوان نے ابھی تک اس کے پاؤں پکڑ رکھے تھے--- سارا اس موقع سے فائدہ اٹھا کر پھر بولنے لگی۔

''ساجدہ! میرا خیال ہے کہ یہ نوجوان جو کچھ کہہ رہا ہے، سچ کہہ رہا ہے کیونکہ سچائی اپنی حقیقت کی خود عکاس ہوتی ہے۔ انسان کی زبان جھوٹ بول سکتی ہے مگر چہرہ اور آنکھیں انسان کی اندرونی کیفیت کی صحیح معنوں میں غماز ہوا کرتی ہیں--- میں مشورہ دیتی ہوں کہ تم اسے معاف کر دو اور آج سے نئی زندگی بسر کرنے کی تیاری شروع کر دو۔''

سارا کی باتیں سن کر ساجدہ کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ پھر اس نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس نوجوان نے ساجدہ کی میری طرف اٹھتی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوئی سوالیہ نگاہوں میں پوشیدہ پیغام شائد پڑھ لیا تھا لہٰذا فوراً بولا۔

''یار، شرجیل! اب تو تمہیں بولنا ہی چاہئے میرے حق میں--- اگر تم حامی بھر لو تو میں کل ابو کے ساتھ تمہیں بھی ساجدہ کے گھر رشتہ مانگنے کے لئے لے کر جانے کو تیار ہوں۔''

میرے پاس اب انکار کی گنجائش نہ تھی چنانچہ میں نے ساجدہ کو مخاطب کیا۔

''میرا خیال ہے، ساجدہ! اب ہم سب کو اس کی باتوں پر یقین کر لینا چاہئے۔''

اگلے ہی لمحے ساجدہ کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ دوڑ گئی لیکن پھر فوراً ہی اس کی گردن شرم سے جھک گئی۔ کمرے کی فضا گویا خوشبو سے مہک اٹھی۔

ہم چاروں کافی دیر تک گپیں لگاتے رہے۔ وہی کمرہ جس کی فضا گھٹن زدہ ہو چکی تھی، اب وہ ہم چاروں کے قہقہوں سے گونج رہا تھا۔ ساجدہ کا ہنستا مسکراتا چہرہ دیکھ کر یہ لگتا ہی نہیں تھا کہ کچھ دیر قبل وہ اپنی زندگی کو ختم کرنے جا رہی تھی۔ اس کے منہ سے الفاظ کی صورت میں گویا پھلجھڑیاں چھوٹ رہی تھیں، نوجوان بھی اب بہت زیادہ خوش دکھائی دیتا تھا۔ ان دونوں کو ہنستا مسکراتا دیکھ کر میں دل ہی دل میں بہت زیادہ خوش ہو رہا تھا۔ پھر سارا اور میں اٹھ کھڑے ہوئے اور ان دونوں سے اجازت لے کر ہم باہر آ گئے۔ گاڑی میں بیٹھ کر وہ خوشی سے سرشار لہجے میں بولی۔

''ہیپی اینڈنگ---''

یہ کہہ کر اس نے اپنی گاڑی سڑک کے سینے پر تیز رفتاری سے دوڑانا شروع کر دی۔

☆☆

میری اور سارا کی نکاح کی تقریب پُروقار مگر نہایت سادگی سے انجام پذیر ہوئی۔ صرف چند ضروری لوگوں کو بلایا گیا۔ میری طرف سے کچھ دوست تھے اور سارا نے اپنی فرینڈز کو انوائٹ کیا تھا۔ ساجدہ اور نوجوان نے بھی خصوصی طور پر میاں بیوی کی حیثیت سے شرکت کی تھی۔

☆☆

سارا مسہری پر دلہن بنی چندے آفتاب، چندے ماہتاب لگ رہی تھی۔ خوبصورت تو وہ پہلے بھی بہت تھی مگر اس وقت دلہن کے روپ میں اس کے حسن و دل کشی میں بے تحاشہ نکھار آیا تھا--- میں مسہری کے قریب جا کر اس پر بیٹھا تو وہ اپنی جگہ پر اور زیادہ سمٹ گئی۔ میں نے اس سے مذاق بھرے لہجے میں کہا۔

''گھونگھٹ نہیں اٹھاؤ گی، سارا---؟''

''نہیں، شرجیل! یہ حق اب آپ کا ہے۔'' وہ بولی۔

میں نے فوراً گھونگھٹ الٹ دیا اور بولا۔

''آج چودھویں کا چاند زمین پر کیسے اتر آیا---''

وہ کچھ نہ بولی، خاموش رہی۔ میں نے پھر کہا۔ ''آج تو چھونے کی اجازت ہے نا، مجھے---؟''

اس نے فوراً جواب دیا۔ ''میرا یہ پورا جسم اور میری روح بھی اب آپ کی ملکیت ہیں--- آپ کو تصرف کا پورا حق حاصل ہے، بحیثیت ایک شوہر---!''

یہ کہہ کر اس نے آنکھیں موند لیں۔ میں نے آگے بڑھ کر کمرے کی لائٹیں بند کر دیں۔

☆☆

منزہ اب بھی شام کو مجھ سے پہلے کی طرح ہوم ورک کرنے میں مدد لیتی ہے مگر اب وہ مجھے ''سر'' کی بجائے ''ابو'' کہہ کر مخاطب کرتی ہے---!

☆☆

سلگتی روح

☆ ایم۔ سلیم

یہ دل اپنی دسترس میں رہے تو انسان کتنا پرسکون رہے ہر انسان کی زندگی میں کوئی نہ کوئی لمحہ ایسا ضرور آتا ہے جب اپنا آپ کسی دوسرے کو سونپ دینے کو چاہتا ہے اور پھر جیسے کچھ بھی دسترس میں نہیں رہتا۔ پھر غم بھی ایسے ملتے ہیں کہ روح تک سلگ اٹھے--- ایک سلگتی روح کا سچا اعتراف!

میں ایک طوائف ہوں فاحشہ---

اوہو! آپ نے تو نفرت سے ناک سکیڑ لی۔ اچھا، اچھا۔ انسانیت کی برہنہ لاش سے آنے والی بو کے بھبکے آپ کے دماغ پر چڑھ گئے۔ اوہ آپ کو تو اُبکائیاں آنے لگیں مگر لگے ہاتھوں اس لاش کے ہلتے لبوں پر بکھری ہوئی داستان تو سنتے جائیے۔ اجی، ذرا سنئے تو سہی۔

جب میں چودہ سال کی تھی تو بہت خوبصورت تھی لمبی گردن، سرخ و سپید گول چہرہ اور گلابی رنگت، پنکھڑی کے سے لب اور فراخ آنکھیں مگر ایک غریب گھرانے سے متعلق ایک غریب کلرک کی بیٹی!

اب تو آپ سننے پر آمادہ ہو گئے نا! ہاں، تو سنئے۔

میں ایک کلرک کی بیٹی ہوں۔ ہمارا خاندان، میں، میری والدہ، والد اور مجھ سے دس سال بڑے بھائی پر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مشتمل تھا۔ چھوٹا سا خاندان مگر ابا جی کی تنخواہ بھی تو مختصر ہی تھی۔ تمام گھر کا خرچ اور کرایہ کا مکان مگر والد صاحب ایک فرض شناس باپ تھے۔ اِس کسمپرسی کے حال میں بھی اُنہوں نے میرا اور بھائی جان کا پڑھائی کا سلسلہ شروع رکھا تھا۔ والد صاحب میرے ساتھ بھیا سے بھی زیادہ پیار کرتے مگر والدہ، وہ ذرا شاہانہ ٹھاٹ سے زندگی گزارنا چاہتی تھیں۔ والد صاحب پردہ کے سختی سے پابند تھے مگر والدہ آزاد خیال واقع ہوئی تھیں اِس لئے گھر میں عموماً جھک جھک رہتی مگر والد صاحب اِن تمام حالات کے باوجود میرا خاص خیال رکھتے۔ صبح کو خود اسکول پہنچاتے اور شام کو خود ہی واپس لاتے۔

بھیا نویں کلاس میں تھے کہ اُنہوں نے اسکول کو خیرباد کہہ دیا۔ بُری سوسائٹی کی وجہ سے ہی بھیا اسکول سے ہٹے تھے۔ اب اُن کا تمام دِن اِنہی غنڈے دوستوں میں گزرتا تھا۔ والد صاحب نے حتی المقدور بھیا کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کی مگر بھیا کے ساتھ والدہ جو تھیں، والد صاحب کو بھیا سے کچھ بھی تو نہ کہنے دیتی تھیں۔ والدہ کے اِسی بے جا لاڈ پیار نے بھیا کا ذہن بُری طرح بگاڑ دیا تھا۔

والد صاحب تمام دِن دفتر میں رہتے۔ شام کو اُن کے گھر آتے ہی مختلف لوگوں کی طرف سے بھیا کے متعلق شکایات پہنچنے لگتیں جن میں سے کسی سے بھیا لڑے ہوتے تو کسی کی کوئی چیز چرائی ہوتی مگر والد صاحب، والدہ اور بھیا کے سامنے بے بس تھے۔ اِنہی حالات میں دِن گزر رہے تھے۔

مَیں نے اِس سال ساتویں جماعت کا امتحان دیا تھا۔ مارچ کا مہینہ تھا۔ والد صاحب کو زبردست زکام تھا۔ وہ صبح دفتر گئے مگر دوپہر کو بہت سخت بخار میں واپس آئے۔ بھیا گھر سے غائب تھے۔ مَیں خود جا کر ڈاکٹر کو بلا کر لائی۔ اُنہوں نے انفلوئنزا تجویز کیا اور ایک انجکشن دے کر چلے گئے مگر شام ہوتے ہی والد صاحب کی طبیعت بگڑ گئی۔ مَیں دوبارہ ڈاکٹر کو لائی۔ والد صاحب تقریباً بیہوش تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے پھر انجکشن دیا۔ آدھی رات کو والد صاحب نے ٹوٹے پھوٹے جملوں میں تین چار دفعہ بھیا کو پکارا اور اِسی ظالم رات کے ایک بجے ابا جی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہم سے روٹھ گئے۔ والدہ رو رہی تھیں، مَیں چیخ رہی تھی مگر جانے والا جا چکا تھا۔ بھیا اپنے کسی دوست کے ساتھ کسی دوسرے شہر گئے ہوئے تھے۔ اُنہیں آدمی بھیج کر بلوایا گیا اور صبح کو والد صاحب کو دفنا دیا گیا۔

والد صاحب کی موت کے ساتھ ہی میرے نصیبوں پر سیاہی چھا گئی۔ میرا رزلٹ نکلا، مَیں نے ساتویں کلاس پاس کر لی تھی۔ مجھے اسکول سے ہٹا لیا گیا۔ پڑھایا بھی کیسے جاتا گھر کی جمع شدہ پونجی تو ایک ہی ماہ میں ختم ہو گئی۔ بھیا کون سے کماؤ تھے، وہ تو پہلے ہی والد صاحب کی تنخواہ پر مچھر سے اُڑایا کرتے تھے۔ اُن کی وفات پر جو کچھ بھی جمع تھا، وہ بھی بھیا نے چند دِنوں میں ختم کر ڈالا۔ اب والدہ کے کانوں کی بالیاں اور آہستہ آہستہ غیر ضروری فرنیچر اور برتن بھی بیچ ڈالے۔ کسی نہ کسی طریقہ سے پیٹ کا ایندھن تو مہیا کرنا تھا مگر یہ چیزیں کب تک چلتیں؟ والد صاحب کی وفات سے لے کر اب تک کا مالک مکان کا کرایہ بھی تو نہیں دیا تھا۔ اب اِس نے بھی تقاضہ شروع کر دیا تھا۔ والدہ جو کہ روزانہ ابا جان کی زندگی میں اِن سے لڑا کرتی تھیں، اب اُن کی خوبیاں یاد کر کر کے آنسو بہایا کرتیں۔ بھیا اب بھی گھر پر ہی دھرنا مارے بیٹھے تھے۔ آہستہ آہستہ نوبت فاقوں تک آ پہنچی۔

ہمارے ہی محلے میں کونے والا مکان میر صاحب کا تھا جہاں وہ اور اُن کی بیگم رہتے تھے۔ بدقسمتی سے میر صاحب کی کوئی اولاد نہ تھی۔ عمر یہی کوئی ستر برس ہو گی مگر اس بڑھاپے میں بھی اچھے خاصے تنومند تھے۔ جب مَیں والد صاحب کی زندگی میں اسکول جایا کرتی تھی تو یہ گلی کے بچوں کو اپنے پاس بلا کر پیار کیا کرتے۔ میر صاحب کے کئی ایک ذاتی مکان تھے جو کہ اُنہوں نے کرائے پر دے رکھے تھے اور خود بھی ایک عالیشان بلڈنگ میں مقیم تھے۔ اِن کی بیگم والد صاحب کے مرنے کے بعد کبھی کبھی ہمارے گھر آتیں اور کچھ نہ کچھ والدہ کو بطور انعام دے جاتیں مگر دوسروں کی امداد سے کہاں تک گھر کا خرچ چلتا؟

ایک روز میر صاحب کی بیگم تشریف لائیں۔ ہم رات سے بھوکے بیٹھے تھے۔ انہوں نے جب ہماری یہ حالت دیکھی تو فرمانے لگیں۔

"دیکھو، بہن! اِس طرح سے زندگی نہیں گزرے گی۔ ہماری نوکرانی ملازمت چھوڑ کر چلی گئی ہے، اگر آپ چاہیں تو آپ کی بیٹی نسرین اِسی تنخواہ پر ہمارے ہاں ملازمت کر سکتی ہے اور دونوں وقت کا کھانا بھی ہمارے ہاں کھا لیا کرے گی اور ہاں، میں میر صاحب سے آپ کے بیٹے فیاض کی ملازمت کے لئے بھی کہوں گی۔"

والدہ نے اِن سے ہاں کہہ دی اور خود مَیں نے بھی طوعاً و کرہاً اِس ملازمت کو قبول کر لیا۔ کیا کرتے مجبوری تھی، اِن فاقوں سے تو بہتر تھا، نا!

مَیں اِس روز میر صاحب کے گھر کام کے لئے گئی تھی۔ والدہ میرے ساتھ تھیں۔

"آؤ بیٹی۔" میر صاحب کی بیگم ہمیں دیکھتے ہی گویا ہوئیں اور ہمیں ساتھ لے کر مختلف کام سمجھانے لگیں۔ "یہ دیکھو، نسرین! یہ رہا باورچی خانہ جس میں ضرورت کی ہر چیز رکھی ہے، تمہیں دو وقت کا کھانا اور صبح کا ناشتہ پکانا ہوگا اور ہاں صحن کی روزانہ صفائی بھی تمہارے ذمہ ہوگی۔ ہاں بیٹی، میر صاحب بہت صفائی پسند ہیں، اِن کے کمرے کی صفائی بھی روزانہ کرنا ہوگی۔ اِن کی کتابوں اور دوسری چیزوں کو سلیقہ سے رکھنا ہوگا۔" بوڑھی مالکہ مجھے ہدایات دے رہی تھیں۔

"بیگم---!" کسی نے بھاری بھرکم آواز میں پکارا۔

"تم یہاں ٹھہرو، مَیں میر صاحب کے پاس سے ہو آؤں۔" بیگم جلدی جلدی میر صاحب کے کمرے کی طرف چلی گئیں۔ تھوڑی دیر بعد بیگم صاحبہ نے ہمیں بھی وہاں کمرے میں بلا لیا۔ میر صاحب کمرے کے ایک کونے میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ ہمارے جانے پر اخبار ہٹا کر گویا ہوئے۔

"اچھا تو، بیگم! یہ ہے نئی نوکرانی۔" وہ والدہ کی طرف دیکھ رہے تھے اور مَیں والدہ کی اوٹ میں کھڑی تھی۔

"اجی یہ نہیں، یہ تو بابو جی کی بیوی ہیں، بیچارے بڑے نیک آدمی تھے۔ یہاں کام اِن کی بیٹی کرے گی۔ نسرین! اِدھر آؤ، بیٹی!" بیگم صاحبہ کی آواز میں شفقت تھی۔

مَیں والدہ کی اوٹ سے نکل کر اِن کے سامنے چلی گئی۔

"اچھا اچھا، یہ ہے آپ کی لڑکی؟" میر صاحب مجھے دیکھتے ہی والدہ سے مخاطب ہوئے۔

"جی ہاں، یہ میری بچی ہے۔" والدہ آہستہ سے بولیں۔

"ماشاء اللہ، آپ کی بیٹی تو بہت خوبصورت ہے---" میر صاحب جلدی جلدی بولے۔ "اور ہاں آپ کا لڑکا کیا کرتا ہے آج کل، بابو جی کی زندگی میں تو بالکل نکما تھا؟"

"میر صاحب! لڑکے کو کوئی ڈھنگ کی ملازمت ہی نہیں مل رہی۔" والدہ بولیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''کتنی تعلیم ہے؟'' میر صاحب نے پوچھا۔

''نو جماعت پاس ہے۔''

''نو جماعت پاس کو کون سی ملازمت مل سکے گی؟ اسے تو کہیں نہ کہیں مزدوری ہی کرنا پڑے گی۔'' میر صاحب بولے۔

''میر صاحب! اپنے باپ کی زندگی میں تو میرے لال نے کام کو ہاتھ تک نہ لگایا' اب مزدوری تو اُس کے بس کا روگ نہیں۔ اگر کوئی لکھائی پڑھائی کی ملازمت مل جائے تو---'' والدہ یہ کہہ کر میر صاحب کے منہ کی طرف دیکھنے لگیں۔

میرا خون کھول اُٹھا۔ بیٹے کے لئے مزدوری اچھی نہیں کیونکہ وہ نو جماعت پاس ہے اور اس نے باپ کی زندگی میں کام کو ہاتھ تک نہیں لگایا مگر لڑکی کا دوسروں کے گھروں میں نوکرانی ہونا کوئی عیب نہیں۔ میں لڑکی جو ہوئی۔

''اچھا تو میں تمہارے لڑکے کے لئے ملازمت کی کوشش کروں گا۔'' میر صاحب بولے۔

والدہ تو تھوڑی دیر کے بعد گھر واپس چلی گئیں اور میں میر صاحب کے لئے کھانا پکانے میں جت گئی۔ میری آنکھوں کے سامنے اپنا بچپن گھوم گیا۔ ابا جی کتنے شفیق باپ تھے۔ مجھے لباس اور دوسری چیزوں کے لئے بھیا سے بھی ترجیح دیتے تھے مگر آج--- اُف--- میں نوکرانی ہوں اور بھیا کے لئے اعلیٰ ملازمت کی تلاش ہے' میں سسک اُٹھی۔

ہر روز صبح میر صاحب کے کمرے کی صفائی میرا معمول تھا۔ میں روزانہ علی الصبح میر صاحب کے ہاں پہنچ جاتی اور شام تک کام میں مصروف رہتی۔ بھیا ابھی پندرہ دن نہ گزرنے دیتے کہ میری دوسرے ماہ کی تنخواہ بھی لے جاتے۔ میں جب بھی میر صاحب کے کمرے کی صفائی کرنے جاتی تو وہ کمرے میں موجود ہوتے اور تمام وقت مجھے یوں گھور گھور کر دیکھتے کہ میں اُنہیں دیکھتے ہی نظریں نیچی کر لیتی۔

''دیکھو' ذری اُٹھا کر یہاں سے صفائی کرو' کل تم نے صفائی اچھی طرح سے نہیں کی۔ کتابیں میز سے اُٹھا کر الماری میں رکھو' میرے بستر کو یوں تہہ نہ کیا کرو---'' وغیرہ وغیرہ۔ میر صاحب متواتر ہدایات دیتے رہتے اور میں نظریں نیچے کئے خاموشی سے کام میں مصروف رہتی۔ میر صاحب کی حتی الوسع کوشش یہی ہوتی کہ میں زیادہ دیر ان کے کمرے میں ہی رہوں۔

میرے اس گھر میں آنے کے چار ماہ بعد بیگم صاحبہ کو نمونیہ ہوا اور وہ بھی چل بسیں مگر میں اس گھر میں بدستور ملازمہ تھی۔

میر صاحب بیگم کی وفات پر بہت سوگوار دکھائی دیتے تھے۔ تمام دن حقہ لئے اپنے کمرے میں پڑے رہتے۔ میں تمام دن گھر کا کام کاج کرتی' ان کا کھانا پکاتی اور شام کو ان کو کھانا کھلا کر برتن واپس رکھ کر بقیہ کھانا اپنے گھر لے آتی۔ بھیا پہلے سے میری راہ دیکھ رہے ہوتے' میرے پہنچتے ہی کھانا پکڑتے اور آخری نوالے کے ساتھ ہی اپنے دوستوں میں چلے جاتے۔ اب تو ان کے لئے کھانے اور مکان کے کرایہ کا بندوبست بھی ہو چکا تھا' اب اُنہیں ملازمت ڈھونڈنے کی کیا ضرورت تھی۔

زندگی جوں توں کر کے گزر رہی تھی۔ میری طبیعت سخت بجھ چکی تھی۔ تمام دن میر صاحب کے گھر کا کام کاج کرتی اور شام کو واپس آتے ہی چارپائی پر گر پڑتی۔ علی الصبح پھر میر صاحب کا ناشتہ تیار کرنا ہوتا۔

پھر ایک شام' میر صاحب کے کچھ مہمان آئے ہوئے تھے۔ میں شام تک کھانا تیار کرتی رہی۔ مہمان کھانا

کھانے کے بعد چلے گئے۔ میر صاحب نے کھانا مہمانوں کے ساتھ نہیں کھایا تھا۔ میں ان کے لئے کھانا لے کر ان کے کمرے میں گئی۔ وہ چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ میں نے کھانا میز پر رکھا اور میر صاحب کے ہاتھ دھلانے کے لئے پانی لے آئی۔ میر صاحب اُٹھے ہاتھ دھوئے اور کھانے کی میز پر جا بیٹھے۔ وہ کھانا بھی کھائے جا رہے تھے اور مجھے بھی تکے جا رہے تھے۔ میں آنکھیں نیچی کئے کھڑی تھی۔

''نسرین! اِدھر آؤ۔'' میر صاحب بولے۔

''جی--- جی---'' میں ہکلا کر رہ گئی۔

''اِدھر آؤ' پانی دو۔''

میں نے جو بھی پانی کا گلاس بھر کر میر صاحب کو دیا' اُنہوں نے گلاس میز پر رکھ دیا اور دوسرے ہاتھ سے میری کلائی پکڑ لی۔ میں بالکل زرد پڑ گئی۔

''نسرین! میری طرف دیکھو' تم مجھ سے اتنا ڈرتی کیوں ہو---''

میر صاحب کی آواز مجھے کسی کنویں سے آتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ میر صاحب نہ جانے کیا کیا کہے جا رہے تھے میں نے ایک جھٹکے سے کلائی چھڑوائی اور واپس آ کر دروازے کے پاس کھڑی ہو گئی۔

''یہ برتن اُٹھا لے جاؤ۔'' میر صاحب گرجے۔

میں نے جلدی جلدی برتن سمیٹے اور باورچی خانے میں چلی آئی۔ میں نے کھانا وہیں چھوڑا اور تیز تیز قدم اُٹھاتی گھر پہنچ گئی۔ بھیا گھر پر نہیں تھے۔ والدہ مجھے خالی ہاتھ دیکھ کر ہونق ہوئی جا رہی تھیں۔

''ارے' نسرین! کھانا نہیں لائی کیا؟''

میں چپ رہی۔

''ارے' میں پوچھتی ہوں کھانا نہیں لائی کیا۔ کمبخت تمہارا بھائی ابھی آ کر کھانا مانگے گا تو اُسے کیا دوں گی' کیا کھانا نہیں بچا آج؟''

''ماں' میں کل سے میر صاحب کے ہاں نوکری پر نہیں جاؤں گی۔'' میں نے جلدی جلدی کہا۔

''کیوں---؟'' امی حیران تھیں۔ ''کیا کہا تمہیں میر صاحب نے' کیا نوکر سے لڑ آئی ہو؟'' امی میری طرف نارانگی سے دیکھتے ہوئے بولیں۔

''امی! میر صاحب مجھے بُری نظروں سے دیکھتے ہیں۔'' میں بڑبڑائی۔

''ہوئی نہ پگلی' ارے میر صاحب کی عمر تو تمہارے دادا کے برابر ہے' وہ کیونکر تمہیں بُری نظروں سے دیکھیں گے؟ شرم کرو' یوں نہیں کہتی کہ کام نہیں کر سکتی۔ اب وہ باپ کے زمانہ کے لاڈ چھوڑ دو' اب تو کام کرنا ہی پڑے گا' بھائیوں سے کچھ نہیں ہوگا۔''

میں دوسرے کمرے میں جا کر چارپائی پر گر پڑی۔ اُف' میرے خدا! میں کیا کروں؟ والدہ جو دکھ درد کی ساتھی ہوتی ہے اور ایک پاسبان بن کر بیٹیوں کی عزت کی حفاظت کرتی ہے' وہی ماں مجھ پر کام چوری کا الزام لگا کر نہ جانے مجھے کیوں برباد کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

ساری رات میرے تصور میں میر صاحب کی ڈراؤنی آنکھیں پھرتی رہیں یا پھر ماں کی وہ ڈانٹ--- صبح میں دن چڑھے تک چارپائی سے نہ اُٹھی۔ والدہ نے مجھے دو ایک بار آوازیں بھی دیں مگر میں خاموشی سے لیٹی رہی کہ اتنے میں میر صاحب کا ملازم آ گیا۔

''بی بی جی! نسرین آج کام پر نہیں پہنچی' میر صاحب آپ کو بلاتے ہیں۔''

''نسرین' نسرین---!'' والدہ نے آوازیں دینا شروع کر دیں۔ میں چارپائی سے اُٹھ کر صحن میں آ گئی۔

''میر صاحب کا ملازم بلانے آیا ہے۔'' ماں نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہا۔

''اماں! مَیں آج سے میر صاحب کے گھر نہیں جاؤں گی۔ مَیں کہیں اور مزدوری کرلوں گی' مجھ سے وہاں کام نہ ہو سکے گا۔''

''آپ تو چلیں' میر صاحب نے تو آپ کو بلایا ہے۔'' باہر سے نوکر بولا۔

اور والدہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتی ہوئی چلی گئیں۔

والدہ کوئی گھنٹہ بعد میر صاحب کے گھر سے واپس لوٹیں۔ بھیا بھی گھر ہی بیٹھے تھے' امی بھیا کو دیکھ کر پکاریں۔

''بیٹا! مبارک ہو' میر صاحب نے تمہیں بھی آج سے ملازم رکھ لیا ہے۔''

''مَیں میر صاحب کے لئے کیا کر سکوں گا؟'' بھیا نے بے دلی سے کہا۔

''ارے' تم کو تو انہوں نے منشی رکھا ہے۔ تم صرف مکانوں کا کرایہ وصول کیا کرو گے اور کوئی مشکل کام تھوڑی ہی ہے۔ میر صاحب نے تم کو ابھی بلایا ہے اور ہاں' اس پگلی کو بھی ساتھ لیتے جاؤ۔ میر صاحب نے ابھی تک ناشتہ بھی نہیں کیا' یہ پکانے ہی نہیں گئی۔''

بھیا نوکری کا سن کر پھولے نہ سماتے تھے۔ منشی گیری کا کام تو شاید انہوں نے کبھی خواب وخیال میں بھی نہ سوچا ہوگا کہ مل جائے گا۔

''نسرین! کہاں ہو؟ آؤ بھئی' میر صاحب کے ہاں چلیں اب ہم دونوں بھائی بہن کی تنخواہ آیا کرے گی۔''

''بھیا! مَیں نہیں جاؤں گی میر صاحب کے ہاں ملازمت کے لئے۔'' مَیں بولی۔

''ہائیں' کیوں نہیں جاؤ گی۔'' بھیا بولے۔

''یہ پگلی کہتی ہے کہ مجھے میر صاحب کی آنکھوں سے ڈر لگتا ہے---'' امی بڑبڑائیں۔ ''میر صاحب کہہ رہے تھے کہ کتنی بھولی بھالی ہے یہ لڑکی۔ اگر مَیں کبھی اس کیطرف دیکھ لوں تو اُسی وقت آنکھیں جھکا لیتی ہے۔''

بھیا نے مجھے کلائی سے پکڑ کر گھسیٹا اور میر صاحب کے ہاں لے چلے۔ بڑے پھاٹک کے پاس ہی میر صاحب کھڑے تھے۔

''ارے' آؤ بھئی' فیاض! تم نے تو بہت دِنوں بعد شکل دِکھائی ہے۔ اِس ماہ تو تم نسرین کی تنخواہ بھی لینے نہ آئے---'' میر صاحب بھیا کو دیکھتے ہی بولے۔

''نسرین! تم اندر جا کر میرے لئے ناشتہ تیار کرو۔ پگلی' کتنی دیر کر دی تم نے آج--- اور ہاں' فیاض! تم آج سے میرے ہاں منشی کی ملازمت پر ہو۔ آج سے تم میرے مکانوں کا کرایہ وصول کیا کرو گے۔ مَیں تمہیں تمام کام سمجھا دیتا ہوں۔'' میر صاحب دوبارہ بھیا سے گویا ہوئے۔ میر صاحب بھیا کو لے کر اپنے کمرے کی طرف چلے گئے اور مَیں باورچی خانہ میں چلی گئی۔

دِن گزرتے گئے۔ اب میر صاحب کے ساتھ ساتھ بھیا کا کھانا بھی میر صاحب کے گھر ہی پکتا۔ بھیا روزانہ میر صاحب کے قصیدے پڑھا کرتے۔ امی بھی بھیا کی باتیں سن سن کر خوش ہوتیں۔ بھیا کہتے۔

''امی! میر صاحب روپے پیسے کو تو کچھ بھی وقعت نہیں دیتے' تجوری کی چابیاں بھی میرے پاس ہی رہتی ہیں۔ جتنے دِل چاہے خرچ کر لوں' کیا مجال جو میر صاحب کبھی حساب تک بھی مانگیں۔''

میر صاحب والدہ صاحبہ کو بھی عموماً کسی نہ کسی بہانے کپڑے اور نقدی نذر کرتے رہتے۔

آہستہ آہستہ میر صاحب اور بھیا میں سے آقا اور نوکر والا فرق مٹ گیا اِس لئے اب امی اور بھیا کو میر صاحب سے اچھا دُنیا میں کوئی بھی نظر نہ آتا تھا۔

میر صاحب نے ہم سے کرایہ کا مکان چھڑوا کر ہمیں اپنا ذاتی دو منزلہ مکان بغیر کسی کرائے کے رہنے کے لئے دے دیا۔ ہمارے مکان میں طرح طرح کا فرنیچر آ گیا' دروازوں اور کھڑکیوں پر پردے لٹک گئے۔

میر صاحب نے خود بھی ہمارے گھر آنا شروع کر دیا اور کبھی کبھی اپنے دوستوں کو بھی ساتھ لے آتے۔ مجھے اب بھی میر صاحب کے گھر جانا پڑتا' اُنہوں نے کھانا پکانے کے لئے اور نوکرانی رکھ لی تھی اور میرا کام صرف اِس کی نگرانی کرنا تھا۔ اگر مَیں کسی روز میر صاحب کے ہاں نہ جاتی تو جھٹ سے ملازم آ کھڑا ہوتا اور والدہ مجھے بضد ہو کر وہاں پہنچا تیں۔

اب مَیں پندرہ سال کی تھی۔ بچپن ایک گزرا ہوا خواب تھا۔ والدہ روزانہ میرے لئے کوئی نہ کوئی کپڑا خرید کر لاتیں اور یہ کپڑے بھیا کی تنخواہ سے خریدے ہوئے بتائے جاتے۔ مَیں جب میر صاحب کے ہاں جانے کے لئے تیار ہوتی تو امی بضد ہو کر اچھا لباس پہننے کے لئے زور دیتیں۔

''پگلی! لوگ کیا کہیں گے۔ بھائی اتنی تنخواہ لیتا ہے اور بہن کے لئے اچھے کپڑے بھی نہیں بنا سکتا۔''

اور پھر ایک دِن جب کہ مَیں میر صاحب کے گھر جانے کے لئے تیار کھڑی تھی کہ اتنے میں امی آ گئیں۔

''نسرین! تم آج سے میر صاحب کے گھر نہیں جاؤ گی۔ یہ تمہارے بھائی کے شایان نہیں کہ اس کی بہن لوگوں کی ملازمت کرتی پھرے۔''

مَیں والدہ کے منہ سے یہ الفاظ سن کر بھونچکی رہ گئی اور کہاں مجھے خود دھکیل کر میر صاحب کے ہاں بھیجا جاتا تھا کہاں آج خود والدہ مجھے روک رہی تھیں۔

''اب تم گلی میں بھی نہ نکلا کرو' آج سے تم مکمل پردے میں رہو۔'' یہ والدہ کا حکم تھا۔ مَیں چپکی سی ہو کر واپس کمرے میں آ گئی۔

بھیا اِسی شام میرے لئے اعلیٰ کپڑے کے دو سوٹ لائے۔ اب بھیا مجھ سے بہت زیادہ لاڈ پیار کرنے لگے تھے۔ مَیں اپنی قسمت پر نازاں تھی کہ اللہ تعالیٰ نے میرے آوارہ منش بھائی کو بھی راہِ راست پر ڈال دیا اور آج وہ تمام گھر کا بوجھ اُٹھائے ہوئے ہے۔

مجھے پردہ میں بٹھا دیا گیا کیونکہ مَیں والدہ کی نظر میں اب جوان ہوتی جا رہی تھی مگر میر صاحب سے اب بھی پردہ نہ تھا' وہ متواتر ہمارے گھر آیا کرتے۔ ان کے لئے چائے لے کر بیٹھک میں مجھے ہی بھیجا جاتا۔ مَیں اُنہیں اپنا بزرگ سمجھتی تھی اور سابقہ حرکت کے بعد دوبارہ کبھی اُنہوں نے مجھے کچھ نہ کہا تھا۔ مَیں نے اُن کی اُس دست درازی کو بھی اب بچوں سے پیار ہی سمجھ لیا تھا مگر اب بھی جب مَیں چائے لے کر بیٹھک میں جاتی تو میر صاحب کی نگاہ میرے سراپے پر پھسلنا شروع کر دی۔ مَیں چائے رکھ کر واپس آ جاتی۔

آج پھر میر صاحب آئے ہوئے تھے' بھیا بھی اُن کے ساتھ ہی بیٹھک میں بیٹھے ہوئے تھے۔ امی نے چائے بنا دی اور مَیں لے کر بیٹھک میں چلی گئی۔ آج میر صاحب نے میری طرف بالکل نہ دیکھا تھا۔ مَیں چائے رکھ کر ابھی دروازے سے نکلی ہی تھی کہ میر صاحب کی آواز میری کانوں سے ٹکرائی۔

''تو کیا رائے ہے' فیاض میاں! آپ کی پھر---''

''اجی' میر صاحب! میری رائے تو بالکل ٹھیک ہے۔'' بھیا نے میر صاحب کی بات کاٹ دی۔

''ہاں بھئی' لڑکی جوان ہے۔ جوان لڑکی گھر پر بوجھ ہوتی ہے' جب تک کہ اِس کی شادی نہ کر دی جائے۔ اب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آپ کو اِس معاملہ کو نپٹا ہی دینا چاہئے۔'' میر صاحب بولے۔

میر صاحب اور بھیا میری شادی کا ہی سوچ رہے ہوں گے۔ جانے میر صاحب نے کون سا دولہا تلاش کیا ہوگا میرے لئے جو آج ہی معاملہ نپٹا دینا چاہتے ہیں۔ اِن کا اپنا بیٹا تو کوئی بھی نہیں شاید کوئی اِن کی برادری میں سے لڑکا ہوگا۔ میں اسی سوچ میں باہر کھڑی تھی۔ شادی کا سن کر مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ شادی ہو گی' شادیانے بجیں گے۔ ہم عمر دولہا ہوگا' کیسے عجیب ہوں گے وہ رات دِن۔ شادی کے لفظ نے مجھے عجیب سے نشہ میں مدہوش کر دیا۔

مَیں اِسی کیفیت میں دیوار سے لگی کھڑی تھی کہ میر صاحب دوبارہ بولے۔

''دیکھو فیاض! اپنی والدہ سے بھی رائے لے لو۔ مَیں یہ مکان تمہارے نام لکھ دوں گا' ویسے میری اپنی جائیداد لاکھوں کی ہے۔ نسرین یقیناً میرے گھر خوش و خرم رہے گی۔''

اُف' میرے ذہن میں دھماکہ سا ہوا۔ مَیں میر صاحب کے گھر میں خوش رہوں گی' یعنی میر صاحب خود اپنے لئے میرا رشتہ مانگ رہے ہیں۔

بھیا نے نہ جانے کیا کہا کیونکہ میں چکرا گئی تھی۔ قریب تھا کہ گر پڑتی' مَیں دیوار کے ساتھ ہی چلتے ہوئے دوسرے کمرے میں پہنچ کر چارپائی پر گر پڑی۔ میری آنکھوں کے سامنے میر صاحب کا بدصورت اور کریہہ چہرہ گھوم گیا۔ اُف' بھیڑیا--- مگر میرے بھیا کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔ ابا--- ابا--- دو دفعہ میرے منہ سے نکلا اور پھر مَیں بے سدھ ہو گئی۔

مجھے اِس وقت ہوش آیا جب کہ میر صاحب جا چکے تھے اور بھیا امی کے پاس دوسرے کمرے میں پھر اِسی رشتہ کے متعلق کھسر پھسر کر رہے تھے۔ دونوں کمروں کے درمیان میں ایک پردہ لٹک رہا تھا اور مَیں بھیا کی تمام باتیں سن رہی تھی۔ اماں بھی راضی جیسی ہی تھیں۔

''بیٹیاں تو اپنے گھر میں ہی پھلتی پھولتی اچھی لگتی ہیں نا! اور پھر ایسی بیٹیوں پر تو جتنا بھی ناز کیا جائے' کم ہے جو کہ خود جانے کے ساتھ ساتھ بے ضمیر بھائیوں کا گھر بھی بھرتی جائیں ورنہ شریف والدین کی بیٹیاں تو سدا ہی اپنے والدین کے گھر سے کچھ نہ کچھ لے کر جاتی ہیں۔''

میرا دماغ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے عاری ہو چکا تھا۔ مَیں دیدے پھاڑے بھیا اور امی کی باتیں سن رہی تھی۔

''یہ تمہاری زندگی اور موت کا سوال ہے۔ خاموشی سے کچھ نہیں ہوگا' خاموشی سے کچھ نہیں بنے گا۔'' میرے اندر کی سوئی ہوئی عورت جاگ پڑی۔ مجھے بھیا سے کہہ دینا چاہئے۔

''بھیا--- بھئی--- یا---!'' آواز میرے حلق میں اٹک گئی مگر بھیا نے میری آواز کو سن لیا۔ پردہ اُٹھا کر بھیا کھڑے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

''کیوں خیریت تو ہے' نسرین؟'' بھیا نے میرے کانپتے ہونٹ دیکھ کر کہا۔

''ہاں--- بھیا---!'' مَیں پھر رُک گئی۔

''کیا بات ہے' نسرین کہو نا!''

''مَیں میر صاحب سے شادی ہرگز نہ کروں گی' بھیا!'' جیسے مجھے اِس بات کو اُگلنے کی بہت جلدی تھی۔

بھیا کچھ دیر خاموش رہے اور پھر آہستہ سے بولے۔

''نسرین! تم ابھی بچی ہو۔''

''بچی ہوتی تو میر صاحب کو مجھے خریدنے کی کیا ضرورت تھی۔'' بُری آواز میں طنز تھا۔

اب کے بھیا چونکے۔

''زیادہ تیز بننے کی کوشش نہ کرو' نسرین!''

''جب ماں اور بھائی جیسے سرپرست بیٹی کی عزت کا سودا چکانے پر تیار ہوں تو بیٹیوں کو تیز بننا ہی پڑتا ہے۔'' مَیں نے جل کر کہا اور جیسے میرے دِل پر سے پہاڑ کا بوجھ اُتر گیا۔

''بک بک مت کرو---'' بھیا دھاڑے۔

''شادی نہیں کرے گی' دیکھا جائے گا۔''

''اچھا تو دیکھا جائے گا۔'' مَیں بھی چیخی۔

''تمہاری یہ طاقت--- ہے نا' فقیرنی کی اولاد اور میر صاحب نے... یہ تمہارا گھر بھر دیا۔ یہ عیش' یہ آرام اور کس لئے تھا' کُتیا؟ بھول گئی نا' وہ دِن جب کہ ابا کے مرنے کے بعد فاقے گزر رہے تھے۔ اب جب کھانے کو روٹی مل گئی اور تن ڈھانپنے کو کپڑا مل گیا تو اینٹھنے لگی ہے۔''

یہ بھیا نہیں بول رہے تھے' یہ وہ نوٹوں کی گڈی تھی جو کہ ابھی تک بھیا کے کوٹ کی جیب میں نظر آ رہی تھی۔ ہائے' یہ رنگین کاغذ جن کے بدلے ایک ماں اپنے جگر کے ٹکڑے کو فروخت کر رہی تھی تو ایک بھائی اپنی بہن کی عصمت اِن چند کاغذوں کے بدلے بیچنے پر تلا ہوا تھا۔

''مجھے یہ عیش آرام نہیں چاہئے' بھیا! خدا کے لئے ہوش میں آؤ' تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ اگر ابا زندہ ہوتے---''

''ہاں' اگر ابا زندہ ہوتے تو تجھ کمینی کو گھر میں ہی رکھ لیتے' شادی ہرگز نہ کرتے۔'' بھیا چیخے۔

''اُف' میرے خدا! غضب خدا کا' اِسلام میں حقوقِ نسواں کا یہ غلغلہ اور مسلمان عورت اتنی مجبور و بے کس؟'' مجھے غصہ آ گیا اور مَیں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''کمینے تم ہو' بھیا! جو اپنی بہن کی زندہ لاش بیچ کر اپنے لئے آرام و آسائش خرید رہے ہو۔'' یہ میرے منہ سے آخری الفاظ تھے۔

میرا یہ کہنا تھا کہ بھیا کا ہاتھ اُٹھا اور تڑاتڑ میرے گالوں گردن اور سر پر برسنے لگا۔ بھیا مجھے بے تحاشہ مارتے رہے اور ساتھ ہی ساتھ نہ جانے کیا بک رہے تھے۔ میری آنکھوں کے سامنے چنگاریاں ناچنے لگیں اور نہ جانے کب بھیا نے ہاتھ روکا' مَیں بے ہوش ہو چکی تھی۔

شام کو مجھے ہوش آیا۔ امی میرا ماتھا سہلا رہی تھیں' میرے ہوش میں آنے پر بولیں۔

''نسرین' بیٹی! کیا تو پاگل ہے' کیا بیٹیاں بھی والدین کے سامنے کبھی اپنے رشتہ کے متعلق بات کرتی ہیں' پگلی' کیا ہم تمہارے دُشمن ہیں؟ میر صاحب ماشاء اللہ امیر ترین آدمی ہیں۔ یہ تو تمہاری خوش قسمتی سے ورنہ انہیں رشتوں کی کونسی کمی ہے۔ اُٹھو منہ ہاتھ دھلاؤں' کیا حالت بنا رکھی ہے۔''

والدہ نے بہ اصرار میرا ہاتھ منہ دُھلایا۔ مَیں سوچ رہی تھی شاید یہ میری حقیقی والدہ نہیں ہے اور نہ وہ میرا سگا بھائی۔

اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔ دُنیا میں اِن دونوں کے سوا میرا ہے بھی کون اور اگر گھر سے باہر قدم رکھوں تو کہاں جاؤں گی۔ ایک گدھ سے بچتے بچتے نہ جانے پھر مجھے کتنے گدھوں کی خوراک بننا پڑے--- آہ' اکیلی عورت گھر سے باہر بھی تو محفوظ نہیں۔ یہ دُنیا ہے نسرین! یہاں بھائی اور والدہ کا یہ سلوک ہے تو دوسرے تیرے ساتھ کون سا بہتر سلوک کریں گے۔

''اُف میرے خدا! مَیں کہاں جاؤں؟''

بیچارگی کے آنسو میرے رُخساروں سے ڈھلک گئے۔ اب صرف ایک ہی راستہ ہے' یہی کہ مَیں اپنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آپ کو اِس مکروہ کام کے لئے آمادہ کرلوں۔

آخر وہی کچھ ہوا۔ بھیا جیت گئے' امی کی گردن سے بیٹی کا بوجھ اُتر گیا۔ دوسرے روز میر صاحب قاضی صاحب اور دو دوستوں کے ساتھ آئے اور میرا نکاح ہو گیا۔ میر صاحب کو نئی نویلی دُلہن مل گئی۔

دینی اور سماجی قانون کی سیاہ چٹان سے ٹکرا کر میری روح کے مطالبے چکنا چور ہو گئے۔ آج مَیں اِس گھر کی مالکہ تھی جس میں کل نوکرانی بن کر آئی تھی۔

آج میری سہاگ رات تھی۔ میر صاحب جھومتے جھامتے کمرے میں داخل ہوئے۔ ہاتھ میں شراب کی بوتل تھی' کچھ باہر ہی پی آئے تھے۔

''نس---نسرین!''

لڑکھڑاتی آواز میں بڑبڑائے اور بوتل کو منہ لگا کر غٹاغٹ پی گئے۔ مَیں پلنگ پر بیٹھی تھی۔ میر صاحب تھوڑی دیر تک کھڑے رہے اور پھر قالین پر دھم سے گر پڑے۔ مجھے اِن کے مکروہ چہرے سے نفرت تھی۔ مَیں منہ دوسری طرف کئے بیٹھی رہی۔ میر صاحب قالین پر بے سدھ پڑے تھے۔ شراب کی بو نے کمرے کی فضا کو مکدر کر دیا تھا۔ مَیں کمرے سے باہر نکل کر کرسی پر بیٹھ گئی اور تمام رات اپنے نصیبوں پر ماتم کناں رہی۔

جوں توں کر کے دِن گزرتے گئے۔ میر صاحب نے مجھے چراغ خانہ کی بجائے شمع محفل بنانا چاہا۔ وہ چاہتے تھے کہ اِن کے دوست اِن کی نوعمر دُلہن کو دیکھ کر میر صاحب کو داد دیں۔ آہستہ آہستہ مَیں بھی اُن کی محفلوں کا ساتھ دینے لگی۔ دِن گزرنے کے ساتھ ساتھ ایک طرف میرا شباب عروج پذیر تھا اور دوسری طرف میری زندگی کھوکھلی ہو کر رہ گئی تھی۔ مَیں نے اپنے بوڑھے شوہر سے گلوخلاصی کی تدبیریں سوچنا شروع کیں۔ میرے لئے کھلا راستہ تھا کہ مَیں عدالت کے ذریعے طلاق حاصل کرلوں مگر عدالت میں کیس شوہر کے گھر پر رہ کر ہرگز نہ ہو سکتا تھا۔ بھائی کے گھر جاتی تو مجھے دوبارہ میر صاحب کے پاس بھیج دیا جاتا یا پھر دوبارہ نیلام کر دی جاتی۔ مَیں کوئی درمیانی راستہ تلاش کر رہی تھی۔

میر صاحب کا ایک نوعمر دوست کئی روز سے میر صاحب کے پاس ملنے آیا کرتا تھا۔ مَیں اُس کی آنکھوں میں اپنے لئے پیام پڑھ چکی تھی۔ دبی دبی چنگاریاں سلگنے لگیں' خون نے جوش کھایا اور پھر عورت کے جذباتی تقاضے اپنے فطری رجحان پر اُتر آئے۔ مَیں نے بھی میر صاحب کے دوست کے پیامِ محبت کا جواب محبت سے دیا اور پھر آہستہ آہستہ ہم دونوں نے میر صاحب سے گلوخلاصی کے لئے یہاں سے بھاگ نکلنے کا ارادہ کرلیا اور پھر ایک اندھیری رات کو مَیں نے تجوری کھول کر رقم اور زیورات اُٹھائے اور اپنے نوعمر آشنا کے ساتھ کراچی کی راہ لی۔

کراچی میں ہم نے ایک اعلیٰ ہوٹل میں کمرہ کرائے پر لے لیا۔ میری تمام رقم اور زیورات میرے آشنا کے قبضہ میں تھے۔ ہم اِس رقم سے دو ماہ تک گلچھرے اُڑاتے رہے۔ مَیں برابر اپنے آشنا پر زور دیتی رہی کہ تنسیخ نکاح کا کیس چلایا جائے مگر وہ روزانہ کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے ٹالتا رہا۔ دو ماہ بعد زیورات بھی بک گئے۔ اب وہ تمام دِن باہر رہتا اور رات میرے پاس ہوٹل میں بسر کرتا اور آخر ایک دِن ایک آدمی کو وہ اپنے ساتھ لایا۔ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد وہ آدمی واپس چلا گیا۔ بعد میں میرے آشنا نے بتایا کہ یہ میرا ایک گہرا دوست ہے' آج کانفرنس میں اچانک اِس سے ملاقات ہو گئی اِس لئے ساتھ چلا آیا۔

دوسرے روز وہ مجھے اِسی دوست کے گھر لے جانے کا بہانہ کر کے ہوٹل سے لے گیا۔ ہُم واقعی اِسی آدمی گھر میں تھے جو کل ملنے آیا تھا۔ مجھے وہاں چھوڑ کر میرا

آشنا سیر کے بہانے گھر سے نکل گیا اور صبح تک نہ آیا۔ ایک عورت متواتر میری نگرانی کر رہی تھی۔ مجھے کچھ شک سا گزرا مَیں نے اِس عورت سے باتوں باتوں میں معلوم کیا تو پتہ چلا کہ میرا آشنا مجھے اِس دلال کے پاس بیچ گیا تھا جسے وہ اپنا دوست بتاتا رہا۔

مَیں تین روز تک اِس گھر میں محبوس رہی۔ آخر چوتھی رات مَیں اِس گھر سے بھی بھاگ نکلی مگر کہاں جاتی؟ اگر گھر واپس جاتی تو پھر اِسی میر صاحب کے ہاں جانا پڑے گا اور پھر کرایہ ہی کون سا پلے تھا جو کہ واپس جاتی۔ پھر یہ بھی ہو سکتا ہے اب میر صاحب بھی مجھے قبول نہ کریں۔ رات کو فٹ پاتھ پر سو رہی۔ علی الصبح پھر شہر کی سڑکیں تھیں اور مَیں تھی۔

کراچی آنے پر چند دِن میرے آشنا نے مجھے سارے شہر کی سیر کروائی تھی اور کراچی مجھے بڑا خوبصورت لگ رہا تھا مگر آج وہی شہر مجھے نہایت ڈراؤنا دِکھائی دے رہا تھا۔ بھوک کے مارے بُرا حال تھا۔ کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کو جی نہ چاہتا تھا۔ اگر پھیلاتی بھی تو مجھے اِن ریشمی کپڑوں میں دیکھ کر خیرات کون دیتا۔ میرے تن پر یہی تین کپڑے تھے۔ کاش! اِن میں سے کوئی کپڑا ہی بک جائے مگر بیچوں کون سا کپڑا۔ دوپٹہ بیچنے سے قوم کے سر سے پگڑی اُتر جائے گی' قمیص اُتار دوں تو قوم کی غیرت کا جنازہ نکل جائے گا۔ آہ! مَیں کیا فروخت کر کے پیٹ کا ایندھن پورا کروں۔

کئی راہ چلتے نوجوانوں نے مجھے ہوسناک نگاہوں سے بھی دیکھا۔ بعض منچلوں نے دیکھ کر سیٹیاں بھی بجائیں اور پھر بعض میر صاحب کی عمر کے بزرگوں نے بھی تاڑا۔

''اگر زندگی چاہتی ہو تو پیٹ کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور فروخت کرو۔'' یہ نفس کی آواز تھی۔

''مَیں کیا فروخت کروں جس کے معاوضہ سے آنتوں کو سنبھالا دے سکوں؟''

''تمہارے پاس' ایک عورت کے پاس عصمت کے سوا اور کیا ہے؟'' میرے دِل میں آئی۔

''چھی چھی چھی---کتنا بُرا خیال ہے۔'' میرے ضمیر نے جھٹک دیا۔

''تم پہلے بھی کون سی باعصمت ہو۔ ایک بے غیرت بھائی کی بے غیرت بہن' ایک غلیظ ماں کی غلیظ بیٹی! تم اب تک کون سا ایک گود کی زینت رہی ہو۔ میر صاحب' اِن کے دوست' تمہارا اپنا آشنا---''

اُف مجھے چکر آ گیا۔ مَیں نے کانوں میں اُنگلیاں ٹھونس لیں۔ تاکہ یہ آوازیں نہ سن سکوں۔

مَیں نے دوسری رات بھی فٹ پاتھ پر گزاری۔ صبح ہوئی پھر اُٹھ کھڑی ہوئی مگر ٹانگوں میں بالکل سکت نہ تھی' مجبوراً چلنے لگی۔ ابھی کوئی ایک فرلانگ گئی ہوں گی کہ سامنے عیسائیوں کا چرچ دِکھائی دیا۔ بے تحاشہ اندر چلی گئی۔ میری سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں سلب ہو چکی تھیں۔ سامنے لان میں پادری اور نَنز بیٹھی تھیں' بھوک کے مارے بُرا حال تھا۔ مَیں نے کچھ کھانے کے لئے منہ کو ہاتھ لگایا۔ یہ لوگ مجھ سے بڑی شفقت سے پیش آئے۔ مجھے کھانے کے لئے دیا گیا۔ مَیں نے اپنی تمام کہانی اوّل تا آخر اُنہیں کہہ سنائی۔ عیسائی مشنری مجھے اپنی پناہ میں لینے کے لئے تیار تھی۔ اِس طرح مذہب بدلنے سے میرا نکاح بھی فسخ ہو جاتا۔ اُنہوں نے مجھے ایک دِن سوچنے کے لئے دیا۔ مَیں تمام رات چرچ میں رہی اور تمام رات سوچتی رہی۔

''مذہب تبدیل کرلوں۔'' مَیں نے سوچا۔

''پہلے کون سے تمہارے گناہ کم ہیں جو ایک اور کا بھی اضافہ کر رہی ہو؟ اپنے آباؤ اجداد کا سچا مذہب چھوڑ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر راہِ راست سے مٹ بھٹکو۔'' یہ میرے ضمیر کی آواز تھی۔ میرا ضمیر بھی اتنا مردہ نہیں ہوا تھا۔

''نہیں نہیں' ہرگز نہیں۔ مَیں مذہب تبدیل نہیں کروں گی' خواہ فاقوں سے مرہی کیوں نہ جاؤں۔''

دوسرے دِن صبح ہی مَیں چرچ سے بھی نکل بھاگی۔ دِن کے بارہ بجے تک آوارہ پھرتی رہی۔ مَیں یونہی بے مقصد ایک تنگ سی گلی میں مڑی تو ایک بھاری بھرکم ہاتھ میرے کندھے پر پڑا۔ مَیں نے پلٹ کر دیکھا یہ وہی شخص تھا جس نے مجھے میرے آشنا سے خریدا تھا۔

''چپ چاپ میرے ساتھ چلی چلو ورنہ چاقو پیٹ کے پار کردوں گا۔'' اُس نے سرگوشی کی اور مَیں پھر مجبوراً اُس کے ساتھ چل دی۔

مَیں پھر واپس اِسی مکان میں تھی جہاں سے آج سے تین دِن پہلے بھاگی تھی۔ مجھے اپنے آشنا پر سخت غصہ آرہا تھا۔ مَیں نے اُس سے محبت کی تھی مگر وہ مجھے فروخت کر کے چلا گیا۔ مَیں نہ جانے اِس کے متعلق کیا کیا بکنے لگی مگر چند لمحوں بعد مَیں نے سوچا۔ اِس بیچارے کا بھی کیا قصور ہے جب کہ ایک بھائی نے بہن کو فروخت کر دیا' ماں نے بیٹی بیچ ڈالی اور پھر ایک تیسرے شخص نے کسی کی بیٹی یا بہن کی قیمت لے لی تو کیا ہوا۔

میرے خریدار نے مجھے آخری موقعہ دیا اور دھمکی دی کہ اگر اب کے مَیں نے بھاگنے کی کوشش کی تو مجھے زندہ نہ چھوڑے گا۔

والدین نے مجھے فروخت کر دیا' میر صاحب نے مجھے دوستوں کا کھلونا بنا دیا' آشنا نے میرے ساتھ وفا نہ کی' مذہب بدلنا مجھے گوارا نہیں اور پھر موت---نہیں مجھے ابھی زندگی چاہئے۔ مجھے ابھی جینا تھا لیکن کس کے سہارے؟ وہیں' جہاں میرا خریدار چاہتا تھا۔ ایک بے سہارا عورت کے لئے اِس کے سوا کوئی سہارا بھی تو نہیں۔

اِنسانیت' انصاف' خلوص' پاکیزگی کے نام سے مجھے چڑ ہوگئی۔ اب کوئی خدارا' بتائے کہ اگر مَیں نے بیموا بننے کو ترجیح دی تو میرا کیا قصور ہے؟

مَیں کہتی ہوں میرے اندر اب بھی کوئی نمایاں فرق نہیں۔ اگر مَیں شوہر کے گھر ڈھکی چھپی طوائف نہ بھی تو اور کیا تھی۔ وہ مجھے میری مرضی کے خلاف استعمال کر کے روئی کپڑا دیتا تھا۔ پھر مَیں شوہر کو چھوڑ کر آشنا کے ساتھ اِس لئے بھاگ آئی کہ مَیں اِس نوجوان کے ساتھ شادی کر کے خوشی کی زندگی گزاروں گی' یہ بھی ناقابلِ معافی جرم تھا مگر یہاں اب مَیں خودمختار ہوں مگر میرا ضمیر کبھی کبھی جاگ پڑتا ہے لیکن میرے لئے سوا اِس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ اِسے تھپک تھپک کر سلاتی رہوں۔

میری اِس کہانی کو اب ختم ہو جانا چاہئے۔ اِسے پڑھنے والے کو یقیناً مجھ سے نفرت ہوگئی ہوگی۔

میری روح آج بھی سسک رہی ہے۔ کاش' مَیں بھی شرافت کی زندگی گزار سکتی مگر مَیں سماج کے اِن ٹھیکے داروں سے یہ ضرور پوچھوں گی جو کہ صرف یہ سمجھتے ہیں کہ مرد ہمیشہ ہی راہِ راست پر چلتے ہیں---''طوائف معاشرہ کے لئے ناسور ہے۔'' کے بلند و بانگ نعرے لگانے والو! خدارا' یہ تو سوچو کہ اِس نے کن حالات میں اِس پیشہ کو اختیار کیا۔ اگر مَیں اِن پارساؤں اور نعرے بازوں کی قلعی کھول دوں تو آپ کو اِن ہی کی سیاہ کاری سے پیدا کردہ اولاد بھی یہیں چلتی پھرتی نظر آئے گی---یاد رکھئے' بدبودار گندی نالی کے پاس سے ناک پر کپڑا رکھ کر گزر جانے سے اِس نالی کی بدبو میں کمی نہیں آئے گی۔ اگر آپ معاشرہ کے صحن کو پاکیزہ دیکھنا چاہتے ہیں تو بدبو کو مٹانے کے لئے اِس نالی کو ختم کیجئے' ناک پر رومال باندھ کر قریب سے گزر جانے کو اِس کا صحیح علاج نہ سمجھئے۔

☆☆

آسیب

☆ انوار علیگی

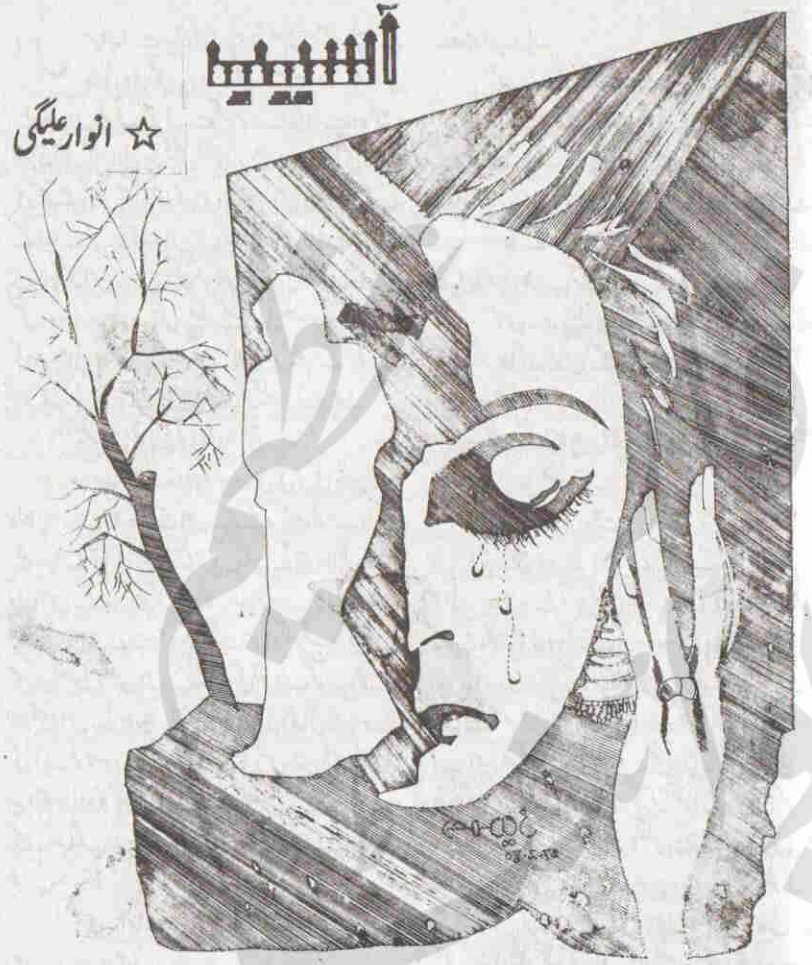

ایک مخلوق کہ جس کی تخلیق آگ سے ہوئی ہے، یہیں ہمارے آس پاس بلکہ ہمارے درمیان ہی بستی ہے۔ وہ لوگ جو اس سچائی کو تسلیم نہیں کرتے، مافوق الفطرت واقعات ان کے ساتھ بھی رونما ہوتے ہیں لیکن وہ ان پر توجہ نہیں دیتے اور درگزر کرتے ہیں لیکن کہیں ان کی موجودگی کا احساس اس تواتر سے ہوتا ہے کہ یقین کئے بغیر چارہ نہیں۔ آسیب ایک ایسے ہی خاندان کا تذکرہ ہے جس کا واسطہ اس مخلوق سے رہا۔ عقل کو حیران کر دینے والے واقعات پر مشتمل دوسری قسط!

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس مرتبہ اسے یہ آواز اپنے قدموں کے نیچے سے سنائی دی تھی۔ وہ اُچھل کر پیچھے ہٹا۔ پھر اس نے چاروں طرف تیزی سے گھوم کر دیکھا، اسے وہ کہیں نظر نہ آیا۔ نیلم اپنی جگہ بیٹھی بیٹھی پریشان ہو رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا شوہر اس کی طرف آنے کے بجائے کونے کھدروں میں کیا دیکھتا پھر رہا ہے؟ اس کا جی چاہا کہ اس سے پوچھے مگر پھر شرم مانع آ گئی۔ وہ دلہن تھی، وہ بات چیت میں پہلے کیسے کرتی؟--- اِدھر اکبر کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر اکبر نیلم کے بیڈ کے نزدیک آیا۔ اس نے ذرا سا جھک کر نیلم سے پوچھا۔

''نیلم! کیا تم نے کوئی آواز سنی ہے؟''

یہ وہ پہلا مکالمہ تھا جو اکبر کو اپنی نئی نویلی دلہن سے بولنا پڑا۔ اس رات کے اس نے کیسے کیسے خواب دیکھے تھے، جانے کیا کیا سوچا تھا؟ یوں کمرے میں داخل ہوگا، یوں اس کے سامنے کھڑا ہوگا۔ سلام کرے گا، پھر بیڈ پر بیٹھے گا۔ دھیرے سے آہستہ آہستہ اس کا گھونگھٹ اُٹھائے گا، کن لفظوں میں اس کے حسن کی تعریف کرے گا۔ وہ لفظ بھی اس نے سوچ لئے تھے۔ پھر منہ دکھائی میں سونے کی ایک خوبصورت انگوٹھی دے گا جس میں ایک ننھا سا ہیرا لگا ہوا ہوگا لیکن سارے پلان دھرے کے دھرے رہ گئے۔ سہاگ رات، خواب رات بن گئی، ایک بھیانک خواب---!

''کیسی آواز---؟'' نیلم نے سر جھکا کے دھیرے سے پوچھا۔

اسی وقت ''میاؤں'' کی آواز آئی۔ اس مرتبہ یہ آواز بیڈ کے نیچے سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

''یہ--- یہ---'' اکبر نے گھبرا کر کہا۔ ''کسی بلے کے بولنے کی آواز---!''

''مجھے تو کوئی نہیں سنائی دی؟'' نیلم نے سادگی سے جواب دیا۔

''ارے، حیرت ہے---'' اکبر نے کہا اور جھک کر بیڈ کے نیچے دیکھا، وہاں کوئی چیز نہ تھی۔ پھر وہ نیلم سے مخاطب ہوا۔ ''اس کمرے میں، میں مسلسل بلے کی آواز سن رہا ہوں لیکن مجھے بلا کہیں نہیں دکھائی دے رہا ہے--- جانے وہ کہاں چھپا بیٹھا ہے، اس بلے نے تو میری زندگی عذاب کر دی ہے۔''

''اس سے پہلے جب آپ کمرے میں آئے تھے تو گھبرا کر بھاگ کیوں گئے تھے، اس وقت کیا ہوا تھا آپ کو---؟''

نیلم نے اپنا چہرہ اُٹھا کر اکبر کو دیکھا، اس کی تیکھی نظروں میں بڑا شکوہ تھا۔

''وہ--- اس وقت---''

یہ کہتے ہوئے اس نے نیلم کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ صابرہ نے اکبر کو منع کر دیا تھا کہ وہ دلہن کو کچھ نہ بتائے، خواہ مخواہ وہ ڈرے گی--- ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس سے کیا کہے کہ نیلم کا چہرہ دیکھ کر ایک مرتبہ پھر اس کے جسم میں کپکپی دوڑ گئی اور وہ گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اب اس گھونگھٹ میں نیلم نہ تھی، ایک لمبی زبان والی خوفناک عورت تھی جو اسے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اکبر کے لئے اب اس کمرے میں ٹھہرنا ممکن نہ تھا، وہ ایک مرتبہ پھر سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ اس مرتبہ وہ عورتوں کی طرف نہ گیا، ماموں فرقان کے پاس پہنچا۔ ماموں فرقان اپنے کمرے کی بجلی بجھا کر لحاف میں گھس چکے تھے اور سونے کی تیاری کر رہے تھے۔

''ماموں فرقان---!'' اکبر نے دروازے پر کھڑے ہو کر آواز لگائی۔

اکبر کی گھبرائی ہوئی آواز سن کر ماموں فرقان نے لحاف ایک طرف پھینکا اور جلدی سے اُٹھ کر کمرے کی

لائٹ جلائی۔

''اب کیا ہوا---؟''

''ماموں! وہ کمرے میں موجود ہے۔ اس مرتبہ وہ اکیلی ہے، اس کے علاوہ کمرے سے میاؤں میاؤں کی آوازیں بھی آ رہی ہیں۔'' اکبر نے جلدی جلدی گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

ماموں فرقان نے منہ سے ایک لفظ نہ کہا۔ وہ خاموشی سے اس کے ساتھ ہو لئے۔

کمرے میں پہنچ کر انہیں کوئی غیر معمولی بات محسوس نہ ہوئی۔ نیلم بیڈ پر بیٹھی تھی، اس کا چہرہ دروازے کی طرف تھا اور صاف نظر آ رہا تھا--- فرقان ماموں نے کمرے میں چاروں طرف چکر لگایا۔ سارے کونے دیکھ ڈالے مگر انہیں وہاں بلے کی موجودگی کا احساس نہ ہوا۔ فرقان ماموں نے سوالیہ نگاہوں سے اکبر کی طرف دیکھا۔ اکبر ان کی سوالیہ نگاہوں کا کیا جواب دیتا، اس نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔ اس وقت کمرے میں نیلم موجود تھی اور کوئی نہ تھا۔ اکبر جب فرقان ماموں کو بلانے آیا تھا تو اس کی آواز خواتین کے کمرے تک پہنچ گئی تھی۔ صابرہ فوراً کمرے سے نکل آئی تھیں، پیچھے پیچھے واجدہ بھی تھیں۔ صابرہ کو دروازے پر دیکھ کر فرقان ماموں نے کہا۔

''صابرہ! ذرا دلہن کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔''

''پھر کچھ ہوا کیا---؟'' صابرہ نے پوچھا۔

''ہاں---''

واجدہ نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لئے اور نیلم سے بولی۔

''آؤ، بیٹی! باہر چلو۔''

دلہن کے باہر جانے کے بعد فرقان ماموں نے اکبر سے کہا۔

''تم بھی جاؤ---''

اس کے جانے کے بعد فرقان ماموں نے کمرہ اندر سے بند کر لیا--- پانچ منٹ کے بعد جب وہ کمرے سے باہر آئے تو ان کے چہرے پر انتہائی سنجیدگی طاری تھی۔ انہوں نے صابرہ کو علیحدہ لے جا کر اس سے کہا۔

''صابرہ! وہ کمرہ ٹھیک نہیں۔''

''کیوں، ماموں! وہاں کیا ہے؟'' صابرہ نے پوچھا۔

''وہ آسیب زدہ ہے---'' فرقان ماموں نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ''تم اس بات کو نہیں سمجھو گی--- اب میرا مشورہ یہ ہے کہ دولہا دلہن کو کوئی اور کمرے دے دو، وہ کمرہ اس گھر میں نہ ہی رہیں تو بہتر ہے۔''

''اچھا، ماموں! ٹھیک ہے۔''

خلاف توقع صابرہ نے کوئی بحث نہیں کی۔ ان کا بیٹا اس وقت جس عذاب میں مبتلا تھا، اسے دیکھ کچھ نہ ماننا آسان نہ تھا--- پھر واجدہ نے تجویز پیش کی کہ نیلم کو اس کے اپنے کمرے میں پہنچا دیتے ہیں۔ جلدی جلدی اس کے کمرے کو ٹھیک کیا گیا اور نیلم کو اس کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔

اس وقت نیلم کے پاس راشدہ موجود تھی۔ وہ اسے بٹھا کر اس کا گھونگھٹ وغیرہ درست کر رہی تھی۔ نیلم نے راشدہ سے پوچھا۔

''راشدہ! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟''

''مجھے تو کچھ معلوم نہیں---'' راشدہ نے صاف جھوٹ بولا۔ ''امی سے پوچھ کر بتا دوں گی۔''

''آؤ، راشدہ! باہر آ جاؤ۔'' صابرہ نے کمرے کے دروازے پر کھڑے ہو کر اسے آواز دی۔

''اچھا، امی! آئی---'' راشدہ نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ''اچھا، بھابی! صبح تک کے لئے خدا حافظ---!''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''خدا حافظ---!'' نیلم نے مسکرا کر کہا۔

راشدہ کے جانے کے بعد نیلم کی نظریں کھلے دروازے پر بچھ گئیں۔ پھر اسے بھاری قدموں کی آواز سنائی دی، اکبر اس طرف آ رہا تھا۔ اس نے فوراً اپنا سر جھکا لیا اور گٹھڑی بن کر بیٹھ گئی۔

اکبر کھلے دروازے میں داخل ہوا، دو قدم آگے بڑھ کر رک گیا۔ اس مرتبہ اس نے فوراً پلٹ کر دروازہ نہیں بند کیا، وہ دودھ کا جلا تھا اس لئے چھاچ بھی پھونک پھونک کر پی رہا تھا--- کچھ لمحے کھڑے ہو کر وہ نیلم کو دیکھتا رہا۔ نیلم سر جھکائے گٹھڑی بنی بیٹھی تھی۔ ابھی تک اس میں کوئی تبدیلی نہ آئی تھی۔

''نیلم---!'' اکبر نے دور ہی سے کھڑے ہو کر اسے آواز دی۔

اس کی آواز سن کر نیلم نے سر اُٹھایا اور آہستہ سے بولی۔ ''جی---''

اس کے سر اُٹھانے پر اس کے چہرے کا خاصا حصہ اسے نظر آیا تھا۔ وہ نیلم ہی تھی۔ یہاں تک خیریت تھی۔ پھر اکبر نے نظریں گھما کر کمرے کا جائزہ لیا، شاید کہیں وہ اُسے بیٹھا نظر آ جائے لیکن اس وقت وہ بلا کمرے میں نہ تھا۔ اکبر نے احتیاطاً کمرے کے وہ کونے بھی دیکھ ڈالے جہاں اس کے ہونے کا امکان ہو سکتا تھا۔ وہ کہیں نہ تھا، کمرے میں اس کی آواز بھی سنائی نہ دی تھی۔ اب اکبر کو کچھ اطمینان ہوا، ہوائیاں اُڑتے چہرے پر تھوڑی سی خوشی لہرائی۔ اب وہ پلٹ کر دروازے کی طرف بڑھا اور دروازہ بند کیا۔ دروازے کو لاک کرنے سے پہلے اس نے ایک نظر نیلم کو دیکھا، وہ اپنی جگہ پر ہی تھی۔ اس نے دروازہ لاک کر دیا اور مسکراتا ہوا واپس نیلم کی طرف بڑھا۔ آگے بڑھتے ہوئے اس نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی، تین بج رہے تھے۔ رات کا آخری پہر تھا، ٹھٹھرتی سرد رات اب آخری دموں پر تھی--- اکبر کو اس سنہری رات کے ضائع ہونے کا بڑا دکھ تھا۔ ایسی راتیں زندگی میں بار بار کہاں آتی ہیں۔ شادی کی پہلی رات کس قدر سحر انگیز ہوتی ہے، یہ رات بڑے انتظار کے بعد آتی ہے۔ قدم قدم پر دل دھڑکتا ہے، ہر آہٹ پر دل اُچھلتا ہے، آنکھیں بند ہو جاتی ہیں، تب کان آنکھیں بن جاتے ہیں جو دیکھتے بھی ہیں اور سنتے بھی ہیں۔ گویا سارے حواس سماعت میں سمٹ آتے ہیں، ہر آواز پر دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے--- آج وہی رات تھی جو دل کی کلیاں کھلاتی ہے، محبت کی پھوار پڑتی ہے تو ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں رقصاں ہوتی ہیں۔

اکبر اور نیلم کے ساتھ قسمت نے عجیب کھیل کھیلا تھا۔ وہ ایک ہونے کے باوجود ایک نہ ہو سکے تھے۔ ایک بندھن میں بندھنے کے باوجود ان میں صدیوں کے فاصلے تھے۔ خوشی جیسے ان سے روٹھ گئی تھی، خوف و ہراس کا چاروں طرف راج تھا--- گھر اور کمرہ تبدیل ہونے کی وجہ سے اکبر کو امید تھی کہ آئندہ اسے خوشی کے لمحات میسر آ جائیں گے، نیلم کو پانے کا خواب شرمندہ تعبیر ہو جائے گا۔ ابھی کچھ نہ بگڑا تھا، ابھی وقت تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ رات اپنے پر سمیٹ رہی تھی، اُڑنے کے لئے پر تول رہی تھی لیکن اسے اُڑتے اُڑتے بھی وقت لگتا۔ ابھی تین بجے تھے۔ ابھی سپیدہ سحر نمودار ہونے میں کچھ وقت تھا، اتنا وقت ضرور تھا کہ وہ اپنا حال دل نیلم کو سنا سکے--- اکبر نے نیلم کا چہرہ آہستہ آہستہ اوپر اُٹھایا، پھر اس کا گھونگھٹ پلٹ دیا۔ اچانک کمرے میں روشنی ہو گئی، نیلم کا چہرہ چاند کی طرح جگمگا اُٹھا۔ اکبر اس ملکوتی حسن میں کھو سا گیا۔ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''ماشاء اللہ---!''

نیلم نے شرما کر اپنے چاند چہرے کو بازو کے حصار

میں چھپا لیا، نیلم کے جسم میں ہلکی ہلکی لرزش تھی۔

''نیلم! تم اس قدر حسین کیوں ہو---؟'' اکبر نے بڑے والہانہ انداز میں کہا۔ ''یہ حسن تم نے کہاں سے پایا؟ تم اس دنیا کی لگتی ہی نہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوہ قاف سے آئی ہو--- میرے لئے اُتری ہو، میری نیلم پری---!'' یہ کہہ کر اکبر نے اس کا ریشمی ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

''میں اتنی خوبصورت کہاں---؟'' نیلم نے اپنے یاقوتی لب کھولے، اس کی آواز میں بڑا سحر تھا۔ ''آپ کو شاید کسی نے بہکا دیا ہے۔''

''مجھے کسی نے نہیں بہکایا، مجھے تمہارے حُسن نے بہکا دیا ہے--- میں نے تمہارے کتنے خواب دیکھے، تمہیں پانے کی کیسی کیسی آرزوئیں کی ہیں، تم کیا جانو--- میں تمہیں پانے کی خوشی میں ہزاروں میل کا سفر کر کے آیا ہوں۔ اس پتھر وقت کو جو کسی طرح آگے کھسکتا ہی نہ تھا، کس طرح گزارہ ہے تم کیا جانو---''

اکبر کے لہجے کی سچائی نیلم کے دل پر اثر کر رہی تھی۔ نیلم نے اپنی بھاری پلکوں کی جھالر کو دھیرے سے اُٹھایا اور اپنی ہیرے کی طرح جگمگاتی آنکھوں سے اکبر کو دیکھا۔

''بہت پسند کرتے ہیں مجھے آپ---؟''

''پسند نہیں، عشق کہو عشق--- میں مرتا ہوں تم پر، تمہارے لئے جان دے سکتا ہوں۔'' اس کی وارفتگی برقرار تھی۔

''ابھی تو ابتدا ہے---'' نیلم نے مسکرا کر کہا۔ ''ابھی تو مرنے جینے کی باتیں نہ کریں۔''

پھر اکبر کو خیال آیا کہ اس نے ابھی تک نیلم کو منہ دکھائی تو دی نہیں۔ اس نے اپنے کوٹ کی جیب سے وہ جگمگاتی انگوٹھی نکالی اور بولا۔

''نیلم! تمہارے حُسن کا خراج، پیار کا پہلا تحفہ--- اسے قبول کرو۔ لاؤ اپنا سیدھا ہاتھ، اسے میں تمہاری انگلی میں پہنا دوں۔''

نیلم نے جگمگاتی انگوٹھی پر نظر ڈالتے ہوئے اپنا سیدھا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ ابھی اکبر نے وہ جگمگاتی انگوٹھی اس کی انگلی میں پہنائی ہی تھی کہ وہ اکبر کے ہاتھ پر گری۔ وہ ایک موٹی سی، کالی سی خوفناک چھپکلی تھی۔ اکبر نے فوراً اپنا ہاتھ جھٹک دیا، نیلم چیخ مار کر کھڑی ہو گئی اور پھر بیڈ سے زمین پر کود گئی۔ اُس کی انگلی سے انگوٹھی نکل کر دور جا گری۔ اکبر بھی فوراً اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ چھپکلی بیڈ پر پڑی ہے۔ نیلم خوف سے لرزتی ہوئی اکبر کے پیچھے آ گئی، اس نے اکبر کے دونوں بازو تھام لئے تھے۔

''اکبر! اسے مارو۔'' وہ گھبرا کر چیخی۔

''کس چیز سے ماروں---؟'' اکبر نے پریشان ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا۔

''میرا سینڈل لے لو۔'' نیلم نے کہا۔

''اسے بیڈ کر مارا تو چادر خراب ہو جائے گی۔'' اکبر نے سینڈل اُٹھاتے ہوئے کہا۔

''ہو جانے دو، اسے فوراً مارو--- دیکھو، یہ کہیں بھاگ نہ جائے۔'' نیلم نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

ابھی اکبر نے چھپکلی مارنے کو سینڈل اوپر اُٹھایا ہی تھا کہ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''اکبر! یہ کیا---؟''

نیلم نے اس کے بازوؤں میں جھولتے ہوئے کہا، وہ چھپکلی کو خوفزدہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اکبر نے دیکھا کہ وہ چھپکلی بغیر مارے ہی زخمی ہو گئی تھی۔ اس کے اردگرد سیاہی مائل سیال پھیل رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ چھپکلی گھل گئی اور چادر پر ایک بڑا سا دھبہ رہ گیا--- نیلم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے یہ سب نہ دیکھا گیا، خوفزدہ ہو کر اپنے ہوش گنوا بیٹھی اور بے ہوش ہو کر قالین پر گر گئی۔ اکبر کے لئے یہ لمحے بڑا عذاب ناک تھے۔ ایک طرف اس نے چھپکلی کو برف کی طرح پگھلتے دیکھا تھا اور اس منظر کی خوفناکی ابھی اس کے جسم سے نہ نکلی تھی کہ نیلم بے ہوش ہو گئی۔ وہ چکرا کر رہ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بار بار اندھیرا چھا رہا تھا--- اکبر قالین پر بیٹھ گیا، اس نے نیلم کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر اسے ہلایا جلایا۔

"نیلم--- نیلم! آنکھیں کھولو۔"

اس نے کئی مرتبہ کہا مگر نیلم نے آنکھیں نہ کھولیں اس پر گہری بے ہوشی طاری تھی۔ اکبر کی عجیب حالت تھی۔ کبھی وہ سفید چادر پر پڑے سیاہی مائل دھبے کو دیکھتا، کبھی نیلم کے چاند چہرے کو نظر ڈالتا۔ اس کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ جو خواب اس کے آنکھوں میں جاگے تھے، وہ اب سسک رہے تھے، ایک ایک کر کے مرتے جا رہے تھے۔ اب سے کچھ دیر پہلے اس کمرے کا ماحول کس قدر رومانی تھا، اکبر اور نیلم کس قدر خوش تھے۔ وہ ان خواب بھرے لمحوں کے ابدی ہونے کی تمنا کر رہے تھے کہ خوشیوں کے کسی دشمن نے ایک لمحے میں ان سے سب کچھ چھین لیا۔ اب اس کمرے میں گنگناتی فضا کے بجائے خوف رہ گیا تھا۔ لرزتے ہاتھ رہ گئے تھے اور شکستہ اعصاب رہ گئے تھے۔ ایک عذاب تھا جو اکبر کے دماغ پر ہتھوڑے برسا رہا تھا، کوئی کٹڑی کا جالا تھا جس نے اکبر کے حواسوں کو جکڑا جا رہا تھا--- وہ کون تھا، ایسا کیوں کر رہا تھا؟ یہ کسی کو معلوم نہ تھا۔ اب اکبر کے لئے کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اپنی حسرتوں پر آنسو بہا کر سو جائے۔ اس کا مقدر سو گیا تھا تو وہ کس طرح جاگتا--- وہ اُٹھا، شکستہ قدموں سے چل کر اس نے دروازہ کھولا۔ یہ دروازہ تو اس نے کھولنا ہی تھا، آخر وہ کب تک اس کمرے میں بند رہتا لیکن یہ دروازہ وہ اس وقت کھولتا جب اس کے دل کا دروازہ کھل جاتا۔ کلیاں چٹکتیں، گلوں کی خوشبو فضا میں مہکتی، سورج کی کرنیں ان مدہوش سوتے لوگوں کے چہرے گدگداتیں تب وہ مسکرا کر اُٹھتا اور دروازہ کھول کر باہر نکل جاتا لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ وہ من کی من میں لئے، اپنی حسرتوں پر آنسو بہاتا باہر نکلا--- باہر نکل کر اس نے ایک بند دروازہ کھٹکھٹایا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کمرے میں کون سو رہا ہے لیکن اسے یہ ضرور معلوم تھا کہ کوئی سو ضرور رہا ہے۔ فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔ دروازے پر واجدہ نمودار ہوئیں، ان کے پیچھے صابرہ تھیں۔ اکبر کو دروازے پر دیکھا تو دونوں کا دل دھک سے رہ گیا۔ انہوں نے قیاس کر لیا کہ پھر کچھ ہو گیا ہے۔

"کیا ہوا---؟" دونوں کے منہ سے بیک وقت نکلا۔

"وہ--- نیلم بے ہوش ہو گئی ہے۔" اکبر نے بڑی آزردگی سے کہا۔

"لیکن کیسے --- کیا ہوا اسے؟" واجدہ نے پوچھا۔

"چھت سے ایک چھپکلی میرے ہاتھ پر گری تھی، جانے وہ کیسی چھپکلی تھی کہ میرے ہاتھ سے اُچھل کر بیڈ پر گری اور ابھی میں نے اسے مارنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ پانی بن کر بہہ گئی اور چادر پر ایک سیاہی مائل دھبہ رہ گیا۔ نیلم اس منظر کو دیکھ کر بے ہوش ہو گئی۔" اکبر نے جلدی جلدی ساری روداد سنا دی۔

"ہائے، میرے اللہ---!" واجدہ نے اپنا دل تھام لیا۔ "ارے، فیاض کو اُٹھاؤ۔"

"یہ کیا ہو رہا ہے---؟" صابرہ نے فکرمند ہو کر کہا۔ "جاؤ، ذرا اپنے باپ کو بلاؤ۔"

پھر تھوڑی دیر میں یہاں سے وہاں تک سب اُٹھ گئے۔ نیلم کے والد بھی اُٹھ گئے، فرقان ماموں کو بھی بلا لیا گیا، کچھ خواتین بھی اُٹھ گئیں۔ بابر علی گہری نیند سو رہے تھے، انہیں نہ اُٹھایا گیا--- نیلم کے منہ پر ہلکے ہلکے پانی کے چھینٹے مارے گئے، اسے ہلایا جلایا گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے آنکھیں کھول دیں۔ آنکھیں کھلیں تو اس نے خود کو اپنی ماں کی گود میں پایا۔ پھر اِدھر اُدھر نظریں گھمائیں تو کمرے میں بہت سے لوگوں کو پایا۔ وہ فوراً اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

"لیٹی رہو، بیٹی---!" واجدہ نے پھر اسے اپنی گود میں لٹانا چاہا۔

"نہیں، امی! میں ٹھیک ہوں۔"

نیلم ہوش میں آ گئی تو پھر وہ چھپکلی موضوع بحث بن گئی۔ چھپکلی کا معمہ حل نہ ہو سکا۔ وہ کس قسم کی چھپکلی تھی، کہاں سے آئی تھی؟ کس طرح اس کے ہاتھ پر گری، پھر چند لمحوں میں کیونکر سیال مادے میں تبدیل ہو گئی؟ سب سوچتے رہے، اپنی اپنی کہتے رہے لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ اس گفتگو کے دوران وہ باتیں بھی نیلم کے سامنے آ گئیں جو اب تک اس سے چھپی ہوئی تھیں، جو اس لئے اسے اب تک نہیں بتائی گئی تھیں کہ وہ ڈر جائے گی، دہشت زدہ ہو جائے گی--- ٹرین سے اب تک کے واقعات جب نیلم کے سامنے آئے تو وہ واقعی خوفزدہ ہو گئی۔ وہ اپنی ماں کے قریب ہوتے ہوئے بولی۔

"امی! مجھے اکیلا نہ چھوڑیں، میرے ساتھ رہیں۔"

اذان کب کی ہو چکی تھی، ہر سُو روشنی پھیلنے والی تھی۔ اب اسے چھوڑنے کا کیا جواز تھا بھلا؟--- واجدہ کے کچھ کہنے سے پہلے صابرہ نے کہا۔

"نہیں، بیٹی! تم پریشان نہ ہو، میں رہوں گی تمہارے پاس۔"

اخلاقیات

☆ عمل دل کو اس طرح زندہ کرتا ہے جس طرح بارش زمین کو۔

☆ ہر نئی چیز اچھی لگتی ہے مگر دوستی جتنی پرانی ہو گی اتنی اچھی ہو گی۔

☆ جو بات معلوم نہ ہو اُس کے اظہار میں شرم نہیں کرنی چاہئے۔

☆ اُس نے اللہ تعالیٰ کا حق نہیں جانا جس نے لوگوں کا حق نہیں پہچانا۔

☆ زندگی ایک خوبصورت کتاب ہے مگر بہت کم لوگ اسے پڑھتے ہیں۔

☆ محبت کی زنجیر ٹکڑے ٹکڑے بھی ہو جائے تو اس کی قید سے رہائی پانا ممکن نہیں۔

☆ محبت ایسے رشتے کا نام ہے جو ذات، نسل، رنگ اور مذہب سے بالاتر ہے۔

☆ جیو تو ایسے کہ لوگ ملنے کی آرزو کریں اور مرو تو ایسے کہ لوگیاں اور بازار بھی روئیں۔

☆ کسی کو یاد کرنا اپنے اختیار میں ہوتا ہے، بھلانا اپنے اختیار میں نہیں۔

☆ پائیدار دوستی کے لئے، سچائی، بے غرضی اور ایمانداری ضروری ہے۔

☆ محبت کا ایک لمحہ سالوں کے دُکھ بھلا دیتا ہے۔

مہر پرویز احمد دولوٗ میاں چنوں

"یہ اکبر کہاں ہیں؟" واجدہ کو اپنے داماد کی فکر ہوئی۔

"وہ ماموں فرقان کے بستر میں گھسے ہوئے ہیں۔" راشدہ نے بتایا۔

"ارے، اِدھر فیاض کے کمرے میں لیٹ جاتے---" واجدہ نے کہا۔ "جاؤ، بلا لاؤ۔"

راشدہ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ تنہا اس مکان سے اُس مکان میں چلی جاتی، وہ بولی۔

"خالہ! میں اکیلی جاؤں--- ویسے وہ اب تک سو چکے ہوں گے، وہ نیند کے بہت پکے ہیں۔"

تب واجدہ نے فیاض حسین کو اُدھر بھیجا، وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دوسرے مکان میں پہنچے تو اکبر واقعی ماموں فرقان کے بستر میں گھسا سو رہا تھا۔ ماموں فرقان نماز پڑھنے کے بعد تسبیح پڑھ رہے تھے--- فیاض نے بے خبر سوتے ہوئے داماد کو اُٹھانا مناسب خیال نہ کیا اور وہ خاموشی سے واپس آ گئے۔ نیلم کو بھی بہت نیند آ رہی تھی۔ وہ جہاں بیٹھی تھی، وہیں لیٹ گئی اور چند منٹوں میں ہی نیند کی آغوش میں چلی گئی۔ صابرہ اور واجدہ کو بھی پریشان ہوتے ہوئے پوری رات ہو گئی تھی۔ ان کی آنکھوں میں بھی نیند بھری ہوئی تھی۔ وہ دونوں بھی اسی کمرے میں نیلم کے ساتھ ہی لیٹ گئیں۔ نیلم قالین پر لیٹی تھی۔ اس نے سردی سے بچنے کے لئے کمبل اوڑھ لیا تھا جبکہ صابرہ بیڈ پر لیٹ گئی تھیں اور واجدہ نیلم کے برابر ہی سو گئی تھیں۔

دروازہ بند نہ تھا، تب وہ کھلے دروازے سے دبے پاؤں اندر آیا اور نیلم کے کمبل میں گھس گیا۔ نیلم بہت گہری نیند سو چکی تھی، اسے معلوم نہ تھا کہ وہ خوفناک کالا بلا اس کے خوبصورت مہندی لگے پیروں سے لپٹ کر سونے کی کوشش میں ہے۔

فرقان ماموں نماز اور وظیفے سے فارغ ہو کر سیر کرنے کے عادی تھے۔ انہوں نے اپنے کانوں سے مفلر اچھی طرح لپیٹا، کوٹ پہنا پھر بھی سردی محسوس ہوئی تو ایک ہلکا سا کمبل اوڑھ لیا اور مکان سے باہر نکل گئے۔ باہر کہر چھائی ہوئی تھی، سٹریٹ لائٹ ابھی تک جل رہی تھی۔ وہ اپنے منہ سے بھاپ اُڑاتے تیز تیز سڑک پر چلنے لگے۔ سڑک تقریباً سنسان تھی۔ اکا دُکا گاڑی کبھی گزر جاتی--- ابھی وہ زیادہ دور نہ گئے ہوں گے کہ انہوں نے محسوس کیا کہ جیسے ان کے پیچھے کوئی آ رہا ہے۔ بھاری قدموں کی آواز آ رہی تھی اور یہ بھاری قدم فرقان ماموں سے نزدیک تر ہوتے جا رہے تھے۔ فرقان ماموں نے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ گہری دُھند میں انہیں بس ایک ہیولا سا نظر آیا تھا، شاید وہ کسی گہرے رنگ کے کمبل میں لپٹا ہوا تھا۔ اب وہ ان کے بالکل نزدیک آ گیا تھا۔ دو چار قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ پھر یہ فاصلہ بھی مٹ گیا اور وہ ان کے برابر آ گیا۔ فرقان ماموں نے اس کے چہرے پر نظر ڈالی لیکن وہ نظر نہ آ سکا کیونکہ اس نے کمبل اس طرح اوڑھا ہوا تھا کہ چہرے پر چھوٹا سا گھونگھٹ بن گیا تھا--- اب وہ ان کے برابر چل رہا تھا۔ فرقان ماموں نے اپنی رفتار ذرا دھیمی کر لی تا کہ وہ آگے نکل جائے لیکن وہ آگے نہ نکلا بلکہ اس نے بھی اپنی رفتار کم کر لی۔ وہ دس پندرہ قدم خاموشی سے ان کے ساتھ چلا۔ دو تین بار اس نے مڑ کر فرقان ماموں کو دیکھا جیسے وہ ان کی صورت پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو، پھر اچانک بولا۔

''آپ فیاض حسین کے گھر سے نکلے ہیں؟''

''میں فیاض کے گھر سے نہیں بلکہ ان کے برابر والے مکان سے نکلا ہوں۔'' فرقان ماموں نے جواب دیا۔

''ایک ہی بات ہے---'' اس شخص نے لاپروائی سے کہا۔ ''بارات کے ساتھ آئے ہیں؟''

''جی ہاں---'' فرقان ماموں بولے۔

''آپ لڑکے کے کون ہیں---؟'' سوال پوچھا گیا۔

''میں لڑکے کا رشتے میں دادا لگتا ہوں لیکن وہ مجھے کہتا ماموں ہے اور وہ کیا، مجھے تو سب ہی ماموں کہتے ہیں۔ آپ بھی چاہیں تو ماموں کہہ لیں--- ویسے میں اکبر کے باپ بابر کا سگا ماموں ہوں---'' ماموں فرقان نے ہنستے ہوئے اپنا تعارف کرایا۔ ''میں نے تو اپنا تعارف کروا دیا، اب آپ فرمائیں کہ آپ کون ہیں؟''

''میں فیاض کا پڑوسی ہوں، میرا نام دلدار بٹ ہے۔ جس مکان میں بارات ٹھہری ہے، میں اس مکان

کے سامنے رہتا ہوں۔ آپ کو گھر سے نکلتے دیکھ کر میں بھی آپ کے پیچھے ہو لیا۔ آپ کو شاید میری طرح صبح سیر کرنے کی عادت ہے؟''

''جی ہاں--- نماز پڑھ کر میں ایک دو میل پیدل چلنے کا عادی ہوں۔'' فرقان ماموں نے سادگی سے کہا۔

''آپ کراچی سے آئے ہیں؟'' دلدار نے پھر سوال کیا۔

''جی ہاں---'' فرقان ماموں نے جواب دیا۔

اس نے اپنا کمبل اب تھوڑا سا سر کے پیچھے کر لیا تھا۔ وہ گول چہرے کا ایک صحت مند شخص تھا، چہرے پر بھاری مونچھیں تھیں۔ ان مونچھوں نے اس کے چہرے کو بارعب بنا دیا تھا۔ وہ ماموں فرقان سے ایسے ہی اِدھر اُدھر کے سوالات کئے جا رہا تھا۔ ماموں فرقان سمجھ رہے تھے کہ وہ ان سے ضرور کوئی خاص بات کرنا چاہتا ہے لیکن شاید اسے اپنی بات کہنے کے لئے مناسب الفاظ نہیں مل رہے ہیں یا پھر وہ اس تذبذب میں مبتلا ہے کہ وہ اپنی بات کہے یا نہ کہے--- کچھ دیر وہ اسی طرح کے بے ضرر سے سوالات کرتا رہا۔ پھر بات کرتے کرتے اچانک خاموش ہو گیا۔ چند لمحے خاموش رہا، پھر اچانک بولا۔

''مجھے آپ سے کچھ بات کرنا تھی۔''

''فرمائیں---'' ماموں فرقان نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ اس لڑکی کے بارے میں کچھ جانتے ہیں؟'' دلدار بٹ نے براہِ راست سوال کیا۔

''کس لڑکی کے بارے میں پوچھ رہے ہیں؟'' فرقان ماموں فوراً محتاط ہو گئے۔

''میں نیلم کی بات کر رہا ہوں، جناب---!'' دلدار نے سیدھے اور صاف لہجے میں کہا۔

''دیکھئے، دلدار صاحب! اگر آپ اس لڑکی کے بارے میں مجھے بتانا چاہتے ہیں تو براہِ کرم اب کچھ نہ بتائیے۔ اس لڑکی کی شادی ہو چکی ہے۔ وہ اب جیسی بھی ہے، ہماری بہو ہے، ہماری عزت ہے۔'' فرقان ماموں نے اس کا منہ بند کرنے کی کوشش کی۔

فرقان ماموں نے دنیا دیکھ رکھی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ ایسے موقعوں پر پاس پڑوس کے لوگ کیا گل کھلایا کرتے ہیں۔ گھر کا بھیدی ہمیشہ لنکا ڈھانے کی کوشش کرتا ہے اور بعض اوقات پڑوسی بھی اس قسم کا کردار ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

''جناب! آپ مطمئن رہیں، میں آپ کی بہو پر کسی قسم کی کیچڑ اُچھالنا نہیں چاہتا۔ آپ مجھے غلط سمجھے ہیں۔ میں تو صرف آپ کی معلومات میں اضافہ کرنا چاہتا تھا---'' دلدار نے بات صاف کرنے کی کوشش کی۔

''اچھا، کہئے کیا کہنا چاہتے ہیں؟'' بالآخر ماموں فرقان سننے کے لئے تیار ہو گئے۔

''آپ کو یہ تو معلوم ہو گا کہ نیلم فیاض حسین کی اکلوتی اولاد ہے---'' دلدار نے کہنا شروع کیا۔

''جی ہاں، معلوم ہے---''

فرقان ماموں نے فوراً جواب دیا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ چاہتا کیا ہے۔

''---لیکن آپ کو یہ معلوم نہیں ہو گا کہ---''

دلدار بٹ نے فرقان ماموں کی معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے جو بات کہی، وہ واقعی ان کی معلومات میں اضافہ ثابت ہوئی۔ فرقان ماموں وہ بات سن کر حیران رہ گئے۔ وہ بار بار یہی کہتے رہے کہ نہیں یہ نہیں ہو سکتا، ایسا کیسے ہو سکتا ہے--- خیر، وہ شخص جس کا نام دلدار بٹ تھا، ان کی معلومات میں اضافہ کر کے آگے بڑھ گیا۔ فرقان ماموں کافی آگے نکل آئے تھے۔ اب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کچھ دُھند چھٹ گئی تھی اور زرد زردسی مریل دھوپ نکل آئی تھی۔ فرقان ماموں نے واپسی کے لئے قدم اُٹھا لئے۔

جب وہ واپس گھر میں داخل ہوئے تو کچھ لوگ جاگ گئے تھے اور کچھ لوگ ابھی پڑے سوتے تھے۔ اکبر بھی بے خبر سو رہا تھا۔ فرقان ماموں ایک خالی بستر دیکھ کر اس میں گھس گئے۔ باہر اچھی خاصی ٹھنڈ تھی۔ ان کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے، جسم میں ہلکی سی کپکپی تھی۔ انہوں نے اچھی طرح اپنے گرد لحاف لپیٹ لیا اور اس شخص کی باتوں پر غور کرنے لگے۔ اگر یہ سب سچ تھا تو بڑی حیرت کی بات تھی، سب سے زیادہ حیرت انہیں اس بات پر تھی کہ یہ بات واجدہ نے صابرہ سے کیوں چھپائی تھی۔ ایک طرح سے یہ بات اہم بھی تھی اور غیر اہم بھی--- بات صرف سچ چھپانے کی تھی اور جہاں اتنا قریبی رشتہ ہو، وہاں کچھ چھپانا ایک طرح سے جرم کے مترادف تھا۔

فرقان ماموں نے سوچا کہ ابھی وہ کسی سے کچھ نہیں کہیں گے۔ یہ بات وہ کراچی پہنچ کر کریں گے۔ اگر انہوں نے فوراً اس راز کو کھول دیا تو ہو سکتا ہے کہ بدمزگی ہو جائے اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ شادی کا ہنسی خوشی کا گھر کسی اذیت سے دوچار ہو جائے۔ پہلے ہی اب تک جو کچھ ہو چکا تھا، وہ کسی عذاب سے کم نہ تھا۔ شادی سے پہلے اور شادی کے بعد کتنی اُلجھنوں کا شکار ہونا پڑا تھا۔ اکبر کے لئے یہ کتنی بدنصیبی کی بات تھی کہ اس کا نصیبہ کھلنے کے باوجود اس کے ہاتھ کچھ نہ آیا تھا۔ بالآخر وہ بے چارہ تھک ہار کر سو گیا تھا۔

سہ پہر کو بارات کی واپسی تھی۔ فرقان ماموں دل ہی دل میں دعا کر رہے تھے کہ یہ سفر بخیر و عافیت تمام ہو جائے۔ اب خاصے باراتی جاگ گئے تھے۔ بابر علی بھی اُٹھ چکے تھے۔ انہوں نے بستر سے نکل کر سب سے پہلے فرقان ماموں کے بستر کی طرف دیکھا، وہ ابھی تک سو رہے تھے۔ انہیں حیرت ہوئی۔ ماموں فرقان جو صبح اُٹھنے کے عادی تھے اور وہ خود اُٹھ کر دوسروں کو اُٹھانے کے عادی تھے، اب تک کیسے سوئے پڑے تھے؟--- یہ اچھا موقع تھا۔ ماموں فرقان پر سبقت لے جانے کا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر ان کے منہ سے لحاف ہٹایا۔ لحاف ہٹایا تو انہیں بڑی حیرت ہوئی۔ ماموں فرقان کے بستر میں ان کا اپنا بیٹا اکبر سو رہا تھا۔

''ارے، یہ کیسے یہاں سو رہا ہے--- اسے تو دلہن کے پاس ہونا چاہئے تھا؟'' انہوں نے سوچا۔ ''یہ یہاں سو رہا ہے تو ماموں فرقان کہاں گئے؟''

''بھئی، یہ ماموں فرقان کہاں گئے؟'' بابر علی نے کسی سے پوچھا۔

''میں یہاں ہوں---'' ماموں فرقان نے بابر علی کی آواز سن کر فوراً اپنے منہ سے لحاف ہٹایا۔

''ارے، آپ وہاں کہاں لیٹے ہیں؟'' بابر علی نے ان کے بستر کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

''بھئی، کیا کروں، تمہارے بیٹے نے میرے بستر پر قبضہ کر رکھا ہے۔'' ماموں فرقان ہنستے ہوئے بولے۔

''یہ یہاں کیوں ہے؟'' بابر علی نے پوچھا۔

''تو پھر یہ کیا کرے بے چارہ، کہاں جائے---؟'' ماموں فرقان نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب، میں سمجھا نہیں---؟'' بابر علی حیرت سے بولے۔

''تم سمجھو گے بھی نہیں، رات بھر خراٹے جو بھرتے رہے ہو---'' ماموں فرقان نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''ادھر آجاؤ میرے پاس، تمہیں رات کی ساری کہانی سناتا ہوں۔''

رات کو اس قدر ہنگامہ ہوا تھا کہ سب ہی جاگ گئے تھے، ایک نہیں جاگے تھے تو بابر علی۔ یہ بڑی گہری نیند سونے کے عادی تھے۔ سونے کے بعد ان کے سر پر دھماکے بھی ہوتے رہیں تو وہ اس کی پروا نہیں کرتے تھے۔ ان کی عجیب عادت تھی۔ سونے کے بعد اگر انہیں کچی نیند میں جگایا جائے تو ان کے سر میں فوراً شدید قسم کا درد ہو جاتا تھا۔ رات کو جب نیلم بے ہوش ہوئی تھی تو صابرہ نے چاہا تھا کہ بابر علی کو اُٹھا لیا جائے لیکن ماموں فرقان چونکہ بابر کی عادت سے واقف تھے اس لئے انہوں نے اسے اُٹھانے سے منع کر دیا تھا--- جب رات بھر کی روداد ماموں فرقان سے بابر علی نے سنی تو وہ فکر مند ہو گئے لیکن حالات اور واقعات ایسے تھے کہ اس میں کوئی کچھ کر نہیں سکتا تھا اور جو کر سکتا تھا، وہ ابھی تک نیلم کے قدموں میں پڑا تھا۔

نیلم گہری نیند سو رہی تھی۔ وہ پوری رات کی جاگی ہوئی، پھر پے در پے واقعات نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد اسے نیند کی گولی دے دی گئی تاکہ اس کے ذہن کو کچھ سکون مل جائے۔ ابھی اسے ایک لمبا سفر بھی کرنا تھا--- نیلم ناشتے کے بعد پھر سو چکی تھی اور وہ اس کے قدموں سے لپٹا ہوا تھا۔ نیلم کو کچھ ہوش نہ تھا، اگر اسے یہ معلوم ہو جاتا کہ ایک خوفناک بلا اس کے پیروں میں لیٹا ہے تو شاید اس کی جان ہی نکل جاتی---

اس سے پہلے کہ اس کمرے میں لوگ جاگتے، وہ کالا بلا نیلم کے پیروں سے اپنا جسم رگڑتا ہوا لحاف سے باہر نکل آیا۔ باہر نکل کر اس نے ایک زوردار انگڑائی لی اور اطمینان سے چلتا ہوا دروازے تک آیا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

نیلم کوئی دس گیارہ بجے تک سوتی رہی۔ کسی نے اُسے اُٹھانے کی کوشش بھی نہ کی، خود ہی اس کی آنکھ کھلی۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کہاں ہے؟ اس کا سر بھاری ہو رہا تھا۔ خواب آور گولی کا نشہ اُتر چکا تھا لیکن اس کے اثرات باقی تھے۔ تھوڑی دیر وہ یونہی خاموشی سے لیٹی رہی۔ کبھی وہ آنکھیں کھول لیتی، کبھی بند کر لیتی۔ پھر اس کے ذہن میں ایک ایک بات تازہ ہو گئی، وہ اپنے

اپنے آپ پر اعتماد کیجئے

انسان اس دُنیا میں جب آتا ہے تو اکیلا ہی آتا ہے لیکن اکیلا آنے کے بعد اسے یہاں والدین اور بھائی بہنوں کا ساتھ مل جاتا ہے اور وہ ان کے ساتھ مل کر اجتماعی اور معاشرتی زندگی کی سطح پر پروان چڑھتا ہے۔ جیسے جیسے وہ جوان ہوتا ہے اُس کا حلقہ معاشرت وسیع ہوتا جاتا ہے۔ دوست و احباب اور سنگی ساتھیوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ وہ اجتماعی اور معاشرتی زندگی کے رنگ میں رنگ جاتا ہے۔ اگرچہ وہ دوسروں کے ساتھ مل جل کر رہتا ہے لیکن اپنی جگہ وہ فردِ واحد ہے اُس نے اپنی ذاتی زندگی کے بہت سے کام خود ہی کرنے ہیں۔ کوئی دوسرا اُس کا ہاتھ پکڑ کر شاہراہِ حیات پر آگے نہیں بڑھائے گا کوئی دوسرا اس کے لئے زندگی بسر نہیں کرے گا۔ اپنی زندگی کی بہتری بھلائی اور تعمیر و ترقی کے سب کام علم حاصل کرنے اور ہنر سیکھنے کے تمام مراحل اُس نے خود طے کرنے ہیں۔ کوئی دوسرا اپنی محنت سے علم حاصل کر کے اُس کے ذہن میں علم کی قابلیت نہیں اُتار سکتا۔ کوئی ہنر، کوئی فن سیکھ کر اس فن ہنر کی صلاحیت اُس کے ہاتھوں منتقل نہیں کر سکتا۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے۔

''انسان محنت کے لئے پیدا کیا گیا ہے'' (سورۃ البدر)

انسان کو وہی ملتا ہے جس کے لئے وہ محنت کرتا ہے۔ ہر انسان اپنی محنت سے، کوشش سے ہی اپنی زندگی کو بناتا ہے، سنوارتا ہے آگے بڑھتا ہے۔ اسے زندگی کا معرکہ خود ہی سر کرنا ہوتا ہے اچھے بُرے حالات کا خود ہی مقابلہ کرنا ہوتا ہے۔ دُنیا میں وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو اپنے آپ پر اعتماد کرتے ہیں۔ وہ اسی خود اعتمادی کی طاقت سے آگے بڑھتے ہیں اور کامیابی کے میدان سر کرتے جاتے ہیں۔

اے ایم انصاری، شکر گڑھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حواسوں میں آ گئی۔ تب اسے احساس ہوا کہ اس نے کیسی بھیانک رات گزاری ہے۔

اسے شادی کا بڑا چاؤ تھا اور جتنا شوق تھا، اتنا ہی اس کے ساتھ بڑا ظلم ہوا تھا۔ وہ سنہری رات جس کے لئے لڑکیاں دن گنتی ہیں، کیسے لمحہ لمحہ عذاب بن کر اس پر ٹوٹی تھی۔ رات گزر گئی تھی لیکن اس کے اثرات ختم نہ ہوئے تھے بلکہ اس کے ذہن پر نقش ہو کر رہ گئے تھے--- ابھی وہ جانے کتنی دیر یوں ہی آنکھیں موندی پڑی رہتی کہ اس کی امی اندر آئیں۔ انہوں نے یہ دیکھنے کے لئے کہ نیلم ابھی سو رہی ہے یا جاگ رہی ہے، اسے آواز دی۔

''اری، نیلم---!''

''جی، امی---!'' نیلم نے آنکھیں کھول دیں۔

''اب اُٹھ جاؤ، بیٹی! ناشتہ وغیرہ کر لو۔'' واجدہ نے پیار سے کہا۔

''جی، امی! اُٹھ رہی ہوں۔'' نیلم نے آہستگی سے کہا۔

''بیٹا! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''بس ذرا سر بھاری ہو رہا ہے۔''

''وہ گولی کی وجہ سے ہوگا، چائے پیو گی تو ٹھیک ہو جائے گا۔''

''امی! یہ خواب آور گولیاں مجھ سے بالکل برداشت نہیں ہوتیں، وہ تو میں نے ابو کی وجہ سے گولی کھا لی تھی ورنہ کبھی نہ کھاتی۔''

''بیٹی! آج تو ہم سے جدا ہو جائے گی، تجھے کچھ معلوم ہے؟'' واجدہ کے چہرے پر اُداسی پھیل گئی۔

''ہاں، امی! جانتی ہوں---'' نیلم نے افسردگی سے کہا۔ ''آپ نے مجھے بیاہ بھی اتنی دور دیا کہ کوئی جلدی آنا بھی چاہے تو نہ آ سکے--- کیا میں آپ کو اتنی بُری لگتی تھی؟''

''اکبر بہت اچھا لڑکا ہے، وہ تیرا بہت خیال رکھے گا۔'' واجدہ نے اسے تسلی دی۔

''ہاں، امی! میں یہ بھی جانتی ہوں---'' نیلم نے تھوڑا سا مسکراتے ہوئے کہا، پھر وہ یکلخت اُداس ہو گئی۔ ''امی! آپ اور ابو مجھے بہت یاد آئیں گے۔''

''ہمارا گھر تو سونا ہو جائے گا۔ اس گھر میں تیرے سوا اور کون ہے۔ اب اس گھر میں وہ ہوں گے اور میں ہوں گی اور وہ بھی کہاں ہوں گے؟ وہ تو دن بھر کاروبار میں مصروف ہوں گے، میں اکیلی ہی گھر پر اِدھر اُدھر گھومتی پھروں گی۔''

''امی! کوئی مصروفیت نکال لینا ورنہ بور ہو جائیں گی۔'' نیلم نے مشورہ دیا۔

''ہاں، کروں گی کچھ ورنہ یہ اکیلا گھر تو مجھے کاٹنے کو دوڑے گا۔'' واجدہ نے نیلم کو پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم اپنا خیال رکھنا، مجھ سے فون پر دوسرے تیسرے روز بات کر لیا کرنا۔ میں بھی تمہیں فون کر لیا کروں گی۔ ہم نے بہت سوچ سمجھ کر تمہیں اتنی دور بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے۔ مجھے پوری اُمید ہے کہ تم وہاں خوش ہو گی، وہ گھر تمہارے لئے اجنبی نہیں ہے، وہاں تم کئی مرتبہ رہ آئی ہو۔ اکبر تمہارا دیکھا بھالا لڑکا ہے، وہ تم سے شادی کرنے کا شدید خواہشمند تھا۔ وہ تمہیں ہر قیمت پر خوش رکھے گا لیکن اتنا یاد رکھنا کہ اسے تمہارے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔ اس سلسلے میں ہر ممکن طور پر اپنی زبان بند رکھنا ورنہ پیچیدگیاں بڑھ جائیں گی--- تم سمجھ رہی ہو نا! میری بات---؟''

''جی، امی! سمجھ رہی ہوں۔'' نیلم نے سنجیدگی سے کہا۔

''ابھی تک کوئی ان حالات سے واقف نہیں ہے اور تمہیں کراچی بیاہنے میں یہ حکمت عملی بھی کارفرما تھی کہ

کوئی ان حالات سے واقف نہ ہو سکے۔ ہم دونوں کی جان تمہارے اندر ہے۔ تمہارے ابو تمہیں ٹوٹ کر چاہتے ہیں، میری محبت سے تو تم واقف ہی ہو۔ اگر وہ سب نہ ہوا ہوتا تو ہم کبھی تمہیں کراچی نہ بھیجتے۔ اس شہر میں لڑکوں کی کیا کمی ہے لیکن ہم نے جان بوجھ کر تمہیں اپنے سے دور کیا ہے تاکہ تم سدا سکھی رہ سکو۔ تمہاری خوشی ہمارے لئے اولین ہے، ہم تمہیں ہر حال میں خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔'' واجدہ کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔

''میں اندر آ جاؤں---'' ابھی یہ دونوں بات کر ہی رہے تھے کہ دروازے سے صابرہ نے جھانکا۔

''ہاں، خالہ! آ جائیں۔'' نیلم نے بڑے احترام اور بڑی محبت سے کہا۔

''بھئی، کوئی پرائیویٹ بات تو نہیں ہو رہی تھی؟'' صابرہ نے چھیڑا۔

''جی ہاں، بڑی پرائیویٹ قسم کی بات ہو رہی تھی۔'' نیلم نے ہنس کر کہا۔

''تو پھر میں واپس لوٹ جاؤں؟'' صابرہ نے نیلم کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ارے، خالہ! کمال کرتی ہیں آپ بھی۔'' نیلم سنجیدہ ہو گئی۔

''نیلم تو مذاق کر رہی تھی---'' واجدہ نے ہنس کر کہا۔ ''کیا ہمارے درمیان کوئی ایسی بات بھی ہو سکتی ہے جو تم سے چھپائی جائے، راز رکھی جائے۔''

''ہاں، ہو سکتی ہے---ماں، بیٹیوں میں ہزار باتیں ایسی ہو سکتی ہے جو چھپائی جائیں۔''

''یہاں چھپانے کو کچھ نہیں ہے۔ ایک نیلم تھی جسے اب تک اپنے کلیجے میں چھپائے رکھا تھا، تم سے یہ بھی نہ دیکھا گیا۔ آخر ہم سے چھین کر لے چلی نا، اپنے ساتھ---'' واجدہ نے بات کا رخ بڑی خوبصورتی سے موڑ دیا۔

''تم نے اپنے کلیجے میں چھپائے رکھا نا، ہم اسے کراچی لے جا کر اپنے دل میں چھپا کر رکھیں گے۔ تم کیا سمجھتی ہو کہ ایک تمہی محبت کرنے والی پیدا ہوئی ہو اس دنیا میں؟'' صابرہ نے ہنس کر کہا۔

''سن لیا تم نے---یہی بات میں تم سے کہہ رہی تھی کہ میری بہن تمہیں اپنے دل میں چھپا کر رکھے گی۔''

''یہ پریشان ہو رہی تھی کیا؟'' صابرہ نے پوچھا۔

''نہیں، پریشان نہیں ہو رہی تھی بلکہ یہ کہہ رہی تھی کہ اتنی دور مجھے کیوں بیاہ دیا، آپ سے ملنے میں بھی دُشواری ہو گی۔'' واجدہ نے بتایا۔

''واہ، نیلم! تم نے خوب فکر کی---'' صابرہ نے نیلم کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''جب تمہارا جی چاہے، لاہور آ جانا۔ لاہور امریکہ میں تو نہیں ہے۔ لاہور پاکستان میں ہی ہے، جہاز گھنٹے سوا گھنٹے میں تمہیں یہاں پہنچا دے گا۔''

کچھ دیر اور اسی طرح کی باتیں ہوتی رہیں، پھر نیلم منہ ہاتھ دھونے کے لئے اُٹھ گئی۔ ناشتہ تیار تھا۔ جو لوگ باقی رہ گئے تھے، ان کے ساتھ نیلم نے ناشتہ کیا۔ باقی رہنے والوں میں اکبر بھی تھا۔ اکبر کی موجودگی میں نیلم کو ناشتہ کرتے ہوئے جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اُٹھ کر تو جا نہیں سکتی تھی، خاموشی سے سر جھکائے ناشتہ کرتی رہی۔

دوپہر کے کھانے کے بعد بارات نے اپنا سامان باندھنا شروع کر دیا۔ پھر وہ گھڑی بھی آ پہنچی جو والدین کے لئے متضاد جذبات لے کر آتی ہے۔ بیٹی جب گھر سے رخصت ہوتی ہے تو ایک طرف والدین کو اپنے فرض سے سبکدوشی کی خوشی ہوتی ہے، دوسری طرف انہیں اپنے لختِ جگر سے دور ہونے کا غم کسی عذاب سے کم نہیں محسوس ہوتا۔ لڑکیاں پرائی ہوتی ہیں، انہیں ایک دن گھر سے جانا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہی ہوتا ہے۔ بابل کے آنگن کی چڑیوں کو ایک دن اُڑنا ہی ہوتا ہے۔

نیلم اپنے ابو کے گلے لگ کر خوب روئی۔ اس طرح کہ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں، بری حالت ہوگئی۔ ماں باپ سے دور ہونے کا غم ایک دم ہی بارش کی طرح برسا تھا۔ وہ بہت دور جا رہی تھی، یہ احساس شدت سے اس کی روح کی گہرائیوں میں اُتر گیا تھا۔ رودھو کر وہ گاڑی میں بیٹھی۔ اس کے پاس اکبر بیٹھ گیا جس نے زندگی بھر اس کے آنسو پونچھے تھے۔ ایک رشتہ ٹوٹا تھا تو دوسرا جڑ گیا تھا۔ ایک گھر چھوٹا تھا، دوسرا مل گیا تھا۔ یہ وہ گھر تھا جہاں اس نے اب ہمیشہ رہنا تھا۔

☆☆

گارڈ نے جھنڈی دکھائی، گاڑی نے رینگنا شروع کیا۔ اچانک ہی وہ کالا بلا کہیں سے نمودار ہوا اور چلتی ٹرین میں چھلانگ لگا کر ایک ڈبے میں چڑھ گیا۔ فرقان ماموں کھڑکی کے نزدیک بیٹھے تھے۔ گاڑی چلی تو انہوں نے کھڑکی سے باہر منہ نکال لیا اور ایسے ہی باہر کی طرف دیکھنے لگے تب ان کی نظر اس کالے بلے پر پڑی۔ انہوں نے اسے برابر والے ڈبے میں چڑھتا دیکھ لیا۔ گاڑی نے اب رفتار پکڑی تھی۔ ماموں فرقان نے اپنا سر کھڑکی کے اندر کیا اور فکرمندی سے بابر علی کو دیکھنے لگے۔ بابر علی ان کے سامنے والی سیٹ پر بیٹھے تھے۔

''کیا ہوا، ماموں---؟'' بابر علی نے ان کی پیشانی پر فکر کی لکیریں دیکھ لی تھیں، انہوں نے پوچھا۔

''آؤ میرے ساتھ---'' ماموں نے برتھ سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ''اُدھر چل کر بات کرتے ہیں۔''

بابر علی فوراً ہی ان کے ساتھ ہولئے۔ ماموں فرقان نے سب سے پہلے بوگی کا دروازہ اندر سے بند کیا۔ یہ پوری بوگی ریزروتھی، اس میں باراتیوں کے سوا کوئی باہر کا آدمی نہ تھا۔ دروازہ بند کرتے ہوئے فرقان ماموں نے کہا۔

''میں نے اسے گاڑی میں چڑھتے دیکھا ہے؟''

''کس کو، ماموں---؟'' بابر علی نے حیران ہو کر پوچھا۔

''اس کالے بلے کو---'' ماموں فرقان نے آہستہ سے کہا۔

''کون سا کالا بلا---؟'' بابر علی کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

''یہ وہی بلا ہے جو ہمارے ساتھ لاہور گیا تھا، اب یہ پھر ہمارے پیچھے لگ گیا ہے۔ بوگی کی ساری کھڑکیاں اور دروازے بند کردو تاکہ اس بوگی میں نہ آسکے اور یہ بات کسی کو بتانی بھی نہیں ہے۔ میں اسی لئے تمہیں اپنے ساتھ اُٹھا کر لایا ہوں۔'' ماموں فرقان نے کہا۔

کھڑکیاں دروازے تو خیر بند کر دیئے گئے لیکن بوگی کے درمیان کے دروازے جو ایک بوگی کو دوسری بوگی سے ملاتے ہیں اور جن سے بیرے اور ٹکٹ چیکر وغیرہ گزرتے رہتے ہیں، انہیں بند کرنا آسان نہ تھا۔ ان دروازوں پر نظر رکھنے کے لئے ضروری تھا۔ یہ ہی ہوسکتا تھا کہ وہاں کوئی آدمی مستقل بیٹھے اور یہ نگرانی کا کام لڑکے ہی اچھی طرح کر سکتے تھے لہٰذا اب ضروری ہوگیا کہ خاندان کے دو تین لڑکوں کو اعتماد میں لے کر انہیں کالے بلے کی نگرانی پر مامور کر دیا جائے--- فرقان ماموں نے دو تین لڑکوں کو منتخب کر کے انہیں صورتحال سے آگاہ کر دیا، انہیں یہ بھی بتا دیا گیا کہ یہ کام بڑی رازداری سے کرنا ہے۔ باراتیوں کو بالخصوص خواتین کو یہ بات ہرگز نہیں بتانی ہے کہ وہ خبیث بلا پھر ہمارا شریک سفر ہے۔ خواہ مخواہ بوگی میں خوف و ہراس پھیل جائے گا۔ اتنا لمبا سفر ہے، ابھی سے عذاب بن جائے گا۔

فرقان ماموں کی خفیہ فورس نے کام کرنا شروع کر دیا۔ ماموں فرقان اور بابر علی بھی بوگی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چکر لگا لیتے تھے، نگرانی ٹھیک طرح جاری تھی۔

شام ڈھلنے لگی، پھر رات آئی۔ یہ ایک اچھی خاصی سرد رات تھی۔ گاڑی میں غیر معمولی سردی تھی۔ کھڑکیاں دروازے بند ہونے کے باوجود یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے بوگی میں برف بھری ہو--- خدا خدا کر کے یہ رات گزری، فرقان ماموں ایک لمحے کو بھی نہیں سوئے۔ عشاء کی نماز پڑھ کر وہ بوگی کے درمیان میں کمبل اوڑھے بیٹھے رہے۔ ان کی نظریں بوگی کے راستے پر دائیں بائیں گھومتی رہیں اور ان کے ہونٹ ہلتے رہے، وہ مستقل کچھ نہ کچھ پڑھتے رہے۔ دن نکلا تو انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ رات خیریت سے گزر گئی تھی، وہ کالا بلا اس بوگی میں داخل نہ ہوسکا تھا۔ پھر وہ وقت بھی آیا جب گاڑی کراچی کے اسٹیشن میں داخل ہوئی۔ سفر تمام ہوا، سارے باراتی ایک ایک کر کے ٹرین سے اُتر آئے۔ ان اُترنے والوں میں ماموں فرقان بھی تھے۔

پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر انہوں نے دور تک جہاں تک دور دیکھ سکتے تھے، دیکھنے کی کوشش کی لیکن وہ انہیں کہیں نظر نہ آیا۔ فرقان ماموں نے اطمینان کا سانس لیا اور پُل کی سڑھیاں چڑھنے لگے۔ باراتوں کو گھر تک لے جانے کے لئے اسٹیشن کے باہر ایک بس موجود تھی لیکن بہت سے باراتی اسٹیشن سے ہی رخصت ہوگئے، بس میں صرف وہ لوگ رہ گئے جن کے گھر بس کے روٹ پر تھے یا گھر جانا چاہتے تھے۔

بس چلی تو کسی کو پتہ بھی نہ چلا کہ وہ کالا بلا کب بس کے دروازے سے چھلانگ لگا کر اندر آگیا اور پورے اطمینان سے ایک سیٹ کے نیچے پیر پھیلا کر لیٹ گیا۔ فرقان ماموں پہلے آگے بیٹھے تھے، پھر جانے کیا سوچ کر وہ پیچھے اُٹھ آئے اور اسی سیٹ پر بیٹھ گئے جس کے نیچے بلا لیٹا تھا۔ ان کے اور بلے کے پیروں کے درمیان مشکل سے دو تین انچ کا فاصلہ ہوگا۔ اگر وہ کالا بلا چاہتا تو ماموں فرقان کی ٹانگ پر اپنا پنجہ مار سکتا تھا۔ اپنے ساتھ انہوں نے بابر علی کو بھی بلا لیا تھا۔ اب وہ دونوں پیچھے بیٹھے سفر بخیر و خوبی ختم ہونے پر خدا کا شکر ادا کر رہے تھے اور نیچے وہ کالا بلا لیٹا ہوا بار بار دُم کو بس کے فرش پر مار رہا تھا جیسے تنبیہ کر رہا ہو کہ یہ سفر ابھی شروع ہوا ہے۔

''چلو، اس بلے سے تو جان چھوٹی---'' ماموں فرقان نے اطمینان کا سانس لے کر کہا۔

کالے بلے نے پھر اپنی موٹی دُم بس کے فرش پر ماری جیسے کہہ رہا ہو کہ ابھی کہاں جان چھٹی، ابھی تو جان عذاب میں آنا شروع ہوگی۔

''ماموں! اس بلے نے واقعی جان عذاب میں ڈال دی تھی۔ پتہ نہیں کہاں سے پیچھے لگ گیا تھا---'' بابر علی نے بس سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''عجیب بلا تھا وہ---''

''تم دادا غفور کو جانتے ہو؟'' فرقان ماموں نے بابر علی سے پوچھا۔

''ہاں، جانتا ہوں--- وہ جو برنس روڈ پر رہتے ہیں، نا؟'' بابر علی نے تصدیق چاہی۔

''ہاں، وہی--- میں ان کے پاس جاؤں گا۔ وہ ان معاملات میں بڑے ماہر ہیں، ان سے بات کروں گا۔'' ماموں فرقان نے کہا۔

''ماموں! ان سے کوئی تعویذ وغیرہ لے لیں۔'' بابر علی نے تجویز پیش کی۔

''میں ان سے بات کرتا ہوں۔ وہ جو بتائیں گے، ویسا کریں گے۔ یہ معاملہ ویسے تعویذوں سے حل ہونے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

والا نہیں ہے، اس کے لئے عمل کرنا پڑے گا۔''

''ماموں! آپ کا کیا خیال ہے کہ یہ معاملہ ابھی ختم نہیں ہوا۔'' بابر علی نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

''یہ بات اگلے دو تین دن میں معلوم ہو جائے گی۔'' ماموں فرقان بولے۔

''کیا پھر کچھ ہو گا؟'' بابر علی نے فکر مندی سے پوچھا۔

''اگر اثرات ختم نہیں ہوئے ہیں تو وہ ہر صورت میں ظاہر ہوں گے۔'' ماموں فرقان نے جواب دیا۔

''ماموں! آپ دو تین دن میرے گھر پر ہی رہیں۔'' بابر علی نے کہا۔

''پریشان کیوں ہوتے ہو، اب کچھ نہیں ہو گا اور اگر کچھ ہوا تو تم سے کون سا دور ہوں۔ مجھے ٹیلیفون کر دینا، میں فوراً آجاؤں گا--- ویسے پرسوں ولیمے پر ملاقات ہو گی، انشاء اللہ سب ٹھیک رہے گا۔'' ماموں فرقان نے تسلی دی۔

لیکن کچھ ٹھیک نہیں رہا۔ فرقان ماموں کے سارے اندازے غلط نکلے۔ ان کا خیال تھا کہ کالے بلے سے نجات مل گئی ہے لیکن ایسا نہ تھا۔

ماموں فرقان تو حسن اسکوائر پر اُتر گئے، انہیں عزیز آباد جانا تھا۔ بابر علی نے انہیں وہاں اُترنے سے منع بھی کیا کہ گھر چلیں، وہاں سے آپ کو گاڑی کے ذریعے گھر بھجوا دوں گا لیکن ماموں فرقان نہ مانے کہ خواہ مخواہ زحمت ہو گی۔ وہ بس سے اُتر گئے اور ٹیکسی پکڑ کر گھر پہنچ گئے۔

ماموں فرقان کے اُترتے ہی کالے بلے نے پورے اطمینان سے پاؤں پھیلا لئے جیسے فرقان ماموں کے اُترنے سے اسے سکون ملا ہو۔

بابر علی کی رہائش گاہ گلشن اقبال میں تھی۔ جب بس گلشن اقبال پہنچی تو اس میں بہت کم باراتی رہ گئے تھے، زیادہ تر گھر کے افراد تھے یا وہ مہمان تھے جو حیدر آباد اور ٹھٹھہ سے آئے ہوئے تھے--- بس خالی ہونے کے بعد کالے بلے نے بھی سیٹ کے نیچے سے اپنا منہ نکالا۔ گردن گھما کر اِدھر اُدھر دیکھا بس میں کوئی نہ تھا۔ وہ پورے اطمینان سے ''مہمان خصوصی'' کی طرح شان سے نیچے اُترا اور گھر کے گیٹ سے اندر داخل ہو گیا۔

شادی کی پہلی رات تو اس کالے بلے کی نذر ہو گئی تھی، دوسری رات ٹرین میں گزری۔ آج تیسری رات تھی۔ اکبر ذہنی طور پر بہت اُلجھا ہوا تھا۔ ان عجیب و غریب واقعات نے اس کے اعصاب شکستہ کر دیئے تھے، اوپر سے سفر کی تکان تھی۔ گھر پہنچ کر اکبر نے تیز گرم پانی کا شاور لیا، ایک خواب آور گولی کھائی، چائے پی اور اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ اس نے راشدہ کو ہدایت کر دی کہ شام ہونے سے پہلے اسے کوئی نہ اُٹھائے۔

اپنے بیڈ پر لیٹ کر اسے اسی طرح کی آسودگی کا احساس ہوا۔ تھکا ہوا تو وہ تھا ہی اوپر سے نیند کی گولی کا نشہ، جلد ہی اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ اس نے لحاف اوپر کھینچا اور کروٹ لے کر سو گیا۔ جانے وہ کتنی دیر سویا ہو گا کہ اچانک اس کی کسی آواز سے آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں اندھیرا پھیلا ہوا تھا، اس کا مطلب تھا کہ شام ہو چکی ہے۔ کوئی زور زور سے دروازہ بجا رہا تھا اکبر نے سوچا وہ اندر سے دروازہ بند کر کے تو نہیں سویا تھا، پھر یہ کون اس بیہودگی سے دروازہ پیٹ رہا ہے، اندر کیوں نہیں آجاتا؟--- وہ لحاف پھینک کر غصے سے اُٹھا کہ دیکھے تو سہی کہ دروازے پر کون ہے--- ابھی وہ دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ دروازہ آہستہ آہستہ کھلنا شروع ہو گیا۔

''ارے، بھئی! آجاؤ، کون ہے؟'' اکبر نے ذرا غصے سے کہا۔

پورا دروازہ کھل گیا تھا لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ اکبر کو اور غصہ آیا کہ ایک تو دروازہ پیٹ کر اسے اُٹھا دیا اور اب مزید اس کے ساتھ مذاق کیا جا رہا ہے۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا تا کہ دیکھ سکے کہ باہر کون ہے۔ چار قدم آگے بڑھائے ہوں گے کہ اسے دیکھ کر اُس کی سٹی گم ہو گئی۔ اکبر جلدی سے اُلٹے قدموں پیچھے بھاگا اور جلدی سے لحاف میں گھس گیا۔ وہ تھر تھر کانپ رہا تھا اور اس کی نظریں اس چیز پر تھیں جو اندر آرہی تھی--- وہ کوئی بڑی ہیبت ناک شے تھی۔ اس کی لمبائی کوئی دو فٹ رہی ہو گی۔ ایک فٹ کے پاؤں ہوں گے اور ان پاؤں کے اوپر سر تھا۔ اس کا دھڑ نہیں تھا، نہ ہاتھ تھے۔ سر چادر سے ڈھکا ہوا تھا اور اس میں سے ایک ہیبت ناک چہرہ جھلک رہا تھا۔ اس عجیب الخلقت چیز کو دیکھ کر اکبر کی چیخ گلے میں پھنس گی، وہ لاکھ چیخنا چاہ رہا تھا لیکن چیخ تھی کہ گلے سے نکلتی ہی نہ تھی اور عجیب الخلقت چیز اپنے پاؤں پر اُچھلتی ہوئی اس کی طرف بڑھی آرہی تھی۔ بڑی مشکل سے اس کی چیخ حلق سے برآمد ہوئی۔ تبھی اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے خود کو بری طرح چیختے ہوئے پایا، وہ پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ اس کا حلق خشک تھا اور جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ کمرے میں اندھیرا نہ تھا کسی نے اندر آکر لائٹ جلا دی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ مغرب کا وقت گزر چکا تھا۔ کمرے میں روشنی دیکھ کر اسے کچھ اطمینان ہوا۔ اس نے گردن گھما کر چاروں طرف کمرے میں دیکھا، وہاں کوئی ایسی چیز نہ تھی جس سے خوفزدہ ہوا جاتا۔ اس کا مطلب ہے اس نے جو کچھ دیکھا تھا، خواب میں دیکھا تھا لیکن جانے کیوں اسے احساس محسوس ہوا تھا کہ اس نے جو کچھ دیکھا تھا، خواب نہ تھا بلکہ اپنی جاگتی آنکھوں سے دیکھا تھا--- اب وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا اور ابھی باتھ روم جانے کی سوچ ہی رہا تھا کہ راشدہ کمرے میں داخل ہوئی۔

''اُٹھ گئے آپ--- شکر ہے۔'' راشدہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے دوست آئے ہیں۔ اِدھر ہی بھیج دوں، ڈرائنگ روم تو اس وقت خالی نہیں ہے؟''

''ہاں، اِدھر ہی بھیج دو---'' اکبر نے بیڈ سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں ذرا منہ ہاتھ دھولوں، پھر چائے بھیج دینا۔''

''جی، اچھا---'' راشدہ یہ کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد اکبر کے دوست آفاق اور گلزار کمرے میں داخل ہوئے۔ اکبر ابھی باتھ روم میں تھا۔ انہوں نے ایک کالے بلے کو اکبر کے بیڈ کے نیچے سے نکلتے دیکھا۔ کالے بلے کی سرخ سرخ آنکھیں اور بڑا قد دیکھ کر وہ دونوں سہم گئے۔ کالے بلے نے ایک نظر دونوں کو دیکھا اور ٹہلتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

''یار! یہ کس قسم کا بلا تھا---؟'' آفاق نے گلزار سے کہا۔ ''یار، وہ عجیب قسم کا بلا تھا، ڈراؤنا اور اتنا لمبا چوڑا میں نے آج تک نہیں دیکھا۔''

شگفتہ شگفتہ

باہر کی مصروفیات سے تھک کر انسان تیزی سے گھر کی طرف بڑھتا ہے۔ اسی طرح ایک پروفیسر صاحب گھر میں داخل ہوئے تو اُن کی بیوی نے باہر سڑک پر جھانک کر دیکھا اور کہا۔

''جی آپ موٹر سائیکل کہاں چھوڑ آئے ہیں؟''

''موٹر سائیکل---؟'' ماسٹر صاحب نے غور کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے راستے میں ایک صاحب کو لفٹ دی تھی۔ یہاں پہنچ کر میں نے اُن کا شکریہ ادا کیا۔ پتا نہیں، وہ موٹر سائیکل کہاں لے گیا؟''

اختر عباس قریشی، ملتان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کالے بلے کا ذکر سن کر اکبر کے پسینے چھوٹ گئے، اس نے جلدی سے باہر نکل کر اِدھر اُدھر دیکھا لیکن وہ کالا بلا کہیں نظر نہ آیا۔ اکبر واپس کمرے میں آیا اور خاموشی سے بیڈ پر بیٹھ گیا۔

''کیا ہوا بھئی، تم کیوں اتنی خاموشی سے بیٹھ گئے؟'' گلزار نے اسے چھیڑا۔

''ہاں، بھئی! سنا کچھ رات کا افسانہ---!'' آفاق نے اسے چھیڑا۔

اکبر کے یہ دونوں دوست بارات میں نہیں گئے تھے، انہیں کچھ معلوم نہ تھا کہ اکبر کے ساتھ کیا بیتی ہے۔ وہ کرید کرید کر اس سے ''رات کا افسانہ'' پوچھتے رہے اور وہ ہنس ہنس کر انہیں ٹالتا رہا۔ وہ کیا بتاتا کہ اس کے ساتھ کیا گزری ہے--- اکبر کپڑے پہن کر اپنے دوستوں کو لے کر باہر نکل گیا۔ کافی دیر کے بعد وہ گھر واپس آیا، پھر اس نے کھانا کھایا اور کھانا کھا کر اپنے ایک اور دوست سے ملنے چلا گیا۔ وہاں سے کوئی ساڑھے گیارہ بجے کے قریب واپسی ہوئی۔

گھر واپس آیا تو گھر والے اس کے منتظر تھے۔ کچھ دیر کے بعد اسے نیلم کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔

وہ کمرے میں داخل ہوا تو دیوار پر لگی گھڑی نے بارہ گھنٹے بجائے۔ اکبر نے پہلے بارہ بجاتی گھڑی اور پھر نیلم کو دیکھا۔ نیلم نے اسے مسکرا کر دیکھا اور پھر اپنی نظریں نیچی کر لیں۔ جب وہ قریب آیا تو نیلم نے اپنا سر بھی جھکا لیا۔ اکبر بیڈ پر بیٹھا اس نے اپنے ہاتھ سے اس کا چہرہ اُٹھایا اور قریب ہونے لگا لیکن قربت اُس کے نصیب میں نہ تھی۔ وہ اچانک چیخ اُٹھا۔

''نیلم! میری آنکھیں---'' اکبر نے گھبرا کر کہا۔

نیلم کا دل دھک سے رہ گیا، اسے ٹھنڈا پسینہ آ گیا۔ ہاتھ پاؤں میں جان نہ رہی، اس نے تڑپ کر پوچھا۔

''ہائے، اکبر! کیا ہوا---؟''

اکبر کچھ نہ بولا، وہ اپنے ہاتھوں سے اپنی آنکھیں مل رہا تھا۔ نیلم نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس سے کہا۔

''اکبر! ہاتھ تو ہٹائیں---''

اکبر نے اپنے ہاتھوں پر نیلم کی نرم ملائم ریشم سی انگلیوں کا لمس محسوس کیا۔ چند ثانیے کو اسے سکون ملا۔ اس نے اپنا ہاتھ آنکھوں سے ہٹا لیا۔ آنکھیں کھول کر نیلم کی طرف دیکھنا چاہا لیکن دیکھ نہ سکا۔ جیسے ہی اس نے آنکھیں کھولیں، شدت سے تکلیف ہوئی اور اس نے فوراً آنکھیں بند کر لیں۔

''اکبر! خدا کے لئے اپنی آنکھیں کھولیں، مجھے دیکھیں۔'' نیلم نے اس کا ذرا سا ہاتھ دبا کر کہا۔

کوئی اور وقت ہوتا تو اکبر، نیلم کے اس جملے پر قربان ہو جاتا، اسے اس طرح دیکھتا کہ پھر اسے دید کی حسرت نہ رہتی لیکن اس وقت تو وہ بڑی مشکل میں تھا۔ اس نے پھر تھوڑی سی آنکھیں کھولنا چاہیں لیکن آنکھوں کے چراغ جل نہ سکے۔ روشنی کے باوجود ہر طرف دُھندلی چھائی رہی۔

''نیلم! آنکھیں نہیں کھل رہیں۔'' اکبر نے ایک کرب کے عالم میں کہا۔

''ہوا کیا ہے---؟'' نیلم نے فکر مندی سے پوچھا۔

''آنکھوں میں شدید مرچیں لگ رہی ہیں۔''

''ابھی تو آپ ٹھیک تھے---؟''

''ہاں، ابھی تو ٹھیک تھا۔'' اکبر نے کہا۔

''پھر سے مرچیں کہاں سے آ گئیں؟'' نیلم نے پوچھا۔

''بس مجھے اچانک ہی یہ محسوس ہوا جیسے کسی نے مٹھی

بھر کر پسی ہوئی مرچیں میری آنکھوں میں جھونک دی ہوں--- اس قدر شدید تکلیف ہے کہ بتا نہیں سکتا۔'' اکبر کے چہرے پر شدید کرب کے آثار تھے۔

''آپ باتھ روم میں جا کر آنکھیں دھو لیں۔'' نیلم نے مشورہ دیا۔

''ہاں، یہی کرنا پڑے گا۔''

یہ کہہ کر اکبر اُٹھا۔ اس کے ساتھ ہی نیلم بھی اُٹھی اس نے سہارا دے کر اکبر کو باتھ روم کا راستہ دکھایا۔ اکبر نے اچھی طرح سے اپنی آنکھیں دھوئیں۔ درد میں بہت معمولی سا فرق پڑا، اس نے کھڑے ہو کر آنکھیں دیکھیں، اس کی آنکھیں لال انگارہ ہو رہی تھیں۔ اس قدر سرخی تھی کہ لگتا تھا جیسے آنکھوں میں خون بھر گیا ہو اور اتنی شدید جلن تھی جیسے کوئی اس کی آنکھوں پر بلیڈ پھیر رہا ہو۔ باتھ روم سے واپس آ کر وہ بیڈ پر لیٹ گیا۔ اسے کسی کروٹ قرار نہ تھا، آنکھوں پر ہاتھ رکھنے کے باوجود کمرے میں جلتی ہوئی ٹیوب لائٹ کی روشنی اس کی آنکھوں میں تیزاب بن کر ٹپک رہی تھی۔ اس نے اپنا منہ بیڈ کے گدے میں چھپا لیا، چین پھر بھی نہ ملا۔

''کیا لائٹ بجھا دوں؟'' نیلم نے اسے گدے میں منہ چھپائے دیکھ کر پوچھا۔

نیلم کا یہ جملہ بھی مرمٹنے والا تھا۔ اس کی آنکھوں میں مرچیں نہ بھری ہوتیں تو وہ اس جملے سے لطف اُٹھاتا لیکن اس وقت تو اسے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اس نے سادگی سے کہا۔

''ہاں، بجھا دو۔''

نیلم نے لائٹ بجھا دی لیکن اس سے بھی کوئی خاص فرق نہ پڑا، تکلیف اپنی جگہ جوں کی توں برقرار رہی۔ پھر نیلم نے باتھ روم کی لائٹ جلا کر دروازہ کھول دیا۔ اس نے تولیہ پانی میں تر کیا اور اس گیلے تولیہ کو اس کی آنکھوں پر رکھ کر بہت آہستہ آہستہ پھیرنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں ٹھنڈ اٹھنڈا پانی لگ رہا تھا۔ پانی کی ٹھنڈک نے اسے تھوڑا سا سکون پہنچایا لیکن یہ سکون بھی لمحاتی ثابت ہوا۔ دس پندرہ منٹ ہو چکے تھے لیکن کسی طرح سے آرام نہیں آ رہا تھا۔ تب نیلم نے پریشان ہو کر کہا۔

''کیا خالہ کو بلا کر لاؤں؟''

''نہیں، تم رہنے دو۔ میں خود جاتا ہوں---'' اکبر نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ''نیلم! بہت شدید قسم کی تکلیف ہے۔''

''آپ جائیں، جا کر کسی ڈاکٹر کو دکھائیں۔'' نیلم نے مشورہ دیا۔

اکبر آنکھوں پر ہاتھ رکھے اندازے سے چلتا ہوا کمرے سے باہر آیا۔ پھر اس نے اپنے امی ابو کے کمرے میں قدم رکھا، اس کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہ لوگ ابھی جاگ رہے تھے۔ اکبر کو اس طرح اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھے آتے دیکھ کر صابرہ نے اپنا کلیجہ تھام لیا۔

''یا اللہ! خیر---'' ان کے منہ سے نکلا۔

''ابو! میری آنکھیں دیکھیں---'' اکبر نے کہا۔

''کیا ہوا تمہاری آنکھوں کو؟''

بابر علی لپک کر اس کی طرف بڑھے۔ انہوں نے جلدی سے اسے اپنے بیڈ پر بٹھایا۔ صابرہ نے اکبر کا ہاتھ ہٹا کر اس کی ایک آنکھ کھول کر دیکھی۔

''ارے، یہ تمہاری آنکھوں کو کیا ہوا، ایک دم لال انگارہ ہو رہی ہیں؟''

''امی! بس اچانک ہی ایسا ہوا، مجھے یوں لگا جیسے کسی نے ڈھیر ساری پسی ہوئی مرچیں میری آنکھوں میں جھونک دی ہوں۔''

''اپنی آنکھیں دھلو۔'' بابر علی نے کہا۔

''ابو! بہت اچھی طرح دھولی ہیں، گیلے تولیے سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھی مسلسل رگڑی ہیں لیکن کوئی فرق نہیں پڑا۔'' اکبر نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''سنیں---'' صابرہ بابر علی سے مخاطب ہوئیں۔

''اسے ہسپتال لے جائیں۔''

''اچھا، ٹھیک ہے؟''

بابر علی نے جلدی جلدی کپڑے تبدیل کیے، گاڑی نکالی اور اکبر کو اپنے علاقے کے ایک اچھے ہسپتال میں لے گئے۔ وہاں ڈاکٹر نے اس کی آنکھوں کا معائنہ کیا۔ آنکھوں کو اچھی طرح دھو کر ایک ٹیوب سے مرہم لگا دیا۔ کھانے کو کچھ دوائیں لکھ کر دیں اور لگانے کو دو قسم کی ٹیوب تجویز کر دیں--- بابر علی کے دریافت کرنے پر کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ اچانک آنکھوں کا یہ حال کیسے ہو گیا تو ڈاکٹر نے بتایا۔

''یہ ایک طرح کی الرجی ہے--- فکر کی کوئی بات نہیں، ایک دو دن میں آنکھیں ٹھیک ہو جائیں گی۔''

ماموں فرقان کو دوسرے دن بابر علی نے فون پر صورتحال سے آگاہ کر دیا تھا۔ ماموں فرقان، اکبر کی آنکھوں کی تکلیف کے بارے میں سن کر فکر مند ہو گئے۔ انہوں نے پوچھا۔

''کسی آنکھوں کے اسپیشلسٹ کو دکھاؤ۔ ہو سکتا ہے، اس ڈاکٹر کی رائے صحیح ہو۔ واقعی اس کی آنکھوں میں الرجی ہو گئی ہو لیکن اسپیشلسٹ کو دکھاؤ ضرورتا کہ تسلی ہو جائے۔''

''ماموں! میں نے شام کا ایک بڑے ڈاکٹر سے وقت لیا ہے، اسے لے کر جاؤں گا۔''

''تم اکبر کو ڈاکٹر کو دکھاؤ، میں رات کو اِدھر آؤں گا---'' ماموں فرقان نے کہا۔ ''دکان سے اُٹھ کر پہلے میں دادا غفور کی طرف جاؤں گا، ان سے ذرا بات کر کے دیکھتا ہوں کہ وہ کیا کہتے ہیں۔''

''اچھا، ماموں! ٹھیک ہے۔ میں رات کو آپ کا انتظار کروں گا۔'' یہ کہہ کر بابر علی نے ریسیور رکھ دیا۔

بابر علی کے ریسیور رکھنے کے بعد بھی ماموں فرقان چند لمحوں تک ریسیور اپنے ہاتھ میں تھامے رہے۔ ان کی پیشانی پر سلوٹیں اُبھر آئی تھیں، پھر انہوں نے گہرا سانس لے کر ریسیور زور سے کریڈل پر رکھ دیا۔

شام کو جلدی اپنی دکان سے اُٹھے تا کہ دادا غفور سے بات کر کے وہ گلشن اقبال پہنچ سکیں۔ پھر گلشن اقبال سے انہیں اپنے گھر واپس بھی آنا تھا۔ لیاقت آباد کی مارکیٹ میں ماموں فرقان کی کپڑے کی بہت بڑی دکان تھی اور خوب چلتی تھی۔ لیاقت آباد سے ٹیکسی پکڑ کر وہ برنس روڈ دادا غفور کے پاس پہنچے۔ دادا غفور ماموں فرقان کے دور کے رشتے داروں میں سے تھے لیکن ان سے دادا غفور کے تعلقات بہت قریبی تھے۔ ماموں فرقان کو جب بھی فرصت ہوتی وہ ان سے ملنے ضرور جاتے۔ دادا غفور بھی ماموں فرقان کو بہت پسند کرتے تھے وہ اگر کبھی ملاقات کو نہ آتے تو دادا غفور انہیں اپنے بیٹے سے فون کروا کر بلوا لیا کرتے تھے۔ دادا غفور کی عمر 72 سال سے کم نہ ہو گی لیکن ان کی آنکھیں بالکل ٹھیک تھیں۔ وہ چشمہ نہیں لگاتے تھے اور اُڑتے کبوتر کو دیکھ کر بتا دیا کرتے تھے کہ یہ کس نسل کا ہے۔ سماعت بھی بالکل ٹھیک تھی، صرف قدموں کی چاپ سے بندے کو پہچان لیا کرتے تھے البتہ ہاتھوں میں خفیف سا رعشہ تھا، تھوڑی بہت گردن بھی ہلنے لگی تھی۔ دبلے پتلے تھے، رنگ گورا چٹا تھا۔ جوانی میں سرخی مائل رہا ہو گا، اب تھوڑا سا زردی مائل ہو گیا تھا۔ سفید داڑھی، گہری سیاہ آنکھیں، مسکراتے ہونٹ، کڑک دار آواز وہ ایک بارعب شخصیت کے مالک تھے--- ماموں فرقان، دادا غفور کے فلیٹ پر پہنچے تو وہ دسترخوان پر بیٹھ چکے تھے۔ کھانا مغرب کے فوراً بعد کھا لیا

کرتے تھے۔ ماموں فرقان کو دیکھ کر خوش ہوئے، بڑی محبت سے بولے۔

''آؤ بھئی، فرقان! بہت اچھے وقت پر آئے، کھانا کھاؤ۔''

ماموں فرقان اگرچہ عشاء کے بعد کھانا کھانے کے عادی تھے لیکن دادا غفور کی دعوت پر ان کا ساتھ دینے کے لئے فوراً دسترخوان پر بیٹھ گئے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ چار لقمے کھا کر اُٹھ جائیں گے لیکن دسترخوان پر ان کی پسند کی چیز موجود تھی۔ پائے وہ بہت شوق سے کھاتے تھے اور دادا غفور کے گھر بنے پایوں کا تو کوئی جواب نہ ہوتا تھا۔ وہ کھانے بیٹھے تو کھاتے چلے گئے، پھر پورا پیٹ بھر کر اُٹھے۔ دادا غفور کو ماموں فرقان کی یہی بے تکلفی بہت پسند تھی۔

کھانے کے بعد دادا کمرے میں چہل قدمی فرمانے لگے۔ دادا کو کھانا کھانے کے بعد ٹہلنے کی عادت تھی۔ ٹہلنے کے لئے وہ باہر نہ جاتے تھے، گھر میں ہی آدھا گھنٹہ ٹہل لیا کرتے تھے۔ ماموں فرقان آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے اور دادا غفور ٹہلتے ہوئے بولے۔

''بھئی، فرقان! تمہارے کاروبار کا کیا حال ہے؟''

''ٹھیک ہے، دادا! اللہ کا بڑا احسان ہے---'' ماموں فرقان نے موقع غنیمت جانا، فوراً بولے۔ ''دادا! مجھے آپ سے ایک بات کرنا تھی۔''

''ہاں، کہو کیا کہنا چاہتے ہو--- کیا دوسری شادی کرنے کا ارادہ ہے؟'' دادا غفور نے اپنی بڑی سیاہ آنکھوں سے انہیں مسکرا کر دیکھا۔

''ارے نہیں، دادا---!'' ماموں فرقان ہنس کر بولے۔

''پھر کیا معاملہ ہے؟'' دادا غفور اب سنجیدہ ہو گئے، دادا غفور نے انہیں درمیان میں ٹوکا، نہ کوئی سوال

حاصل مطالعہ

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ جب کوئی مر جاتا ہے اور اُس کے گھر والے رونا شروع کرتے ہیں تو ملک الموت اِس مکان کے دروازے پر کھڑے ہو کر کہتے ہیں کہ مَیں نے اِس کی روزی نہیں کھائی، یہ اپنی روزی ختم کر چکا تھا۔ مَیں نے اِس کی عمر ختم نہیں کر دی، یہ اپنی زندگی کے دن پورے کر چکا تھا۔ مجھے اِس گھر میں بار بار آنا ہے جب تک یہ سب ختم نہ ہو جائیں--- حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ خدا کی قسم! اگر گھر والے اِس وقت اِس فرشتے کو دیکھیں اور اُس کی باتیں سن لیں تو وہ مردے کو بھول جائیں اور اپنی فکر میں پڑ جائیں۔

حسن نواز زیدی سرگانہ، باگڑ سرگانہ

گئے۔

''میرا بھانجا ہے بابر علی، فرنیچر کا کاروبار کرتا ہے۔ اچھا بزنس ہے اس کا---'' ماموں فرقان نے کہا۔ ''اس کے بیٹے کی شادی تھی، گزشتہ کل ہی بارات لاہور سے واپس آئی ہے اور کل اس کا ولیمہ ہے۔''

''اچھا، پھر---؟''

دادا غفور نے ٹہلتے ٹہلتے ماموں فرقان کی طرف دیکھا۔

''اس شادی میں کچھ ایسے واقعات ہوئے ہیں کہ سب چکرا کر رہ گئے ہیں۔'' ماموں فرقان نے بتایا۔

''مسئلہ کیا ہے---؟'' دادا غفور نے پوچھا۔ ''ذرا تفصیل سے بتاؤ؟''

ماموں فرقان نے الف سے لے کر بے تک ساری داستان پوری تفصیل سے ان کے گوش گزار کر دی۔ دادا غفور ٹہلتے رہے اور ماموں فرقان کی بات پوری توجہ سے سنتے رہے۔ ماموں فرقان جب تک خود خاموش نہ ہو گئے، دادا غفور نے انہیں درمیان میں ٹوکا، نہ کوئی سوال

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کیا۔ جب وہ چپ ہو گئے تو دادا غفور نے پوچھا۔

"تمہاری سمجھ میں کیا آیا؟"

"میری سمجھ میں تو یہ آرہا ہے کہ نیلم پر اثر ہے۔ اثر کس قسم کا ہے، یہ آپ بتائیں گے؟"

"اچھا---" دادا غفور اچانک ٹہلتے ٹہلتے رک گئے، پھر وہیں کھڑے کھڑے اپنے پوتے ساجد کو آواز لگائی۔ "ساجد---!"

ان کی آواز سن کر دس بارہ سال کا ایک لڑکا فوراً اندر آیا۔ "جی، دادا---!"

"بیٹا! ایک شیشے کا گلاس اچھی طرح دھو کر اس میں پانی لاؤ۔" دادا غفور نے کہا۔

"جی دادا۔" ساجد نے بڑی فرمانبرداری سے کہا اور اندر چلا گیا۔

دادا غفور عملیات کے ماہر تھے۔ ماموں فرقان اور دادا غفور کی دوستی کا راز بھی انہی عملیات میں مضمر تھا۔ وہ دونوں اکٹھا بیٹھتے تو نہ جانے کب کب کے قصے چھڑ جاتے۔ دادا غفور اپنے پیر کے قصے سناتے جن کے یہاں جنوں کے بچے قرآن شریف پڑھنے آتے تھے۔ حاضرات کا علم دادا غفور نے انہی سے سیکھا تھا۔ ان کے پیر ہاتھ کے انگوٹھے پر حاضرات کیا کرتے تھے اور ذرا سے ناخن کے انگوٹھے پر دنیا دیکھ لیا کرتے تھے۔ دادا غفور اس علم کو پانی سے بھرے گلاس پر کیا کرتے تھے۔

ساجد پانی سے بھرا شیشے کا چمکتا گلاس ایک چھوٹی میز پر رکھ کر چلا گیا۔ دادا غفور نے وضو کیا، پھر باوضو ہو کر چوکی پر بیٹھ گئے۔ سودانے والی تسبیح نکالی، تسبیح کا ایک چکر کیا اور پھر ہاتھ کے اشارے سے ماموں فرقان کا گلاس اپنے سامنے چوکی پر رکھنے کو کہا۔ ماموں فرقان نے بہت احتیاط سے گلاس اُٹھا کر ان کے سامنے رکھ دیا۔ دادا غفور نے گلاس کو اپنے آگے کھسکا کر اور اپنے اوپر ایک سفید چادر ڈال لی۔ چادر انہوں نے اس طرح اپنے اوپر ڈالی تھی کہ وہ بالکل ڈھک گئے تھے۔

ماموں فرقان پورے اطمینان سے بیٹھے ان کو دیکھتے رہے، وہ اس عمل کو بارہا اپنے سامنے ہوتے دیکھتے رہے تھے۔ ہاں، کوئی نیا آدمی ہوتا تو بڑا حیران و پریشان ہوتا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ڈر کر کمرے سے بھاگ جاتا--- چادر سے اب کوئی آواز نہیں آرہی تھی لیکن ماموں فرقان کو معلوم تھا کہ وہ کچھ پڑھ رہے ہیں، وہ ان کا سر ہلتے دیکھ رہے تھے۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ گھر والوں کو منع کر دیا گیا تھا کہ کوئی دروازہ نہ کھٹکھٹائے۔ پھر اچانک انہوں نے چادر اُلٹ دی۔ ایسی سخت سردی میں بھی ان کی پیشانی پر پانی کے قطرے چمک رہے تھے۔ ماموں فرقان کی نظر جب پانی کے گلاس پر پڑی تو وہ ایک لمحے کو سہم کر رہ گئے۔ پانی کا رنگ سرخ ہو چکا تھا، ایسا لگ رہا تھا جیسے گلاس میں تازہ تازہ خون بھرا ہو۔

"یہ کیا، دادا---؟" ماموں فرقان نے پریشان ہو کر کہا۔

"کوئی فکر کی بات نہیں---" پسینے میں نہائے ہوئے ہونے کے باوجود مسکرا کر بولے۔ "ذرا اپنا رنگ دکھا رہا ہے۔"

"کون ہے وہ---؟" ماموں فرقان نے پوچھا۔

"ابھی صرف دھواں ہے۔" دادا غفور گلاس پر اپنی نظریں گاڑتے ہوئے بولے۔

"دھواں---؟" ماموں فرقان نے کہا۔

"ہاں، دھواں---" دادا غفور نے اپنی گہری سیاہ آنکھوں سے ماموں فرقان کو دیکھا۔ "خیر، کوئی بات نہیں۔ کب تک دھواں بنا رہے گا، کب تک سامنے نہیں آئے گا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ میرا اندازہ ٹھیک تھا، نیلم پر

کوئی اثر ضرور ہے۔"

"ہاں، دلہن کسی کے زیر اثر ہے---" دادا غفور نے یقین سے کہا۔ "یہی وجہ ہے کہ وہ دولہا کو دلہن کے پاس جانے نہیں دے رہا ہے۔ جب بھی دولہا، دلہن سے قریب ہونے کی کوشش کرتا ہے، وہ شعبدہ دکھا کر اسے ڈرا دیتا ہے، اسے دور کر دیتا ہے۔"

"آنکھوں کی بیماری بھی کیا دلہن سے دور رکھنے کی کوشش ہے؟" ماموں فرقان نے پوچھا۔

"حالات تو یہی بتاتے ہیں--- خیر، کوئی بات نہیں۔ میں تمہیں ایک فلیتہ دیتا ہوں۔ تم جا کر ذرا دلہن کے سامنے جلاؤ، پھر آ کر مجھے بتاؤ اور ہاں، آتے ہوئے دلہن کا کوئی استعمال شدہ کپڑا لیتے آنا۔ کوئی کمیض یا دوپٹہ وغیرہ۔" دادا غفور نے کہا۔

"---اور دولہا کے بارے میں کیا حکم ہے؟" ماموں فرقان نے پوچھا۔

"اس سے کہو کہ ذرا صبر سے کام لے، دلہن کے نزدیک نہ جائے ورنہ کسی بڑی مصیبت میں پھنسنے کا اندیشہ ہے۔ وہ جو کوئی بھی ہے، اب شعبدہ بازی سے براہِ راست نقصان پہنچانے پر اُتر آیا ہے۔"

"جی، ٹھیک ہے دادا! میں اسے ہدایت کر دوں گا---" یہ کہتے کہتے ان کی نظر گلاس پر پڑی تو وہ ایک دم چونک پڑے۔ "ارے، یہ کیا---؟"

"بس دیکھتے رہو---"

دادا غفور نے بڑے اطمینان سے کہا اور خود بھی گلاس کو غور سے دیکھنے لگے۔ گلاس کی سرخی غائب ہوتی جا رہی تھی اور گلاس کا پانی اوپر سے سفید ہو گیا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ پورا گلاس سفید ہو گیا۔ دادا غفور نے ماموں فرقان کو مسکرا کر دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، ایسے شعبدے میں نے بہت دیکھے ہیں--- پھر دادا غفور نے ایک پیلے رنگ کا کاغذ اپنی الماری سے نکالا اور اس پر قلم سے کچھ لکھا اور اس کاغذ کی اس طرح پڑیا بنا دی جیسے چنے بیچنے والے بناتے ہیں۔ اس لمبی سی بتی پر انہوں نے ایک لال دھاگا لپیٹ دیا۔ دھاگا لپیٹتے ہوئے وہ کچھ پڑھتے جا رہے تھے۔

"یہ لو فرقان---!" دادا غفور نے وہ فلیتہ ماموں کی طرف بڑھایا۔ "اسے دلہن کے سامنے جلانا اور اس سے کہنا کہ اس جلتے ہوئے فلیتے کو دیکھے۔ فلیتے کو دیکھنے سے پہلے کمرے کو بند کر لینا۔" دادا غفور نے ہدایت کی۔

"کیا دلہن کو اس جلتے فلیتے میں کچھ نظر آئے گا؟" ماموں فرقان نے پوچھا۔

"ہاں، نظر تو آنا چاہئے---"

پھر دادا غفور نے ماموں فرقان کو کچھ پڑھنے کو بتایا۔ ماموں فرقان نے اس فلیتے کو اپنی کوٹ کی جیب میں رکھا اور دوسرے دن "رپورٹ" دینے کا وعدہ کر کے ان کے فلیٹ سے نکل آئے۔

اتفاق کی بات کہ بلڈنگ کی سیڑھیاں اُترتے ہی نیچے سڑک پر ایک خالی ٹیکسی مل گئی اور اس نے گلشن اقبال چلنے پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ ایسے حسین اتفاق کراچی میں کم ہی میسر آتے ہیں--- گلشن اقبال پہنچے تو عشاء کا وقت ہو چکا تھا۔ ماموں فرقان نے سب سے پہلے عشاء کی نماز پڑھی۔ نماز سے فارغ ہوئے تو بابر علی نے کہا۔

"ماموں! کھانا میز پر لگ چکا ہے، آپ کا انتظار ہے۔"

"بھئی، میں دادا غفور کے ہاں سے کھانا کھا کر آرہا ہوں۔ تم لوگ کھاؤ، مجھے ابھی کچھ پڑھنا ہے۔"

"اچھا، ماموں! ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر بابر علی کمرے سے نکل گئے۔

ماموں فرقان عشاء کی نماز کے بعد جو پڑھتے تھے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ تو انہوں نے پڑھا ہی، وہ بھی پڑھا جو دادا غفور نے بتایا تھا۔ ادھر ماموں فرقان اپنے پڑھنے پڑھانے سے فارغ ہوئے، اِدھر وہ لوگ کھانا کھا کر اس کمرے میں آ گئے۔ بابر اور صابرہ کو دیکھ کر ماموں فرقان نے پوچھا۔

"اکبر کہاں ہے؟"

"وہ کمرے میں ہے، آنکھیں بند کئے لیٹا ہے۔" صابرہ نے بتایا۔

"ذرا بلاؤ اسے۔" ماموں فرقان نے کہا۔

"اچھا، میں بلاتی ہوں۔" صابرہ اُٹھتے ہوئے بولیں۔

"دادا غفور سے آپ کی کوئی بات ہوئی؟" بابر علی نے صابرہ کے جانے کے بعد پوچھا۔

"ہاں، بڑی تفصیل سے ہوئی ہے--- معاملہ بڑا سنگین ہے۔" ماموں فرقان نے جواب دیا۔

"کیا مطلب---؟" بابر علی فکرمند ہو گئے۔

"مطلب یہ کہ نیلم پر اثر ہے۔" ماموں فرقان نے وضاحت کی۔

اتنے میں کمرے میں اکبر داخل ہوا۔ اس نے آنکھوں پر تاریک شیشوں کا چشمہ لگایا ہوا تھا۔ اس نے ماموں فرقان کو دیکھ کر سلام کیا اور ایک صوفے پر خاموشی سے بیٹھ گیا۔

"اکبر! کیا حال ہے۔" ماموں فرقان نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"ماموں! بہت برا حال ہے، آنکھوں کی تکلیف بھی ختم نہیں ہوئی۔" اکبر نے افسردگی سے کہا۔

"ذرا آنکھیں دکھاؤ۔" ماموں فرقان بولے۔

اکبر نے آنکھوں سے چشمہ ہٹا دیا۔ اس کی آنکھیں اس قدر سرخ اور گلی گلی سی ہو رہی تھیں کہ ماموں فرقان سے دیکھا نہ گیا، انہوں نے فوراً اپنا منہ پھیر لیا۔

"تمہاری آنکھیں تو بہت خراب ہو رہی ہیں---" ماموں فرقان نے کہا۔ پھر ہاتھ بڑھا کر اپنے سامنے رکھا ہوا پانی اکبر کی طرف بڑھایا۔ "لو، اسے پی لو۔"

اکبر نے پڑھا ہوا پانی پیا تو اسے اپنی آنکھوں میں کچھ ٹھنڈک کا احساس ہوا۔

"ماموں! یہ پانی تو بہت اچھا ہے، میری آنکھوں میں ایک دم ٹھنڈک سی پڑ گئی۔" اکبر نے خوش ہو کر کہا۔

"میں ابھی اور پانی پڑھ دوں گا۔ تم اسے بوتل میں ڈال کر رکھ لینا اور اسے بغیر پڑھے پانی میں ڈال کر پیتے رہنا---" ماموں فرقان نے کہا۔ "دو تین دن میں تمہاری آنکھیں صاف ہو جائیں گی۔ اب تم اپنے کمرے میں جا کر سو جاؤ، نیلم کے کمرے میں دو تین دن نہ جاؤ تو اچھا ہے۔"

ماموں فرقان کا اتنا کہنا کافی تھا، اکبر ان کی بات کو سمجھ گیا۔ ماموں فرقان کی بات سمجھ کر اس پر اوس پڑ گئی لیکن اب مجبوری تھی۔ حالات اور واقعات جس طرح پیش آ رہے تھے، اس کے پیش نظر نیلم سے دور ہی رہنا بہتر تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا، یہی چاہتا تھا۔ اکبر اپنی بدنصیبی کو کوستا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

"ماموں فرقان دادا غفور کے پاس سے آ رہے ہیں---" بابر علی اکبر کے جانے کے بعد صابرہ سے مخاطب ہوئے۔ "ان کا خیال ہے کہ نیلم پر اثر ہے--- کیوں، ماموں---؟"

"ہاں، یہ بات بالکل ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر ماموں فرقان نے دادا غفور کے یہاں جو کچھ ہوا تھا اور انہوں نے جو کچھ کہا تھا، وہ سب پوری تفصیل کے ساتھ دونوں میاں بیوی کو بتا دیا۔

ساری باتیں سن کر بابر علی پریشان ہو گئے لیکن صابرہ پر اس کا کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ انہوں نے کہا۔

"ماموں! میں نہیں مانتی اس اثر وثر کو---"

"ہاں، تم مت مانو، میں کب کہہ رہا ہوں کہ مانو۔ تمہارے ماننے سے اثر ختم ہو جائے تو شاید میں اصرار بھی کرتا---" ماموں فرقان نے ہنس کر کہا۔ "تم بس اتنا کرو کہ دو تین دن نیلم کو اپنے پاس سلاؤ۔ اکبر کو اس سے دور رکھنا ہے ورنہ اسے کوئی شدید قسم کا نقصان پہنچ سکتا ہے۔" یہ کہہ کر فرقان ماموں نے گھڑی دیکھی۔ "خاصا وقت ہو گیا ہے، مجھے گھر بھی پہنچنا ہے۔ تم اب مجھے نیلم کے کمرے میں لے چلو، مجھے فلیتہ جلانا ہے۔"

"اچھا، میں کمرہ خالی کراتی ہوں۔ کچھ پڑوس کی لڑکیاں آئی ہوئی ہیں۔" یہ کہہ کر صابرہ کمرے سے نکل گئیں۔

"ماموں! یہ صابرہ عجیب مٹی کی بنی ہے، کسی چیز کو مانتی ہی نہیں۔" بابر علی نے کہا۔

"بھئی، تمہیں تو مانتی ہے، کیا اتنا کافی نہیں؟" ماموں فرقان نے ہنس کر جواب دیا۔

"آیئے، ماموں---!" صابرہ نے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔

"اچھا---" ماموں فرقان اُٹھتے ہوئے بولے۔ "نیلم کس کمرے میں ہے؟"

"آیئے، میرے ساتھ۔" صابرہ نے کہا۔

ماموں فرقان نیلم کے کمرے میں پہنچے تو وہاں راشدہ بھی موجود تھی۔ دونوں نے ماموں فرقان کو سلام کیا۔ ماموں نے سلام کا جواب دے کر راشدہ کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ راشدہ خاموشی سے اُٹھ کر باہر چلی گئی۔ صابرہ اور بابر علی بھی کمرے سے باہر نکل آئے اور دروازہ باہر سے بند کر لیا۔

کمرے کا دروازہ بند ہوتے ہی نیلم کی حالت ایک

اخلاقیات

حضرت جنید بغدادیؒ خلیفہ بغداد کے دربار میں پہلوان تھے۔ ایک دن وہ دربار میں بیٹھے تھے۔ وہاں ایک دُبلا پتلا سا آدمی آیا اور خلیفہ وقت سے کہا کہ مَیں جنیدؒ کے ساتھ کشتی لڑنا چاہتا ہوں۔ دربار میں جو لوگ بیٹھے تھے ہنس پڑے۔ کہنے لگے کہ اپنا وجود دیکھ تو اتنے بڑے پہلوان کے ساتھ کشتی کرے گا؟--- اس نے کہا کہ جناب! مجھے کچھ ایسے داؤ آتے ہیں جو اور پہلوان نہیں جانتے۔ حضرت جنیدؒ بھی یہ بات سن کر بہت حیران ہوئے اور سوچا' اللہ جانے کون سا داؤ اسے آتا ہے؟--- چنانچہ وقت طے ہو گیا اور خلیفہ بھی وہاں پہنچ گیا۔ وہ کمزور' دُبلا پتلا آدمی مشکل سے کھڑا ہو سکتا تھا' وہ بھی آ گیا میدان میں۔ حضرت جنیدؒ لنگر لنگوٹ کس کے آگے تو اُس نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ اُنہوں نے ہاتھ پکڑ کر سلام کیا۔ ایک دوسرے سے ملے' سلامی لینا جسے کہتے ہیں اور جب حضرت جنید بغدادیؒ کا مضبوط ہاتھ آگے بڑھا تو وہ ذرا پیچھے ہٹ گیا۔ پھر اُس نے ایک چھلانگ لگائی اور اُن کے گلے سے لپٹ گیا۔ جب لٹک گیا' تو اُن کے کان کے پاس منہ کر کے کہنے لگا۔

"مَیں سات دنوں سے بھوکا ہوں' میرے پاس روزگار کا کوئی ذریعہ نہیں۔ یہ ڈھونگ میں نے اِس لئے رچایا ہے تا کہ مَیں لوگوں کو دکھا سکوں کہ میری کوئی عزت ہے۔"

جنید بغدادیؒ نے یہ سنا' تو زمین پر دھڑ کر کے گرے اور اُس سے ڈھے گئے۔ وہ اُن کے سینے پر چڑھ کر بیٹھ گیا اور تالی بج گئی۔ دُنیا حیران پریشان ہو گئی' یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ جنید بغدادیؒ نے کہا کہ ٹھیک ہے' اِس کو واقعی ایسا داؤ آتا ہے جو دُنیا میں کسی کو نہیں آتا۔ خلیفہ نے انعامات اکرام خلعت وغیرہ عطا کر دی اور حضرت جنیدؒ تولیہ اور صافہ جو گلے میں تھا' جھاڑتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"اے اللہ! مَیں نے زندگی میں کبھی کوئی ایسا بڑا کام نہیں کیا لیکن تیرے ایک بندے کی عزت رکھی ہے۔"

اِس کے بدلے اللہ تعالیٰ نے اُنہیں بہت بڑا روحانی درجہ عطا فرمایا اور ولی کامل ہوئے۔

روبینہ کوثر' سرگودھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دم بدل گئی۔ ابھی وہ لجائی شرمائی سی بیٹھی تھی، دروازہ بند ہوتے ہی اس نے اپنا سر اُٹھایا اور غصے بھری نظروں سے ماموں کو دیکھا۔ ماموں فرقان نے اس غصے بھری نظروں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی کوٹ کی جیب سے فلیتہ نکالا۔ فلیتے کو دیکھ کر نیلم زور سے ہنسی۔ بڑی بڈیانی سی ہنسی تھی، اس کی آواز بھی بدلی ہوئی تھی۔ ماموں فرقان نے سیدھے ہاتھ میں فلیتہ پکڑ لیا اور بائیں ہاتھ سے جیب سے ماچس نکالنے لگے۔ اب نیلم نے شرم وحیا کو بالائے طاق رکھ کر اپنا دوپٹہ سر سے اُتار کر دور پھینک دیا۔ غصے سے ایک مرتبہ پھر ماموں فرقان کو دیکھا اور بولی۔

''کیا کرتا ہے۔---؟'' یہ آواز نیلم کی نہ تھی، ایک مردانہ آواز تھی۔

''کچھ نہیں، فلیتہ جلا رہا ہوں---'' ماموں فرقان نے بڑے سکون سے کہا۔ ''تم کیوں ناراض ہو رہی ہو؟''

''ہو نہیں رہی، ہو رہا ہوں۔'' نیلم نے پھر کرخت مردانہ آواز میں جواب دیا۔

''کون ہو تم---؟'' ماموں فرقان نے دیا سلائی جلاتے ہوئے پوچھا۔

''دیکھ، فرقان! ہمارے معاملے میں نہ پڑو ورنہ بہت پچھتائے گا۔''

نیلم نے غصے سے کہا۔ اس کی نظریں جلتی تیلی پر تھیں تبھی تیلی بھڑک کر بجھ گئی۔

''اچھا، شعبدے باز شروع ہو گئی---'' ماموں فرقان نے بجھتی ہوئی تیلی کو ایک طرف پھینکتے ہوئے کہا۔ ''یاد رکھو، میں اکبر نہیں ہوں۔''

''ہاں، جانتا ہوں کہ تُو اکبر نہیں ہے، تُو اکبر کا دادا ہے---'' نیلم نے کہا۔ ''تیرے حق میں یہی بہتر ہے کہ تو کنارہ کش ہو جا۔''

ماموں فرقان نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ انہوں نے خاموشی سے تیلی جلائی اور اس کے شعلے کو فلیتے کے قریب لے آئے تبھی تیلی بجھ گئی۔ یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے پھونک مار کر بجھا دی ہو حالانکہ نیلم اپنی جگہ سے ہلی نہیں تھی۔

''اچھا، یہ بات ہے---'' ماموں فرقان کو بھی غصہ آ گیا۔ ''اب بجھا کر دکھا تو جانوں۔'' یہ کہہ کر ماموں فرقان نے ماچس سے ایک تیلی اور نکالی اور اس کے مصالحے پر کچھ پڑھ کر پھونکا، پھر تیلی جلانے سے پہلے بولے۔ ''تُو کون ہے؟''

نیلم نے ماموں فرقان کے سوال کا جواب نہ دیا۔ وہ بڑی حیرت سے تیلی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ماموں فرقان نے ماچس پر تیلی رگڑی، شعلہ بھڑکا اس سے پہلے کہ تیلی بجھانے کی کوشش کی جاتی، ماموں فرقان نے فلیتے کو آگ دکھا دی۔ فلیتہ جل اُٹھا۔ ماموں فرقان نے جلتے فلیتے کو نیلم کی آنکھوں کے سامنے کیا اور سختی سے بولے۔

''ہاں، اب بتا کہ تم کون ہو؟''

''میں سیّد پور کا جن ہوں---فرقان! مجھ سے فکر نہ لے، میں تیری زندگی خراب کر دوں گا۔''

نیلم نے یہ کہتے ہوئے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا اور بے ہوش ہو گئی۔ فلیتہ اب پورا جل چکا تھا۔ کمرے میں دھواں ہی دھواں تھا۔ اتنا دھواں کمرے سے باہر نکل رہا تھا، لگتا تھا جیسے کمرے کے اندر آگ لگ گئی ہو---

ماموں فرقان دروازے کی طرف بڑھے۔ انہوں نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ باہر سے بند تھا۔ ماموں فرقان نے ہاتھ سے دروازہ بجایا، فوراً ہی دروازہ کھول دیا گیا۔

''کیا ہوا، ماموں؟'' صابرہ کی پریشان صورت نظر آئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کچھ نہیں، ایک گلاس میں پانی لاؤ۔" ماموں فرقان نے کہا۔

صابرہ جلدی سے پانی لے آگئی۔ بابر علی کمرے میں داخل ہو چکے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ نیلم بے ہوش پڑی ہے اور کمرے میں دھواں ہی دھواں بھرا ہے---

ماموں فرقان نے صابرہ سے گلاس ہاتھ میں لے کر کچھ پڑھا، پانی پر پھونکیں ماریں اور نیلم کے چہرے پر کئی بار چھینٹے دیئے۔ چند لمحوں کے بعد نیلم نے آنکھیں کھول دیں اور حیران ہو کر چاروں طرف دیکھا۔ پھر فوراً ہی اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ ماموں فرقان نے گلاس اس کی طرف بڑھایا اور بولے۔

"لو، بیٹی! پانی پی لو۔"

نیلم نے ماموں فرقان کے ہاتھ سے گلاس لے لیا اور صدیوں کے پیاسے کی طرح غٹ غٹ پانی پی گئی۔ اس کا حلق سوکھ رہا تھا، زبان پر جیسے کانٹے سے چبھ رہے تھے۔ پانی پیا تو کچھ ہوش بحال ہوئے۔

"مجھے کچھ ہو گیا تھا کیا؟" نیلم نے صابرہ سے پوچھا۔

"ہاں، بیٹی! تم بے ہوش ہو گئی تھیں۔" ماموں فرقان نے کہا۔

"یہ کمرے میں دھواں کیسا بھرا ہے؟"

"ابھی نکل جائے گا، تم پریشان مت ہو۔" ماموں فرقان نے کہا۔

"ماموں! ابھی آپ میرے کمرے میں آئے تھے۔ پھر خالہ، خالو باہر چلے گئے تھے۔ اتنا مجھے یاد ہے اس کے بعد کیا ہوا، یہ مجھے یاد نہیں۔ کیا میں بے ہوش ہو گئی تھی؟" نیلم نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"بس میں تم سے کچھ بات کر رہا تھا کہ تم بات کرتے کرتے بے ہوش ہو گئیں---" ماموں فرقان نے بات ٹالنے کے لئے کہا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ نیلم کو ابھی یہ بتایا جائے کہ تم پر جن کا سایہ ہے۔ پھر وہ ہنستے ہوئے بولے۔ "نیلم! تم پریشان مت ہو، میرے ہوتے ہوئے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔"

پھر انہوں نے نیلم کے کمرے سے باہر آ کر باہر، صابرہ اور اکبر کے سامنے بند کمرے کی روداد سنائی۔ صابرہ نے کوئی بات پوچھنا چاہی تو بابر علی نے انہیں ڈانٹ دیا۔

"صابرہ! پلیز، اب کوئی اُلٹی سیدھی بات نہ کرنا۔ معاملہ بہت سنگین ہو گیا ہے۔"

صابرہ نے یہ سن کر خاموشی اختیار کر لی۔ جو کچھ انہوں نے فرقان ماموں کے منہ سے سنا تھا، اس پر انہیں یقین کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا لیکن حالات ایسے تھے کہ یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا--- ماموں فرقان تھوڑی دیر وہاں اور ٹھہرے۔ انہوں نے نیلم کا استعمال شدہ دوپٹہ لیا اور کل ولیمے میں ملاقات کا وعدہ کر کے گھر سے نکلنا چاہا تو بابر علی نے انہیں روکا۔

"ٹھہریں، ماموں! میں آپ کو چھوڑ آتا ہوں--- راشدہ! ذرا گاڑی کی چابی لانا۔"

ماموں فرقان نے منع بھی کیا کہ وہ آرام سے چلے جائیں گے، کوئی ٹیکسی لے کر لیکن بابر علی نہ مانے۔ وہ انہیں ان کے گھر تک چھوڑ کر ہی گئے۔

دوسرے دن وہ شام کو ولیمے میں شرکت سے پہلے دادا غفور کے یہاں پہنچے۔ انہوں نے دادا غفور کو نیلم کا دوپٹہ دیا اور فلیتہ جلانے سے پہلے اور جلانے کے بعد جو کچھ نیلم سے گفتگو ہوئی، وہ دادا غفور نے گوش گزار کر دی۔ دادا غفور نے فرقان ماموں کی ایک ایک بات غور سے سنی۔

"میرا خیال تھا کہ ظاہر ہونے میں کچھ وقت لے گا

لیکن وہ تو فلیتہ ہی دیکھ کر پکار اُٹھا---" دادا غفور نے ماموں فرقان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "تو وہ سید پور کا جن ہے--- نام نہیں بتایا اس نے؟"

"نہیں---" ماموں فرقان نے کہا۔ "نام پوچھنے سے پہلے ہی وہ نیلم کا جسم چھوڑ گیا۔"

"فرقان! کچھ کرنا پڑے گا، بھئی---" دادا غفور نے فکر مند ہو کر کہا۔ "نہیں تو وہ لڑکی کو تباہ کر کے رکھ دے گا--- تم نے دولہا کو تو دور رہنے کی ہدایت کر دی تھی؟"

"جی، دادا---!" فرقان ماموں نے جواب دیا۔ "زندگی لڑکی کی ہی نہیں، لڑکے کی بھی تباہ ہو گی۔"

"اچھا، تم یوں کرو کہ نیلم کا دوپٹہ چھوڑ جاؤ۔ میں ذرا اثرات کی گہرائی کا اندازہ کر لوں، پھر کچھ کریں گے۔ ہمیں بہر حال دولہا دلہن کو اس خبیث سے نجات دلانا ہو گی۔"

"ٹھیک ہے، پھر میں کل آؤں گا۔" ماموں فرقان نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"سنو، وہ دولہا دلہن کے نام کیا ہیں؟" دادا غفور نے پوچھا۔

"دلہن کا نام نیلم اور دولہا کا نام اکبر ہے۔" ماموں فرقان نے بتایا۔

"---اور نیلم کی ماں کا کیا نام ہے؟" دادا غفور نے پھر پوچھا۔

"واجدہ---!" ماموں فرقان نے بتایا۔

"اکبر کی والدہ کا نام کیا ہے؟" دادا غفور نے دوبارہ پوچھا۔

"صابرہ---!" ماموں فرقان نے پھر بتایا۔

"نام سے تو یہ دونوں بہنیں معلوم ہوتی ہیں؟" دادا غفور نے خیال ظاہر کیا۔

"جی ہاں، واجدہ اور صابرہ آپس میں سگی بہنیں ہیں۔" ماموں فرقان نے تصدیق کی۔

"ٹھیک ہے۔ اب تم جاؤ، پھر کل ملاقات ہو گی۔"

دادا غفور نے انہیں جانے کی اجازت دے دی۔ ماموں فرقان جب دادا غفور کے فلیٹ سے نیچے اُتر رہے تھے تو سیڑھی پر ان کا توازن بگڑا، انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے پیچھے سے انہیں دھکا دیا ہو۔ سیڑھیوں پر زیادہ روشنی نہ تھی، انہوں نے فوراً دیوار کا سہارا لیا اور پیچھے مڑ کر دیکھا مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ ماموں فرقان نے اپنا وہم سمجھ کر محتاط طریقے سے سیڑھیاں اُترنے لگے--- ٹیکسی میں بیٹھ کر اچانک انہیں دلدار بٹ یاد آ گیا۔ دلدار بٹ نے انہیں جو کچھ بتایا تھا، اس کا تذکرہ انہوں نے ابھی کسی سے نہیں کیا تھا۔ خیال آیا کہ دادا غفور کو بتا دینا چاہئے تھا۔ خیر، کوئی بات نہیں، کل ان کو اس حقیقت سے آگاہ کر دیا جائے گا۔

☆☆

ولیمہ راشد منہاس روڈ پر بنے ایک بہت بڑے شادی ہال میں تھا۔ فرقان ماموں نے گھڑی دیکھی اور اندازہ لگایا کہ ابھی یہ لوگ شادی ہال نہیں پہنچے ہوں گے لہٰذا انہوں نے سوچا کہ گھر ہی چلا جائے۔

گھر پہنچے تو فرقان ماموں کو معلوم ہوا کہ لاہور سے بھی مہمان پہنچ چکے ہیں۔ اب یہی وہ وقت تھا کہ وہ تمام حقائق سے بابر علی کو آگاہ کر دیں۔ ماموں فرقان، بابر علی کو گھر سے باہر لے آئے اور بولے۔

"مجھے تنہائی میں تم سے کچھ بات کرنا تھی۔"

"جی، ماموں! فرمائیں، اس وقت یہاں میرے آپ کے سوا کوئی نہیں ہے۔" بابر علی نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے کہا۔

"لاہور میں جب بھی صبح کی سیر کو نکلا تھا تو مجھے ایک شخص ملا تھا۔ وہ خود کو فیاض کا پڑوسی کہتا تھا اور نام اس کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ولدار بٹ تھا۔ اس نے نیلم کے بارے میں ایک عجیب انکشاف کیا تھا۔۔۔" ماموں فرقان نے بتایا۔

"وہ کیا، ماموں۔۔۔؟" بابر علی نے فکر مند ہو کر پوچھا۔

"اس نے کہا تھا کہ نیلم واجدہ اور فیاض حسین کی سگی بیٹی نہیں ہے۔۔۔"

ماموں فرقان نے انکشاف کیا اور یہ انکشاف کسی بم کے دھماکے سے کم نہ تھا۔ بابر علی چکرا کر رہ گئے۔

"نہیں، ماموں! یہ کیسے ہوسکتا ہے؟" انہوں نے کہا۔

"کیوں نہیں ہوسکتا؟ اس دنیا میں سب کچھ ممکن ہے۔۔۔"

"ماموں! ذرا سوچیں، واجدہ صابرہ کی سگی بہن ہے، وہ اپنی بہن کی آنکھوں میں کسی طرح دھول جھونک سکتی ہے؟"

"ہوسکتا ہے، واجدہ سے اس مسئلے پر کبھی پوچھا ہی نہ گیا ہو۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ از خود یہ سوچ لیا ہو کہ نیلم واجدہ کی ہی بیٹی ہے۔"

"نہیں، ہم نے از خود نہیں سوچا۔۔۔ خود یہ قیاس کر کے نہیں بیٹھ گئے کہ نیلم، واجدہ کی سگی بیٹی ہوگی بلکہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ نیلم مری میں پیدا ہوئی تھی۔ ڈاکٹر نے واجدہ کو ہدایت کی تھی کہ وہ کسی صحت افزا مقام پر رہے۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے پیش نظر ہی واجدہ مری چلی گئی تھی اور وہاں نیلم پیدا ہوئی تھی۔ مری سے واپسی پر اس کا خط آیا تھا جس میں نیلم کے بخیر و عافیت پیدا ہونے کا ذکر تھا اور اب آپ کہہ رہے ہیں کہ نیلم، واجدہ کی بیٹی نہیں ہے۔۔۔ میں اس بات کو کس طرح مان لوں؟"

"ماننے کو تو میرا دل بھی نہیں چاہ رہا۔ میں نے بھی

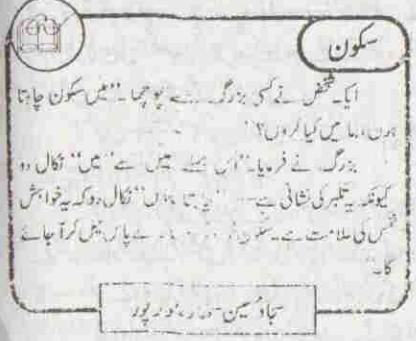

سکون

ایک شخص نے کسی بزرگ سے پوچھا۔ "میں سکون چاہتا ہوں، بتائیں کیا کروں؟"

بزرگ نے فرمایا۔ "اس جملے میں سے "میں" نکال دو کیونکہ یہ تکبر کی نشانی ہے۔۔۔ "چاہتا ہوں" نکال دو کہ یہ خواہش نفس کی علامت ہے۔ سکون [illegible] پاس چل کر آجائے گا۔"

سجاد حسین۔ [illegible]

اس معاملے میں اس سے بہت بحث کی تھی کہ ایسا کیسے ممکن ہے۔ پھر اس نے بتایا تھا کہ وہ نیلم کی اصل ماں کو جانتا ہے اور اگر مجبوری نہ ہوتی تو وہ مجھے اس کی اصل ماں سے ملوا دیتا۔" ماموں فرقان نے بتایا۔

"مجبوری کیا تھی۔۔۔؟" بابر علی نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"اس کی اصل ماں کا انتقال ہو چکا ہے۔" ماموں فرقان نے جواب دیا۔

"چلو، قصہ ہی ختم ہوا۔۔۔" بابر علی نے مذاق کے انداز میں کہا۔ "۔۔۔اور باپ۔۔۔؟"

"وہ ماں کے مرنے سے پہلے ہی اللہ کو پیارا ہو چکا ہے۔"

"ماموں! پھر بھی آپ نے اس بدمعاش کی بات پر یقین کر لیا؟۔۔۔ ماموں! یہ صرف تعلقات خراب کرانے کی کوشش ہے، اس کے سوا کچھ نہیں۔ ایک طرف الزام لگا دیا کہ نیلم واجدہ کی سگی بیٹی نہیں، دوسری طرف اس کے والدین کو مار دیا۔ اب کر لو کیا کرو گے، کس طرح تصدیق کرو گے۔۔۔" بابر علی نے غصے سے کہا۔

"ماموں! آپ نے مجھے فوراً کیوں نہیں بتایا، میں ذرا اس کمینے سے نمٹتا۔"

"میں نے اس لئے نہیں بتایا کہ خواہ مخواہ بدمزگی پیدا ہوگی۔"

"بدمزگی تو اس صورت میں ہوتی اگر یہ بات سچی ہوتی۔۔۔ اسی وقت اگر آپ بتا دیتے تو وہ ولدار کا بچہ فوراً ایکسپوژ ہو جاتا، اس کے عزائم سامنے آجاتے۔ ساری بات کھل کر فیاض کے سامنے ہو جاتی۔"

"بس میں نے چاہا نہیں۔۔۔ ویسے اس طرح کی بات پر یقین نہ تھا، مجھے میں نے اسے ایک پڑوسی کی دشمنی پر محمول سمجھتے ہوئے خاموشی اختیار کر لی تھی۔"

"لیکن اس وقت تو آپ اس انداز سے بات کر رہے ہیں جیسے آپ کو بھی نیلم کے واجدہ کی سگی اولاد نہ ہونے کا یقین ہو؟" بابر علی نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

"ہاں، تم ٹھیک اندازہ لگایا ہے۔ مجھے اب شبہ ہونے لگا ہے کہ نیلم واقعی واجدہ کی بیٹی نہیں ہے۔۔۔ بابر! ہمیں چاہئے کہ اس معاملے کی کھوج کریں۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ اگر نیلم واجدہ کی سگی بیٹی نہ نکلے تو اسے فوراً طلاق دلوا دی جائے۔ ایسی احمقانہ بات میں تصور میں بھی نہیں لاسکتا۔ اب وہ واجدہ کی بیٹی ہے یا نہیں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ ہماری بہو ہے، ہماری عزت ہے۔"

"ماموں! آپ کے اس شبہ کی وجہ کیا ہے؟" بابر علی نے پوچھا۔

"بابر! تم کسی سید پور سے واقف ہو؟"

"نہیں، ماموں! میں نہیں جانتا کہ سید پور کہاں ہے۔"

"سید پور کا خیر مجھے بھی معلوم نہیں کہ کہاں ہے لیکن ولدار نے بتایا تھا کہ نیلم کی ماں سید پور کی رہنے والی تھی اور نیلم پر جس جن کا سایہ ہے، وہ بھی سید پور کا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ جن نیلم پر سید پور سے آنا شروع ہوا۔ اب اس بات کا سراغ لگانا چاہئے کہ نیلم کا سید پور سے کیا تعلق ہے۔"

"اس کا سید پور سے کیا تعلق ہوسکتا ہے؟" بابر علی نے سوچتے ہوئے کہا۔

"نیلم کا سید پور سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے۔ تم ذرا اس مسئلے پر واجدہ سے بات کر کے دیکھو۔"

"بات تو خیر میں ابھی آپ کے سامنے کر لیتا، بس ذرا ولیمے کا خیال ہے۔ ولیمہ ہو جائے تو پھر رات کو بات کروں گا اور صبح میں آپ کو بتا دوں گا۔۔۔ ٹھیک ہے۔"

"ہاں، یہ ٹھیک ہے۔ بات کرتے ہوئے اس بات کا خیال رکھنا کہ جھگڑا نہ بڑھے۔" ماموں فرقان نے ہدایت کی۔

"نہیں، جھگڑا نہیں بڑھے گا۔ جھگڑے کی کوئی بات نہیں ہے۔ پہلے تو میں باتوں باتوں میں یہ معلوم کروں گا کہ یہ سید پور کہاں ہے۔ سید پور کے پیچھے کوئی کہانی موجود ہے تو واجدہ چونکے بغیر نہ رہ سکے گی، واجدہ کے رویے سے معلوم ہو جائے گا کہ سید پور کا کیا چکر ہے۔"

"ہاں، یہ طریقہ اچھا ہے۔ واجدہ سے انجان بن کر بات کرنا۔ جو ہوگا، سامنے آجائے گا۔"

"اگر یہ بات آپ کے سامنے ہوتی تو اچھا ہوتا، آپ کو ولدار بٹ کے حوالے سے بات کرنے میں آسانی ہوتی۔"

"نہیں، ابھی میں سامنے نہیں آنا چاہتا۔۔۔ تم فی الحال سید پور کا بم چھوڑ کر واجدہ فیاض حسین کا رد عمل دیکھو بلکہ واجدہ اور فیاض حسین سے الگ الگ بات کرو تو زیادہ بہتر ہے۔ اگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو تو پھر میں درمیان میں آؤں گا اور براہ راست اس مسئلے پر بات کروں گا۔"

"چلئے ٹھیک ہے۔۔۔" بابر علی نے گھر کی طرف

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بڑھتے ہوئے کہا۔ ''آیئے، گھر چلیں---''

صابرہ بابر علی کو ماموں فرقان کے ساتھ دیکھ کر خاموش ہوگئی۔ انہیں اپنے شوہر کے اس طرح غائب ہو جانے پر بڑا غصہ آرہا تھا، بھلا یہ بھی کوئی بات تھی کہ لوگ ولیمے میں جانے کے لئے کھڑے ہیں اور وہ جناب غائب ہو گئے--- ماموں فرقان نے صابرہ کا چہرہ دیکھ کر اندازہ لگایا کہ اسے اس وقت غصہ آرہا ہے، وہ ہنستے ہوئے بولے۔

''اس غریب کو معاف کردو، یہ میرے ساتھ تھا۔''

''کوئی بات نہیں تھی، ماموں---!'' صابرہ نے کہا۔ ''آیئے، سب تیار ہیں۔''

شادی ہال پر پہنچے تو خاصے مہمان آچکے تھے۔ دس بجے کے قریب کھانا شروع ہوا، کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد تصویریں اُتاری گئیں۔ اکبری آنکھوں پر سیاہ چشمہ دیکھ کر سب کو پریشانی ہوئی، سب نے اس سے باری باری پوچھا۔ وہ بے چارہ آنکھوں کا حال بتاتا بتاتا بے حال ہوگیا۔ کیمروں کی روشنی اس کی آنکھوں میں بجلی بن کر کوند رہی تھی۔ تاریک شیشوں کا چشمہ چڑھانے کے باوجود لائٹ اس کی آنکھوں میں بری طرح چبھ رہی تھی لیکن وہ تصویریں اُتروانے پر مجبور تھا۔

ولیمہ بخیر و عافیت اپنے انجام کو پہنچا۔ ساڑھے گیارہ بجے یہ لوگ اپنے گھر پہنچ گئے۔ فرقان ماموں کھانے کے فوراً بعد اپنے اہل خانہ کے ساتھ اپنے گھر عزیز آباد چلے گئے۔

کوئی ایک بجے تک سب لوگ کمرے میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ کافی کا دور بھی چلا۔ اس گفتگو کے دوران بابر علی خاصے بے چین دکھائی دے رہے تھے۔ وہ چاہ رہے تھے کہ کسی طرح واجدہ کمرے میں تنہا رہ جائے تو وہ اس سے سیّد پور کا ذکر چھیڑیں لیکن واجدہ کے تنہا رہ جانے کا کوئی سوال نہ تھا۔ ہاں، اتنا ضرور ہوا کہ آہستہ آہستہ کمرے میں رش کم ہوگیا--- اب کمرے میں وہ چاروں رہ گئے۔ واجدہ اور فیاض حسین، صابرہ اور بابر علی۔ بابر علی کے دل سے دھواں سا اُٹھ رہا تھا جب ماموں فرقان نے نیلم کے سلسلے میں انکشاف کیا تھا۔ بابر علی کو یہ جان کر بہت افسوس ہوا تھا۔ افسوس اس بات کا زیادہ تھا کہ بہن نے بہن کو دھوکا دیا تھا۔ اگرچہ ابھی اس بات کی تصدیق نہ ہو پائی تھی لیکن جانے کیوں انہیں یقین سا ہوتا جارہا تھا کہ ماموں فرقان نے جو کچھ کہا ہے، حقائق پر مبنی ہے۔ بابر علی ابھی اکیلے ہی اس آگ میں جل رہے تھے، ابھی انہوں نے اپنی بیوی صابرہ کو اس میں شامل نہ کیا تھا۔ ولیمے کے دوران کئی بار ان کے جی میں آئی کہ اس جان لیوا انکشاف کے بارے میں اپنی بیوی کو بتادیں لیکن ہر بار رک گئے یا بتانا بھی چاہا تو کوئی مہمان درمیان میں آگیا۔ اب وہ سوچ رہے تھے کہ پہلے واجدہ سے بات کریں یا بات کرنے سے پہلے حقیقت صابرہ پر کھول دیں--- اسی ادھیڑ بن میں تھے کہ کیا کریں کہ فیاض حسین کو جماہی پہ جماہی آنے لگیں اور وہ یہ کہہ کر اُٹھ گئے۔

''اچھا جی، میں تو چلا، مجھے نیند آرہی ہے۔''

''بھئی، مجھے تو ابھی نیند نہیں آرہی۔ آپ چلیں، میں آتی ہوں۔'' واجدہ نے کہا۔

بابر علی نے فیاض حسین کے کمرے سے نکلنے پر شکر ادا کیا۔ قدرت نے انہیں ایک گولڈن چانس عطا کر دیا تھا۔ اب وہ پورے اطمینان سے واجدہ سے بات کر سکتے تھے--- بابر علی نے دو چار منٹ اِدھر اُدھر کی باتیں کی، پھر انہوں نے صابرہ کو چائے بنانے کے بہانے سے کمرے سے باہر بھیج دیا۔ اب وہ دونوں کمرے میں تنہا رہ گئے۔

''واجدہ! ایک بات تو بتائیں---؟'' بابر علی نے فوراً اپنی پٹاری کھولی۔

''جی، پوچھیں---'' واجدہ نے مسکرا کر کہا۔ ''کوئی خاص بات پوچھنی ہے کیا؟''

''ہاں، میں یہ جاننا چاہ رہا تھا کہ سیّد پور لاہور سے کتنی دور ہے؟''

''سیّد پور---؟''

واجدہ نے اس طرح آنکھیں پھاڑ کر بابر علی کو دیکھا جیسے سامنے بابر علی نہ ہو، کوئی ببر شیر بیٹھا ہو لیکن یہ کیفیت چند لمحوں تک ہی رہی۔ واجدہ نے فوراً خود کو سنبھال لیا اور بولی۔

''کون سا سیّد پور--- مجھے نہیں معلوم آپ کس سیّد پور کی بات کر رہے ہیں؟''

''اچھا، تم دلدار بٹ کو جانتی ہو؟'' اس مرتبہ بابر علی نے دوسری پٹاری کھولی۔

''کون دلدار بٹ---؟'' واجدہ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''ارے، تم دلدار بٹ کو بھی نہیں جانتیں---؟'' بابر علی نے اب واجدہ کے چہرے کا رنگ اُڑتا ہوا محسوس کرلیا تھا۔ سیّد پور کے نام پر وہ چونکی تھی اور دلدار بٹ کے نام پر اس کی آنکھوں سے خوف جھلکنے لگا تھا۔ دال میں کچھ کالا تھا لیکن بابر علی نے اپنی بے نیازی برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ ''بھئی، وہ تمہارا پڑوسی ہے۔''

''لیکن آپ اسے کیسے جانتے ہیں؟'' واجدہ نے ذرا سا پریشان ہوکر پوچھا۔

''میری اس سے لاہور میں ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے---'' بابر علی نے جان بوجھ کر اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''وہ پاگل آدمی ہے--- کئی ماہ تک پاگل خانے میں رہ چکا ہے، پچھلے ہی دنوں وہاں سے واپس آیا ہے۔ اس کی ذہنی حالت اب بھی ٹھیک نہیں۔ وہ لوگوں کو پکڑ کر ان سے عجیب عجیب باتیں کرتا ہے۔ آپ سے بھی کچھ کہہ دیا ہوگا اس نے؟'' واجدہ نے جلدی جلدی بتایا۔

''اچھا---'' بابر علی نے اس کی بات پر یقین کرتے ہوئے کہا۔ ''ویسے مجھ سے اس نے بڑی دلچسپ بات کہی۔''

''وہ کیا---؟'' واجدہ کے چہرے پر پھر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔

''اس نے مجھے بتایا کہ نیلم تم لوگوں کی سگی بیٹی نہیں ہے---''

بابر علی نے واجدہ کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ اتنے میں صابرہ چائے کی ٹرے ہاتھ میں لئے اندر داخل ہوئیں، انہوں نے اپنے شوہر کی زبان سے نکلنے والا جملہ سن لیا تھا۔ یہ سن کر ان کے ہاتھ میں ٹرے لرز کر رہ گئی۔

''بابر! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، کس نے کہی آپ سے یہ بات---؟''

انہوں نے بمشکل چائے کی ٹرے میز پر رکھی اور جلدی سے بابر علی کے برابر آکر بیٹھ گئیں اور پریشان ہوکر بابر علی کی صورت تکنے لگیں۔ اب بابر علی کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اسے چاہئے تھا کہ جیسے ہی نیلم کے بارے میں معلوم ہوا تھا، وہ فوراً صابرہ کو بتادیتا اور اگر اس مسئلے کو راز ہی رکھنا تھا تو اس بات کا خیال رکھتا کہ صابرہ کے کانوں میں کوئی بات نہ پڑے لیکن دونوں ہی باتیں نہ ہو سکی تھیں۔ نہ تو بابر علی صابرہ کو پہلے سے کچھ بتا سکا تھا اور نہ ہی اس مسئلے کو راز رکھ سکا تھا اور یہ صورتحال ایسی تھی جو اس کی بیوی صابرہ کے لئے دُکھ کا باعث بن سکتی تھی اور ناراضگی کا سبب بھی--- بابر علی نے اس نازک صورتحال کو قابو میں کرنے کے لئے پینترا بدلا۔ پہلے بابر علی نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک زوردار مصنوعی قہقہہ لگایا۔ صابرہ بھی پریشان ہوگئی، وہ بولی۔

''ہائے، کیا ہوگیا آپ کو---؟''

''بھئی، صابرہ! مجھے تو کچھ نہیں ہوا---'' بابر علی نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''لاہور میں مجھے واجدہ کا ایک پڑوسی دلدار بٹ ملا تھا۔ اس نے نیلم کے بارے میں ایک عجیب انکشاف کیا کہ وہ ان لوگوں کی سگی بیٹی نہیں ہے۔ یہ بات میں نے تمہیں نہیں بتائی تھی اور اس لئے نہیں بتائی تھی کہ مجھے وہ آدمی کچھ ابنارمل سا لگا تھا۔ میں نے سوچا کہ واجدہ سے تصدیق کر کے تمہیں بتاؤں گا تاکہ تمہارے دل میں خواہ مخواہ کوئی گرہ نہ پڑ جائے۔ اب میں نے واجدہ سے ذکر کیا تو انہوں نے بتایا کہ وہ پاگل آدمی ہے۔ اس کا کام ہی یہ ہے کہ وہ لوگوں سے اسی طرح کی الٹی سیدھی باتیں کرتا رہتا ہے۔ چلو، اب بات صاف ہوگئی۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ بدگمان ہونے سے پہلے تصدیق کر لینا چاہئے۔ بتاؤ، اگر میں اس وقت واجدہ سے اس معاملے کی تصدیق نہ کرتا تو کیسی تباہی پھیلتی۔''

''ہاں، آپ نے بہت اچھا کیا جو مجھ سے پوچھ لیا ورنہ نہ جانے کیا ہو جاتا، آپ ہم لوگوں کے بارے میں کیا سوچتے۔'' واجدہ نے کہا، اب اس کے چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا تھا۔

''میں تو یہ بات سن کر لرز گئی تھی۔'' صابرہ مسکراتے ہوئے کہا۔

''صابرہ! آپ چائے بنائیں، میں ذرا باتھ روم ہو کر آیا۔''

بابر علی یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئے۔ دو تین منٹ کے بعد وہ واپس آئے تو صابرہ چائے بنانے کے لئے اُٹھ چکی تھیں۔ تینوں نے بیٹھ کر چائے پی۔ چائے خاموشی سے پی گئی، پھر بابر علی نے کہا۔

شگفتہ شگفتہ

کالج سے حال ہی میں فارغ ہوئے کچھ منچلے مستیاں کرتی ہوئے پولیس نے پکڑے۔ پولیس اسٹیشن پہنچ کر ان میں سے ایک طالبعلم نے جو قانون کا طالبعلم تھا، کہا کہ اُسے ایک کال کرنے کا قانونی حق حاصل ہے۔ اسے اجازت دے دی گئی اور ضروری کارروائی کے بعد انہیں حوالات بھیج دیا گیا۔ کچھ دیر بعد ایک ڈلیوری بوائے پولیس اسٹیشن پہنچا۔ اُس نے ڈیسک سارجنٹ کے پاس پہنچ کر پوچھا۔

''پیزا کا آرڈر کس نے دیا ہے؟''

پرنس کشمیری' تونسہ شریف

''اچھا بھئی، اب میں تو چلتا ہوں، نیند کی آمد آمد ہے۔''

''تو پھر ہم یہاں بیٹھ کر کیا کریں، ہم بھی چلتے ہیں۔'' واجدہ نے کہا۔

بابر علی کا مقصد بھی یہی تھا۔ وہ چاہ رہے تھے کہ واجدہ اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلی جائے۔ چائے پینے سے پہلے جو بابر علی اُٹھے تھے، وہ باتھ روم میں نہیں گئے۔ فیاض حسین کے کمرے میں گئے تھے۔ فیاض حسین سو چکے تھے اور بابر علی اپنی کارروائی مکمل کر کے وہاں سے نکل آئے تھے۔ اب ضروری تھا کہ واجدہ بھی اپنے کمرے میں پہنچ جائے تاکہ انہوں نے جو کمرے میں دام بچھایا تھا، اس میں پنچھی پھنس سکے۔

☆☆

صبح جب فیاض اور واجدہ کمرے سے نکل آئے تو بابر علی فوراً اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے ٹیبل لیمپ کے برابر کتابوں کے درمیان رکھا کتاب جیسا حساس ٹیپ ریکارڈر وہاں سے نکالا اور تیزی سے کمرے سے نکل آئے۔ پھر انہوں نے اپنے کمرے میں پہنچ کر دروازہ بند کیا اور کیسٹ کو ریورس کر کے ٹیپ ریکارڈ کو آن کر دیا۔

☆☆

واجدہ جب بابر علی کے کمرے سے نکلی تو اس کی کیفیت کشتی کے اس مسافر جیسی تھی جس کی کشتی طوفان میں گھر کر نکل آئی ہو۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے اس نے اپنے شوہر پر نظر ڈالی۔ دروازہ بند کرنے کی آواز سے فیاض حسین کی اچانک آنکھ کھل گئی تھی اور اب وہ واجدہ کو گردن اٹھا کر دیکھ رہا تھا۔ فیاض حسین کو جاگتے دیکھ کر وہ تیزی سے بیڈ کے نزدیک آئی اور تشکر آمیز لہجے میں بولی۔

''اللہ کا شکر ہے کہ آج ہم بچ گئے۔''

''کیوں کیا ہوا، خیریت تو ہے؟'' فیاض نے پوچھا۔

''دلدار بٹ--- اس کمینے نے تو ہمیں کہیں کا نہ رکھا تھا۔ اگر میں اسے پاگل قرار نہ دیتی تو اس نے تو اس بھیانک راز سے پردہ اُٹھا دیا تھا جسے آج تک ہم اپنے سینے میں چھپائے ہوئے تھے۔''

''وہ گدھے کا بچہ بابر علی کو کہاں سے مل گیا، ہم نے تو بابر علی کو اپنی نگرانی میں رکھا تھا؟''

''مجھے نہیں معلوم کہ وہ انہیں کہاں ملا، میں نے ان سے پوچھا بھی نہیں لیکن بابر علی بھائی کی گفتگو کے انداز سے یہ معلوم ہوا کہ اس نے سب کچھ انہیں بتا دیا ہے۔ وہ سیدپور کے بارے میں پوچھ رہے تھے کہ لاہور سے کتنی دور ہے۔''

''ارے، یہ تو بہت برا ہوا۔ پھر تم نے بات کو کیسے سنبھالا؟'' فیاض حسین نے فکرمند ہو کر پوچھا۔

''بس اس وقت جانے کیسے میرے دماغ میں یہ بات آگئی، میں نے فوراً اسے ذہنی مریض قرار دیدیا۔ بس اس طرح بات بنھ گئی اور ایک بھیانک حقیقت سے پردہ اُٹھتے اُٹھتے رہ گیا۔''

''بابر کو تمہاری بات کا یقین آگیا؟'' فیاض حسین نے سوال کیا۔

''ہاں، مجھے محسوس تو یہی ہوا کیونکہ جب یہ بات ہو رہی تھی تو صابرہ جی اندر آگئی تھیں۔ انہیں بابر بھائی نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ اس وقت بابر بھائی نے جس طرح قہقہہ لگا کر بات کی، اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے میری بات کا یقین کر لیا ہے---'' واجدہ نے بتایا۔ پھر چند لمحے توقف کر کے بولی۔ ''لیکن، فیاض! اب میرا دل ڈرنے لگا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے اب یہ راز کہ نیلم ہماری بیٹی نہیں ہے، ظاہر ہو کر رہے گا اور اگر کسی طرح یہ بات ثابت ہوگئی تو میں اپنی بہن کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہ رہوں گی۔ شرمندگی ہو گی، بہت تباہی پھیلے گی۔ جانے کیا ہو جائے---؟''

''ارے، کچھ نہیں ہوگا، تم فکر مت کرو---'' فیاض حسین نے یقین سے کہا۔ ''---اور اگر قسمت میں کچھ ہونا ہی لکھا ہے تو اسے بھگتیں گے--- آؤ، اب سو جاؤ۔''

ٹیپ ریکارڈ پر یہ ساری گفتگو سن کر بابر علی سناٹے میں آگیا۔ اس نے دروازہ کھول کر سامنے سے گزرتی راشدہ سے کہا۔

''بیٹا! ذرا امی کو بھیجنا۔''

''جی، اچھا ابو---!''

چند منٹ کے بعد صابرہ کمرے میں داخل ہوئی اور بولی۔

''آپ نے مجھے بلایا---؟''

''ہاں، میں نے تمہیں بلایا ہے--- ذرا دروازہ بند کر دو اور میرے پاس آؤ۔'' بابر نے کہا۔

''شاید آپ بھول گئے کہ شادی آپ کی نہیں، آپ کے بیٹے کی ہوئی ہے؟'' صابرہ بولی۔

''ہاں، مجھے معلوم ہے--- وقت ضائع مت کرو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور دروازہ بند کر کے ادھر آؤ۔“

بابر علی نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ بابر علی کے لہجے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ صابرہ کی شوخی ہوا ہو گئی۔ اس نے خاموشی سے دروازہ بند کیا اور بابر کے نزدیک آ کر بولی۔

”خیر تو ہے---؟“

”خیر کہاں---“ بابر علی نے بڑے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ”میں اپنے چاروں طرف طوفان اُٹھتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ کالی آندھی چل رہی ہے، سمندر موجیں مارتا ہماری طرف بڑھتا چلا آ رہا ہے---“

”بابر! آپ کو کیا ہو گیا ہے؟“ صابرہ نے پوچھا۔

”تمہاری بہن نے ہمیں دھوکا دیا ہے۔“

”کیا مطلب، میں سمجھی نہیں---؟“

”نیلم واجدہ کی بیٹی نہیں ہے۔“

”لیکن رات کو تو آپ نے کہا تھا کہ---“

”رات کی بات چھوڑو---“ بابر علی نے صابرہ کی بات کاٹ کر کہا۔ ”یہ ٹیپ سنو۔“

”اللہ کا شکر ہے کہ آج ہم بچ گئے---“ واجدہ کی آواز سنائی دی۔

صابرہ نے اپنے کان پوری توجہ سے ٹیپ کی طرف لگا دیئے۔ جیسے جیسے واجدہ اور فیاض کی گفتگو آگے بڑھتی جا رہی تھی، صابرہ کے ہوش اُڑتے جا رہے تھے۔ وہ گھبرا گھبرا کر بابر علی کو دیکھ رہی تھی۔ پھر اس پر اسرار گفتگو کا آخری جملہ سنائی دیا۔

”ارے، کچھ نہیں ہو گا۔ تم فکر مت کرو اور اگر قسمت میں کچھ ہونا ہی لکھا ہے تو اسے بھگتیں گے---آؤ، اب سو جاؤ۔“

جملے کے ختم ہوتے ہی بابر علی نے ٹیپ ریکارڈ کا بٹن دبا دیا۔ کمرے میں ایک سوگوار سناٹا چھا گیا، ایسا لگا جیسے کسی کی موت ہو گئی ہو۔ موت واقعی ہو گئی تھی۔ یہ اس بھروسے کی موت تھی جو ایک بہن نے دوسری بہن پر کیا تھا---صابرہ کو جہاں اپنی سگی بہن کے دھوکا دینے کا دکھ تھا، وہاں اسے غصہ بھی تھا۔

”میں اس کمینی کو اپنے گھر نہیں رکھوں گا---پتہ نہیں کس ذلیل کی اولاد ہے۔ جب سے ہمارے گھر میں آئی ہے، تباہی پھیلا دی ہے---میں اس چڑیل کو طلاق دلوا دوں گی۔“

”صابرہ---صابرہ---!“ بابر علی نے اسے روکتے ہوئے کہا۔ ”ذرا صبر سے کام لو۔ اس میں نیلم کا کیا قصور ہے، اسے طلاق دلوا کر کیوں عذاب میں مبتلا کرنا چاہتی ہو؟ سزا دینا ہی ہے تو اپنی بہن کو دو کہ اس نے اتنی بڑی حقیقت کو ہم سے کیوں چھپائے رکھا۔“

”اس کو تو میں ایسی سزا دوں گی کہ زندگی بھر یاد رکھے گی۔“ صابرہ نے غصے سے کہا۔

”صابرہ! تمہیں یاد ہو گا کہ نیلم کی پیدائش پر لاہور سے خط آیا تھا۔ اس خط میں مری میں نیلم کے پیدا ہونے کی اطلاع دی گئی تھی، وہ سب کیا تھا؟“ بابر علی نے صابرہ کو یاد دلایا۔

”وہ ڈرامہ ہی ہو گا---پتہ نہیں کس کی لڑکی کو گود لیا ہے۔ اس لڑکی کو اپنی بچی ثابت کرنے کے لئے وہ مری میں رہی۔ ویسے ان لوگوں نے ڈرامہ بڑی کامیابی سے کیا۔ آج تک اس حقیقت کا پتہ نہ چلنے دیا۔ وہ تو بھلا ہوا اس آدمی کا جس نے یہ راز فاش کر دیا۔“

”صابرہ! تم مجھ سے ایک وعدہ کرو۔“ بابر علی نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔

”وہ کیا---؟“ صابرہ بولی۔

”تم ان لوگوں سے لڑو گی نہیں---“ بابر علی نے کہا۔ ”میں تمہارے غصے سے اچھی طرح واقف ہوں لیکن اس غصے کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ جو ہونا تھا، ہو چکا۔ نیلم کس کی بیٹی ہے، اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ اب وہ ہماری بہو ہے، ہماری عزت ہے۔“

”میں نیلم کو تو خیر بخش سکتی ہوں لیکن واجدہ کو کسی قیمت پر معاف نہیں کروں گی۔“

”تم کیا کرو گی؟“ بابر علی نے پوچھا۔

”میں اب زندگی بھر اسے نیلم سے نہیں ملنے دوں گی۔ اس نے ہمیں دکھ پہنچایا ہے تو ہم بھی اسے چین سے نہیں رہنے دیں گے۔ اس نے دھوکا دے کر ہمارے دل کو تڑپایا تو ہم اس سے نیلم کو دور کر کے اسے تڑپائیں گے۔“

بابر علی ٹھنڈے مزاج کا آدمی تھا۔ اس نے صابرہ کو بہت سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ نہ مانی اس کے اندر آگ بھڑکی ہوئی تھی۔ وہ واجدہ سے اس مسئلے پر خوب لڑی، پہلے تو واجدہ نے اس حقیقت سے انکار کرنے کی کوشش کی لیکن جب صابرہ نے بلند آواز میں وہ ٹیپ سنوا دی تو دونوں میاں بیوی کی سٹی گم ہو گئی۔ اب دونوں میاں بیوی کے پاس فرار کا کوئی راستہ نہ تھا۔ بالآخر انہیں اقرار کرتے ہی بنی۔ اس بھیا نک حقیقت کا اقرار تو انہیں کرنا ہی پڑا کہ اب اسے چھپانا ممکن نہ رہا تھا۔ دونوں کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں، نظریں اُٹھتی نہ تھیں---شام کو فرقان ماموں آئے تو بابر علی نے پوری روداد سنائی اور وہ ٹیپ کی ہوئی گفتگو بھی سنوا دی۔ ساری تفصیل سن کر ماموں فرقان بولے۔

”حیرت ہے، تمہیں گفتگو ٹیپ کرنے کا خیال کیسے آیا؟“

”ماموں! جب میں نے واجدہ سے سیّد پور اور دلدار بٹ کے بارے میں سوالات کئے تو میں نے اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑتی دیکھی تھیں۔ اسی سے مجھے اندازہ ہوا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ تب میں نے اس کی بات پر یقین کر کے اسے فریب میں مبتلا کر دیا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ یہ کمرے میں جا کر فیاض سے اس معاملے پر گفتگو ضرور کرے گی تو میں نے اس کے کمرے میں جا کر ٹیپ ریکارڈر رکھ دیا اور اسے آن کر کے آ گیا۔ اس کا نتیجہ سامنے ہے، آپ نے ساری گفتگو سن ہی لی۔“ بابر علی نے اپنے کارنامے کی تفصیل بتائی۔

”ابھی ایک بات اور چھپائی ہے ان دونوں نے---“ ماموں فرقان نے اور اور دھماکا کیا۔

”وہ کیا ماموں---؟“ بابر علی نے پریشان ہو کر کہا۔

”میں اس وقت داداغفور کے گھر سے آ رہا ہوں۔ انہوں نے اس اثر کے بارے میں اپنے علم کے ذریعے معلومات حاصل کی ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق یہ اثر تقریباً چھ ماہ پرانا ہے اور یہ جن سیّد پور سے نیلم کے ساتھ لگا ہے۔“ ماموں فرقان نے بتایا۔

”اس کا مطلب ہے کہ یہ بات بھی دانستہ چھپائی گئی؟“ بابر علی نے کہا۔

”آخر کیوں---؟“ صابرہ نے پوچھا۔

”ظاہر ہے، یہ شادی پھر نہ ہوتی۔ جس لڑکی پر جن کا سایہ ہو، ایسی لڑکی سے جانتے بوجھتے کون شادی کرنے کی ہمت کرتا؟“ ماموں فرقان نے جواب دیا۔

”یہ سیّد پور کا راز کیا ہے، نیلم آخر وہاں کیوں گئی---؟“ بابر علی کچھ سوچتا ہوا بولا۔

”اس راز سے تو واجدہ ہی پردہ اُٹھا سکتی ہے، اسی سے پوچھو۔“ ماموں فرقان نے کہا۔

”میں پوچھوں گی اس سے اور اس طرح پوچھوں گی کہ زندگی بھر یاد رکھے گی۔“ صابرہ غصے سے بپھر اُٹھی۔

”صابرہ! اتنا غصہ مت کرو، تمہاری طبیعت خراب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہو جائے گی۔'' بابر علی نے اسے سمجھایا۔

''اب کون سی میری طبیعت ٹھیک ہے؟---ان لوگوں نے میرے گھر کا سکون تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ میرا بیٹا ایک عذاب میں مبتلا ہے---'' صابرہ نے بڑے کرب کے عالم میں کہا۔ ''میں جاتی ہوں، اسے یہیں بلا کر لاتی ہوں۔ اب جو بھی بات ہوگی، سب کے سامنے ہوگی۔ ماموں بھی اس وقت یہاں موجود ہیں۔''

''بہت شدید غصے میں ہے۔'' صابرہ کے جانے کے بعد ماموں فرقان بولے۔

''ماموں! ویسے یہ غصے والی بات تو ہے۔ ان لوگوں نے ہمارے ساتھ وہ سلوک کیا جو کبھی کوئی غیر بھی نہیں کرتا۔ میرا تو اب اپنوں سے ایمان اٹھ گیا ہے۔ ایسے ہوتے ہیں اپنے، عذاب میں مبتلا کرنے والے، ذہنی سکون لوٹنے والے؟---میں صابرہ کے سامنے زیادہ بولا نہیں۔ میں اگر غصہ دکھاتا تو صابرہ آپے سے باہر ہو جاتی لیکن سچی بات یہ ہے کہ میرا دل بھی چاہ رہا ہے کہ ان دونوں میاں بیوی کو گھر سے کھڑے کھڑے نکال دوں۔'' بابر علی نے کہا۔

''بابر! تم سمجھدار آدمی ہو۔ ذرا صبر سے کام لو، غصہ کرو گے تو حقائق پوری طرح سامنے نہیں آئیں گے اور اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے سامنے پورے حقائق آجائیں تاکہ نیلم کو اس سے نجات دلوائی جا سکے---'' ماموں فرقان نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''نیلم پر جو سایہ ہے، وہ اتنی آسانی سے دور ہونے والا نہیں ہے۔ اس کے لئے بہت محنت کرنا پڑے گی۔''

ماموں فرقان ابھی بابر علی کو سمجھا رہے تھے کہ دروازے پر زور زور سے بولنے کی آواز سنائی دی۔ واجدہ اور فیاض حسین مجرموں کی طرح گردن جھکائے کمرے میں داخل ہو رہے تھے اور صابرہ بولے جا رہی تھی جو اس کی نوک زبان پر آرہا تھا۔ وہ بے نقط سنا رہی تھی اور وہ خاموشی سے سننے پر مجبور تھے۔ ایک تو بیٹی والے تھے، اوپر سے کام ایسا کیا تھا کہ بغیر سنے چارہ نہ تھا--- صابرہ مستقل بولے چلی جا رہی تھی جب اس کا غصہ بڑھتا ہی گیا تب بابر علی نے اسے روکا اور چپ رہنے کی تلقین کی۔

''صابرہ! چپ ہو جاؤ۔''

''میں کیسے چپ ہو جاؤں، میرے کلیجے میں آگ لگی ہوئی ہے۔''

''بھائی صاحب! انہیں بولنے دیں، ان کا غصہ ٹھنڈا ہو جانے دیں۔ ہم لوگ واقعی قصوروار ہیں۔ ہم نے نیلم کے بارے میں حقائق چھپا کر بہت زیادتی کی ہے۔ اگر ان کی جگہ ہم ہوتے تو اسی طرح کا ردِعمل سامنے آتا۔'' فیاض حسین نے بڑے التجا بھرے لہجے میں کہا۔

''بھئی، فیاض صاحب! یہ سب ہوا کیسے؟'' ماموں فرقان نے پوچھا۔

''ماموں! میں اب کوئی بات نہیں چھپاؤں گا، ایک ایک بات تفصیل سے بتاؤں گا۔ بس ذرا صابرہ کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے۔''

''صابرہ! بھئی، اب تم کچھ نہیں بولو گی۔''

ماموں فرقان نے صابرہ کو تنبیہہ بھرے لہجے میں کہا۔ ماموں فرقان کی ہدایت پر صابرہ نے خاموشی اختیار کر لی تب فیاض حسین نے کہنا شروع کیا۔

☆☆

○ پراسرار واقعات کا سلسلہ دراز ہے لیکن یہ شروع کہاں سے ہوا، ایسا کون سا فرد ہے جس کے باعث یہ آفت ان پر نازل ہوئی؟ اس راز سے پردہ اٹھنے والا ہی ہے لیکن آپ کو تجسس اور تحیر سے بھرپور تیسری قسط کا انتظار کرنا ہوگا۔

ناقابلِ فراموش

مختصر مگر پُراثر واقعات کا مجموعہ

روزمرہ زندگی میں بے شمار ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں جو احساس میں ہلچل پیدا کر دیں' سبق آموز یا حیرت انگیز ہوں۔ ''ناقابلِ فراموش'' ایسے ہی واقعات کو منظرِ عام پر لانے کے لئے مخصوص ہے۔ واقعہ آداب عرض کے چار صفحات سے زیادہ طویل نہ ہو۔ آپ بھی لکھئے اور اس پتہ پر واقعہ ارسال فرما دیجئے۔

نگراں ''ناقابلِ فراموش'' ماہنامہ ''آدابِ عرض'' پوسٹ بکس نمبر 4132 ملتان روڈ لاہور 54500

فریب کار

اے۔ایف، لاہور

شام کو گھر میں داخل ہوا تو میرے بچپن کا دوست نصیر میرا منتظر تھا۔ وہ پچھلے ماہ انڈیا گیا تھا، کل ہی واپسی ہوئی تھی اور آج مجھ سے ملنے آگیا۔ نصیر اور میں تقریباً بیس سال پہلے ایک ہی محلے میں رہتے تھے۔ پانچویں جماعت تک ایک ساتھ پڑھے، اس کے بعد نصیر کا خاندان دوسرے علاقے میں جا بسا مگر ملاقات ہوتی رہی کیونکہ نصیر کا خاندان جس علاقے میں گیا تھا، وہاں میرے بڑے بھائی کے سسرال تھے۔ نصیر اور میں ایک ماہ بعد ملے تھے، خیر خیریت کے بعد سفر کے قصے شروع ہو گئے۔ اسی دوران نصیر نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ یار! تمہیں وہ دوست محبوب یاد ہے جو ہمارے ساتھ پڑھتا تھا اور ہم اسے گدھا کہہ کر تنگ کرتے تھے، وہ میرے محلے کے قریب رہتا ہے۔ جب میں انڈیا گیا تھا تو وہ میرے گھر آیا تھا۔ میرے چھوٹے بھائی سے کہنے لگا کہ نصیر نے انڈیا جانے سے پہلے مجھے کہا تھا کہ میرے چھوٹے بھائی کو کہیں سروس پر لگا دو، ایک اچھی پوسٹ نکلی ہے مگر تقریباً دو ہزار رشوت دینا پڑے گی۔ تم ہزار روپے اور اپنے کاغذات دے دو مگر میرے چھوٹے بھائی نے محبوب کو کچھ نہ دیا۔ میں نے محبوب سے کبھی بھی سروس کے لئے نہیں کہا تھا۔ ہوسکتا ہے، وہ ہزار روپے بٹورنا چاہتا ہو جو اسے نہیں ملے--- یہ تمام باتیں بتانے کے بعد نصیر چلا گیا۔

تقریباً دو ماہ بعد اگست کے مہینے میں ہلکی ہلکی پھوہار پڑ رہی تھی، میں گھر کی جانب آرہا تھا کہ محبوب مل گیا۔ میں نے اسے پہچان لیا مگر وہ مجھے نہ پہچان سکا۔ میں نے اپنا تعارف کرایا تو کافی خوش ہوا کہنے لگا کہ تم کافی بدل گئے ہو۔ صحت بھی کمزور اور رنگ بھی کالا ہو رہا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ گردش دوراں ہے، تم اپنی سناؤ؟--- کہنے لگا کہ آؤ کہیں بیٹھتے ہیں۔ میں قریبی ہوٹل میں اسے لے گیا اور چائے کا آرڈر دے دیا۔ ہم دونوں تقریباً بیس سال بعد ملے تھے اس لئے تفصیل سے گفتگو ہونے لگی۔ اسکول، کالج، نوکری اور آخر حال بچوں کی باتیں ہونے لگیں۔ چائے سگریٹ سے فارغ ہونے کے بعد محبوب نے مجھ سے کہا کہ یار، میں آج کل فارغ ہوں۔ بیوی زچگی کی وجہ سے ہسپتال میں ہے۔ خون کی کمی ہے، خون کی اشد ضرورت ہے مگر میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ تم مجھے کچھ پیسے دے دو---ان دنوں میری مالی پوزیشن کافی کمزور تھی۔ بہرکیف، میں نے اپنی جیب کی تمام رقم نکال کر تقریباً بیس روپے اپنی جیب میں رکھے، باقی تمام رقم محبوب کے حوالے کر دی۔ یہ رقم ان دنوں خون کی دو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بوتلیں خریدنے کے لئے کافی تھی۔

محبوب کے جانے کے بعد میں اپنے گھر آ گیا اور ذہن انسان کی بے بسی کے بارے میں الجھا رہا۔ آج کل حساس ہونا بھی خودکشی کے برابر ہے۔

اگلی شام میں کھانا کھا رہا تھا کہ باہر سے میرا بلاوہ آ گیا۔ میں کھانا چھوڑ کر باہر نکلا تو محبوب کو منتظر پایا۔ سلام دعا کے بعد میں نے اس کے بیوی بچوں کے بارے میں دریافت کیا کہ اب وہ کیسے ہیں؟ محبوب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے چپ کرایا تو ہچکیوں کے درمیان محبوب نے بتایا کہ اس کی بچی کا ہسپتال میں انتقال ہو گیا ہے، بیوی کی حالت بھی ٹھیک نہیں ہے اور وہ سیدھا میرے پاس آ رہا ہے کیوں کہ اس کے پاس کفن وغیرہ کے پیسے نہیں ہیں اور اس وقت اور کہیں سے انتظام بھی نہیں ہو سکتا--- میری مالی حالت ان دنوں بہتر نہیں تھی اور کل ہی میں اپنی جیب کی تمام رقم محبوب کو دے چکا تھا مگر اس سانحے کو سن کر میں تقریباً رو دیا۔ جب میرے اوسان بحال ہوئے تو میں نے اپنی راڈو گھڑی ہاتھ سے اتار کر محبوب کے حوالے کی کہ اس کو فروخت کر کے اپنا کام چلا لے مگر محبوب راضی نہ ہوا اور کہنے لگا کہ اس وقت میں اس کو کہاں فروخت کروں گا، دوسرا میں اتنا بے غیرت بھی نہیں کہ اپنے دوست کی گھڑی فروخت کر دوں--- میرے مجبور کرنے پر بھی وہ راضی نہ ہوا اور واپس جانے لگا کہ میں بچی کی لاش ایدھی ٹرسٹ کے حوالے کر دوں گا۔ میں نے اسے حوصلہ دیا اور اپنے ساتھ لے کر اپنے ایک دوست کے کارخانے جا پہنچا۔

میرا دوست حساب کتاب میں مصروف تھا، جمعرات ہونے کی وجہ سے تمام کاریگر جا چکے تھے۔ میں نے اپنے دوست سے کہا کہ مجھے کچھ پیسے چاہئیں۔ میرے دوست نے بتایا کہ اسے آج پارٹی سے بل نہیں ملا، دوسرا جمعرات کی وجہ سے کاریگروں کا حساب بھی کرنا ہوتا ہے۔ اب میرے پاس صرف ڈیڑھ یا دو سو روپے موجود ہیں--- میں نے اپنے دوست سے کہا کہ مجھے ہر حال میں پیسے چاہئیں۔ میرا دوست ہمیں انتظار کرنے کا کہہ کر کہیں چلا گیا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد میری مطلوبہ رقم میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے پیسے محبوب کے حوالے کئے اور کہا کہ اب جا کر انتظام کرو، میں کل صبح آ جاؤں گا۔ اگر مزید پیسوں کی ضرورت ہوئی تو فکر نہ کرنا۔ جاتے وقت محبوب نے اپنے شناختی کارڈ کی کاپی نکال کر مجھے دی کہ اس پتہ پر کل صبح آٹھ بجے تک آ جانا، میں انتظار کروں گا۔

محبوب کو فارغ کرنے کے بعد میں نے اپنے دوست کو حالات سے مطلع کیا تو وہ بہت رنجیدہ ہوا اور مجھے صبح میت میں جانے کی تاکید کی۔

شام محبوب کے آ جانے کی وجہ سے بنا کھانا کھائے کے گھر سے نکل آیا تھا اور اب ذہن و دل پریشان ہونے کی وجہ سے گھر آ کر بھی میں نے کھانا نہ کھایا۔ کچھ دیر بعد میں اپنے ایک دوست کے پاس گیا اور اس سے اس کی گاڑی مانگی کہ مجھے صبح کام ہے اور اتنی صبح اٹھانا اچھا نہیں، یاد رہے کہ میرا یہ دوست ان دنوں منتخب عوامی نمائندہ تھا۔ نہایت شریف بردبار اور حساس--- بہر حال، میں اس کی گاڑی لے کر آ گیا۔ گھر آ کر بستر پر لیٹا مگر نیند آنکھوں سے اڑ چکی تھی۔ پوری رات کروٹیں بدلنے کے بعد صبح چھ بجے بغیر ناشتہ کئے گھر سے روانہ ہوا۔ سیدھا نصیر کے گھر پہنچا تو وہ سو رہا تھا کیوں کہ جمعہ ہونے کی وجہ سے چھٹی تھی۔ میں نے اسے جگا کر تمام حالات بتائے تو وہ جلدی سے تیار ہو کر میرے ساتھ گاڑی میں آن بیٹھا۔ ہم سفر کرتے ہوئے محبوب کے حالات پر غور و فکر کرنے لگے تب نصیر بولا کہ کہیں محبوب نے فراڈ نہ کیا ہو، وہ ایسے ہی دھندے کرتا ہے۔ میں نے اس بات پر نصیر کو اچھا خاصا

جھاڑا کہ ٹھیک ہے، اس نے تم سے یا تمہارے چھوٹے بھائی سے جھوٹ بولا مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ ہمیشہ فراڈ ہی کرے--- نصیر میری ان باتوں سے خاموش ہو گیا مگر مطمئن نہ ہوا۔ کچھ دیر بعد ہم مطلوبہ پتہ پر جا پہنچے مگر وہاں کے ماحول سے کسی بات کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ محبوب کے والدین اپنی دوکان پر بیٹھے تھے، وہ نابینا تھے۔ محبوب کا چھوٹا بھائی گاہکوں کو سامان دے رہا تھا۔ جب تمام گاہک چلے گئے تو میں نے محبوب کے والد کو سلام کیا اور پتہ کی تصدیق چاہی۔ محبوب کے والد نے پتہ کی تصدیق کی تو میں نے محبوب کے بارے میں دریافت کیا کہ وہ یہیں رہتا ہے؟ جواب میں محبوب کے والد نے بتایا کہ محبوب یہاں نہیں رہتا، شاید وہ آپ لوگوں کچھ پیسے لے گیا ہو گا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں محبوب کا دوست ہوں۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ محبوب کی بچی کی حالت خراب ہے اس لئے ہم عیادت کو آئے ہیں--- محبوب کے والد نے ہماری بات پر یقین نہ کیا، کہنے لگے کہ ہم نے محبوب کو اس کی حرکتوں کی وجہ سے گھر سے نکال دیا ہے اور ہمارا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ محبوب نے اپنا شناختی کارڈ دیا تھا، اس پر پتہ یہیں کا لکھا ہوا ہے۔ محبوب کے والد نے کہا کہ پتہ یہیں کا ہے لیکن وہ اب یہاں نہیں رہتا۔ اگر وہ آپ کو ملے تو اس سے کہنا کہ اپنی ذلیل حرکتوں سے باز آ جائے۔ آخر میں محبوب کے والد نے پھر پوچھا کہ آپ نے کتنے اور کیوں پیسے دیئے تھے۔ میں نے ان کو تسلی دی کہ ہم نے محبوب کو کوئی پیسہ نہیں دیا۔ ہم واپس مڑے تو نصیر نے میرا مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ میں چوبیس گھنٹے سے بھوکا تھا اور اس پر نصیر کا مذاق، بہر حال ہم قریبی علاقے میں اپنے بڑے بھائی کے سسرال گئے اور وہاں سے محبوب کے بارے میں معلومات حاصل کی جو مختصراً یوں تھیں کہ موصوف ہر طرح کا فراڈ کرتے ہیں۔ کبھی خود کو آرمی آفیسر ظاہر کرتے ہیں تو کبھی ریکوریٹنگ ایجنٹ اور کبھی بروکر یا بزنس مین۔ لوگوں سے لاکھوں کا فراڈ کیا ہوا ہے۔ اس کے گھر والوں نے اسے گھر سے بھگا دیا ہے۔ اب معلوم نہیں کہاں ہے۔

مجھے سخت صدمہ ہوا کہ انسان اس قدر بھی گر سکتا ہے کہ اپنے بچے کے کفن کے نام پر بھی فراڈ کرے۔ مجھے بے حد غصہ بھی تھا۔ میں نے نصیر سے کہا کہ اگر محبوب مجھے مل گیا تو اسے پولیس کے ذریعے سیدھا کراؤں گا۔ بہر کیف، دوپہر کو نصیر کو اس کے گھر چھوڑ کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا۔

جس دوست کی گاڑی تھی، ان کو گاڑی دینے ان کے گھر گیا۔ میری شکل تھکن، افسوس اور بھوک سے عجیب ہو رہی تھی۔ میرے دوست نے مجھ سے احوال پوچھا تو میں نے پوری تفصیل بیان کر دی۔ میرا دوست خوب ہنسا اور مجھے ناشتہ وغیرہ کرایا۔ چونکہ میرا یہ دوست عوامی نمائندہ تھا، میں نے کہا اس سے کہا کہ میں محبوب کو پولیس کے حوالے کروں گا۔ میرے دوست نے مجھے تسلی دی اور کہا کہ جس کی قسمت میں جیسا رزق ہے، وہ اسے ملتا رہے گا۔ تم اسے چھوڑ دو، کبھی نہ کبھی خود ہی پھنس جائے گا--- چونکہ میں اس دوست کی بہت عزت کرتا تھا اس لئے یہ بات مان گیا اور اس واقعہ کو بھولنے کی کوشش کرنے لگا۔

تقریباً چھ ماہ بعد محبوب مجھے نظر آ گیا مگر ساتھ ہی اپنے دوست سے کیا ہوا وعدہ بھی یاد آیا اور میں نے محبوب سے کچھ نہ کہا اور خاموشی سے گھر آ گیا۔

تقریباً دو سال بعد ایک دن میں اپنے اسی دوست کے گھر گیا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی کیوں کہ وہاں محبوب میرے دوست سے مصروف گفتگو تھا۔ میں نے سلام کے بعد تمام لوگوں سے ہاتھ ملایا اور ایک طرف بیٹھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گیا۔ محبوب نے بھی ہاتھ ملایا مگر مجھے نہ پہچاننے کی اداکاری کرنے لگا۔ محبوب کی حالت بہت مخدوش تھی۔ شیو بڑھی ہوئی، کپڑے میلے اور پھٹے ہوئے، بال گرد آلود، پاؤں میں ہوائی چپل اور پیروں پر میل کی تہہ نظر آ رہی تھی۔ میں خاموشی سے ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سننے لگا۔ محبوب بتا رہا تھا کہ مجھے پولیس والوں نے الٹا لٹکا کر مارا ہے۔ تین دن ہو گئے، پتہ نہیں میرے بال بچوں کا کیا حال ہے۔ مجھے ان لوگوں نے ناجائز پھنسایا ہے، میں تنگ آ گیا ہوں۔ میں ایک نہ ایک کو جان سے مار کر خودکشی کر لوں گا--- میرے دوست نے کہا کہ پریشان مت ہو، اللہ سب ٹھیک کر دے گا۔ اپنے بال بچوں کا خیال کرو، میں تمہیں کوئی چھوٹا سا کاروبار کرا دوں گا اور آئندہ تمہیں کوئی تنگ نہ کرے گا۔ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا کیوں کہ میں اب تک صرف ان کی باتیں سن رہا تھا، مجھے فکر تھی کہ محبوب میرے دوست سے کوئی فراڈ نہ کر دے۔ میں واپس جانے کے لئے اٹھا اور اپنے دوست کو اشارہ کیا کہ باہر آ کر میری بات سن لے۔ میں اور میرا دوست باہر آئے تو میں نے پوچھا کہ یہ کون صاحب ہیں؟ میرے دوست نے بتایا کہ میں نہیں جانتا کہ کون ہیں مگر علاقے کے کچھ لوگ میرے پاس آئے تھے کہ پولیس والے ایک آدمی کو تین دن سے مار رہے ہیں۔ میں نے جا کر ان کی جان چھڑائی، شاید کسی نے پھنسوا دیا ہوگا۔ میں نے کہا کہ جو آپ کر چکے ہیں، اتنا ہی کافی ہے۔ آئندہ کچھ نہ کریں، نہ ہی مالی امداد دیں کیوں کہ یہ فراڈ آدمی ہے۔ میرا دوست حیران ہو کر میری شکل دیکھنے لگا اور بولا کہ تم اس کو جانتے ہو؟ میں کہا کہ بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ آئندہ خود نہیں آئے گا کیوں کہ اس نے مجھے جان اور پہچان لیا ہے اور اگر آئے بھی تو پیسے سے امداد نہ کرنا۔ اتنا کہہ کر میں گھر آ گیا۔

اگلے دن میں نے اپنے دوست کو بتایا کہ یہ وہی محبوب ہے جو مجھ سمیت سینکڑوں افراد سے فراڈ کر چکا ہے۔ اس کے بعد سے محبوب نظر نہیں آیا۔ نہ جانے کس انداز سے فراڈ کر رہا ہوگا لیکن مجھے امید ہے کہ وہ پھر پھنسے گا اور شاید اسے اب کوئی چھڑانے والا بھی نہ ملے۔ میری خداوند کریم سے دعا ہے کہ وہ محبوب پر اپنا کرم کرے اور اسے سیدھا راستہ دکھائے، آمین!

☆☆

صبر کا صلہ

خالد محمود شیخ، ابوظہبی

یہ واقعہ مجھے ایک بلڈوز آپریٹر نے سنایا ہے، یہ صاحب ادھر بھی یہی کام کرتے ہیں۔ پہلے یہ پاکستان آرمی میں انجینئرنگ کے شعبہ کی کنسٹرکشن ٹیم میں تھے۔

یہ واقعہ ۱۹۷۶ء کا ہے۔ یہ آزاد کشمیر کی ایک تحصیل سرساوا کے گاؤں مجھاڑا میں سڑک بنا رہے تھے جو کہ بہت اونچائی پر واقع ہے۔ آپ کو پتہ ہے کہ جب روڈ بنتی ہے تو مشینری کی آمد و رفت کی وجہ سے صرف روڈ کی جگہ ہی نہیں بلکہ ساتھ والی زمینیں بھی اس کی زد میں آ جاتی ہیں۔ کسانوں کا دل یہی چاہتا کہ یہ بلڈوزر ہمارے اوپر سے گزر جائیں مگر کسی طرح ہماری فصلیں بچ جائیں۔ الغرض جہاں جہاں سے بھی سڑک گزرتی، کسانوں کا جم غفیر اکٹھا ہو جاتا۔ کوئی آتے ہی اکڑتا اور کچھ آتے ہی معاوضے کا پوچھتے۔ جب ہم اس گاؤں کے پاس سے گزر رہے تھے تو ہماری یہ ترتیب ہوتی تھی کہ سب سے پہلے سروے والے، پھر اس کے پیچھے ہم پائلٹ ٹریک والے۔ یعنی بس ایک سنگل بلیڈ مارے جانا اور جہاں

کہیں سروے کا نشان سیدھا کسی عمودی پہاڑ پر چڑھ جاتا اس کے اوپر چڑھنے کے لئے ہم انسانی ٹریک بنا دیتے۔

جب اس گاؤں کے پاس پہنچے تو ایک ایسی ہی جگہ تھی جہاں ہم نے اوپر چڑھنے کے لئے ایک اضافی راستہ بنانا شروع کر دیا۔ یہ گندم کی بالکل تیار کھڑی فصل کے بیچ میں سے گزر رہا تھا۔ بس آن کی آن میں بلڈوزر نے کام شروع کر دیا اور وہ پکی پکائی فصل دو منٹ میں تباہ و برباد ہو گئی۔ اس زمین میں خوبانیوں کے درخت بھی لگے ہوئے تھے، وہ بھی گر گئے۔ یعنی سب کی سب زمین تباہ و برباد ہو گئی مگر کوئی آدمی نہ آیا اور یہ ایک بڑی خلاف معمول بات تھی۔

شام تک ہم لوگ بڑے حیران پریشان رہے کہ اس زمین کا مالک کون ہے جو اس زمین کے پاس آ کر کھڑا بھی نہیں ہوا؟--- ہمارے منیجر صاحب خود پابند نماز تھے اور میرے خیال میں بہت مخلص سپاہی اور اچھے انسان تھے۔ آج بھی وہ جہاں ہوں، اللہ ان کو خوش رکھے۔ وہ بھی بڑے حیران ہوئے اور مقامی لوگوں سے کہا کہ جس آدمی کی یہ زمین ہے اور فصل تباہ ہوئی ہے، اسے بلاؤ۔

دوسرے روز دیکھا تو ایک ادھیڑ عمر باریش آدمی کھڑے ہمارے میجر صاحب سے مصروف گفتگو تھے۔ میں بھی پاس جا کھڑا ہوا۔ وہ بزرگ کہہ رہے تھے کہ جی، یہ زمین میری کہاں ہے، بس میرا کام تو اس میں ہل چلانا اور دانے پھینکنا ہیں۔ بس قدرت کو منظور نہیں تھا۔ اگر آپ نہ آتے تو شاید ژالہ باری ہو جاتی--- الغرض کسی اکڑفوں یا ناراضگی کے اظہار کی بجائے وہ شکر کر رہے تھے۔ ان کے چہرے پر بالکل سکون اور بشاشت تھی۔ میجر صاحب کا پتہ نہیں، میں خود حیران کھڑا رہ گیا۔ وہ بزرگ سلام کر کے اور ہاتھ ملا کر چلتے بنے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد میجر صاحب نے کہا کہ بھئی، کام روک دو اور ادھر دوسری طرف اپنے بلڈوزر وغیرہ لے کر آ جاؤ۔ اس جگہ یہ پہاڑ وغیرہ کاٹ کر میں ایک بہت اچھا لیول کر کے پلین بنا دوں گا--- ہمارا سارا پائلٹ گروپ اس دن کام میں لگا رہا اور آرمی کے سپاہیوں اور وہاں کے مقامی مزدوروں نے مل کر رات گئے تک کام کیا اور اس زمین سے زیادہ ستواں، اچھی اور بڑی جگہ بنوا دی۔ پھر میجر صاحب نے خود پاس کھڑے ہو کر جو لوگ کلیم درج کرتے ہیں، ان سے بزرگ کی جگہ کا نقشہ اور فصل کے لئے کلیم بنوایا۔ اگر وہ بزرگ بھی دوسرے لوگوں کی طرح باتیں بناتے تو سوائے فصل کے معاوضے کے کچھ بھی نہ ملتا--- اگرچہ یہ چھوٹی سی بات ہے مگر صبر و شکر کے فوائد کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

☆☆

جذبات کا شکنجہ

فریدہ جیلانی، میرپور خاص

راجہ اور بشیرا بچپن کے دوست تھے۔ راجہ سبزیوں کا ٹھیلہ لگاتا تھا اور گلی گلی گھوم پھر کر اپنا اور اپنے بوڑھے والدین کا پیٹ پالتا تھا جبکہ بشیرا کسی کارخانے میں ملازم تھا۔ بچپن کی دوستی کو مضبوط کرنے کے لئے راجہ کی منگنی بشیرا کی بہن نجمہ سے کر دی گئی تھی۔

راجہ اپنے والدین کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا۔ اس سے بڑی دو بہنیں اور ان سے بڑا بھائی تھا جو سب شادی شدہ تھے۔ بھائی اسی شہر کے دوسرے محلہ میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتا تھا جبکہ دونوں بہنیں شادی ہو کر نواب شاہ چلی گئی تھیں، اس طرح گھر میں راجہ کے علاوہ اس کے بوڑھے والدین تھے جو ہر وقت اس کی شادی کے پیچھے پڑے رہتے تھے لیکن راجہ اتنی جلدی اس بندھن

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں بندھنے کے لئے تیار نہیں ہوتا تھا۔ آخر ایک دن اس کی ماں کی طبیعت جب زیادہ خراب ہوگئی تو اس نے شادی کے لئے حامی بھر لی۔

ایک ہفتہ تک گھر میں ڈھولک بجتی رہی۔ اس کی بہنیں بھی اپنے بال بچوں کے ساتھ نواب شاہ سے آئی ہوئی تھیں۔ گھر میں ایک ہنگامہ تھا اور اس ہنگامے کے دوران ایک مبارک دن نجمہ اُس کی زندگی کی ساتھی بن کر اس کے چھوٹے سے گھر کو روشن کرنے کے لئے آگئی۔

نجمہ اور بشیرا دو بہن بھائی تھے۔ باپ کا انتقال ہو چکا تھا، ماں حیات تھی۔ نجمہ کا رنگ بہت گورا تھا اور وہ بہت خوبصورت تھی۔ راجہ ایسی خوبصورت بیوی کو پا کر بہت خوش تھا۔ صبح کا ناشتہ کر کے ٹھیلا لے کر جاتا تھا اور شام کو مغرب کے وقت واپس آتا تھا۔ دن بھر میں اچھی خاصی کمائی ہو جاتی تھی جو اس کے چھوٹے سے گھرانے کے لئے کافی تھی۔

شادی کو کافی دن گزر گئے تھے۔ تمام مہمان جن میں راجہ کی بہنیں بھی شامل تھیں، اپنے اپنے گھروں کو واپس لوٹ گئے تھے۔ اب گھر میں صرف چار نفوس رہ گئے تھے۔ نجمہ کا میکہ چونکہ اسی شہر میں تھا اور تھوڑے ہی فاصلے پر تھا اس لئے وہ صبح کو جلدی جلدی گھر کا کام نمٹا کر اپنے میکے چلی جاتی اور شام کو رراجہ کے آنے سے پہلے واپس آجاتی تھی۔ کسی کو کوئی اعتراض نہ تھا، یہی سوچتے کہ نئی شادی ہوئی ہے اس لئے چلی جاتی ہے۔ وقت گزرے گا تو خود ہی آنا جانا کم کر دے گی۔

کافی دنوں سے جب وہ ٹھیلا لے کر نکلتا اور پھر گھر میں گھستا تو محلّہ والے اس کو عجیب سی نگاہوں سے دیکھتے اور طنز آمیز گفتگو کرتے تھے۔ پہلے تو وہ کچھ سمجھا نہیں لیکن جب اپنے والدین سے معلوم کیا تو اسے پتہ چلا کہ اس کی غیر موجودگی میں اکثر پرویز جو بشیرا کے ساتھ کارخانے میں کام کرتا تھا، اس کے گھر آتا ہے اور نجمہ اس کے ساتھ خوب ہنسی مذاق کرتی ہے اور وہ کافی کافی دیر گھر میں رہتا ہے۔ راجہ نے نادان سمجھتے ہوئے پیار و محبت سے نجمہ کو سمجھایا کہ وہ پرویز سے نہ ملا کرے، محلّہ والے اور رشتہ دار باتیں بناتے ہیں۔ نجمہ نے وعدہ کرلیا کہ آئندہ اس کو کوئی شکایت نہیں ہوگی لیکن وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئی بلکہ جب اس کے ضعیف ساس سسر نے سمجھانے کی کوشش کی تو وہ ان سے بھی بہت بدتمیزی سے پیش آئی۔ پرویز اسی طرح راجہ کی غیر موجودگی میں آتا رہا اور ہنسی مذاق کرتا رہا۔ جب بات برداشت سے باہر ہوگئی تو راجہ نے نجمہ کی پٹائی شروع کر دی لیکن مار کھانے کے باوجود اس نے پرویز سے ملنا بند نہیں کیا بلکہ اب تو وہ دھڑلے سے اس سے ملتی اور تحائف بھی وصول کرتی تھی۔

ایک دن اس کے ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی دیکھ کر راجہ نے جب پوچھا تو اس کو یہ معلوم ہوا کہ یہ انگوٹھی بھی پرویز نے دی ہے۔ اس پر تو جنون طاری ہوگیا اور اپنے ہاتھوں اور لاتوں سے نجمہ کو روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا اور اسی وقت اس کو لے جا کر اس کی ماں کے حوالے کر کے اور یہ کہہ کر آگیا کہ جب تک یہ اپنی غلط حرکتوں سے باز نہیں آئے گی، میرے گھر میں قدم نہیں رکھے گی۔

شام کو جب بشیرا کام پر سے واپس آیا تو نجمہ نے رو رو کر اس کو راجہ کے ظلم و ستم کی داستان سنائی اور جسم پر مار پیٹ کے نشانات دکھائے اور کہ کہا کہ راجہ اور گھر والے خوامخواہ پرویز کا نام لے کر مجھے بدنام کر رہے ہیں۔ ماں نے فوراً اس کی بات کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ وہ لوگ ایسے نہیں ہیں، تو نے غلط حرکت کی ہوگی جس کی وجہ سے نوبت یہاں تک پہنچی ہے اور اگر وہ پرویز کا آنا مناسب نہیں سمجھتے ہیں تو کیوں اس کو بلاتی ہے اور گھر میں بٹھا کر ہنسی مذاق کرتی ہے؟--- لیکن نجمہ نے کچھ اس

طرح اس واقعہ کو بھائی کے سامنے بیان کیا کہ اس نے ماں کو بھی غلط سمجھا۔ اب ماں بچاری کیا کہتی کہ اس کی یہ حرکتیں شادی سے پہلے سے جاری ہیں۔ اس نے خود کئی دفعہ اس کو پرویز سے ہنسی مذاق کرتے اور تحفے وصول کرتے دیکھا تھا اور شادی میں جلدی اسی لئے کی تھی کہ یہ سنبھل جائے گی اور بیٹے کو اگر اس بات کی خبر نہیں ہونے دی تھی تو اس کی وجہ بیٹے کا گرم خون تھا جو یہ سن کر بہن کو بھی مار ڈالتا اور پرویز کو بھی ختم کر کے خود جیل چلا جاتا لیکن اب اس کو افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے بیٹی کی غلط حرکات کی پردہ پوشی کیوں کی۔

بشیرا بہن کی حالت دیکھ کر اور اس کے بین سن کر فوراً غصہ میں آگیا اور اسی وقت راجہ سے دو دو ہاتھ کرنے کے لئے نکلا۔ ماں سمجھاتی رہ گئی لیکن وہ نہ مانا۔ راستہ میں اس کو پرویز ملا، غصہ میں دیکھ کر اس نے اس کا سبب پوچھا تو بشیرا نے دوست کو تمام بات بتادی۔ پرویز نے یہ سن کر اس کو اور بھڑکایا اور بشیرا کو راجہ سے اپنی اور بہن کی ذلت کا انتقام لینے پر خوب اکسایا، ساتھ ہی یہ بھی مشورہ دیا کہ ابھی فوری طور پر کوئی قدم نہ اٹھاؤ، میں کل تمہیں بتاؤں گا کہ کیا کرنا ہے۔

دوسرے دن شام کو بشیرا راجہ کے گھر گیا اور بہن کی طرف سے معافی مانگی اور کہا کہ وہ آئندہ ایسی حرکت نہیں کرے گی، میں نے اس اچھی طرح سمجھادیا ہے۔ میں نے پرویز سے بھی بات کی ہے اور وہ بھی تم سے شرمندہ ہے اور تم سے معافی مانگنا چاہتا ہے لیکن یہاں آنے کی اس کی ہمت نہیں ہو رہی ہے اس لئے آؤ اس کو گھر سے لے لیتے ہیں اور کہیں بیٹھ کر چائے بھی پئیں گے اور صلح و صفائی بھی ہو جائے گی۔

سردیوں کے دن تھے۔ اس دن سردی بھی عام دنوں سے زیادہ تھی، کوئٹہ کی برفانی ہوائیں چل رہی تھیں جس کی وجہ سے سڑک پر وہ رونق نظر نہیں آرہی تھی جو عام دنوں میں ہوتی تھی۔ یہ تینوں دوست شہر کے ایک پکچر ہاؤس کے سامنے بنے ہوئے ہوٹل میں بیٹھ گئے۔ وہیں پرویز نے معافی مانگی اور چائے وغیرہ پیتے رہے۔ راجہ بار بار گھر جانے کے لئے کہتا لیکن یہ لوگ اس کو بہانے سے بٹھا لیتے۔ گپ شپ ہوتی رہی یہاں تک کہ آخری شو ختم ہوگیا۔ پکچر ہاؤس بھی بند ہوگیا اور تمام لوگ اپنے اپنے گھروں کو واپس لوٹ گئے۔ ہوٹل والے نے بھی اپنا سامان سمیٹنا شروع کر دیا تو پرویز کے اصرار پر آخری دفعہ چائے پی گئی۔ چائے پیتے ہی یہ تینوں دوست روانہ ہوئے۔ آخری کپ چائے میں پرویز نے بے ہوشی کی دوا ملادی تھی اس لئے آہستہ آہستہ اس کا اثر ہوا شروع ہوگیا۔

یہ لوگ ٹہلتے ہوئے گھر کی طرف جارہے تھے کہ ایک تاریک گلی میں راجہ نیم بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑا۔ پرویز نے فوراً اپنی جیب سے دو انجکشن نکالے اور اس کے دونوں بازوؤں میں گھسیڑ دیئے۔ بشیرا نے اس کی مدد کی اور بے ہوش راجہ کو اٹھا کر ایک ایسی مصروف ترین سڑک پر ڈال دیا جہاں دن رات ٹرک چلتے تھے تاکہ کسی ٹرک کے نیچے آکر وہ ختم ہو جائے---- لیکن جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے؟ اس رات وہاں سے کسی ٹرک کا گزر نہیں ہوا اور اگر ہوا تو وہ اسے بچا کر نکل گیا۔

صبح سویرے فجر کی اذان کے بعد سبزی فروش مارکیٹ سے سبزی لانے کے لئے جب اس سڑک پر سے گزرے تو انہوں نے سڑک پر کسی کو پڑے دیکھا۔ وہ لوگ سمجھے کہ کوئی ٹرک والا ایکسیڈنٹ کر کے بھاگ گیا ہے۔ جب نزدیک جا کر دیکھا تو راجہ کو پہچان لیا جو آہستہ آہستہ کراہ رہا تھا۔ اس کو اسی وقت سول ہسپتال لے جایا گیا اور پر اطلاع دی۔ بوڑھے والدین روتے پیٹتے جب ہسپتال پہنچے تو ڈاکٹروں نے جواب دے دیا کہ یہ کیس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہمارے اختیار سے باہر ہے، فوراً کراچی لے جاؤ۔ اسے کراچی لے جایا گیا لیکن اتنی دیر ہو چکی تھی کہ انجکشن کا اثر اس کے دونوں بازوؤں میں ہو چکا تھا اور آخر اس کی جان بچانے کے لئے ڈاکٹروں نے اس کے دونوں بازو کاٹ دیئے کیوں کہ ڈاکٹروں کی رپورٹ کے مطابق اس کے بازوؤں میں قوی تیزاب کے انجکشن لگائے گئے جس کی وجہ سے اس کے دونوں بازو اندر سے بالکل گل چکے تھے اگر تھوڑی دیر اور ہو جاتی تو اس کی زندگی کو خطرہ تھا۔

جب راجہ کو ہوش آیا تو پولیس نے اس کا بیان لیا۔ اس نے بتایا کہ بشیر اور پرویز اس کو بہانے سے لے گئے تھے اور اس کو تیزاب کے انجکشن لگائے گئے ہیں کیوں کہ جب وہ گلی میں گرا تھا تو نیم بیہوشی کی حالت میں اس نے ان دونوں کی گفتگو سنی تھی اور اس نے بھاگنے کی کوشش کی تھی لیکن چائے میں ملنے والی دوا نے اس کی تمام ہمت چھین لی تھی اور ایسا کرنے پر اکسانے والی اس کی بیوی نجمہ تھی جس کی غلط حرکتوں کی وجہ سے وہ اس کو میکے چھوڑ آیا تھا--- راجہ کے بیان کی روشنی میں نجمہ، بشیر اور پرویز کو گرفتار کر لیا گیا جو آج تک جیل کی سلاخوں کے پیچھے اپنے کیے کی سزا بھگت رہے ہیں۔

راجہ کے دونوں بازو کٹ جانے سے کچھ دن تک راجہ کو بہت تکلیف اٹھانا پڑی۔ نہانا دھونا، کھانا پینا سب اس کے بوڑھے والدین کرتے تھے۔ پھر مخیّر افراد کی بدولت اس کے مصنوعی بازو لگا دیئے گئے اور اب وہ ان ہی بازوؤں سے سبزی کا ٹھیلہ لگاتا ہے اور اپنے والدین کی خدمت کرتا ہے۔

نجمہ سکھر جیل میں اپنی سزا کاٹ رہی ہے اور اب اپنی غلطیوں پر شرمندہ ہے۔ راجہ نے صحت یاب ہوتے ہی اسے طلاق دے دی تھی۔ کاش! اس نے یہ سب کچھ کرنے سے پہلے کچھ سوچا ہوتا تو اس کو آج یوں شرمندگی نہ اٹھانی پڑتی۔

☆☆

یہ کیسی خوشی

محمودہ خانم آرزو، مانسہرہ

ہر انسان کی زندگی نت نئے واقعات کی آماجگاہ ہے اور کچھ واقعات تو ایسے ہوتے ہیں جن کے اثرات انسان کو اپنے گھیرے میں لئے رہتے ہیں۔ میری زندگی میں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس کا خیال اگر آج بھی آتا ہے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

ہم چھ بہن بھائی ہیں۔ دو بھائی نجمہ سے بڑے ہیں، پھر ہم دو بہنیں اور پھر دو بھائی۔ میری دونوں بڑے بھائیوں کے ساتھ کافی دوستی تھی۔ ہم جو شرارت بھی کرتے اکٹھے کرتے اور اگر مار بھی پڑتی تو اکٹھے ہی مار کھاتے۔ ہم تینوں بہن بھائی ایک ہی پبلک سکول میں زیر تعلیم تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ہم لوگوں کے سالانہ امتحانات ہو رہے تھے۔ میرا بڑا بھائی پیپر دے کر جلدی چلا گیا، میں اور میرا دوسرا بھائی رہ گئے۔ پیپر ختم ہونے کے بعد جب ہم باہر آئے تو دیکھا کہ سکول کی گلی میں خون پھیلا ہوا ہے۔ سکول کی گلی میں ایک شادی بھی ہو رہی تھی، بھائی نے اس خون کے بارے میں مجھ سے پوچھا تو میں نے کہہ دیا کہ اس شادی والے گھر میں گائے ذبح ہوئی ہو گی تب ہی تو اتنا خون پھیلا ہوا ہے۔ اس کے بعد ہم ہنستے کھیلتے گھر آئے۔

جب اپنے گھر کے پاس پہنچے تو پتہ چلا کہ میرے بڑے بھائی کو وہیں گولی لگ گئی ہے۔ لوگوں کا ایک ہجوم گھر میں موجود تھا۔ میری والدہ صاحبہ رہ رہی تھیں اور ساتھ ہی سینہ کوبی بھی کر رہی تھیں۔ محلے والی عورتیں بھی رو رہی تھیں۔ یہ سب کچھ دیکھ کر ہم نے بھی رونا شروع کیا۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ وہ خون میرے بھائی کا ہی ہے۔ میرے بھائی کو لوگ ہسپتال لے گئے، بعد میں پتہ چلا کہ شادی والے گھر میں فائرنگ ہو رہی تھی اور گولی باہر سے گزرتے ہوئے میرے بھائی کے کندھے میں لگ گئی۔ گولی بالکل سامنے سے لگی تھی۔ جس نے گولی چلائی، وہ خود کہیں چھپ گیا اور میرے بھائی کو دوسرے لوگوں نے اٹھایا۔ سات دن تک گولی جسم میں رہی، اس کے بعد آپریشن کے ذریعے یہ گولی نکالی گئی۔ میرے بھائی کو اللہ نے بچا لیا۔ ہمارے گھر ہر وقت لوگوں کا تانتا بندھا رہتا۔

ساتویں دن ایک عورت آئی اور پوچھنے لگی کہ جس سے گولی لگی ہے، اس کو آپ کیا سزا دیں گے؟ میرے والد صاحب نے کہا کہ میں نے اس کو معاف کر دیا ہے کیوں کہ اس نے جان بوجھ کر تو گولی نہیں چلائی تھی۔ اس عورت کو شاید یقین نہیں آیا اور قرآن میری والدہ صاحبہ کی جھولی میں ڈال کر کہنے لگی کہ آپ اسے دل سے معاف کر دیں کیوں کہ وہ لڑکا جس سے گولی لگی ہے، مجھ بدنصیب کا ہی بیٹا ہے--- اس نے پیسے بھی دینے کی کوشش کی لیکن میرے گھر والوں نے وہ پیسے لینے سے انکار کر دیا۔ ہمارے رشتہ داروں نے کافی کہا کہ آپ اس لڑکے پر مقدمہ کریں لیکن میرے والد صاحب نے کہا کہ اللہ نے میرے بیٹے کو بچا لیا ہے تو ہم کیوں اس پہ مقدمہ کریں۔ اگر خدانخواستہ میرے بیٹے کو کچھ ہو بھی جاتا تو بھی میں اسے معاف کر دیتا کیوں کہ جو خدا کو منظور ہوتا ہے، وہی کچھ ہوتا ہے۔

☆☆

آزمائش

آسیہ راجپوت، بوچھال کلاں

یہ آج سے تقریباً پندرہ برس پہلے کا واقعہ ہے۔ ہم راولپنڈی سکول آف سگنل آرمی کوارٹرز میں رہا کرتے تھے۔ رات کا وقت تھا، شدید گرمی کی وجہ سے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میرے کزن لیٹے ہوئے تھے۔ میں اور میرے دیور بیٹھے باتوں میں مصروف تھے کہ باہر زور زور سے پکارنے اور للکارنے کی آوازیں سنائی دیں۔ شور سن کر میرے کزن باہر کی طرف بھاگ نکلے، جاتے جاتے مچھر دانی کا لوہے کا ڈنڈا ہاتھ میں لیتے گئے۔ بھائی جان اور میں پریشانی کے عالم میں بیٹھے رہے کہ نہ جانے رات گئے کون چور گھس آیا ہے جبکہ پہرہ بھی سخت ہے؟ اچانک میرے دل میں دھڑکا سا ہوا کہ کہیں میرا بھائی نہ آیا ہو کیوں کہ چند دن بیشتر میں نے اپنے بھیا نثار کو خط لکھا تھا کہ میرا دل اداس ہے، آ کر مجھے مل جاؤ--- یہ خیال آتے ہی میں بھائی جان سے التجا کرنے لگی کہ آپ باہر جائیں اور دیکھیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ میرا بھائی دیر سے آیا ہو اور راستے میں لوگوں نے اسے چور سمجھ کر پکڑ لیا ہو۔

انہوں نے مجھے تسلی دی کہ میرے کزن ابھی آتے ہوں گے، پتہ چل جائے گا۔ اسے تو وہ بھی پہچان سکتے ہیں--- باہر سے برابر شور وغل اور مار کٹائی کی آوازیں آ رہی تھیں کوئی چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ میں چور نہیں، میری بات تو غور سے سنو--- مگر اسے مارنے والے تو فوجی نوجوان تھے جنہیں ٹریننگ ہی دشمن کا مقابلہ کرنے کی ملی ہوتی ہے۔ وہ تو اپنا فرض پورا کر رہے تھے۔ اس آدمی کی کھال اتارے جا رہے تھے۔ جیسے ہی اسے مار پڑتی، وہ چیخ چیخ کر رونا شروع کر دیتا۔ غیظ و غضب میں بپھرے ہوئے نوجوان ایک ہی سانس میں اسے مارتے چلے گئے۔ اتنے میں سامنے والے کوارٹر کا بلب روشن ہوا تو ایک فوجی کی نظر اس پر پڑی۔ اس نے اس آدمی کو پہچان لیا۔ ڈنڈوں کی بارش تو تھم گئی مگر اب یہ سوال تھا کہ وہ کیوں ادھر فوجی لائنوں میں آیا تھا؟--- اس کو کیپٹن

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

صاحب نے بالوں سے پکڑ لیا۔ وہ اشرف تھا جو کپڑے دھوتا تھا۔ اس سے پوچھا کہ تیرا اس لائن کی طرف آنے کا مطلب کیا تھا؟ وہ کہنے لگا کہ یہاں میری برادری کے لوگ ہیں۔ ان کا بچہ بیمار تھا، اس کو دیکھنے آیا تھا کہ ان سب نے مل کر میری کھال اتار دی--- دوسرے لمحے ایک زوردار تھپڑ اشرف کے گال پر پڑا۔ یہ نائب صوبیدار تھے۔

''بے غیرت! میں سب تیری چال سمجھتا ہوں--- بتا تو اس عورت کو ملنے آیا ہے یا بچے کی بیمار پُرسی کرنے؟''

اس کا سر چکرا گیا، ہوش وحواس گم ہو گئے۔ اب اشرف کے منہ سے مارے ندامت کے کوئی بات نہیں نکل رہی تھی۔ اس کی زبان گنگ ہوگئی تھی، کوئی بات بن نہیں رہی تھی کہ کیا جواب دے۔ وہ خاموش رہا۔ سب نے کیپٹن صاحب کو مشورہ دیا کہ اشرف کو گھر لے جا کر قید کر دیں، کل صبح کوئی کارروائی عمل میں لائی جائے گی۔

تقریباً ایک گھنٹہ بعد میرے کزن واپس آئے تو میں نے جلدی سے پوچھا کہ لوگ اسے کیوں مار رہے تھے؟

''وہ ایک عورت سے ملنے آیا تھا۔ اسے پکڑ لیا ہے۔ کل جو ہوگا سو ہوگا۔'' انہوں نے جواب دیا۔

''آپ نے بھی مارا---؟'' میں نے ان کا انٹرویو لینا شروع کر دیا۔ ''آپ نے کتنے پول مارے؟''

''تین اور ایک تھپڑ---!''

''اُف اللہ! آپ کا اس نے کیا بگاڑا جو اس غریب کو مارا--- اس کا کیا جرم تھا؟''

میں نے بچوں کے سے انداز میں کہنا شروع کر دیا۔ کزن غصے سے بولے۔

''تمہاری نظروں میں اس کا کوئی جرم نہیں، اس کا کوئی گناہ نہیں--- تم اسے بے گناہ کہتی ہو؟''

''آپ کو غصہ آ گیا--- میرا مطلب تو یہ ہے کہ جو کچھ اس نے کیا ہے، اپنے لئے ہی کیا ہے۔ کسی کا تو کچھ نہیں بگاڑا، نا؟''

''آسیہ! تم تو خواہ مخواہ بحث میں الجھ رہی ہو۔ مان لیا کہ یہ اس کا انفرادی جرم ہے مگر اجتماعی طور پر سارا ماحول، پورا محلہ، پورا معاشرہ اس برائی کی زد میں آ کر بدنام ہوسکتا ہے۔ اگر ہم ایک غلطی کرنے والی انفرادی ہستی کو نظر انداز کرتے ہیں تو سمجھ لو کہ آج ایک ہے، کل دو ہو جائیں گے۔ پھر یہ برائی سارے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔ سمجھ آئی، میں نے اس لئے اسے مارا ہے، کوئی ذاتی دشمنی تو نہ تھی۔''

ان کا یہ جواب سن کر میں خاموش ہوگئی۔

صبح جب وہ آفس جانے لگے تو میں نے تجسس بھرے لہجے میں کہا کہ مجھے بتائیے گا، اس کے بارے میں کہ کیا فیصلہ ہوا۔ وہ حامی بھر کر آفس چلے گئے۔

تقریباً دس بجے آئے۔ میں نے پوچھا کہ سنائیں، کیا بنا اشرف کا؟ تو انہوں نے بتایا کہ صبح جب اشرف کو تھانے میں پیش کیا گیا تو انسپکٹر صاحب نے پوچھا کہ تم صاف صاف سیدھے طریقے سے بتا دو کہ کیا معاملہ ہے؟--- اشرف نے جو بیان دیا، وہ یہ تھا کہ اس عیسائی عورت سے میں محبت کرتا ہوں۔ صرف میں ہی قصوروار نہیں ہوں، دونوں برابر کے شریک ہیں۔ اگر شک ہو تو اسے بھی حاضر کر کے بیان لے لیں--- اس عورت کو بحکم انسپکٹر صاحب تھانے میں پیش کیا گیا۔ وہ دونوں یہاں میاں بیوی آئے۔ اس سے پوچھا گیا کہ بتاؤ تم اشرف کو جانتی ہو؟--- اس نے جواب دیا۔

''میں اشرف کو جانتی ہوں۔''

''تو پھر رات کے واقعہ کا بھی پتہ ہوگا؟'' انسپکٹر

نے سوال کیا۔

''جی، سر---!'' اس نے جواب دیا۔

''تمہارا ردِعمل---؟''

''میں مسلمان ہونا چاہتی ہوں۔'' اس نے کہا۔

''تم تین چار بچوں کی ماں ہو۔ بچے دنیا میں عورت کے لئے زنجیر ہوتے ہیں اور وہ باوجود کوشش کے ان زنجیروں کو توڑ نہیں سکتی۔ ہر ستم اپنے اوپر سہہ لیتی ہے مگر بچوں کی جدائی برداشت نہیں کر سکتی---''

انسپکٹر صاحب سمجھاتے ہوئے اس کا دل ٹٹولا کہ بھلا کس حد تک صدق دل سے مذہب اسلام قبول کرنا چاہتی ہے--- اس نے اک نظر بچوں پر ڈالی جو قریب ہی بنچ پر بیٹھے تھے، پھر شوہر کی طرف گردن گھمائی مگر اس کی نگاہوں کی تاب نہ لا سکی۔ کچھ بھی سہی، خواہ وہ غیر مسلم ہی تھے مگر غیرت تو سب کی زندہ ہوتی ہے۔ کوئی مرد یہ ہرگز ہرگز برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کی رفیقہ حیات کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے یا اس کی عزت کی طرف کوئی ہاتھ بڑھائے مگر یہ مسئلہ ہی اور نکل آیا تھا۔ بچے تو معصوم بے زبان تھے، وہ کیا کہتے یا ان کو کیا پتہ تھا کہ ابھی تھوڑی دیر بعد قیامت صغریٰ برپا ہونے والی ہے۔ انہیں جنم دینے والی ہستی، گود میں لوریاں دے کر سلانے والی ماں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بچھڑ جائے گی۔ وہ تو صرف اتنا سوچ رہے تھے کہ ابھی ماں کے ساتھ گھر جائیں گے، ماں پکائے گی تو بچوں کے پیٹ کا دوزخ ٹھنڈا ہوگا--- انسپکٹر صاحب الجھتے گئے، مسئلہ بچوں کا آڑے آ رہا تھا۔ دوسری طرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ۔ مذہب اسلام کی غیبی آوازیں سنائی دے رہی تھیں کہ مذہب اسلام پر مر مٹو۔ اپنی اولاد، گھر بار، والدین چھوڑ دو--- عورت نے ہاتھ باندھ کر انسپکٹر صاحب کی بات کا جواب دیا کہ آپ مجھے کلمہ شہادت پڑھوا دیں، آگے دیکھ لینا کہ میں کیا ثبوت دوں گی۔ بچے، شوہر، گھر تو الگ رہا، جان بھی جانے کا اندیشہ ہوا تو کوئی پرواہ نہیں۔

''اگر اشرف نے زوجیت میں لینے سے انکار کر دیا تو---؟'' انسپکٹر نے سوال کیا۔

اب اس کے شوہر کو بات کرنے کا موقع ملا۔ اس کے دل میں جو نفرتوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا، زبان کے راستے بہہ نکلا۔ کہنے لگا۔

''میں تم کو روک تو نہیں سکتا۔ بے شک مسلمان ہو جاؤ مگر اس سے پہلے میرا یہ فیصلہ بھی کان کھول کر سن لو کہ بچوں کی شکل زندگی بھر نہ دیکھنے دوں گا--- اس گلی میں، جہاں ہمارا گھر ہے تمہیں آنے کی جرات نہ ہو سکے گی۔ آج کے بعد تمہارا میرا ناطہ ٹوٹ جائے گا۔''

عورت سوچنے لگی۔ اب اشرف پر منحصر تھا وہ جو کہتا۔ اشرف کو لایا گیا۔ انسپکٹر صاحب نے اشرف کو مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا کہ کیا تم اسے پسند کرتے ہو اور اپنی زوجیت میں ابھی قبول کر لو گے؟--- چونکہ اشرف کی بیوی فوت ہو چکی تھی اس لئے اشرف نے بغیر کی حیل و حجت کے اسے بخوشی قبول کر لیا۔ اسی وقت مولوی صاحب نے کلمہ شہادت پڑھوایا اور عورت مسلمان ہوگئی۔ اب اشرف سے اس کا ناطہ تھا۔ پرانے سب ناطے رشتے ٹوٹ گئے تھے۔ باپ بچوں کی طرف بڑھا اور بولا کہ اب گھر چلو، تمہاری ماں مر گئی ہے، تم یتیم ہو گئے ہو--- بچوں نے رو رو کر برا حال کر لیا۔ ایک برباد ہو گیا تو ایک آباد۔ کسی کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا تو کوئی شادمان تھا۔

بچے ماں سے دیوانہ وار چمٹ گئے۔ وہ روئے جا رہے تھے۔ ماں مجسمہ حیرت تھی، بچے سراپا التجا تھے۔ بچے ماں کو گھر لے جانے کے لئے التجائیں کر رہے تھے۔ دور کرنے سے وہ اور زیادہ قریب آتے۔ ہر آنکھ اشکبار تھی،

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سب کے لبوں پہ چپ کی مہر لگ گئی تھی۔ ہر دل کی دھڑکن میں ممتا کی تڑپ شامل تھی۔ اب ماں اور بچے مذہب کی دیوار کو گرا نہیں سکتے تھے۔ جو کچھ ہوا تھا، ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچ کر ہوا تھا، جذبات کی لغزش نہیں تھی---
پھر سب اپنے گھروں کی طرف چل دیئے۔

پہلا دن تھا، نیا نیا زخم تھا۔ بچوں نے اودھم مچا دیا۔ ماں بن گھر کے در و دیوار سے لپٹی ہوئی تنہائی ڈسنے کو دوڑتی مگر اسے دور کرنا کسی کے بس کا روگ نہیں تھا۔ یہ تو وقت ہی ہے جو زخم کا مرہم بنتا ہے--- یہ ساری باتیں مجھے سنا کر وہ واپس چلے گئے۔ میں کافی دیر پریشان رہی، سوچتی رہی کہ قدرت کے کھیل بڑے نرالے ہوتے ہیں۔ کئی ماؤں کے بچے نہیں ہوتے تو کبھی تقدیر کا ہاتھ بچوں سے مائیں چھین لیتا ہے۔ یہ سب کیوں ہوتا ہے؟ اگر خداوند مالکِ دو جہاں کو یہ بات پسند تھی کہ عالیہ کو اسلام کی نعمت سے مالا مال کرنا ہے تو اس کے شکم سے بچوں کو جنم دے کر اسے آزمائش میں کیوں مبتلا کیا؟ اس مرد کے نصیب میں بھی اللہ رب العزت نے اسلام کے نور کی کرن لکھ دی ہوتی۔ کاش، ایسا ہوتا۔

میں آج اس واقعہ کو یاد کرتی ہوں تو عجیب کشمکش میں مبتلا ہو جاتی ہوں۔ نہ یہ زبان سے نکال سکتی ہوں کہ وہ مسلمان کیوں ہوئی تھی، بچوں کو کیوں چھوڑا۔ نہ یہ لبوں پہ آتا ہے کہ وہ کیسی ماں تھی جسے بچوں سے پیار و محبت نہ تھی، ہمدردی نہ تھی؟ کیوں کہ ہم اپنے مذہب اسلام کی خاطر مال، اولاد، گھر بار سب کچھ قربان کرنا اوّلین فرض سمجھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی حکم عدولی کیسے کریں، حضور پاک کی سنت کو کیسے نظر انداز کریں--- آیئے مل کر دعا کریں کہ ہم دین اسلام کی راہ میں آنے والی ہر رکاوٹ کو دور کر سکیں، دین اسلام کے اصولوں پر کاربند رہنے کی ہمت پیدا کریں تاکہ آنے والی نسلیں ہمارے نقشِ قدم پر چل سکیں، آمین!

☆☆

واہ ری عورت

اعجاز حسین سٹھار، نور پور تھل

وہ صرف نام ہی کی شریفاں تھی ورنہ شرافت اس کے نزدیک سے بھی نہ گزری تھی۔ اس کا ٹھکانہ گاؤں سے تین میل دور زمیندار کی جاگیر پر کنویں کے پاس تھا جہاں ایک ہی خاندان کے دس بارہ گھر آباد تھے اور زمین کا سینہ چیر کر پیٹ کا دوزخ بھر رہے تھے۔ وہ ابھی تیرہ چودہ کے سن کو ہی پہنچی تھی لیکن اپنے کرتوتوں کی وجہ سے سب کی نظروں میں آ گئی۔ سب جوان لڑکوں سے معاشقہ چلا رکھا تھا۔ کسی سے مسکراہٹ کا تبادلہ ہو رہا ہے تو کوئی ترچھی نظروں کی زد میں ہے۔ سب جوان دوسروں سے چوری اپنی محبت کا خراج وصول کرتے رہتے لیکن یہ کسی کو معلوم نہ تھا کہ وہ کس سے کس حد تک سیریس ہے یا تعلقات کس نہج پر ہیں، بس کنویں کی رونقیں اسی کے دم سے تھیں اور زمیندار کے لڑکے کو تو وہ بڑی لفٹ کراتی تھی اور تحفوں کا تبادلہ سرِ عام ہوتا تھا۔ اس کا بوڑھا باپ کڑھتے کڑھتے ملک عدم کو سدھار گیا تو باگ ڈور بھائیوں کے ہاتھ آ گئی لہٰذا انہوں نے بے راہ روی سے روکنے کا واحد ذریعہ شادی قرار دیا اور اسے اس بندھن میں باندھ دیا گیا۔

شریفاں کا خاوند نہ صرف عمر کا بڑا تھا لیکن کم تو اور عقل کا بھی پورا تھا۔ ایسے لوگوں کو عام طور پر بدھو کا خطاب دیا جاتا ہے۔ وہ بیچارہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی خاموش تھا کیوں کہ پھر خوبصورت بیوی سے ہاتھ گنوانے پڑتے--- گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ شریفاں ایک بچی کی ماں بن گئی لیکن طبیعت میں وہی رنگینیاں رہیں۔ شوہر بے چارے نے چپ سادھ لی تھی اور اسے کھل

کھیلنے کا موقع مل گیا تھا کیوں کہ شادی کے بعد گھر کی مالکن تھی۔ سودا سلف خریدنے گاؤں جاتی تو وہاں بھی اپنے کئی مداح پیدا کر لئے۔ کئی منچلے دکاندار اس کی نظرِ التفات حاصل کرنے کے لالچ میں سودا ادھار دے دیتے لیکن ادھار کا تو بس بہانہ ہوتا تھا۔ بہی کھاتوں میں اس کا نام کئی سالوں سے چلا آ رہا تھا لیکن میزان میں اضافہ ہوتا رہا، رقم میں کمی واقع نہ ہو سکی۔

گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ شریفاں کی لڑکی جوان ہو گئی بلکہ بھائی بھی جوانی کی حدوں کو چھو رہے تھے لیکن اس کے لچھن وہی تھے۔ حقیقت میں وہ بوڑھی ہوئی نہ تھی کیوں کہ کم عمری میں شادی ہوئی اور جلد ہی اولاد ہو گئی۔ وہ اپنی لڑکی سے سترہ یا اٹھارہ سال بڑی تھی، اس کی بڑی بہن نظر آتی تھی۔ چہرے پر ذرہ برابر بھی بے رونقی نہ تھی کیوں کہ جس کے ذہن میں عیاشی ہو، گھر کا نفع و نقصان نہ سوچا جائے تو بڑھاپا قریب بھی نہیں پھٹکتا۔ پھر وہ شوخ اور پھولدار کپڑے پہنتی اور ہر دیکھنے والی آنکھ جب میلی ہو تو بوڑھی کیسے نظر آتی؟--- شریفاں کے بھائیوں نے لوگوں کے کہنے سننے میں آ کر بھانجی کی شادی گاؤں میں ایک دور کے رشتہ دار سے کر دی مبادا کہیں شریفاں اسے بھی اپنے راستے پر نہ لگا لے لیکن شریفاں نے بیٹی کو کبھی ٹِک کر نہ بسنے دیا۔ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر لڑکی کو لئے ڈیرے پر آ جاتی اور لڑکی بھی بس اللہ میاں کی گائے تھی جو ماں کے کہنے میں آ کر آئے روز لڑ جھگڑ کر میکے پہنچ جاتی۔ کہنے والے یہ کہتے تھے کہ شریفاں دراصل رفیق سے رقم بٹورنا چاہتی تھی جو اس کی بیٹی کا خاوند تھا لیکن وہ ہر دفعہ کیسے فرمائشیں پوری کرتا؟ لیکن شریفاں کو تو پیسے کی لت تھی۔ وہ رشتوں کو بھی زر میں تولنا چاہتی تھی۔ رفیق اب اس کی چال سمجھ گیا تھا اور ہاتھ کو کھینچ کر رکھتا تھا۔ نتیجتاً شریفاں بیٹی کو اپنے پاس ہی رکھنے لگی۔ یہ سب کچھ رفیق کو ناپسند تھا کیوں کہ وہ اپنی خوشدامن کے لچھن سنتا رہتا تھا لہٰذا آئے روز جھگڑا بڑھنے لگے۔

شریفاں اب گاؤں آتے وقت کبھی کبھار بیٹی کو بھی ساتھ لانے لگی۔ اس سے جہاں اس کا حلقہ احباب بڑھنے لگا، وہاں رفیق کے دل میں نفرت کے الاؤ سلگنے لگے کیوں کہ وہ اسی گاؤں میں ہی رہائش پذیر تھا۔ دوست بیلی اسے اطلاعات فراہم کرتے رہتے تھے۔ رفیق کچھ صبر کر ہی لیتا لیکن اس کے دوسرے گاؤں میں مقیم رشتہ داروں تک جب یہ باتیں پہنچیں تو بھڑک اٹھے، رفیق کو اگر غیرت دلائی اور بیوی کو گھر لانے پر زور دیا لہٰذا بات کافی طول پکڑ گئی کیوں کہ شریفاں یوں ہونس میں آ کر بیٹی کو بھیجنے پر تیار نہ تھی بلکہ حقیقت میں یہ تو بہانہ تھا، وہ تو بیٹی کو اپنے پاس رکھنا چاہتی تھی تاکہ رونقیں ماند نہ پڑنے پائیں۔

رفیق اور اس کے رشتہ داروں نے اپنی سی کوشش کر دیکھی لیکن شریفاں نے ان کی ایک بھی نہ چلنے دی۔ اس کے بھائی اور بیٹے بھی بے بس نظر آتے تھے اور یوں یہ گھر میں معاملہ انتہائی سنگین صورت حال اختیار کر گیا۔ معاملے کی نوعیت کے پیشِ نظر کئی دوسرے سرکردہ لوگوں نے بھی اپنی سی کوشش کر دیکھی لیکن معاملہ سلجھنے کی بجائے اور بگڑ گیا--- بظاہر بات کئی مہینوں سے دبی ہوئی تھی لیکن اندر ہی اندر کھچڑی پک رہی تھی۔

رفیق کے رشتہ دار جس گاؤں میں رہتے تھے، اکھڑ مزاجی اور قتل و غارت وہاں کا معمول تھا۔ اسی وجہ سے کئی اشتہاص تختہ در تختہ بھی پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے ہی رفیق کے ساتھ مل کر منصوبہ بنایا کہ گھی اب ٹیڑھی انگلیوں سے ہی نکالنا پڑے گا کیوں کہ جب سے شریفاں کا خاوند مرا تھا، اس کے لچھن ہی بدل گئے تھے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ شریفاں نے بوڑھے کو خود ہی گلا دبا کر ہلاک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر دیا تھا کیوں کہ مرحوم کی گردن پر نیلے نشان دیکھے گئے تھے لیکن موت سردی لگنے سے بتائی گئی تھی۔۔۔ بہر حال، بڑے بوڑھوں نے عزت کی خاطر معاملہ دبا دیا تھا لیکن شریفاں کو کھل کھیلنے کا موقع ہاتھ آ گیا تھا اور اس کی لڑکی کو بھی ڈیرے کے ایک جوان کے ساتھ ملتے اور رنگ رلیاں مناتے دیکھا گیا تھا کیوں کہ وہ کتنا ہی پاگندہ ماحول سے بچتی لیکن آخر وہ بھی جوان تھی۔ مچلتے جذبات کو کہاں تک دباتی، پھر روکنے ٹوکنے والا بھی کوئی نہ تھا۔ اس کا بھٹک جانا حیرت کی بات نہ تھی۔

رفیق کے رشتہ داروں نے یہ پروگرام طے کیا کہ لڑکی کو جا کر اٹھا لیتے ہیں، دیکھتے ہیں کون ہمارے راہ کی دیوار بنتا ہے۔ ان لوگوں نے وہیں سے کچھ اور لوگوں کو بھی ساتھ شامل کر لیا جن میں کئی سابقہ سزا یافتہ مجرم بھی تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب پہیہ کی ایجاد دیہاتیوں تک نہیں پہنچی تھی۔ سواری کے لئے صرف اونٹ اور گھوڑے ہی استعمال ہوتے تھے۔ ہاں، البتہ بندوق وغیرہ کہیں کہیں نظر آ جاتی تھی لیکن زیادہ تر ہتھیار کے طور پر نیزہ، برچھا اور کلہاڑی استعمال ہوتے تھے۔ ان وقتوں میں زیادہ تر زمینیں بنجر اور غیر آباد ہوتی تھیں۔ کم جگہ پر کاشت ہوتی تھی۔ لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ مزدوری پر منتقل ہوتے رہتے تھے۔

وہ بھی اپریل کا مہینہ تھا۔ فصلوں کی کٹائی زوروں پر تھی۔ شریفاں بھی مزدوری کے بہانے ایک دور کے ڈیرے پر جو گاؤں کے دوسری طرف تھا، گئی ہوئی تھی لیکن دراصل وہاں وہ اپنے آشنا سے ملاقاتوں کو طول بنانے کے لئے رہتی تھی۔ سنا تھا، وہ نکاح کرنے والی ہے لیکن بھائی رکاوٹ بنے ہوئے تھے کیوں کہ اس کا آشنا پوتے پوتیوں والا تھا لیکن ذاتی کئی اراضی کا مالک تھا۔۔۔ اسی دوران رفیق اور دوسرے پندرہ رشتہ داروں نے گھوڑوں اور اونٹوں پر سوار ہو کر شریفاں کے ڈیرے پر چڑھائی کر دی۔ شریفاں کی لڑکی وہیں موجود تھی۔ ڈیرے والوں نے جب اتنے لوگوں کو مسلح دیکھا تو سب گھروں میں گھس گئے۔ کسی نے بھی دخل اندازی نہ کی، صرف شریفاں کے بھائی موقع پر کھڑے رہے اور معاملہ کو سلجھاتے رہے۔ شریفاں کی لڑکی کو اسی دوران کہیں نہ کہیں چھپنے کو جگہ مل گئی۔

ادھر پہلے فریقین کے درمیان گالی گلوچ کا تبادلہ ہوا، پھر معاملہ بڑھ گیا۔ رفیق کے ساتھیوں نے نیزوں، برچھوں اور کلہاڑیوں کا استعمال شروع کر دیا جس کے نتیجے میں شریفاں کے جوان بھائیوں کی آنتیں زمین پر آ رہیں۔ ایک بھائی جو ابھی چھوٹا تھا، شدید زخمی ہوا۔ پھر انہوں نے شریفاں کی لڑکی اور اپنے نشانے کو تلاش کرنا شروع کیا۔ وہ کہیں کاٹھ کباڑ میں چھپی ہوئی تھی، اسے اٹھا کر اونٹ پر سوار کر لیا اور اپنے گاؤں جو کہ وہاں سے تقریباً تیس میل دور تھا، وہاں چلے گئے۔ بات تھانے کچہری تک پہنچی تو پولیس نے چھاپہ مار کر تمام ملزموں کو مع مغویہ پکڑ لیا اور حوالات میں بند کر دیا۔ شریفاں کے دو بھائیوں نے سات دن کے اندر جان خدا کے حوالے کر دی۔ تیسرا بھائی جو کم عمر تھا، زندہ بچ گیا جو چند سال ہوئے طبعی موت مرا ہے۔

ادھر شریفاں کی کارگزاری بھی سن لیجئے۔ جب اس نے سنا کہ اس طرح اس کی لڑکی کو اٹھا کر لے گئے ہیں اور تینوں بھائی زخمی ہیں تو اس نے میدان صاف دیکھ کر سب سے پہلے آشنا سے نکاح کر لیا، بعد میں واپس گھر لوٹی اور یہ اپنے رویہ سے نہ ظاہر ہونے دیا کہ اتنا بڑا فساد صرف اسی کی وجہ سے ہوا ہے اور وہ جواب کام کر کے آئی تھی، وہ ابھی کسی پر بھی ظاہر نہ ہوا تھا کہ ایک طرف بھائیوں کی

لاشیں پڑی تھیں اور اسے اپنے بیاہ کی پڑی ہوئی تھی گویا بھائیوں کا خون ہاتھوں پر لگا کر اس نے مہندی کی رسم بھی پوری کر لی اور پھر چہرے پر پچھتاوے کی جھلک تک نہ آنے دی۔

پولیس نے رفیق اور اس کے ساتھیوں سے شریفاں کی لڑکی برآمد کر لی اور اس کی مرضی کے مطابق واپس بھیج دیا۔ رفیق اور دوسرے لوگوں پر مقدمہ چلا جن میں سے رفیق کا ایک قریبی رشتہ دار پھانسی کے تختے تک پہنچا اور باقی کو عمر قید ہوئی۔ جن میں سے ایک جیل میں ہی مر گیا اور دوسروں کی قسمت اچھی تھی کہ اسی دوران پاک ملک معرضِ وجود میں آیا تو وہ رہا ہو کر گھر آ گئے۔

شریفاں کی دوسری شادی سے تین لڑکیاں ہوئی تھیں جو اب اپنے گھروں والی ہیں اور وہ خود کئی سال قبل وفات پا گئی تھی۔ اس کی لڑکی ابھی تک زندہ ہے اور کافی بچے ہیں۔ اس کی برادری میں پھر شادی کر دی گئی تھی۔۔۔ شریفاں جب تک زندہ رہی، اس کی زبان پر کبھی بھی یہ الفاظ نہ آئے کہ وہ اپنی سابقہ زندگی پر پچھتا رہی ہے یا اس کی وجہ سے کتنے گھروں کے چراغ گل ہوئے۔ عمر بھر کے لئے خاندان کے لئے کلنک کا ٹیکہ ثابت ہوئی۔ وہ دراصل عورت کے پوتر وجود پر گندگی کا دھبہ تھی۔ اب جب بھی اس کا ذکر آتا ہے تو بیٹیوں والے لوگ سر جھکا لیتے ہیں کیوں کہ وہ بھی تو آخر کسی کی بیٹی تھی۔

کسی کا دوش نہیں

فرح دیبا لاشاری، تونسہ شریف

اس نے چائے دان کو گلابی کشیدہ کاری والی ٹیکوزی سے ڈھانک دیا، جسے اس نے حسین خیالات سے الجھتے الجھتے بنایا تھا۔ باکثرت استعمال نے اس پر تہہ در تہہ میل چڑھا دیا تھا لیکن ایک دن وہی ٹیکوزی دھونے کے بعد پھر سے چمکنے لگی مگر اس کے خیالات سلجھنے کا نام ہی نہ لیتے، ہر سلجھاؤ کئی ہزار الجھنوں کو جنم دیتا اور وہ سسک کر رہ جاتی۔ آج پھر ماں نے کہا تھا۔

''بیٹی! چند مہمان آ رہے ہیں، برتن نکال لینا۔''

وہ پوچھے بغیر ہی سمجھ گئی کہ مہمان کون ہیں، کیوں آ رہے ہیں اور ان کے آنے کے بعد کیا ہوگا؟ اس طرح کی کئی مہمان نوازیاں اسے ابھی تک یاد تھیں۔

''لڑکی تو ہمیں بے حد پسند ہے لیکن آپ جہیز۔۔۔'' وہی ایک سوال اس کے کانوں میں گونج اٹھا۔

''بس، خدارا۔۔۔'' وہ اپنی انگلیاں کانوں میں ٹھونس لیتی۔

''بیٹی! بڑی دیر ہو گئی، مہمان ابھی نہیں آئے؟'' ماں کی آواز پر وہ چونک گئی۔

''ہاں، ماں! بڑی دیر ہو گئی۔۔۔''

اس نے بے دلی سے گھر کی غربت اور اپنی قسمت پر نہ جانے کیا سوچتے ہوئے کہا۔ ماں کی بوڑھی آنکھیں اب بھی امید سے جھلملا رہی تھیں۔ اس نے منہ پھیر کر اپنے آنسو آنچل میں جذب کئے اور کھولتا ہوا پانی چائے دان میں ڈال دیا۔

''کیوں، شاردا! کرچیاں نکلے چائے دان کو تو اس ٹیکوزی سے ڈھانپ دیا لیکن اپنی غربت کو کس لبادے میں لپیٹو گی۔۔۔؟''

اسے لگا جیسے ٹیکوزی مضحکہ خیز انداز میں اسے گھور کر پوچھ رہی ہو، جیسے وہ بھی ان کی غربت کا مذاق کر رہی ہو۔۔۔ اس دن آنے والوں میں سے کوئی بھی نہ آیا اور وہ دن یونہی گزر گیا۔

اس کے ہاتھ کپڑے کو تھامے ہوئے تھے اور پیر مشین کے پائدان پر تیزی سے حرکت کر رہے تھے۔ نیند

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے اس کی پلکیں بوجھل ہوئی جارہی تھیں۔ ہر مرتبہ حوصلہ ہارنے کے باوجود پھر بھی اس نے کام جاری رکھا۔ تھکن کا احساس سارے وجود پر چھایا ہوا تھا۔ اسے کچھ بھی پتہ نہیں تھا کہ رات کتنی بیت چکی ہے۔ وہ اپنے کام اور سوچوں میں اس طرح مگن تھی کہ جیسے وہ تو اس دنیا ہی میں نہیں رہتی اور نہ ہی اس دنیا سے کچھ تعلق ہے۔ اچانک اس نے بڑی مضبوطی سے پیر پائدان پر جما دیئے اور سانس روکے ہمہ تن گوش ہو گئی۔ دوسرے کمرے سے بھائی کی آواز آرہی تھی۔

"فریج، صوفہ سیٹ، پلنگ، ٹی وی، سنگھار میز، پنکھا اور دس ہزار نقد---!"

اسے یوں لگا جیسے بھائی کی آواز دور بہت دور کسی کھائی میں سے آرہی ہو۔ وہ چیخ چیخ کر سب کو بلانا چاہتی تھی لیکن اس میں اتنی ہمت ہی نہ رہی تھی۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ کیا وہ بوجھ ہے تم سب پر؟---- لیکن بول نہ سکتی تھی۔ وہ اکیلے ہی اپنی اس بے بسی پر آنسو بہاتی رہی لیکن کسی کو خبر نہ ہوئی اور کسی نے اسے دلاسا نہ دیا۔

لڑکی والوں کے گھر میں یہ سلسلہ چلتا ہی ہے سوچتا رہا۔ بالآخر ایک دن اسے دلہن بننا پڑا۔ باپ کے گھر سے سہیلیوں کے گیتوں اور ماں کی ہچکیوں کے درمیان اسے وداع کیا گیا۔ اس نے ایک اور احسان اس گھر پر کیا تاکہ ماں باپ کی فکریں، لوگوں کی باتیں اور بھائیوں کی پریشانیاں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں۔ وہ نہ صرف دو عدد بیویوں کا شوہر تھا بلکہ چھ عدد بچوں کا باپ بھی تھا۔ اپنی پچاس سالہ زندگی میں وہ تیسری بار حجلہ عروسی میں داخل ہو رہا تھا جہاں ایک معصوم اٹھارہ سالہ کنواری لڑکی اپنی بدنصیبی اور اپنے خوابوں کی بھیانک تعبیر پر آنکھیں موندے دل ہی دل میں لرز رہی تھی۔

اسی طرح اس نے حالات سے سمجھوتہ کرلیا۔ وہ چھ بچوں کے بوڑھے شوہر کی ایک خدمت گار مشین بن گئی۔ اپنی ذمہ داریوں کو نبھاتے نبھاتے اتنی تھک گئی کہ اسے اپنے بارے میں سوچنے کا وقت ہی نہ ملتا۔ کبھی کبھار جب اسے اپنی بے بسی پر رونا آتا تو وہ اپنی دوست عافیہ کے پس چلی جاتی جو اس کے مضمحل دل و دماغ پر پیار سے پھائے رکھتی اور اسے اپنی پیاری باتوں میں ایسا الجھاتی کہ وہ سب کچھ بھول جاتی۔ عافیہ کو خدا نے ہر خوبی سے نوازا تھا لیکن اس کی ساری خوبیاں غربت کی راکھ تلے دھندلا گئی تھیں۔ بوڑھا باپ دو وقت کی روٹی اور دو جوڑے کپڑے مہیا کرتے کرتے تھک سا جاتا۔ شادی بیاہ تو بہت بڑی بات ہیں، رشتے آتے اور مطالبات کی تکمیل کا امکان نہ ہونے پر لوٹ جاتے، شاید بیچارے غریبوں کی قسمت ہی ایسی ہوتی ہے۔ لوگ اپنی طاقت کے بل بوتے پر ان کو کئی بار مارتے اور پھر زندہ کرتے ہیں اور یہی ان کے شب و روز ہیں جو بغیر کسی شور شرابے اور ہلکی سی آہٹ کے یوں ہی گزر جاتے ہیں۔

اس نے سوچ لیا کہ وہ عافیہ کو اپنی بھابی بنا لے گی۔ کتنی پیاری اور سگھڑ ہے، ماں کو اور کیا چاہئے۔ بھائی خود بھی کون سا راجکمار ہے، چھ سات سو ماہانہ کمانے والے کو اور کون سی راج کماری ملے گی۔ اس خیال کے آتے ہی وہ روتے میں مسکرا پڑی---- عافیہ کو اپنے گلے لگا کر وعدہ کیا کہ وہ اسے اپنی بھابی بنائے گی اور اس طرح ایک معصوم لڑکی تباہ ہونے سے بچ جائے گی۔

جب وہ میکے گئی تو اس نے کسی سے بھی شکایت نہ کی لیکن اس کے دل میں صرف ایک ہی خیال تھا کہ بھائی کو راضی کرے۔ اپنے دکھ درد اور محرومیت کے ناسور سب کچھ فراموش کر دیئے۔

"بھائی جان! میں نے ایک چاند سی بھابی ڈھونڈ لی ہے۔"

مکہ معظمہ کی خوشبو کا شاہد

مکہ سے خبر آئی کہ ہمارا دوست امان اللہ جو کہ مکہ معظمہ میں پچاس سال سے مقیم اور سعودی شہری تھا، انتقال کر گیا۔ امان اللہ ایک خوش نصیب شخص تھا کہ وہ ایک متبرک خوشبو کا شاہد تھا۔ اس کے انتقال کی خبر سنی تو بے اختیار مجھے خوشبو کا وہ واقعہ یاد آیا اور اس کا تذکرہ کرنے کا خیال آیا کیونکہ ایک خوشبو نے امان اللہ کی زندگی بدل دی تھی---- امان اللہ سے اسی کی دہائی میں عارف الحق عارف کے توسط سے دوستی ہوئی تھی اور ایک عمرے کے موقع پر ہم امان اللہ کے گھر مہمان بھی رہے تھے۔ امان اللہ برمی نژاد پاکستانی تھے۔ جب سعودی حکومت نے برمیوں کو اپنے ملک کے ویزے دیئے تو امان اللہ اپنے والد کے ساتھ مکہ کے شہری بن گئے۔ چھوٹی سی عمر میں وہ ایک سنار کی دوکان میں ملازم ہو گئے۔ مروہ پہاڑی کے پاس پرانے صرافہ بازار کی دوکان میں وہ کام کیا کرتے تھے۔ میں نے یہ دوکان دیکھی ہے لیکن اب یہ بازار حرم پاک کا حصہ بن گیا ہے---- امان اللہ بتاتے ہیں کہ ان کی دوکان کے سامنے کی دوکان ایک بخاری کی تھی۔ وہ صبح سویرے وہاں تلاوت کیا کرتے تھے۔ ایک دن انہوں نے مجھے بلایا اور دوکان کے ایک کونے کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ وہاں رک جاؤ اور دیکھو کہ وہاں کیا ہے؟---- امان اللہ دوکان کے ایک کونے میں گئے۔ وہاں کوئی غیر معمولی چیز نظر نہ آئی لیکن ایک عجیب مسحور کن خوشبو وہاں پھیلی ہوئی تھی۔ بوڑھے بخاری سنار نے پوچھا، کیا دیکھا؟---- امان اللہ نے بتایا کہ دیکھا تو کچھ نہیں البتہ ایک بہت اچھی خوشبو وہاں سے آئی ہے اور میں نے آج تک ایسی خوشبو نہیں سونگھی۔ بخاری نے کہا کہ ہاں، میں یہی جاننا چاہتا تھا کیونکہ کبھی کبھی دوکان کا یہ کونہ اس خوشبو سے مہک جاتا ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ میرا وہم ہے یا میرے خیال کی خوشبو ہے اس لئے میں نے کہا کہ میں کسی بچے کو وہاں بھیجوں اور دیکھوں کہ اس خوشبو کی حقیقت کیا ہے؟---- امان اللہ اس کے بعد اپنی دوکان میں آکر بیٹھ گئے۔ یہ خوشبو ان کے ذہن سے گویا پورے جسم میں سما گئی تھی۔ ان کو بے پایاں خوشی کا انوکھا احساس ہو رہا تھا۔ وہ اس خوشبو سے سرشار بیٹھے تھے کہ دوکان کا عرب مالک آگیا اور اس نے کہا کہ بچہ! آج سے یہ دوکان تیری ہے۔ اب میں یہاں نہیں آؤں گا۔ اس دوکان میں اتنا حصہ تیرا اور اتنا میرا اور میرا حصہ مجھے گھر پہنچا دیا کرنا---- دیکھتے ہی دیکھتے چودہ سال کا بچہ کروڑ پتی بن گیا۔ وہ ایک دم سے سونے کی دوکان، تین کارخانوں اور منوں سونے کا مالک بن گیا تھا۔ سب لوگ اس کے نصیب پر رشک کرتے۔ کوئی اس کی ایمانداری کو اس کا سبب بتاتا، کوئی اسے عرب سنار کی دریا دلی کہتا لیکن امان اللہ اسے اللہ کا فضل کہا کرتا تھا۔ کبھی کبھی اس کے ذہن میں یہ بات بھی آتی تھی کہ یہ تبدیلی اس خوشبو کا فیضان ہے اور اس خوشبو کا شاہد بنانا بھی اللہ ہی کا فضل تھا---- امان اللہ ہر سال زکوٰۃ کی مد میں کروڑوں روپے پاکستان، بنگلہ دیش اور بھارت کے دینی مدرسوں کے علاوہ برما کے مسلمانوں کو ہر سال یہ رقم پہنچاتا تھا۔ اس کے ریکارڈ میں اداروں اور ضرورت مندوں کی طویل فہرست تھی۔ جب ہم مکہ کے پرانے صرافہ بازار میں اس کی دوکان دیکھنے گئے تو وہاں توسیع حرم کے سلسلے میں کھدائی شروع تھی۔ دو سال بعد معلوم ہوا کہ یہ بازار ختم ہو گیا اور امان اللہ کو ایک دوکان کے بدلے حرم پاک کے اطراف میں تین دوکانیں الاٹ ہو گئیں۔ ہم نے یہ دوکانیں بھی دیکھی تھیں---- پرانے صرافہ بازار کی کھدائی ہوئی، دوکانیں ٹوٹیں تو معلوم ہوا کہ بخاری سنار کی اس دوکان کے اس کونے میں جہاں سے خوشبو اٹھتی تھی، وہاں حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے گھر کا ایک ستون آرہا تھا۔ یہ وہی دوکان تھی جہاں کئی سال پہلے امان اللہ نے خوشبو کا فیض حاصل کیا تھا۔ وہ اس مقام تک پہنچا، وہاں کھڑا ہو کر اس ستون کو دیکھا تو اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ امان اللہ جب بھی کسی کو یہ واقعہ سناتا ہے، اس کی آواز بھرا جاتی تھی۔ میں امان اللہ کو خوش نصیب کہا کرتا ہوں۔ جو کچھ اس کو ملا، وہ بڑے نصیب کی بات ہے۔ کرم کے فیصلوں کے حامل ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں۔ اس سے پوچھنے والے پوچھا کرتے تھے کہ بتاؤ تو، وہ خوشبو کیسی تھی؟---- وہ کہتا تھا کہ میں بتا نہیں سکتا کہ وہ خوشبو کیسی تھی لیکن وہ میری روح میں رچی ہوئی ہے، میرے دل میں بسی ہوئی ہے۔

عظیم سرور، لاہور

"اچھا---"

بھائی کے شوق اور اشتیاق نے اسے آگے کچھ اور کہنے کا حوصلہ دیا۔

"خوبصورت اور سگھڑ---- اب کیا کہوں، اتنی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پیاری ہے کہ جتنی بھی تعریف کروں کم ہے---" اسے عافیہ کی تعریف کے لئے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ "میں واقعی بڑی خوش نصیب ہوں جو مجھے اتنی اچھی بھابی مل گئی---" وہ مسرور تھی۔ اس نے بھائی کے چہرے کو دیکھ کر اندازہ لگایا، وہ بھی اس غیر یقینی انکشاف پر بے انتہا خوش تھا۔ "لیکن، بھائی جان---!" وہ جھجکی جیسے کوئی سنگین جرم کرنے جا رہی ہو۔ "لوگ بہت غریب ہیں، شادی پر ہزاروں نہیں خرچ کر سکتے۔"

"کیا---؟" بھائی کا چہرہ دھواں دھواں سا ہو گیا۔ سارا جوش اور خوشی دودھ کے ابال کی طرح بیٹھ گیا۔ "مجھے کوئی روز روز شادی تو نہیں کرنی ہے۔" بھائی کے اندر بیٹھا لالچی حیوان گرجنے لگا۔

"اوہ---"

وہ چند قدم سہم کر پیچھے ہٹ گئی۔ یہ مرد--- اس کا دل چاہا اپنے بھائی کا منہ نوچ لے، انہیں جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر پوچھے کہ تم نے مجھے کیا دیا تھا، کون سے ہزاروں روپے میری شادی پر خرچ کئے تھے؟ صرف چائے پر ہی تو نکاح پڑھوایا تھا اور وہ بھی ایک بوڑھے کھوسٹ سے جس نے آج تک ایک رات بھی سہاگ کا وہ سکھ نہیں دیا جسے پانے کی امید لئے ہر کنواری لڑکی اپنے پیا کے گھر جاتی ہے۔ میں نے تو صرف تم لوگوں کی خاطر اپنے ہی آبلوں سے رسنے والا پانی پی کر تشنگی کو بہلایا ہے اور تم میری خاطر اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ اس جوان اور غریب لڑکی کو اپنا لو جو حسن اور شرافت کا پیکر ہے اور اسی دولت سے مالا مال ہے جو شاید تم جیسے بے حس لوگ محسوس نہیں کر سکتے۔ کیا یہی برائی ہے اس میں کہ وہ ایک غریب ماں باپ کی بیٹی ہے، غریب گھر میں پیدا ہوئی ہے۔ اگر غریب ہونا جرم ہے تو تم بھی تو غریب ہو۔ تم بھی مجرم ہو اس جرم کے، تمہیں انسان کہنا بھی انسانیت کی توہین ہے---" وہ ساکت سی بھائی کو تکتی رہی اور اس کی آنکھوں سے موتی ٹوٹ کر بکھرتے رہے۔

پھر ایک دن عافیہ کو بھی وداع ہونا پڑا۔ ڈھولک کی تھاپ پر وداعی کے گیتوں کی آواز سن کر اس کا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ عافیہ کو بابل کے گھر سے وداع کر کے اپنے ساتھ لے جانے والا عافیہ کے باپ سے دو چار سال چھوٹا تھا۔ وہ دور کھڑی عافیہ کو حسرت و یاس سے تکتی رہی، کتنی اداس اور غمگین تھی عافیہ--- ہمیشہ پھول کی طرح ہنسنے اور مسکرانے والی عافیہ پتھر کی طرح بے جان لگ رہی تھی۔ اس کے دل میں غصے اور نفرت کے آتش فشاں کھول رہے تھے۔ اسے ایسے لگا جیسا پھر سے وہی کہانی دہرائی جا رہی ہو اور شاید ہم جیسی کئی غریب لڑکیوں کے ساتھ ہمیشہ ایسا ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا۔ "بھابی" رو رو کر اسے یہ لفظ یاد آ رہا تھا جو اس نے عافیہ کے لئے ہی سوچا تھا لیکن اب تو عافیہ بھی اس کی طرح اپنی بے بسی پر رو رہی تھی۔ شاید یہی اس کا نصیب تھا جو اسے مل چکا تھا۔

"شاردا---!" رخصت ہوتے وقت عافیہ نے سوگوار آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ "آپ نے تو مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ آپ مجھے اپنی بھابی بنا لیں گی۔ پھر میں اس بوڑھے شخص کے حوالے کیوں کی جا رہی ہوں؟"

"میں کیا کرتی، عافیہ! اگر میں مجبور نہ ہوتی تو خود گئیوں مضبوط بانہوں کی تمنا کے باوجود بوڑھی ہوس کا شکار ہوتی--- میں نے بھی جوان ساتھی کے خواب دیکھے تھے۔"

اس نے کہنا چاہا لیکن الفاظ اس کے حلق میں اٹک کر رہ گئے اور وہ رندھے ہوئے گلے سے صرف اتنا کہہ سکی۔

"اس میں کسی کا دوش نہیں، پگلی! اپنا نصیب ہی ایسا ہے۔"

☆☆

منظوم حکایات

شاعری کا ذوق رکھنے والوں کے لئے ایک گوشہ

ہر ماہ پختہ کار و نو آموز شعراء کا تازہ کلام اس عنوان کے تحت پیش کیا جاتا ہے۔ ہم گزارش کریں گے کہ شعرا کرام غزل کے ساتھ ساتھ نظم پر بھی توجہ دیں اور مناسب ہو کہ نو آموز شعراء کسی مستند شاعر سے اصلاح لینے کے بعد ہمیں اپنے کلام سے نوازیں۔ اپنا کلام اس پتہ پر ارسال فرمائیے۔

نگراں "منظوم حکایات" ماہنامہ "آداب عرض"، پوسٹ بکس نمبر 4132 ملتان روڈ لاہور 54500

حمد باری تعالیٰ

یہ ہے انسان جو اپنی خطائیں کم نہیں کرتا
وہ ہے رزاق، وہ اپنی عطائیں کم نہیں کرتا
سلیقہ اپنی بخشش مانگنے کا کچھ نہیں ہم کو
صبح دم ربِ کعب تو صدائیں کم نہیں کرتا
ہمی کرتے ہیں نافرمانیاں اس ربِ اکبر کی
مگر وہ پھر بھی جنت کی ہوائیں کم نہیں کرتا
گناہ کرتے ہیں اور اس کے غضب کو دیتے ہیں دعوت
وہ ہے رحمٰن، رحمت کی گھٹائیں کم نہیں کرتا
گرے ہیں ظلمت عصیاں میں ہم تو ہر گھڑی خالد
وہ خالق، نور و رحمت کی شعاعیں کم نہیں کرتا

☆

خالد یوسفی، سرگودھا
موبائل: 0321-7715366

نعت

جاؤں در رسولؐ پہ چاہت لیئے ہوئے
مدت سے چشم شوق ہے حسرت لیئے ہوئے
جب آسماں سے ظلم برستا تھا رات دن
آئے تھے آپ دنیا میں راحت لیئے ہوئے
انساں جھلس رہا تھا عداوت کی دھوپ میں
رحمت مآبؐ آئے اخوت لیئے ہوئے
جب نفرتوں کے زہر میں سب شہر غرق تھے
ذاتِ نبیؐ تھی خوئے محبت لیئے ہوئے
توفیق ہو عطا جو دیارِ رسولؐ کی
جاؤں در حضورؐ پہ چاہت لیئے ہوئے

☆

ابراہیم حسان، حاصل پور

نعت

صد شکر کہ مدینے کی مجھے رات ملی ہے
لگتا ہے کہ اکرام کی خیرات ملی ہے
ہر بات محمدؐ ہی کی بس حکمِ خدا ہے
سرکار سے الطاف کی ہر بات ملی ہے
سرکارؐ عطا کرتے ہیں یہ نطق کی دولت
اس در سے ہی نعتوں کی یہ سوغات ملی ہے
سرکارؐ مدینے سے ہمیں فیض ملا ہے
اس در سے عنایات کی برسات ملی ہے
عادلؔ کو ملا، جو بھی اس نے ہے مانگا
طیبہ سے ہی یہ دولتِ جذبات ملی ہے

☆

محمد عادل گلزار، فیصل آباد
موبائل: 0300-6616042

نعت شریف

دل میں لیئے مہکار مدینہ
حاضر ہیں، سرکار مدینہ!
آنکھوں میں اشکوں کی جھڑی
سامنے ہے دربار مدینہ
دل کی سیاہی دور ہوئی
دیکھے جب انوار مدینہ
شاید نقش پا مل جائے
آؤ چلیں بازار مدینہ
میرا مسیحا کملی والا!
مجھ کو لگا آزار مدینہ
دشمن پہ بھی نظر کرم
ایسے ہیں سالار مدینہ
وہ خوش بخت ہیں جن کو شمیم
حاصل ہے دیدار مدینہ

☆

صادق شمیم چوہدری، گوجرانوالہ
موبائل: 0300-6470574

نعت

ہم پر بھی کرم ہوگا، ہم پر بھی عطا ہوگی
ہم حجرہ اسود کو ان آنکھوں سے دیکھیں گے
آنکھ میں نقش ہوگا سبز گنبد کا منظر
جب بڑھے گا مکہ سے طیبہ کو قافلہ
یارب نصیب کرنا ہم کو بقیع کی مٹی
اس سال مقدر میں مدینے کی ہوا ہوگی
اور سامنے کعبے کے نماز اپنی ادا ہوگی
میرے آقاؐ کے گھر کی وہ پاک فضا ہوگی
کتنی پرکیف منزل وہ میرے خدا، ہوگی
بھلا اور کیا تمنا میری اس کے سوا ہوگی

☆

سعدیہ قادریہ عطاریہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پردیسی

جو گھر سے دُور ہوتے ہیں
بہت مجبور ہوتے ہیں
کبھی باغوں میں سوتے ہیں
کبھی چھپ چھپ کے روتے ہیں
گھروں کو یاد کرتے ہیں
تو پھر فریاد کرتے ہیں
مگر جو بے سہارا ہوں
گھروں سے بے کنارا ہوں
انہیں گھر کون دیتا ہے
یہ خطرہ کون لیتا ہے
بڑی مشکل سے اک کمرہ
جہاں کوئی نہ ہو رہتا
نگر سے پار ملتا ہے
بہت بیکار ملتا ہے
تو پھر دو، تیں ہم جیسے
ملا لیتے ہیں سب پیسے
اور آپس میں یہ کہتے ہیں
یونہی مل جل کے رہتے ہیں
اوائل میں مہینے کے
سب اپنے خوں پسینے کے
جو پیسے جوڑ لیتے ہیں
گھروں کو بھیج دیتے ہیں
اور اپنے خط میں لکھتے ہیں
دھیان ہم اپنا رکھتے ہیں
بہت جی چاہتا ہے تب
کہ ماں کو بھیج دیں یہ سب
جو گودی میں سلاتی تھی
کھلاتی تھی، پلاتی تھی
مگر کچھ بھی نہیں ہوتا
تو کر لیتے ہیں سمجھوتا
کوئی پہروں بلکتا ہے
کوئی دل میں سلگتا ہے
یہ ہے پردیس، اے علوی!
کہاں ہے دیس، اے علوی!

☆

❀ محمد عرفان علوی، گوجرانوالہ
موبائل: 0300-7452161

پچھتاوے

من مندر میں آگ لگی تو
جل گئے سب اَرمان
افراتفری کے عالم میں
پیار چڑھا پروان
بدل گیا انسان
ہیر سلیٹی چوریاں لے کر
بیلے میں لے جائے
رانجھا مزے مزے سے کھائے
سوہنی چادریا میں ڈوبی
کچا ڈوبا جائے
رورو نیر بہائے
گیت غموں کے گائے
سسی نیند میں کھوئی رہ گئی
پنوں کر گیا کوچ
نیند سے جب بیدار ہوئی وہ
ویلے کو پچھتائے!

☆

❀ عبدالعزیز چشتی
شورکوٹ شہر ضلع جھنگ

ارمان

(نوجوانوں کے نام)
تم رونقِ گلشن گلشن کی
تم خوشبو باغ بہاروں کی
تم محفل چاند ستاروں کی
یہ بزم تمہارے دَم سے ہے
ہر عزم تمہارے دَم سے ہے
اِن بکھرے بکھرے لوگوں کے
تم آنسو پونچھو دامن سے
تم خوشیاں بانٹو گھر گھر میں
اِس شہر کے کونے کونے میں
ہر بستی، قریہ، گاؤں میں
اور دھوپ، سویرا، چھاؤں میں
تم بن کے سہارا اوروں کا
قسمت کا ستارا اوروں کا
یوں عمر بتانی ہے تم نے
یوں بات بنانی ہے تم نے
اور نگری نگری، کوچہ کوچہ
عزت، عظمت، رفعت، وقعت
آباء کی بتانی ہے تم نے
اِک جہات ہمارے ماضی کی
دُنیا کو دکھانی ہے تم نے
اِس دیش کی بس پہچان ہو تم
ہر آس، ہر اس، امکان ہو تم
سب چندا، جگنو، جان ہو تم
اور بھکی مسکان ہو تم
اِک شاعر کا وجدان ہو تم
اس دل کے سب ارمان ہو تم
اس دل کے سب ارمان ہو تم!

☆

❀ ارمان یوسف، مظفرگڑھ

اُلجھن

میں بھی خواب بنوں گی، لیکن
دِل کی بات سنوں گی، لیکن
پہلے مجھ کو یہ بتلاؤ
آنکھ اور خواب کا
رشتہ کیا ہے؟
پیاس سراب کا
رشتہ کیا ہے؟

☆

❀ حنا یاسمین

رُوح اور جسم

بتاؤں، رُوح کیا ہے، جسم کہتی ہے کسے دُنیا
بدن اور رُوح کا ہے کیا تعلق، سوچ اے اِنساں!
بنا ہے خوب مٹی سے کہ اس میں سب لوازم ہیں
سرائے رُوح کی ہے، جسم کہتی ہے جسے دُنیا
بہ الفاظِ دگر دُنیا اگر ہے گلشنِ ہستی
بدن میں رُوح یوں ہے پھول میں جیسے بسی خوشبو

☆

❀ تنویر پھول
نیویارک

کچھ تو بولو!

پی چپ کے بندھن کھولو
کچھ تو بولو
سرخ گلابوں سے اِن ہونٹوں پہ کیوں چپ کے
قفل لگے ہیں؟
کہنے کو تو کتنی باتیں
تیرے من میں پوشیدہ ہیں، پھر کیوں چپ ہو
پھر کیوں چپ ہو؟
بھیگی بھیگی سی ان راتوں میں جب
میری آنکھ کھلے تو تیری صورت سامنے پا کے
مَیں مدہوش سا ہو جاتا ہوں، اور خوابوں میں کھو جاتا ہوں
کاش، کبھی تم بھی آ جاؤ
چہرے سے آنچل سرکا کے
میرے کانوں میں رس گھولو، کچھ تو بولو
کچھ تو بولو!
کہہ دو
تیری یاد آتی ہے، میرے من کو تڑپاتی ہے
تکیے میں چہرے کو چھپا کے اور آنکھوں میں اشک سجا کے
اپنا چہرہ دھوتی ہوں، دھیرے دھیرے رو لیتی ہوں
کیوں روتی ہو؟
بھید تو کھولو!
کچھ تو بولو، کچھ تو بولو!

☆

❀ ہارون حسرت جالندھری

ہنستے زخم

مسکراہٹ لبوں پہ اپنے سجا کے
ہنستے ہیں ہم ہر اِک غم کو بھلا کے
کتنے ہی غم اپنے دل میں چھپاتے
آنکھوں سے آنسو مگر نہ بہاتے
دل میں کئی دیپ آرزو کے جلاتے
نادان دل پہ پھر ہم مسکراتے
ہر بار ٹھوکر دُنیا کی ہم کھاتے
پھر بھی ہر اک سے ملے مسکراتے

☆

❀ سطوت صبا، پشاور

کنارہ

تو بہتی ندیا کی ایک صورت
ہیں تیری پائل یہ آبشاریں
یہ پربتوں کے کٹھور رستے
ہر ایک لمحہ تجھے پکاریں
یہ سبز وادی، یہ ٹھنڈی جھیلیں
تری ہنسی کی نظر اُتاریں
محبتوں کی ہے ایک وادی
بنی ہے تو اُس کی شاہزادی
تمہارے حسنِ نظر کے آگے
ہیں سارے بے کیف یہ نظارے
تمہاری زلفوں کے پیچ وخم میں
چھپے ہوئے کئی اشارے
محبتوں کے ہیں یہ ستارے
کوئی ستارا جو مانگ لیں ہم
کرو گی کیا نام اِک ہمارے
اگر کسی شام گھر سے نکلو
تو تنہا جانا
کہاں ہے جانا؟
یہ مَیں بتا دوں
تو پانیوں کے سفر پہ جانا
پہنچ کے تم جھیل کے کنارے
اپنی سوچوں کا ایک کنکر
اُچھال دینا
کوئی صدا جو وہاں سے اُبھرے
تمہیں کسی نام سے پکارے
تو جانتی ہو
وہ کون ہوگا
ترا ستارا
تری محبت کا اِک کنارا
مگر خدارا
نہ چھوڑ دینا یہی کنارا
تمہاری میری رفاقتوں کا
بس آخری ہے یہی سہارا
نہ چھوڑ دینا یہی کنارا!

☆

❀ راؤ وحید اسد، ملتان
موبائل: 0300-7360093

پرنم موسم

جاتی سردیوں کی اُداس شام
مٹا دیا اِک نام
مَیں نے اپنی یادوں سے
سجایا تھا جسے دل میں
نہیں تھا اُس کو میری
چاہت کا احترام
عشق کے سب دیپ بجھا کر
شدتِ خلوص سے
سب کچھ لٹا کر
اِک جان بچی تھی
سو وہ بھی
سوئے یار پھینک کر
جاتی سردیوں کی اُداس شام
مٹا دیا اِک نام!

☆

❀ نگہت اکرم، لاہور

رشتہ

مان لو کہ
میرا تمہارا رشتہ
ضرورت کا رشتہ ہے
ہر انسان کی ضرورت کا رشتہ
کہ ہر کوئی
اپنا دُکھ سُکھ
کسی ایسے ساتھی سے
بانٹنا چاہتا ہے
جو اس کا احساس کر سکے
دُکھ درد بانٹ سکے
میرا تمہارا یہ ہی رشتہ ہے
اعتماد کا رشتہ
ہاں، ضرورت کا رشتہ!

☆

❀ محمد ارباب بزمی
موڑ ایمن آباد، گوجرانوالہ
موبائل: 0333-8137252

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نظمیں

کب سے ہم اکیلے ہیں

کوئی بھی نہیں ایسا
جو کہ حالِ دل پوچھے
بے کلی سی رہتی ہے
ہر خوشی ادھوری ہے
پاؤں لڑکھڑاتے ہیں
سانس ٹوٹ جاتی ہے
کیفیت عجب سی ہے
ہر طرف اُداسی ہے
منزلیں نہیں ملتیں
خواہشوں کے جنگل میں
ہم بھٹکتے پھرتے ہیں
سائباں نہیں کوئی
کارواں نہیں کوئی
اپنی یہ کہانی ہے
جو کہ رائیگانی ہے
زندگی کے رستے پر
یاد ہی نشانی ہے
آپ سے شکایت کیا
ہم ہی کچھ الگ سے ہیں
ہم میں ہی خرابی ہے
تم نہیں یہ سمجھو گے
تم نہیں یہ جانو گے
کب سے ہم اکیلے ہیں!

☆
❁ مسعود تنہا
موبائل:0345-6068166

یاد

جن میں مہکی ہوئی خوشبو تھی
تیری سانسوں کی
اے دوست!
آج بھی تازہ ہیں
دل کے گلستان میں
وہ تیری یاد کے پھول!

☆
❁ عائشہ مریم

سچائی

سنا ہے
موسم بدلنے سے
حالات وواقعات بدلتے ہیں
رنگ اور نظارے بدلتے ہیں اگر
ان سب سے بڑھ کر
اے دوست!
صرف ایک چیز سے بچنا
جو کہ بہت جلد
بدل جاتی ہے
اور وہ ہے انسان!

☆
❁ شہزاد شریف اشعر' لاہور
موبائل:0300-4190030

عجب بے چارگی ہے

گھروں میں بھوک کے قبضے
گلی بازار جیسے خون کی ندیاں
سروں پر موت کے سائے
عجب بے چارگی ہے' نا----!
مرے سب لوگ سوئے ہیں

☆
❁ اشعر اقبال' دوبئی
موبائل:00971559057886

میرے شہر میں

دہشت مست ہوئی پھرتی ہے
اَمن کہیں دبکا بیٹھا ہے
ہر شہری چپکا بیٹھا ہے
لرزاں ہے اخلاص یہاں پر
سازش جال بنے بیٹھی ہے
آپس میں ہے بغض یہاں پر
بے حس لوگ نظر آتے ہیں
ظلم پہ بھی خاموش رہیں گے
افراتفری ہے' دھوکے ہیں
قائم جھوٹ راج ہوا ہے
میرے شہر کراچی' تجھ کو
جانے کس کی نظر لگی ہے
شہر میں یوں تو ہر شے' یارو!
جو تم چاہو' مل سکتی ہے
اتنا ہے اس شہر میں' لیکن
باقی اپنا مان نہیں ہے
انساں کی پہچان نہیں ہے!

☆
❁ ڈاکٹر جاوید پنجابی
موبائل:0345-8122095

لفظ کہانی

مَیں اِک ایسا
لفظ ہوں' جس پر
زیر نہیں ہے
زبر نہیں ہے
پیش نہیں ہے
پھر بھی دیکھو
زندہ ہوں مَیں
کل کی کون
خبر رکھتا ہے

☆
❁ اعجاز علوو الوی
موبائل:0346-5520640

انتظار

وادیٔ عشق میں
بارشوں کا موسم ہے
تیرے قرب کا بادل
کب مجھ پہ برسے گا!

☆
❁ راحت وفا' لاہور

کوئی پگلی کو سمجھاتا

مَیں نے یہ محسوس کیا ہے
کوئی دل میں ڈھیرے ڈھیرے
پیار کے دیپ جلانے والا
پیت پریت نبھانے والا
سوچوں کو چمکانے والا
من کی پیاس بجھانے والا
یادوں کو سلگانے والا
من کا مور نچانے والا
قسمت کے گن گانے والا
دل کے راز چھپانے والا
دُکھ میں ساتھ نبھانے والا
موسم کو مہکانے والا
چاندنی کو دُھندلانے والا
منزل تک تو آ پہنچا ہے
لیکن اتنی دوری کیسی
اُس کو ہے مجبوری کیسی
آخر کون وہ ہو سکتا ہے
جس کے خوف سے وہ کترائے
مجھ کو ملنے تک نہ آئے
سوچیں سوچے اور گھبرائے
کئی کئی راتیں نیند نہ آئے
مایوسی کے بادل چھائے
غیروں جیسی گھات لگائے
نہ کچھ پیئے' نہ کچھ کھائے
نہ کوئی ہچکی' نہ کوئی چائے
اپنے من کو آگ لگائے
ٹھنڈی آہیں' تپتے سائے
اندر خود کو کھاتا جائے
مایوسی کے گیت سنائے
شاید کوئی سپنا ٹوٹا
ہاتھ سے اُس کے ہاتھ ہے چھوٹا
کوئی پگلی کو سمجھاتا
وقت ہے سب کی آس کا داتا
جس نے وقت سے جوڑا ناتا
وہ ہے غم سے کیوں گھبراتا
رات کے بعد ہے دن بھی آتا
راہ سے بھٹکا منزل پاتا
تیری منزل دور نہیں ہے
پیار تیرا مجبور نہیں ہے
ہمت کر کے ہاتھ بڑھاؤ
اپنی منزل تم خود پاؤ!

☆
❁ ڈاکٹر ممتاز حسن جوئیہ
زندگی ہسپتال' ڈی جی خان

دُکھ کی لہر

جب بھی دُکھ کی لہر اُٹھی
اور دل تڑپا
سارا سمندر اِک طوفان بن کر اُٹھا ہے
سوکھی پلکوں کے ساحل سے
موجیں سر ٹکرا کر
بنیں بگولہ
مٹی کے اِس ڈھیر میں پھر تبدیل ہوئیں
اور مَیں نے اِن آنکھوں کی گہری
بہت ہی گہری قبر میں اِن کو دفن کیا
جب بھی ایسا عالم گزرا
ہر بار یہی اِک خواہش جاگی
کوئی ساتھی ایسا ملتا
جس کے شانے پر سر رکھ کر
بلک بلک کر دیر تلک مَیں روتا رہتا
ہر بار مری اِس خواہش نے
خود اپنے حاصل سے محروم کیا
ایسے دُکھ کے عالم میں بھی
اپنی بابت سوچوں جب
ہنس دیتا ہوں
اتنی عمر گئی ہے' لیکن
دل کے مکاں میں کوئی نہیں ہے!

☆
❁ دستگیر شہزاد' ٹوبہ ٹیک سنگھ
موبائل:0300-7662735

المیہ

نیلاہٹ آسماں کی
لال ہونے لگی
شام یہ
خون آشام ہونے لگی
اِستادہ ہیں چہار سو
شکاری ہوس کے
وقت نے زنجیر پا کیں
دھڑکنیں دل کی
کہانی محبت کی انجام ہونے لگی
بکتے ہیں ایمان یہاں
چند ٹکوں کے عوض
بات یہ ہر جگہ عام ہونے لگی
دیکھئے' نشے سے چور ہیں کیسے
عزت غریبوں کی
خس وخاشاک ہونے لگی
دشتِ محرومی میں
سوچ کے طبیعت پُر ملال ہونے لگی
اے ظالم تمناؤ! خاموش رہو
شور سے تمہارے سوئی ہوئی قوم
بے آرام ہونے لگی

☆
❁ روشانے سبعین' فیصل آباد

ناس

زندگی بھر
کسی بھی کھیل میں
چاہے جان بوجھ کر ہی سہی
مَیں تم سے جیتا ہی کب ہوں
ٹھہرو
اِس سے پہلے کہ تم ناس کرو
مَیں اپنی شکست تسلیم کرتا ہوں!

☆
❁ ندیم اقبال' چنن آباد ضلع بہاولنگر
موبائل:0300-7925500

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس دل پہ ایک تازہ قیامت کے باوجود
جینا پڑا ہے تیری عداوت کے باوجود
اندر وجود میں ہے تعفن رچا ہوا
چہرے پہ زندگی کی علامت کے باوجود
سوچیں سراب پا ہیں تجھے دیکھتے ہوئے
الفاظ منجمد ہیں بلاغت کے باوجود
در تو کھلا ہے پر بھی کوئی کھول دے مرے
میں قید میں ہوں تیری سخاوت کے باوجود
مانا کہ اعتبار کے قابل نہیں ہیں لوگ
ڈھونڈو تو مل ہی جائیں گے قلت کے باوجود
اب تک بھی غم چھپانے کی عادت نہیں ہوئی
آنسو نکل پڑے ہیں ریاضت کے باوجود
دل میں منافقت کے ہیں دفتر کھلے ہوئے
اب روز و شب میں کارِ محبت کے باوجود
☆

سید فہیم الدین، دوحہ قطر
موبائل: 00974-5138374

بن گئے میرے لئے ایک تماشا آنسو
میری آنکھوں سے جو جاری ہوئے بے جا آنسو
میرے رونے پہ ہمیشہ ہی سے ہنسنے والے
کیا ہوا تجھ کو؟ تری آنکھ میں کیسا آنسو
آنکھ رو رو کے مری خشک ہوئی جاتی ہے
رات باقی ہے اب آئے کوئی خوں کا آنسو
آج پوچھا جو یہ اُس سے کہ بچھڑ کر خوش ہو
وہ تو خاموش رہا آنکھ میں بولا آنسو
مثل گوہر چمک اٹھا ہے رخِ تاباں پر
چند لمحوں کو جو رخسار پہ ٹھہرا آنسو
ہائے کیا درد تھا روداد میں تری عاکف
دیکھ لے غیر کی آنکھوں سے بھی ٹپکا آنسو
☆

شمس القمر عاکف، اٹک
موبائل: 0333-5514725

کیا دُکھ تھا اُسے کہہ نہ سکا دیکھتا رہا
میں بھی کسی کے بارے میں بس سوچتا رہا
ایسا گیا وہ لوٹ کے آیا نہ پھر کبھی
دیوار و در سے اُس کا پتہ پوچھتا رہا
اے چاند! شکریہ کہ دیا تو نے میرا ساتھ
شب بھر تو میرے ساتھ ساتھ جاگتا رہا
تھک کر ہوا ہوں چور بدن ٹوٹ رہا ہے
میں زندگی کے پیچھے مگر بھاگتا رہا
احساس مرا ذات تک ہی قید تھا مری
جنگل میں مور کی طرح میں ناچتا رہا
ہر اک قدم پہ اُس کا دیا ساتھ دوستو!
ہر اک قدم پہ دل کو وہی توڑتا رہا
ماں کے بغیر گھر بھی ہے اب گور کی طرح
سناٹا مرے دل کا بہت بولتا رہا
کیا کیا مرے مزاج کے برعکس تھا مگر
قیصر میں اپنے نفس ہی کو مارتا رہا
☆

جاوید قیصر، کراچی
موبائل: 0321-2920851

شہر سے دامنِ کہسار تک آ پہنچا ہے
لشکرِ دشمنِ جاں غار تک آ پہنچا ہے
صلح کا اب کوئی امکان نہیں ہے کہ وہ شخص
دشمنی میں مرے معیار تک آ پہنچا ہے
ضبط ٹوٹا ہے تو آنکھوں سے ترے ہجر کا دکھ
اشک بن کر مرے رخسار تک آ پہنچا ہے
میں من و تو کے مسائل میں ہوں مصروف ابھی
اور عدو کابل و قندھار تک آ پہنچا ہے
عقل محروم ہے یہ رمز سمجھنے سے کہ عشق
کس طرح آگ سے گلزار تک آ پہنچا ہے
☆

سعید عاصم، بھکر

سوچنے لگتی ہوں اکثر شبِ تنہائی میں
کیا مزہ ملتا ہے اس کو مری رُسوائی میں
بارہا ہم نے نکالے ہیں جہاں سے موتی
لوگ ڈوبے ہیں ابھی تک اُسی گہرائی میں
وہ سرِ شام مرے گھر سے گیا تھا واپس
رات بھر نور برستا رہا انگنائی میں
چاہتی ہوں کہ مری عمر گزر جائے یہیں
لطف آتا ہے ترے در کی جبیں سائی میں
کس طرح لوٹ کے ہم آئیں وہاں سے جاناں!
زندگی ڈوبی ہے جس درد کی گہرائی میں
ہو گئیں صاعقی تاروں کی نگاہیں پُرنم
ایسی کیا بات تھی آخر ترے سودائی میں
☆

شاہدہ صاعقی، ہارون آباد

بعد خلوص وہ گر ہم سے دوستی کرتے
ہم اپنا آپ بجھا کر بھی روشنی کرتے
جو نفرتوں میں محبت نثار کرتا رہا
ہم ایسے شخص سے کیا خاک دشمنی کرتے
تمام عمر ہی جو لوگ ہجرتوں میں رہے
پھر ایسے لوگ کہاں اپنی زندگی کرتے
کبھی تو وہ بھی ہمیں روکتے محبت سے
وہ اپنی ذات کی اس طور سے نفی کرتے
ہم اپنے دل کا کہا کیوں نہ مانتے آخر
ہمارے اپنے ہی جذبے جو سرکشی کرتے
ہمیشہ ان کے لبوں سے رہی شرر باری
کبھی وہ ہم سے کوئی بات شبنمی کرتے
یہ اور بات کہ خود کو بھلا دیا ہے غیاث
ہم ان کی چاہ میں کیسے بھلا کمی کرتے
☆

غیاث الدین غیاث
شاہ فیصل کالونی، کراچی 75230

رفتہ رفتہ حسن خوباں کا اثر ہونا ہی تھا
عشق کی بنیاد پر تعمیر گھر ہونا ہی تھا
دوستو! اپنے لہو کو معتبر ہونا ہی تھا
راہ میں مہکا ہوا ہر اک شجر ہونا ہی تھا
بے نیاز گردشِ شام و سحر ہونا ہی تھا
دل خیالِ یار کے زیرِ اثر ہونا ہی تھا
دردِ الفت میں مجھے حسنِ طلب ملتا نہیں
کیا مری قسمت میں یوں دستِ نگر ہونا ہی تھا
اس قدر مجھ سے مراسم کس لئے پیدا کیے
فیصلہ دل کا اگر اک بات پر ہونا ہی تھا
ملتفت ہونے لگی جس دم نظر سے وہ نظر
آخرش بادہ کشوں کو معتبر ہونا ہی تھا
رات کی تنہائی میں احساسِ دل کو سرخرو
اک دیے کی روشنی میں ڈوب کر ہونا ہی تھا
محنتِ شاقہ پہ اپنی ناز تھا ہم کو بہت
یوں دلوں کے فاصلوں کو مختصر ہونا ہی تھا
زندگی کی آزمائش میں رہا ثابت قدم
آرزوؤں کو مری مر کر امر ہونا ہی تھا
چاند رہتا ہے سفر میں اس لئے عاطر اُسے
ایک سائے کی طلب میں دربدر ہونا ہی تھا
☆

رانا حنیف عاطر
452-بی جھنڈو ضلع میرپور خاص سندھ

مٹ گئی ہے صفتِ دار و رسن
ہم سے ہے یہ شوکتِ دار و رسن
سر اُٹھا کے دیکھتے ہیں سب ہمیں
ہم ہیں اور ہے رفعتِ دار و رسن
سرمد و حلاج نے ترتیب دی
داستانِ اُلفتِ دار و رسن
ظلم سے کیسے نہ ٹکراؤں گا اب
دل میں ہے کچھ رغبتِ دار و رسن
مل رہی ہے بے گناہوں کو سزا
کیسی ہے یہ جدتِ دار و رسن
ایک مجرم کو بچانے کے لئے
دی انہوں نے قیمتِ دار و رسن
ہم غریبوں کو ہماری بے بسی
دے رہی ہے دعوتِ دار و رسن
میری حرفت جراتِ صدق و وفا
ان کا پیشہ صنعتِ دار و رسن
☆

سید اطہر علی نایاب
بلدیہ ٹاؤن کراچی

جب سے مقدروں نے تمہارا بنا دیا
ذرّے کو آسماں کا ستارا بنا دیا
طوفاں میں زندگی کا سہارا بنا دیا
تنکے کو بحرِ غم کا کنارا بنا دیا
دن سب کو ہے پسند مگر چودھویں کے چاند!
تو نے تو رات کو بھی گوارا بنا دیا
یہ معجزہ نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟ وقت نے
اک اجنبی کو جان سے پیارا بنا دیا
یہ بھوک جب بھی ضبط کی حد سے گزر گئی
پھر اس نے راکھ کو بھی شرارا بنا دیا
آیا جو جسم و جاں کو معطر سا کر دیا
بچھڑا تو اور بھی تھکا ہارا بنا دیا
لے کے چراغ ہاتھ میں آئی تھی چاند رات
جس نے دلہن سا شہر ہمارا بنا دیا
تازی! یہ چاند رات، حنا اور چوڑیاں
اس رُت نے لڑکیوں کو شرارا بنا دیا
☆

تازیہ عباس، گگومال

شعر و سخن کو یوں تو بہانے بہت سے ہیں
میرے تمہارے بیچ فسانے بہت سے ہیں
شرمندۂ وفا ہیں بہت دیر سے جو ہم
احسان تم نے اور جتانے بہت سے ہیں
یوں آ گیا ہوں میں سرِ بازار بے طلب
اب سیم و زر کے بار اٹھانے بہت سے ہیں
وہ ہجر بے ثکان تھے یہ قربتیں عجیب
وعدے وفا کئے ہیں نبھانے بہت سے ہیں
صالب تمہاری یاں سے بھی نقلِ مکاں کے بعد
کیا کیا زمانے اور نہ جانے بہت سے ہیں
☆

منصور صالب
موبائل: 0300-2180207

لکھی ہے ہست و بود کی تقدیر لوح پر
خالق نے بخت کر دیا تحریر لوح پر
باطن کے نقش اس پہ اجاگر ہیں خود ہوئے
اچھے بُرے کی بنتی ہے تصویر لوح پر
پڑھ لے جو اس کو بس وہی نباضِ عصر ہے
ہوتی رقم ہے وقت کی تقریر لوح پر
ہر حرف و لفظ اس کا جواہر سے کم نہیں
خطاط کی ہے ساری ہی جاگیر لوح پر
اس سے ہے میرے ظاہر و باطن میں روشنی
پھیلی ہے حرفِ صدق کی تنویر لوح پر
کر دے خدایا اس کو رقم بخت میں مرے
لکھا ہے میں نے آج جو کشمیر لوح پر
دونوں جہان اس کی ہتھیلی میں آ گئے
قدرت نے جس کو بخشی ہے تسخیر لوح پر
لکھا ہے جو بھی میرے مقدر میں اے ریاض
لفظوں کے روپ میں ہے گرہ گیر لوح پر
☆

ریاض احمد قادری، گورنمنٹ کالج سمن آباد فیصل آباد

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

درد جینے کی سزا ہے تو ہے شکوہ کیسا
یہ محبت کا صلہ ہے' تو ہے شکوہ کیسا
میں نے بے وقت بہاروں کی تمنا کی تھی
اب جو بے سمت ہوا ہے' تو ہے شکوہ کیسا
کوئی زنجیر نہ تھی پاؤں میں اُس کے' لیکن
وہ جو خود قید رہا ہے' تو ہے شکوہ کیسا
میں نے اظہار تمنائے محبت نہ کیا
اُس کو مجھ سے یہ گلہ ہے' تو ہے شکوہ کیسا
تیرے ہونٹوں نے بھی اک لفظ کہا تھا پہلے
اب یہ لوگوں نے کہا ہے' تو ہے شکوہ کیسا
ساری دُنیا نے وفاؤں کا چلن چھوڑ دیا
وہ مجھے بھول گیا ہے' تو ہے شکوہ کیسا
میں نے دُشمن سے بھی بے لوث محبت کی ہے
میرا انجام بُرا ہے' تو ہے شکوہ کیسا
☆
نذیر اے قمر' اچین

خزاں رسیدہ چمن پہ بہار آ جائے
کلی کلی پہ' الٰہی! نکھار آ جائے
جو ہونا ہو' وہ بہر طور جلد ہو جائے
بجھے بجھے سے دلوں کو قرار آ جائے
حسین وعدوں پہ کب تک فریب کھائے کوئی
وہ وعدہ کر کہ یقیں' اعتبار آ جائے
گزر چکی ہے قیامت سی اہلِ گلشن پہ
قدم قدم پہ کہیں پھر نہ خار آ جائے
ہجوم یاس سے تنگ آ گئے ہیں فرزانے
قریب ہے کہ ہر اک سوئے دار آ جائے
غزل سرا ہو ترنم سے آج پھر' ارشاد
ہر ایک شعر پہ تیرے خمار آ جائے
☆
یونس ارشاد

ظلمتوں سے رہائی ہو جائے
روشنی تک رسائی ہو جائے
موسم گل ہے اپنے جوبن پر
زخم کی رونمائی ہو جائے
لمحہ بھر تجھ کو بھی بھلا بیٹھوں
تجھ سے کچھ بے وفائی ہو جائے
کیا خبر تھی کہ یوں بھی ہونا تھا
بھائی سے دور بھائی ہو جائے
آپ تھوڑی سی گر توجہ دیں
میری مشکل کشائی ہو جائے
کاش! ایسا بھی ہو شفیق آصف
بُت کی ہر سو خدائی ہو جائے
☆
شفیق آصف' سرگودھا
موبائل:0300-7337088

یہ گماں ہے کہ یقیں خطرے میں ہے
ایسا لگتا ہے' زمیں خطرے میں ہے
کربلائے دہر میں' ابنِ علی!
پھر ترے نانا کا دیں خطرے میں ہے
جو کرے سجدے خدا کی ذات کو
آج ہر اک وہ جبیں خطرے میں ہے
بھیج موسیٰ ان فرعونوں کے لئے
ہر بشر ربِّ امیں! خطرے میں ہے
صحنِ گل میں آتش و آہن کا کھیل
صحن گل کا ہر مکیں خطرے میں ہے
بادشاہ بھی اور عوام الناس بھی
جو کوئی بھی ہے کہیں' خطرے میں ہے
حسن خطرہ ہے' یہ سنتے آئے تھے
آج ارشد! ہر حسیں خطرے میں ہے
☆
ارشد محمود ارشد' سرگودھا
موبائل:0333-9801168

لگتا ہے' اُسے مجھ سے محبت نہیں رہی
اور میری چاہتوں میں بھی شدت نہیں رہی
لہجہ شکستہ ہونے سے معلوم یہ ہوا
اُس میں بھی بات کرنے کی ہمت نہیں رہی
شام ہو یا کوئی صبح وصل ہو
کوئی گھڑی بھی اب تو قیامت نہیں رہی
سوچو تو انتظار کی زحمت سہوں میں کیوں
جب اُس کو مجھ سے ملنے کی فرصت نہیں رہی
اب سوچتی ہوں' ساتھ نبھائے گا کس طرح
اُس کو رباب مجھ سے جو قربت نہیں رہی
☆
ارم رباب بخاری' راولپنڈی

عارض سے تیرے چاند کو سورج نکال دوں
تو بے مثال ہے' تری کیسے مثال دوں
خود زندگی بھی تلخ ہے اور مے بھی تلخ ہے
دونوں کو ایک ساتھ نہ ساغر میں ڈال دوں
معلوم ہے مجھے کہ یہ دُنیا ہے خود غرض
اے دل! تجھے نہ رنجِ شکست سوال دوں
آغاز کے لئے بھی کوئی لفظ مجھ سے لے
انجام کے لئے بھی اچھوتا خیال دوں
تو بھی ستم رسیدہ ہے' میں بھی شکستہ دل
باہیں! قریب آ' تری گردن میں ڈال دوں
واعظا! تری زبان میں تاثیر کیوں نہیں
آ' میرے پاس آ' تجھے رزق حلال دوں
لائی صبا چمن میں تری بوئے پیرہن
ساغر اُچھال دوں کہ صراحی اُچھال دوں
حیران کیوں ہو' میں نے گریباں جو سی لیا
کچھ تاب دید ہو تو جگر بھی نکال دوں
☆
فاروق روکھڑی (بابائے تھل)
پوسٹ آفس کندیاں ضلع میانوالی

تعلقات کا اک سلسلہ ابھی تک ہے
ہمارے بیچ مگر فاصلہ ابھی تک ہے
وہ ایک شخص جو ترا نام اب نہیں لیتا
مگر یہ ہے کہ تجھے سوچتا ابھی تک ہے
غبار وقت میں گم ہو گئی مری صورت
ترا خیال' مرا آئینہ ابھی تک ہے
چراغ بجھ بھی چکے' گھر بھی ہو چکا تاریک
یہ کیا غضب ہے کہ برہم ہوا ابھی تک ہے
بھلا چکا ہوں میں دل سے وہ رنجشیں کب کی
اور ایک تو ہے کہ مجھ سے خفا ابھی تک ہے
جو ساتھ چلنے سے تیرے' ہمیں ہوا درپیش
ہمارے ساتھ وہی مسئلہ ابھی تک ہے
اب اُس سے کوئی رہ و رسم تو نہیں سیفی
یہی بہت ہے کہ وہ آشنا ابھی تک ہے
☆
سیف الرحمٰن سیفی
موبائل:0300-2823876

فرزانوں کی بات نہ چھیڑو
دیوانوں کی بات کرو
نظر میں کٹیا کو بھی رکھنا
جب محلوں کی بات کرو
جو جو دین کے کام آئی ہیں
اُن جانوں کی بات کرو
صرف عمارت کو مت دیکھو
تہہ خانوں کی بات کرو
ہر ناطق انساں نہیں ہوتا
انسانوں کی بات کرو
کلمۂ حق تھا آتش جن پر
اُن شانوں کی بات کرو
☆
آصف اقبال خان نیازی' تری خیل
موبائل:0332-4424145

کس نے چھیڑی ہے یہ جلترنگ بانسری
کر گئی رقص میں انگ انگ بانسری
جب بھی ساجن کی یادیں ستائیں اُسے
اُس کے من میں جگائے اُمنگ بانسری
چاند تارے زمیں پہ اُترنے لگے
بن گئی آسماں پہ پتنگ بانسری
بانسری اُس کی شہرت کا باعث بنی
ہو گئی دفن رانجھے کے سنگ بانسری
زندگی کی سبھی دھڑکنیں رُک گئیں
کر گئی ساری محفل کو دنگ بانسری
ساری دھرتی پہ وجدان طاری کرے
وجد میں جب بجائے ملنگ بانسری
☆
علی شاہ' درعلی سکیرہ ضلع بھکر
موبائل:0333-8903177

نہیں ہے اگر اب کسی کی تمنا
تو پھر کس لیے زندگی کی تمنا
نکل آتے ہیں وہ اندھیروں سے آخر
جو کرتے رہیں روشنی کی تمنا
پلا دو اگر آج آنکھوں سے اپنی
نہ ہو پھر کبھی مئے کشی کی تمنا
چلن ہو تمہارا زمانے میں ایسا
کرے ہر کوئی دوستی کی تمنا
سوا اس کے مانگوں گا کیا میں خدا سے
مجھے ہے فقط آپ ہی کی تمنا
نوازا خدا نے مجھے اس طرح سے
نہیں اب کسی بھی خوشی کی تمنا
رہا گم میں افضال سوچوں میں اپنی
زمانے سے تھی آگہی کی تمنا
☆
افضال احمد
موبائل:0301-4164180

کسی سے کوئی شکایت نہ کچھ گلہ ہے مجھے
مرے نصیب کا لکھا ہوا ملا ہے مجھے
میں شہرِ علم کے دروازے کا گداگر ہوں
یہ شاعری اسی در کی ہی عطا ہے مجھے
تو مضطرب ہے ہزاروں کے کارواں میں' مگر
میں مطمئن ہوں کہ کافی مرا خدا ہے مجھے
قدم قدم پہ یہاں سازشوں کا سامنا ہے
یہ شہر کوفہ و بغداد و کربلا ہے مجھے
خدا تعالیٰ کا مجھ پہ کرم ہے' اے صابر
کہ اس کے ہجر میں جینے کا حوصلہ ہے مجھے
☆
صابر انصاری' ملتان
موبائل:0300-6361468

تم اپنے حال سے بھی اپنا سلسلہ رکھنا
مگر یہ سوچ لو' ماضی سے رابطہ رکھنا
یہ حد سے بڑھنے لگے گا تو ٹوٹ جائے گا
ہر اک کے ساتھ تعلق میں فاصلہ رکھنا
نہیں ہیں سہل محبت کے راستے' سن لو
نکل پڑے ہو تو پھر دل میں حوصلہ رکھنا
ہر ایک بات کو پہلے سے طے نہیں کرتے
ایک آدھ بات کا آخر یہ فیصلہ رکھنا
اُسے بھی لائیں گے یہ سلسلے محبت کے
اس ایک آس پہ در کو ذرا کھلا رکھنا
یہ کر رہے ہو کہانی کی ابتدا جس سے
اسی ہی شخص کو قصے کی انتہا رکھنا
وہ شخص تم کو حسن چھوڑ جائے گا اک دن
تم اُس کے ساتھ زیادہ نہ واسطہ رکھنا
☆
سید مرتضیٰ حسن' سرگودھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مجھ کو نہ آئی صبح بہار' چمن بھی راس
اب تک ہے دل ملول' نگاہیں اُداس اُداس
اِس حسنِ التفات سے لوٹے مرے حواس
بجلی سی ایک کوند رہی تھی نظر کے پاس
پھولوں میں کوئی رنگ' نہ کلیوں میں کوئی باس
تیرے بغیر جام و سبو' ابر' سب اُداس
ہے فتح' ہر شکست کے پیچھے یہی تھی آس
سب داؤ پر لگا دیا' جو کچھ تھا میرے پاس
طلعت نہ بجھ سکے گی یہاں تیرے من کی پیاس
غیظ و غضب دلوں میں ہے' لہجوں میں ہے مٹھاس
☆
ڈاکٹر طلعت محمود
موبائل:0345-7317635

بھول جائے مجھے کہ پیار کرے
جو بھی رستہ وہ اختیار کرے
عشق میں جلد بازیاں کیسی
اُس سے کہہ دو کہ انتظار کرے
چھپ کے کیوں واردات کرتا ہے
سامنے آ کے مجھ پہ وار کرے
زندگی بھی وفا نہیں کرتی
آدمی کس کا اعتبار کرے
ایک اُنی بھی میرے پاس نہیں
وہ مجھے کس طرح شمار کرے
دو کناروں میں رہ نہیں سکتا
اب خدا مجھ کو بے کنار کرے
دوست اچھا وہی ہے' اے مظہر!
دوست کے دوست سے جو پیار کرے
☆
محمد مظہر نیازی' میانوالی

جس کو ہونے کا اعتبار ملا
ہاں' وہی شخص بیقرار ملا
اُس کو خوف خدا نہیں کچھ بھی
اِک ذرا جس کو اختیار ملا
بے طلب مل گیا کسی کو کوئی
ہم نے مانگا تو انتظار ملا
منزلوں پر پہنچ گیا کوئی
ہم کو رستے کا بس غبار ملا
مست و بیخود ہیں عام لوگ' مگر
ہر خرد مند اشکبار ملا
جس سے ملنے کی آرزو نہ تھی
جانے کیوں ہم کو بار بار ملا
یہ شکایت ہے سب کو تجھ سے' عظیم
تو ملا جب بھی' سوگوار ملا
☆
ابن عظیم فاطمی' کراچی
موبائل:0333-2385477

تیرا آنا بڑا دُشوار ہوگا
وہ دن ہفتوں میں اِک اتوار ہوگا
تپش میں دھوپ کی جلتے رہیں کیا
کہیں تو سایۂ دیوار ہوگا
اُسی کی انجمن میں' اُس کے آگے
بھلا ہم سے کہاں اظہار ہوگا
نہ ایکو ساؤنڈ اتنا تیز رکھو
برابر میں کوئی بیمار ہوگا
انہیں شرمندگی کا سامنا ہے
نہ اُن سے اب نیا اقرار ہوگا
کروں کیسے میں رانا لب کشائی
بہت بدنام اپنا پیار ہوگا
☆
قدیر رانا
ایمان میڈیکل سٹور' کری روڈ
ہارون چوک' راولپنڈی

جسے چاہتی ہوں' وہ میرا نہیں
مگر دل بغیر اُس کے رہتا نہیں
محبت کے بدلے میں نفرت ملی
اُسے کاٹتی ہوں جو بویا نہیں
گلے شکوے ہوتے ہیں مجھ سے اُسے
مگر وہ کبھی مجھ سے روٹھا نہیں
اُسے یاد کر کے تڑپتی ہوں میں
مگر چین سے وہ بھی سوتا نہیں
بہت دُکھ ہوا' جب یہ عقدہ کھلا
جسے اپنا کہتی ہوں' اپنا نہیں
☆
تسمین اختر' منکیرہ

اُس نے کہا کہ بن تیرے جینا محال ہے
میں نے کہا کہ ایسا ہی کچھ میرا حال ہے
اُس نے کہا کہ چاند کو دیکھا ہے کیا کبھی
میں نے کہا کہ حسن بس تیرا کمال ہے
اُس نے کہا کہ عشق کی کوئی مثال دو
میں نے کہا کہ عشق تو خود بے مثال ہے
اُس نے کہا کہ دوریاں ہیں کیوں یہ درمیاں
میں نے کہا کہ یہ کسی دُشمن کی چال ہے
اُس نے کہا' کیوں خواب میں ملتے نہیں کبھی
میں نے کہا' تم رات بھر سوتے نہیں' تبھی
اُس نے کہا کہ مجھ کو دلا دو نا' چوڑیاں
میں نے کہا کہ ختم ذرا ہو لیں دوریاں
اُس نے کہا کہ پیار کا تحفہ تو دیجئے
میں نے کہا کہ ملنے کا موقعہ تو دیجئے
☆
تنویر طلحہ
موبائل:0300-9632815

وقتِ سفر ہے' یار! اب آواز نہ دینا
مشکل تھا انتظار' اب آواز نہ دینا
گزری ہوئی حیات کا پل پل عذاب تھا
دل کو ملا قرار' اب آواز نہ دینا
اب لوٹ کے آؤں گا نہ محفل میں تمہاری
کر لو تم اعتبار' اب آواز نہ دینا
روئے زمین کتنے جوانوں کو کھا گئی
میں بھی گیا ہوں ہار' اب آواز نہ دینا
ظالم جہاں میں نفرتیں پھوٹی ہیں جابجا
مجھ کو ملا ہے پیار' اب آواز نہ دینا
ایسا نہ ہو کہ چھوڑ دے رستے میں جاں شکن
سہتا ہوں بار بار' اب آواز نہ دینا
ہمدم تمہارے شہر میں آیا تھا چار دن
جانے لگا ہے یار' اب آواز نہ دینا
☆
محمد اسلم ہمدم' ملتان
موبائل:0321-6302409

نہ ستا' خواہشِ وصال مجھے
وصل لگتا ہے اب محال مجھے
تو بناتا رہا ہے ڈھال مجھے
اب نہ یوں بزم سے نکال مجھے
تو میرا ہمسفر اگر ہوتا
یوں نہ کرتا سفر نڈھال مجھے
شکر ہے' روبرو نہیں آئے
مار دیتے نہ خد و خال مجھے
بے خبر میرے حال سے کیوں ہے
روز و شب جس کا ہے خیال مجھے
ہاں' بہت آرزو تھی ملنے کی
اور مل کر ہوا ملال مجھے
☆
عتیق العالم گرواہ
P/O کوٹ سلطان تحصیل چنیوٹ ضلع جھنگ

جب محبت کی بات ہوتی ہے
اشک خوں کے یہ آنکھ روتی ہے
میری قسمت نہ جانے کب جاگے
دیکھیں کب تک پڑی یہ سوتی ہے
پھل اُٹھاتی ہے قوم ویسا ہی
قوم جیسا کہ بیج بوتی ہے
اُن کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ ہے
لیکن لگتا ہے' آنکھ روتی ہے
اس جہاں میں ہزاروں لوگوں کی
زندگانی بھی موت ہوتی ہے
جب بھی آتی ہے یاد اِن کی مجھے
بحرِ غم میں مجھے ڈبوتی ہے
آج دُنیا میں دیکھ لو راحت
پارسائی فریب ہوتی ہے
☆
راحت امیر نیازی تری خیلوی
پوسٹ آفس تری خیل ضلع میانوالی
موبائل:0333-4504891

میرا دُشمن سماج سارا ہی
اِس کے اندر رواج سارا ہی
بادشاہ سوچتا ہے پہلے یہ
کس کو دینا ہے تاج سارا ہی
ایک دن تم غریب لوگوں میں
بانٹ دینا اناج سارا ہی
میرے دل کے طبیب' آ کر تم
دل کا کرنا علاج سارا ہی
میں نے اعظم بھلا دیا اِس کو
دُکھ دیا جس نے آج سارا ہی
☆
اعظم سہیل ہارون' حاصل پور
موبائل:0300-7857987

نفرت کی دیوار گرانا' لوٹ آنا
ساکھ اپنی اُلفت کی بچانا' لوٹ آنا
دیس کی مٹی بھول نہ جانا' لوٹ آنا
پردیس میں اپنا دل نہ لگانا' لوٹ آنا
میں تنہا اور تیری جدائی کے صدمے
جاناں! اپنی جاں نہ جلانا' لوٹ آنا
ہر شے ہم کو میسر ہے گھر میں' لیکن
میرا سکون تم ہو' لوٹ آنا' لوٹ آنا
اِک اِک دن سالوں کا بن کر گزرا ہے
مشکل ہے دل کا بہلانا' لوٹ آنا
پوچھتے ہیں وہ' تجھ کو ہوا کیا ہے جاوید
مشکل ہے اب درد چھپانا' لوٹ آنا
☆
میاں جاوید جالندھری
چھوٹا مال چک 62 ر ب
براستہ کھڑیانوالہ ضلع فیصل آباد

آنکھوں سے رواں خون کا دریا نہیں کرتے
اتنا کسی کی یاد میں رویا نہیں کرتے
مانا کہ اب جینے کا سہارا ہیں اُمیدیں
ہر وقت پہ یہ پیرہن پہنا نہیں کرتے
بھر دو میرے دامن کو ستاروں سے فقط تم
ہم چاند کو پانے کی تمنا نہیں کرتے
سہہ لیتے ہیں سب جبر و اذیت کی تلخیاں
پر اس طرح اے دل میرے' چیخا نہیں کرتے
ہو جائے ترا سامنا' اتنا ہی بہت ہے
ہم تجھ سے لپٹنے کی تمنا نہیں کرتے
چھن جائے گی اِک روز یہ نادان نظر بھی
سورج سے یوں آنکھ ملایا نہیں کرتے
☆
ناظم بخاری' ضلع لودھراں
موبائل:0345-8784254

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جب سے جناب' آپ نے دامن چھڑا لیا
ہم نے بھی آرزوؤں کو دل میں دبا لیا
بس اتنی سی ہے ہماری یہ داستانِ عشق
بے وجہ ہم نے آپ کو سر پہ چڑھا لیا
تذلیل عشق ہو گئی اِس درجہ آج کل
لوگوں نے اِس کو روزی کا دھندہ بنالیا
مجبوریاں نہ پوچھ دلِ نامراد کی
مَیں نے رقیب کو بھی گلے سے لگا لیا
مختار سے نہ پوچھو خفا ہو کے حالِ دل
بس سن چکے جناب' اور اُس نے سنالیا
☆

حاجی مختار احمد گوندل

فوجی فاؤنڈیشن ہسپتال' راولپنڈی

میری پلکوں پہ سلگتے ہوئے تارے نکلے
رات پچھلی تو کئی درد کے مارے نکلے
بے وفا جس کو سمجھتا تھا زمانہ سارا
اُس کی آنکھوں میں کئی خواب ہمارے نکلے
کون ہوتا جو مرے حق میں گواہی دیتا
لوگ سارے ہی طرفدار تمہارے نکلے
ایک نیزے پہ اُتر آیا ہے سورج اب کے
گھر سے نکلے تو کوئی کس کے سہارے نکلے
جب نظر آپ کے چہرے پہ پڑی ہے اُن کی
ایسے ڈوبے کہ نہ پھر چاند ستارے نکلے
کس قدر آگ بھری ہے ترے سینے میں' حکیم!
سانس بھی مَیں نے اگر لی تو شرارے نکلے
☆

حکیم خان حکیم

فیض بک ڈپو ڈاک خانہ کامل پور موسیٰ ضلع اٹک

سفر میں اتنا خیال رکھنا
وفا کا رشتہ بحال رکھنا
قدم بڑھاؤ تو سامنے تم
ہماری' جاناں! مثال رکھنا
وہ آرہا ہے ہماری جانب
بچھا کے' لوگو! نہ جال رکھنا
سنبھل کے اُٹھنا' سنبھل کے چلنا
وہی جو پہلے تھی' چال رکھنا
کچھ اور آئیں گے مرحلے بھی
نہ اتنا خود کو نڈھال رکھنا
قصور کیانی کا کون سا تھا
یہ اُس کے آگے سوال رکھنا
☆

ایم عثمان کیانی

موبائل:0320-5172252

تجھے تو جیسے وفا کی ہوا لگی ہی نہ ہو
گماں ہے' صاحباں کوئی تجھ میں دوسری ہی نہ ہو
یوں راہ چلتے ہوئے ٹھوکریں لگا نہ اسے
جسے سمجھتے ہو پتھر' وہ آدمی ہی نہ ہو
عجیب وہم و یقیں کا ہے سامنا دل کو
کہ تیرا پیار کہیں تری دل لگی ہی نہ ہو
یہ سوچ کر مَیں تجھے بددعا نہیں دیتا
میرے عدو! تو کہیں میری زندگی ہی نہ ہو
گلہ نہ کر کہ ہواؤں نے گل کیا ہے چراغ
یہ کیا خبر کہ مقدر میں روشنی ہی نہ ہو
تعلقات کی راہوں پہ اتنی دور نہ جا
وہ چھوڑ جائے تو احساسؔ' واپسی ہی نہ ہو
☆

محمد اعظم احساسؔ

ڈھوک کالیاں ڈاک خانہ ساگری راولپنڈی

ہزاروں سانحوں میں پل چکے ہیں
ہم اندر سے تو بالکل گل چکے ہیں
بڑی مشکل سے اب کندن ہوئے ہیں
جنوں کی آگ میں ہم جل چکے ہیں
کہیں پر بھی اماں ملتی نہیں ہے
نصیب اپنے بھی اب تو ڈھل چکے ہیں
یہ گلشن میں ہے کیسی آگ بھڑکی
پرندے آنچ سے ہی جل چکے ہیں
مناسب فیصلے کرتے نہیں ہیں
دماغ اپنے تو بالکل چل چکے ہیں
بڑے خوش ہیں مبشر ہم کہ منہ پر
غلامی کی سیاہی مل چکے ہیں
☆

مبشر رضا مبشر

بمقام کوٹ رسول ڈاک خانہ مانانوالہ
تحصیل شاہ کوٹ ضلع ننکانہ صاحب

زندگانی بھی ہار بیٹھے ہیں
جان کر کے نثار بیٹھے ہیں
کون دل میں خلوص رکھتا ہے
سارے محفل میں یار بیٹھے ہیں
جس کو اپنا حبیب سمجھا تھا
لے کے دامن میں خار بیٹھے ہیں
اب بھلا دل میں زندگی کیسی
سارے جذبوں کو مار بیٹھے ہیں
اپنا دعویٰ تھا پیار کا ' ساجدؔ!
اِس لئے بے قرار بیٹھے ہیں
☆

ملک عاشق حسین ساجد

P/O ہیڈ بکائنی تحصیل جتوئی ضلع مظفر گڑھ

انتظار ہے ترا
آ جا اَب' آ بھی جا
مَیں تڑپ چکا بہت
مجھ کو اور مت ستا
روٹھنا ہے گر تو پھر
یاد کر نہ یاد آ
عشق جنگ تو نہیں
جیت اور ہار کیا
کر چکا تھا اعتبار
یونہی پیار کب کیا
یار! ایک کام کر
یاد آ کے بھول جا
مارتا ہے' مار یوں
پاس آ' گلے لگا
☆

سیّد عرفان عرفی

موبائل:0302-5871746

جانتا ہوں کہ مرا دل مرے پہلو میں نہیں
پھر کہاں ہے جو تیرے حلقۂ گیسو میں نہیں
ایک تم ہو کہ تمہارے ہیں پرائے دل بھی
ایک مَیں ہوں کہ مرا دل مرے قابو میں نہیں
دُور صیادؔ چمن پاس' قفس سے باہر
ہائے وہ طاقتِ پرواز کہ بازو میں نہیں
دیکھتے ہیں تمہیں جاتے ہوئے اور جیتے ہیں
تم بھی قابو میں نہیں' موت بھی قابو میں نہیں
حیف جس کے لئے پہلو میں نہ رکھا دِل کو
کیا قیامت ہے کہ ایازؔ وہی پہلو میں نہیں
☆

شیخ وقاص احمد ایازؔ بھابڑہ شریف

موبائل:0300-5757789

خنجر ہے بہار اُس کے لیئے
باغ میں ہے نکھار اُس کے لیئے
جذبۂ عشق جس کا صادق ہو
امتحاں ہیں ہزار اُس کے لیئے
بن سنور کے جو منتظر ہے ترا
تو بھی خود کو سنوار اُس کے لیئے
جو فراموش کر چکا ہے مجھے
دل ہے کیوں بے قرار اُس کے لیئے
کیسے مانوس ہو سکے گا وہ
اجنبی ہے دیار اُس کے لیئے
اُس کے ہی خواب ہیں اِن آنکھوں میں
بجتے ہیں دل کے تار اُس کے لیئے
گر ضرورت پڑے تو دل کیا ہے
جان کردوں نثار اُس کے لئے
☆

زید ایم ناشاد

موبائل:0302-5299450

طرفہ حالات ہیں زمانے کے
اُڑ گئے تنکے آشیانے کے
عشق کی سر بہ سر حکایت ہے
لاکھ عنوان ہیں فسانے کے
چرخ و گردش فقط عنواں ہیں
خاکساروں کو آزمانے کے
جانے اِس آنکھ نے کہاں سیکھے
ڈھنگ سارے شراب خانے کے
بجلیوں کو بھلا نصیب کہاں
اِس کے انداز مسکرانے کے
اب نہیں آہ میں اثر باقی
اب نہیں نالے کام آنے کے
☆

جی مصطفیٰ شان

اوسلو' ناروے

پنہا ہیں تغیر میں تغیر کے نشاں اور
بدلا ہے بہت' آگے بھی بدلے گا جہاں اور
اے کاش! کہ ہم سوچ کے انداز کو بدلیں
کر بیٹھے ہیں تعمیر کے پردے میں زیاں اور
بستی میں کہیں چین ہے باقی' نہ اماں ہے
اب جائے بھی رہنے کو اِنسان کہاں اور
آزاد کھلے عام پھرا کرتے ہیں وحشی
پسپا ہی ہوا جاتا ہے اِنسان یہاں اور
ہر کوئی پجاری ہے فقط اپنی اَنا کا
مٹتے ہی چلے جاتے ہیں عظمت کے نشاں اور
آثار قیامت کے ہیں اب سامنے' اکرم
آنے ہی کو ہے اب آخری طوفان یہاں اور
☆

ایم اکرم' کراچی

موبائل:0304-2020420

مجھ کو لگا ہے' میرے ساتھی! عجب زمانہ تیرے بعد
نہ وہ نظمیں' نہ وہ غزلیں' نہ وہ ترانہ تیرے بعد
مَیں تو سب کچھ بھول چکا ہوں مجھ کو تو اب یاد نہیں
کوئی کہانی تجھ سے پہلے' کوئی فسانہ تیرے بعد
خوش رہتے تھے لوگوں سے بھی میل ملاپ ہوا کرتا تھا
لوگوں سے بھی ختم ہوا ہے آنا جانا تیرے بعد
کیسے خواب سجا پاؤں گا نیند سے عاری آنکھوں میں
سیکھ لیا ہے پلکوں پر' اِک برف جمانا تیرے بعد
ہم نے قیصرؔ سوچ لیا ہے تم سے بچھڑ کر چپکے سے
اِن ٹوٹے پھوٹے کھنڈروں میں کیا شہر بسانا تیرے بعد
☆

فیض رسول قیصرؔ

میراں پور' مظفر گڑھ

موبائل:0306-6966551

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آپ کے نام

قبیلہ آداب عرض کی چاہتوں سے لبریز ایک عنوان

یہ قبیلہ آداب عرض کی اپنی محفل ہے۔ آپ دل میں بسنے والوں کو پکار سکتے ہیں' کسی موضوع پر اپنے موقف کی وضاحت کر سکتے ہیں۔ متنازعہ اور ایسے مراسلے جن میں کسی کی تضحیک کا پہلو ہو' شائع نہیں کیئے جائیں گے اور جس حد تک ممکن ہو' طوالت سے گریز فرمائیے۔ اپنے خط اس پتہ پر ہر ماہ کی 15 تاریخ تک ارسال فرمایئے۔

نگراں "آپ کے نام" ماہنامہ "آداب عرض" پوسٹ بکس نمبر 4132 ملتان روڈ لاہور 54500

پیارے بھائیو اور بہنو! السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟ دوستو! ایک عرض کرنی تھی آپ سے۔ وہ یہ کہ پچھلے دنوں چھوٹے بیٹے کو ہسپتال داخل کروایا۔ رات کو ہسپتال کے لان میں تھکا ہارا سویا تو پتہ نہیں کس ٹائم کسی کاریگر بھائی نے میری قمیض کی سائیڈ والی جیب سے میرا موبائل فون اور پانچ ہزار روپے نکال لئے۔ ظالم نے نیچے سے جیب کو بلیڈ مار کر اپنی ڈاکٹری دکھائی۔ اب آپ بھی دوسروں کی طرح کہیں گے کہ کیوں جی، آپ کو پتہ نہیں چلا؟ تو میں وہی کہوں گا جو دوسروں سے کہتا رہا ہوں کہ اگر دوسروں کی جیبوں پر ڈاکا ڈالنے والے اتنے ہی اناڑی ہوں تو آدھے سرکاری ملازم اور آدھے جیب کترے جیل میں بند ہوں، وہ بھی پاکستان کی پوری پولیس کے ساتھ۔ میں نے نیا موبائل لیا اور ہر دوست کے فون اور SMS پر اُس کا نام پوچھنا شروع کر دیا۔ بہت سے دوستوں نے یہ سمجھا کہ شاید میں نے اُن کا نمبر ڈیلیٹ کر دیا تھا اور اب موبائل چوری کی کہانی سنا کر انہیں مطمئن کر رہا ہوں۔ خیر، کسی نے یقین کیا اور کسی نے جھوٹ سمجھ کر بُرا منایا۔ آپ نے وہ لطیفہ تو سُنا ہو گا کہ ایک شخص کے دونوں رخسار جلے ہوئے تھے۔ دوست نے دوران ملاقات پوچھا کہ یار، تیرے دونوں رخسار کیسے جل گئے؟ دوست بولا، میں کپڑے استری کر رہا تھا کہ فون آ گیا۔ میں نے بے دھیانی اور بے خیالی سے بجائے فون کے استری کو اٹھا کر کانوں سے لگا لیا۔ اور دوسرا رخسار کیسے جلا، دوست نے پوچھا۔ پہلا دوست بولا، استری نیچے ہی رکھی تھی کہ ایکبار پھر فون آ گیا۔ ہوا یوں کہ بیگم نے وہی کپڑے استری کر دیئے جن کپڑوں کی جیب پر بلیڈ کے زخم لگے تھے۔ بیگم کو بھی یاد نہ رہا اور میں تو جناب، سدا کا بھلکڑ ہوں۔ نہا دھو کر کپڑے پہنے، کنگھی شنگھی کی اور باہر کی راہ لی۔ موبائل قمیض کی سامنے والی جیب میں تھا۔ راستے میں ایک دوست کا فون آیا، اسے سُنا۔ فون بند ہوا تو موبائل کو سائیڈ والی جیب میں ڈال دیا۔ گھر واپسی پر ٹائم دیکھنے کیلئے جب موبائل نکالنے کیلئے جیب میں ہاتھ ڈالا تو موبائل کی بجائے نیچے سے پورا ہاتھ نکل آیا۔ ابھی ان سطور کو لکھنے تک نیا موبائل نہیں لیا لیکن اس کے بغیر گزارہ بھی نہیں، جلد یا بدیر لے ہی لوں گا۔ بس دوستوں سے عرض ہے کہ اب مجھے SMS کریں تو نیچے اپنا نام ضرور لکھیں۔ آخر میں تمام دوستوں کے لئے سلام و دعا!

✿ سید ابرار بخاری

موبائل: 0346-6051885

☆

جناب خالد بن حامد صاحب! آداب عرض باقاعدگی سے مل رہا ہے۔ آداب عرض کے تمام قارئین کو میری طرف سے خلوص بھرا اسلام۔ خوش رہئے اور خوشیاں بانٹتے رہئے کہ زندگی کا بھروسہ نہیں۔ رائٹر حضرات سے گزارش ہے کہ اپنی آمد کو ریگولر بنائیں۔

✿ سہیل انجم، محلہ خضر آباد خوشاب

موبائل نمبر: 0315-4205252

☆

آداب عرض میں طویل عرصہ بعد دوبارہ شریک ہونے کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔ کچھ ذاتی وجوہ کی بنا پر آداب عرض میں خطوط کا سلسلہ جاری رکھ سکا۔ جناب خالد بن حامد صاحب! کیسے ہیں آپ؟ اُمید کرتا ہوں کہ آپ خیریت سے ہونگے۔ مجھ ناچیز سے موبائل پر بات کر کے اچھے دوست اور پُرخلوص باوفا دوست ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ آپ سے بات کر کے بہت خوشی ہوئی --- جواد حسین! آپ سے مل کر اور بھی حوصلہ بڑھتا ہے۔ اللہ آپ سب کو اپنی حفظ امان میں رکھے، آمین! ایس ایم ایس کا سلسلہ جاری رکھنے کا بے حد شکریہ --- مرید عباس! بھائی آپ کے ہاں جا کر بہت خوشی محسوس ہوئی اور آپ نے یقیناً بہت اچھے مہمان نواز ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ بہت شکریہ، اللہ تعالیٰ آپ کو ڈھیروں خوشیاں دے، آمین --- شکیل سالک صاحب! دریا خان آپ کے شہر گیا مگر ملاقات نہ ہو سکی جس کا مجھے افسوس ہے۔ آپ سے موبائل اور SMS سے بات اور حالات سے آگاہی ہوتی ہے۔ یاد رکھنے اور دعاؤں کا تحفہ بھیجنے کا مشکور ہوں --- کامران شہزاد! بھائی، میں ماہ رمضان میں بھکر آیا تھا لیکن آپ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ بھکر میں ہمیں بہت پیار اور خلوص و محبت ملا۔ لوگوں نے بڑی ہمدردی اور محبت کا اظہار کیا تھا۔ اچھے SMS بھیجنے کا شکریہ --- ملک عصمت اللہ بھائی! لیہ میں اگر دوبارہ گیا تو آپ سے ضرور ملاقات ہو گی، انشاء اللہ --- یہی بات م۔ قادر یوسفی صاحب کیلئے کہوں گا۔ ویسے یوسفی صاحب! آپ کا نمبر بند ہونے سے میں لیہ جا کر بے حد پریشان ہوا۔ چلو، کوئی بات نہیں --- جاوید خان بلوچ! محبتوں اور SMS کا شکریہ۔ میری طرف سے تمام دوستوں اور آداب عرض کے قارئین کو سلام خلوص پیش ہے۔

✿ منظر عباس بلوچ ضلع خوشاب

موبائل نمبر: 0301-4371512

☆

ثاقب چوہان صاحب! ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے آپ نے کبھی درشن نہیں دیئے؟ غزل کی پسندیدگی کا شکریہ --- اشرف نجمی صاحب! فون پر ایک بار رابطہ ہوا۔ دوبارہ ناچیز اس امید پر تھا کہ آپ رابطہ فرمائیں گے --- سید فہیم الدین صاحب! آپ پاکستان آئے بھی اور ملے بغیر ہی چلے گئے؟ میرے اور آپ گھر کے درمیان چند قدموں کا فاصلہ ہے --- ملک ساجد صاحب آف ہیڈ بکائنی! اپنی دعاؤں میں یاد رکھیئے گا --- عبدالستار شاہی صاحب! ہر بار ارادہ کیا آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کا مگر مہنگائی اور حالات نے اجازت نہ دی۔ دُنیا کی طرح میں بھی امید پر قائم ہوں، آپ کے درشن ضرور حاصل ہوں گے، اپنی دعاؤں میں یاد رکھنا --- سجاد راکب صاحب! آپ ہمارے وسیب کا مان ہیں۔ ناچیز سمجھتا ہے کہ آداب عرض میں آپ کی آمد ضروری ہے۔ آپ آداب عرض میں لکھتے رہا کریں، ہم جیسے نوآموز لکھاریوں کو اپنے اندر قوت اور حوصلہ محسوس ہوتا ہے۔

✿ یادش منصور

موبائل نمبر: 0332-7359236

☆

اس محبت بھری بزم میں پہلی مرتبہ حاضر خدمت ہو رہا ہوں۔ اسید کرتا ہوں کہ آپ مجھے ضرور خوش آمدید کہیں گے۔ آداب عرض میں کافی عرصے سے پڑھ رہا ہوں لیکن لکھنے کی جرات آج ہوئی ہے جو مجھے میرے انکل جناب عاشق حسین ساجد صاحب نے عنایت کی ہے۔ اب انشاء اللہ، آداب عرض سے ناتا زندگی ضرور رہے گا۔ مجھے اپنے انکل ساجد حسین اور سیّدہ آمنہ بہار، ہماشاہ اور صفدر علی صفدر کی شاعری نے متاثر کیا ہے۔

✿ مبشر حسین، ہیڈ بکائنی شریف

موبائل نمبر: 0312-6401351

☆

بھائی ریاض تبسم چوہان! آپ کی نانی کی وفات کا سن کر بہت دکھ ہوا۔ اللہ اُن کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ جتنا ماں اپنے بچے کو پیار کرتی ہے، اتنا ہی نانی پیار کرتی ہے --- میاں عقیل صاحب! کیا بات ہے، مصروفیات زیادہ ہو گئی ہیں کیا؟ میں لاہور سے گاؤں گیا ہوا تھا اس لئے کسی سے بھی رابطہ نہیں ہوتا رہا کیوں کہ میرے گاؤں میں سروس کا بڑا مسئلہ ہے۔ جب لاہور آؤں گا، آپ سے رابطہ ضرور کروں گا --- شبیر حسین! آپ کو آداب عرض کی محفل میں خوش آمدید --- ملک عاشق حسین ساجد! آپ کو میری طرف سے سپیشل سلام۔ اللہ آپ کی عمر دراز کرے، آمین --- محمد اسلم خان بلوچ! آداب عرض کی محفل میں خوش آمدید --- باقی سب دوستوں کو سلام۔ اللہ سب کو اپنے حفظ امان میں رکھے، آمین!

✿ میاں شاہد سلیم، شکرگڑھ

موبائل نمبر: 0300-8121072

☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

محترم تنویر پھول! آپ کے ہم زلف اور ماموں کی وفات حسرت آیات پر دلی صدمہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے، آمین---محترم پروفیسر محمد ظریف خان! آپ کا مُرسلہ تحفہ بہت پہلے مل گیا تھا۔ مصروفیت کی وجہ سے مطلع نہ کر سکا، معذرت خواہ ہوں۔ بچوں کے لئے ڈرامہ نگاری کے مقابلہ میں اول انعام حاصل کرنے پر ڈھیر ساری مبارکباد قبول فرمائیے گا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش و خرم رکھے---محترم میں جاوید جالندھری! آپ کا ہمیں شعر میں یاد کرنا بہت ہی اچھا لگتا ہے۔ رب سوہنا آپ کو دونوں جہانوں کی خوشیاں عطا فرمائے---یاسمین، سکینہ صدف، زبیدہ مسکان، لبنیٰ حزیں، کرن شہزادی! آپ سب کی شرکت اپنے پیارے آداب عرض میں بہت ضروری ہے--- محترم محمد ارباب بزمی! امید ہے، آپ خیریت سے ہوں گے---محترم حکیم خان حکیم، مہر پرویز احمد ڈولو! نظم کی پسندیدگی کے لئے شکر گزار ہوں---محترمہ رابعہ تسنیم! آپ کا طویل مکتوب موصول ہوا، یاد آوری کے لئے ممنون ہوں۔ آپ نے جس سوال کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے، اُس کا مختصر جواب پیش خدمت ہے۔ صرف پاکستان ہی ہماری امیدوں کا مرکز ہے۔ پاکستان ہی ہمارا سب کچھ ہے، جس کے حصول کے لئے لاکھوں انسانوں نے اپنے خون کے نذرانے دیئے۔ یہ ایک ایسی دھرتی ہے جو پورے رُوئے زمین کے لئے محبت، امن، آشتی اور پناہ کا پیغام ہے۔ یہ ایک ارب سے زائد انسانوں کی زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔ پاکستان کا قیام قائد کے بقول اُس روز ہی عمل میں آ گیا تھا جس روز برِصغیر کی سرزمین پر پہلے مسلمان نے قدم رکھا تھا۔ کون اس حقیقت کو نہیں جانتا ہوگا کہ برِصغیر پر صدیوں تک مسلمانوں کی حکمرانی کا پرچم لہراتا رہا ہے مگر کبھی کسی کو مذہب یا عقیدہ چھوڑنے پر مجبور نہیں کیا گیا۔ پھر ہندو قوم نے انگریزوں سے مل کر سازش کی اور مسلمانوں کو تہہ تیغ کرنا شروع کیا۔ کسی کی عزت محفوظ رہی، نہ جان اور مسلمانوں کو مجبور کر دیا گیا کہ وہ اپنے نظریئے کی حفاظت کے لئے الگ ملک کا مطالبہ کریں۔ محمد علی جناحؒ نے کہا تھا کہ ''اگر دشمن ہمیں اٹھا کر بحرہ عرب میں بھی ڈال دے تو ہم مطالبہ پاکستان سے ہرگز باز نہیں آئیں گے''---دشمن کی سازشیں بالآخر پاکستان معرضِ وجود میں آ گیا لہٰذا ہمیں اس نعمت کی قدر کرنی چاہئے---محترم لقمان ناصر! لوٹ آؤ، اسی میں آپ کے لئے بہتری ہے---شہزادہ جی! حسبِ وعدہ آپ تشریف لائے، بہت بہت شکریہ---محترم ارشد حسین! آپ نے جس پہلو کی طرف توجہ دلائی ہے، اس پر ضرور عمل ہوگا، مطمئن رہیے گا---مہر پرویز احمد ڈولو! اللہ تعالیٰ آپ کے شہر کو بھی شاد و آباد رکھے---ملک عاشق حسین ساجد! جی ہاں، ہم آپ کے بالکل قریب ہی رہتے ہیں---ظفر ندیم دہرہ، شفیق آصف، مرزا شبیر بیگ، ابنِ عظیم فاطمی، ڈاکٹر طلعت محمود، صابر انصاری، محمد امین، سیّد امبر بخاری، شکیل عادل، امجد جاوید اور ڈاکٹر نسیم جاوید سیّد کی خدمت میں سلام عقیدت اور خلوص بھری دُعائیں!

✿ سرور رہنما لدھیانوی

جنرل بس اسٹینڈ حیدر آباد، (سندھ)

☆

میری طرف سے ادارے کے تمام ارکان اور خالد صاحب کو بالخصوص عید کی بہت بہت مبارکباد قبول ہو۔ تمام اہل وطن اور آداب عرض قارئین کو بھی عید کی ڈھیروں مبارکباد قبول ہو۔ مسقط کے عبدالوہاب صاحب! میری طرف سے عید کی مبارکباد قبول کیجئے---پروفیسر ظریف خان صاحب، ڈاکٹر نسیم جاوید سیّد صاحب، امبر سائیں، الطاف قادر، عبدالغفار عابد اور امجد جاوید صاحب! میری طرف سے عید کی مبارکباد قبول کیجئے۔ خدا کرے کہ یہ عید ہمارے لئے حقیقی خوشیوں کا پیغام لیکر آئے، آمین! اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہر قسم کے آفات اور بیماریوں سے محفوظ و مامون رکھیں، آمین!

✿ سیّد وہاب، شوگر کین فارم مردان

☆

شمارے میں ہر طبقہ فکر کے افراد کے لئے پڑھنے کا مواد موجود ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے عوام و خواص اسے بے حد پسند کرتے ہیں۔ ''ناقابل فراموش'' بلاشبہ ایک بہترین سلسلہ ہے جو عرصہ دراز سے ہم جیسے قارئین کو محظوظ کر رہا ہے۔ آپ جس طریقے سے واقعات کی نوک پلک سنوارتے ہیں، وہ زبان و بیان کی لطافت، واقعے کا فطری بہاؤ اور الفاظ کے عمدہ چناؤ کی بنا پر قارئین کے دل میں جگہ بنا لیتا ہے اور اس سلسلے میں بہادری، انتقام، خود غرضی، انسانی بے بسی، پرانے ادوار اور ماورائی واقعات کو جس طرح بیان کیا جاتا ہے، قابل تحسین ہے۔ آپ کے اس طبع شدہ سلسلے کا ایک بڑا ذخیرہ میرے ایک دوست کے پاس بالکل محفوظ ہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ ایک تو اس ضمن میں ماورائی واقعات زیادہ شامل کئے جائیں کیونکہ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ انسانی عقل بے شمار واقعات کی توجیہہ پیش نہیں کر سکتی۔ انہیں اسی انداز میں پیش کیا جانا چاہئے جیسے یہ بیتے ہوں۔ اگر ہو سکے تو ''ایک شعر، ایک پیام'' کا ایک صفحہ بھی بڑھا دیں---سدرہ ناز! اللہ تعالیٰ نے آپ کو فرزند ارجمند سے نوازا، میری اور میرے اہل خانہ کی طرف سے مبارکباد قبول فرمائیں۔ اللہ اُسے تندرست و توانا رکھے اور نظرِ بد سے بچائے---حافظ عبداللہ شاکر، حاجی مختار احمد گوندل، ریاض تبسم چوہان، محمد اقبال عامر، مرید عباس خان، اقبال ظفر ٹوانہ، ندیم حیدر، ثناء اللہ آصف اور محمد شعبان! عید کے موقع پر SMS اور فون کالز کے ذریعے مجھے یاد رکھا، آپ کا شکریہ---ثمرہ یاسمین، شمع منظور، بشریٰ فردوس! آپ آداب عرض میں اپنی حاضری کو یقینی بنائیں۔ میں آپ کا بہت زیادہ مشکور ہوں گا۔ آداب عرض اور قارئین کے لئے ڈھیروں دُعائیں!

✿ جاوید خان بلوچ، خوشاب

موبائل نمبر:: 0302-8701935

☆

شمارہ بہت اچھا جا رہا ہے۔ یوں بھی جن کی محنت میں اخلاص شامل ہو، وہ ضرور نوازے جاتے ہیں، رب کی رحمتوں اور برکتوں سے بھی اور ہزار ہا لوگوں کی پُر خلوص چاہتوں سے بھی۔ شمارے کے بعض آرٹیکلز تو اس قدر شاندار ہوتے ہیں کہ اختتامی سطر تک بغیر رکے پڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اکثر تحریریں معلومات سے بھرپور ہوتی ہیں۔ آپ کی ٹیم کے تمام ارکان اور بطور خاص ان کے سربراہ کو ایک سلیوٹ پیش کرنا چاہوں گی--- جاوید خان بلوچ! مُنے کے لئے گفٹ اور دعاؤں بھرا لیٹر موصول ہو گئے ہیں، بہت بہت شکریہ۔ اللہ آپ اور آپ کے گھر والوں کو خوش رکھے---شمع منظور! کہاں ہو؟---فیصل آباد کے بھائی کے لئے بہت ساری دُعائیں ---اللہ تمام قارئین کو خوشی دے اور صحت مند رکھے، بیماروں کو صحت کاملہ عطا کرے اور جو آج ہم میں نہیں، ان کی مغفرت فرمائے، آمین!

✿ سدرہ ناز، گوجرانوالہ

☆

میں آداب عرض میں نئے شرکت ہونے والوں خصوصاً صفدر علی صفدر، وسیم ساحل، کاشف رمضان کاشی اور ثمرہ یاسمین کا تہہ دل سے خوش آمدید کہتا ہوں اور ساتھ ہی یہ استدعا کرتا ہوں کہ اب آپ کی شمولیت پابندی ہونی چاہئے---بیٹی یاسمین کنول! آپ نے میری نظمیں سیلاب 2010ء، بیٹی کی رخصتی اور ''عید کے دن'' پسند کی، بہت ممنون ہوں۔ مجھے آپ کی دعاؤں کی بہت ضرورت ہے۔ پیارے عبداللہ کا کیا حال ہے۔ مجھے آپ جیسی ادبی ذوق کی مالک بیٹی کا انکل ہونے پر بجا طور پر ناز ہے۔ آپ کا نیا مجموعہ کلام کب منظر عام پر آ رہا ہے؟---- ڈاکٹر ناصر وقار احمد ناصر! آپ کا کلام پڑھے کافی عرصہ بیت گیا۔ کنجوسی اچھی نہیں ہے، کوئی پھڑکتی سی غزل ہو جائے تاہم آپ کے اشعار کا انتخاب واقعی لاجواب ہے۔ میری دُعائیں آپ کے ساتھ ہیں----ایم اشرف انجمی، اقبال عامر، جاوید خان بلوچ، اشفاق شاہین، وقار احمد آتش، مظہر حسین عباسی، شمس القمر عاکف، ظفر اقبال ٹوانہ، تنویر پھول، پروفیسر محمد ظریف صاحب، عزیز جی آ! میں آپ لوگوں کی محبتوں کا اسیر ہوں----ڈاکٹر نسیم جاوید سیّد کی صحت یابی کے لئے دُعا گو ہوں----شاہد مشتاق، بدر منیر قریشی، بشیر گوندل دفا، محمد عبدالقدوس سنی، عبدالوہاب! جناب، واپس آ جائیں---شگفتہ سیال، مرید عباس خان، راجہ عظمت علی، ایس اے ناز! خداوند کریم آپ کے پیاروں کو جنت الفردوس عطا فرمائے اور آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے---آصف عاطر کو شادی اور رمضان پریشان جٹ کو منگنی مبارک ہو---معزز قارئین! میں حاجی مختار احمد گوندل 18 نومبر 2011ء کو ساٹھ برس کا ہو جاؤں گا۔ میری سالگرہ پر اپنی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مبارکبادوں اور منظوم کلام سے نوازیں اور میرا مان بڑھائیں، دعا گو رہوں گا۔

✪ حاجی مختار گوندل، راولپنڈی

☆

سچ تو یہ ہے کہ حکومتوں سے لیکر صنعت کاروں تک، تاجروں سے لے کر دوکانداروں تک، اُوپر سے لے کر نیچے تک ہر کوئی کسی نہ کسی شکل میں بھتہ خوری کر رہا ہے۔ فرق تو صرف اتنا ہے کہ کہیں یہ بدمعاشی غیر قانونی ہے اور اکثر جگہ اسے قانونی حیثیت حاصل ہے۔ کہیں بھتے کو چندہ، ٹیکس، رشوت، کمیشن، نذرانہ، تحفہ یا کچھ اور کہا جاتا ہے اور کہیں بھتہ کو صرف بھتہ ہی کہا جاتا ہے۔ عذاب کو کسی نام سے بھی پکارو، عذاب ہی رہے گا۔ والدالحرام کو ''سنگل پیرنٹ چائلڈ'' کہنے سے گناہ کی کہانی نہیں بدل جاتی۔ معذور بچوں کو سپیشل چلڈرن کہنے سے ان کی معذوری ختم نہیں ہوتی۔ تیسری دنیا کے تیسرے درجے کے ملکوں کو ترقی پذیر ممالک کہنے سے ان کا سٹینس نہیں بدلا جاسکتا اور تو بھتے کو کوئی بھی نام دینے سے بھی حرام کبھی حلال نہیں کہا نے گا۔۔۔۔ امجد جاوید! میں سوچتا رہتا ہوں کہ ہم جو ہر اچھائی کے ٹھیکیدار ہیں، کفار مغرب کے مقابلے پر اس قدر گرے ہوئے اور گئے گزرے کیوں ہیں۔ وہاں گندگی دکھائی نہیں دیتی، یہاں صفائی نظر نہیں آتی۔ وہاں نظم و ضبط انتہا پر ہے اور یہاں بے سمت بھگدڑ زدہ ہجوم۔ وہاں آپ دو نمبر دوائی اور ملاوٹ زدہ خوراک کا تصور تک نہیں کر سکتے اور یہاں دونوں نایاب۔ انتہا یہ کہ جامن دھوئیں تو جامنی رنگ اُترنے لگتا ہے۔ وہاں فسادات بھی پھوٹ پڑیں تو بڑے سے بڑا ہتھیار ہے بیس بال کا ڈنڈا اور یہاں ہر خوشی پر بھی فائرنگ۔۔۔۔ اِس ملک میں وہ دودھ بک رہا ہے جو مہذب دنیا میں کب کا بین ہو چکا۔ کہیں ڈرگ مافیا، کہیں تاوان مافیا۔ کسٹم کے یو ڈی سی اور ریونیو کے پٹواری تک ارب پتی ہیں۔ جو کرپٹ ترین ہیں، وہ کرپشن کے بارے میں زیادہ اونچی آواز میں بولتے ہیں۔۔۔۔ سعودی عرب سے اقراء نوید! یوں محسوس ہوتا ہے کہ قدرت نے بھی ہمیں مکمل طور پر ''رائیٹ آف'' کر دیا ہے کہ ''مین میڈ'' مصیبتوں کے علاوہ قدرت بھی ہمیں سزا دینے پر تلی ہوئی ہے۔ بھوک، ننگ، بیروزگاری، قتل و غارت، اغواء، زیادتی، لوڈشیڈنگ، مہنگائی ذاتی کارنامے ہیں مگر غیب سے بھی ہولناک مضامین ہی نازل ہو رہے ہیں۔ مثلاً زلزلے، سیلاب، بارشیں اور اب ڈینگی رہی سہی کسر نکال رہا ہے کہ مچھروں کو سزا دینے پر مامور کر دیا گیا ہے لیکن بے حسی کی برف ہے کہ پگھلنے کا نام نہیں لے رہی۔ شاید اسے سورج کے سوا نیزے پر آنے کا انتظار ہے۔۔۔۔ مسقط عمان سے عاصم! انسان کے انسان ہونے امکان ہوتا تو الہامی کتابوں کے بعد بھلا کس تحریر کی ضرورت تھی؟ یہاں تو حال یہ ہے کہ اقبال تک کو اعتراف کرنا پڑا کہ ''خود بدلتے نہیں، قرآن کو بدل دیتے ہیں''۔۔۔۔ ایسے میں انسانی تحریریں اس کی جبلت اور علت سے کہاں تک برسر پیکار رہ سکتی ہیں۔۔۔۔ پروفیسر مقبول حسین! کراچی تو کراچی ہے، یہاں تو نیویارک میں بجلی چلی جائے یا لندن میں انسانی فیوز اُڑ جائے تو اچھے بھلے انسانوں کے اندر سے حیوانوں کے غول در غول برآمد ہوتے ہیں۔ ہزاروں سال کی مسلسل مشقت کے بعد بھی انسان پر انسان کا صرف ''میک اپ'' ہی کیا جاسکا ہے اور خودغرضی کی ایک بارش یہ ''میک اپ'' اتار دیتی ہے۔۔۔۔ ایبٹ آباد سے آمنہ عارف! کیسی ستم ظریفی ہے کہ اسمبلی جانے کے لئے کچھ نہیں؟ ٹیکسی چلانے کے لئے بی۔اے کی ڈگری ضروری ہے۔ کتنی دلچسپ بات ہے کہ آج منٹو، احسان دانش، اقبال ساجد، مہاراج کتھک اور استاد دامن جیسے لوگ زندہ ہوتے تو پیلی ٹیکسی کے لئے کوالیفائی نہ کر سکتے۔۔۔۔ دوحہ قطر نورین! آپ نے بھی دیکھا ہو گا کہ ایک اشتہار میں عبادت گزار ماں دعائیں پڑھ کر موبائل فون کے ذریعہ بیرون ملک زیر تعلیم بیٹی کو پھونکیں مار مار کر اس کی شیمپو زدہ زلفوں میں ارتعاش پیدا کرتی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ دعائیں قبول فرمانے والے مالک و خالق و رازق نے فون ایجاد کرنے والے اس شخص کے بارے میں کیا سوچ رکھا ہوا گا جس نے اربوں انسانوں کے لئے اتنی زبردست سہولت اور آسانی مہیا کر دی ورنہ ابھی کل کی بات ہے، جب بیرونی ملک کال کرنا کسی عذاب سے کم نہ تھا۔ کتنے بھلے ہیں وہ انسان جو انسانوں کے لئے آسانیاں پیدا کرتے ہیں کہ اصل میں تو یہی اشرف المخلوقات کہلانے کے مستحق ہیں۔ سچائی یہ بھی ہے کہ وہ موبائل فون اور ہم پھونکیں ایجاد کرتے ہیں۔۔۔۔ پروفیسر ریاض! جب ہم مٹھی بھر تھے تو دنیا مسلمانوں کی مٹھی میں تھی۔ آج ہم ڈیڑھ عرب ہیں اور عربوں سمیت دنیا کے قدموں میں ہیں تو ایسا کیسے ہو گیا؟ کیا ہم نے نمازیں چھوڑ دیں یا روزے ترک کر دیئے۔ ہم حج بھول گئے یا عمرے سے منہ موڑ لیا؟ ہرگز نہیں کہ ہماری عبادتیں تو کہیں زیادہ پرجوش ہو گئی ہیں، ہماری رقت آمیز دعائیں بھی بہت بڑھ گئی ہیں۔ ہماری تمام تر طاقت اور توانائی دکھاوے کے لئے وقف ہے۔ کیا آج سے تین سو سال پہلے اتنے شہر اعتکاف بجتے ہونگے۔ حج اور عمرے ادا کرنے والوں کی تعداد کتنی ہو گی، ہر گھر میں ٹی وی سیٹ سے مذہبی تعلیم و تبلیغ کی مقدس صدائیں اسی طرح بلند ہوتی ہوں گی کہ ماشاءاللہ، گلوکار اور اداکار بھی مصروف تبلیغ ہیں کہ کون سے مسئلے کا حل کس وظیفہ یا ورد میں ہے۔ میری بہن! ایسے معطر و مذہبی ماحول کا تو ماضی میں تصور بھی ممکن نہیں تھا تو پھر کیا ہوا کہ اس دنیا میں ہمارا کردار ہم سے چھین کر ہمارے حریفوں کے حوالے کر دیا گیا۔ ہم سے دنیا کی قیادت و امامت والا کردار واپس لے لیا گیا کہ بس تم اس قابل ہی نہیں رہ گئے کہ انسانوں کی قیادت کر سکو۔۔۔۔ اقصیٰ شیخ! اب قوم کو تو کسی ایسے بیان کا بھی انتظار ہے جس میں کوئی ''حضرت'' یہ فرمائیں گے کہ دراصل بجلی کی ایجاد ہی عالم اسلام کے خلاف یہود و ہنود کی سازش تھی۔ ایڈیسن امریکہ کا ایجنٹ تھا جس سے بجلی صرف اس لئے ایجاد کروائی گئی کہ پہلے اسلام کے قلعہ پاکستان میں مقیم اقبالؒ کے شاہین اس شیطانی ایجاد سے پوری طرح عادی ہو جائیں، پھر ان سے بجلی چھین لی جائے اور وہ احتجاجاً ایک دوسرے کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں۔۔۔۔ بہن رمیلا طاہر! آپ کی بات کے جواب میں چھوٹا سا سوال یہ کہ ایک بین الاقوامی ادارے نے قوموں کا کردار جانچنے پرکھنے کے لئے مختلف ملکوں کے مختلف پبلک مقامات پر قیمتی موبائل فون رکھوا دیئے جیسے کوئی بھول گیا ہو۔ نیوزی لینڈ کے لوگوں نے 24 گھنٹوں کے اندر اندر 100 فیصد فون واپس کر دیئے۔ سنگا پور کے لوگوں نے 48 گھنٹوں میں 100 فیصد فون واپس کر دیئے۔ امریکہ میں ریٹ آف ریٹرن 50 فیصد رہا۔ سوال یہ ہے کہ اگر اس سروے میں اسلام کا قلعہ اسلامی جمہوریہ پاکستان بھی شامل ہوتا تو کتنے فیصد فون واپس ہوتے؟ اس سوال کے جواب میں ہر سوال کا جواب موجود ہے اور حقیقت صرف اتنی ہے کہ جب روم جل رہا تھا تو صرف نیرو بانسری بجا رہا تھا جبکہ یہاں نیرو سے لیکر نتھو تک سب اپنی اپنی بانسریاں بجا رہے ہیں۔

✪ دستگیر شہزاد، ٹوبہ ٹیک سنگھ

موبائل نمبر: 0300-9667909

☆

میرے تمام ساتھی لکھنے والے جون کہ اس پرچے کو حسین بناتے ہیں، تعریف کے حقدار ہیں۔ شاہدہ صاعقی کے سچے موتیوں سے لفظ، کچھ سچائیاں، کچھ معصوم باتیں بھلی لگتی ہیں۔ مسعود ممتاز کی شاعری سے مایوسی ٹپکتی نظر آتی ہے۔ اگر ایسے ہی لکھتے رہے تو کمزور دل حضرات ضرور جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے سو پلیز، مسعود صاحب! کچھ زندگی کے رنگوں کی بھی بات کریں۔۔۔۔ ہما شاہ کی شاعری جیسے سب دلوں کی آواز ہے، سب کے احساسات کی ترجمان ہے اُن کی آواز۔ مجھے ہمیشہ اُن کی نظم کا، شاعری کا انتظار رہتا ہے کہ وہ بولیں تو موسم حسین لگے۔۔۔۔ کہانی نویس مروت جانے کہاں غائب ہیں؟۔۔۔۔ سوچ نگر میں پہنچ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم کسی محفل میں موجود ہیں اور ارد گرد بیٹھے سب اپنے خیالات کا اظہار کر رہے ہیں۔ اچھا لگتا ہے اس محفل میں بیٹھنا۔۔۔۔ ''ایک شعر ایک پیام'' بہت ہی مزے کا ہے۔ انھی پسندیدہ ہستی کے نام ایک شعر کر دیا جائے، واہ۔۔۔۔ ویسے اس رسالے کو ترتیب دینے والی ٹیم! یہ تو بتایئے کیسے بنا ڈالا اس کو پیارا کہ سب کے ہاتھوں میں خوشبو بکھیرتا نظر آتا ہے۔

✪ عظمیٰ شکور، سرگودھا

☆

یہ آنگن اتنا ویران تو کبھی نہ ہوا تھا جتنا آج ہو چکا ہے۔ بہت سے پیار محبت والے لوگ پتہ نہیں کہاں چلے گئے، کیوں وہ اس محبت بھری محفل سے غائب ہیں،

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انہوں نے اس محفل میں شامل ہونا کیوں چھوڑ دیا ہے؟ میں ان سب سے جو غیر حاضر ہیں یا غائب ہیں یا ناراض ہو کر چلے گئے ہیں، کہوں گی کہ آ جائیں، ہم آپ کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے آواز دیتے ہیں۔ آئیں اور اس ویران محفل کو رونق بخشیں---ڈاکٹر نسیم جاوید سید! صحت کی خرابی کے باوجود آپ کا اس محفل میں حاضر ہونا کمال محبت کی دلیل ہے۔ ہم الفاظ کی صورت میں آپ کا شکریہ ادا نہیں کر سکتے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ رب العزت آپ کو صحت کاملہ عاجلہ عطا کرے۔ آپ کی عمر میں برکت عطا کرے، اللہ کرے زور قلم زیادہ---میاں عقیل احمد! بہت ہی شرمندہ ہوں لیکن امید ہے کہ آپ محسوس نہیں کریں گے۔ بس وقت نے منجمد کر کے رکھ دیا ہے، دعاؤں کی درخواست ہے---ریاض تبسم! کیا بات ہے، آپ کی محبت بہت ہی سرد پڑ چکی ہے؟---احمد فہیم! آپ کی محبت، آپ کی دوستی پر ہمیں بڑا فخر ہے---امجد جاوید! ''عشق سیڑھی کانچ کی'' لکھ کر آپ نے کمال کر دیا۔ اللہ آپ کے قلم کو اور زیادہ جلا بخشے۔ آپ ایسے ہی ناول لیکر آئیں جن سے آپ ایک مبلغ اسلام نظر آئیں---ارشد جٹ! کہاں ہو، نہ میسج نہ کوئی رابطہ اور نمبر بھی بند؟---عاشق حسین ساجد! آپ کیوں خاموش ہیں، کیا کر دیا ہم نے؟--- اشفاق شاہین! بڑی مدت ہوئی آپ کا محبت نامہ پڑھے، آ جائیں---مہر پرویز احمد دولو! آپ نے کہاں مصروفیات شروع کر لیں؟---ابن عظیم فاطمی! آپ کی مختصر مگر پرخلوص دعا بڑی پیاری ہوتی ہے--- اقبال عامر! آپ نے یاد کرنا کیوں چھوڑ دیا، غلطی ہو گئی ہم سے کوئی؟---جاوید قیصر! محبت نامے ارسال کرنے کا شکریہ---میاں جاوید جالندھری! آپ کیوں نہیں آتے؟---ایم اشرف نجمی! میں بڑا ہی حیران و پریشان ہوں کہ آپ کا قلم کیوں خاموش ہے۔ خیریت تو ہے، نا؟---رحمت انصاری! بڑا آرام کر لیا آپ نے، اب آ جاؤ شاباش---رانا قدیر! آپ تو بالکل ہی بھول گئے، آنا نہیں ہے اب؟---اس کے علاوہ قبیلہ آداب عرض کے مخلص ترین حضرات جناب ریاض بٹ، جناب روشن کمال، شہزاد اشعر، میاں شاہد سلیم، شمس القمر، زبیر وارثی، رمضان پریشان، بوٹا راہی، ارمان یوسف، ابراہیم حسان، حاجی مختار، ابرار بخاری، دستگیر شہزاد، عادل یعقوب، ارشاد ورک، شفیق آصف، بہزاد جاذب، صادق شمیم چوہدری، ارشد محمود ارشد، دوست محمد وٹو، ہارون حسرت، ظفر ندیم، اطہر علی نایاب، زاہد حیدر، بدر سعید، احمد علی کیف، سید وہاب، محسن شہزاد، حنیف گجر، عابد شیخ، سرور رہنما، انجم عباس، سجاد شفار، پروفیسر مقبول، فرید عباس، عادل گلزار، عبدالعزیز جی آ، بابا ظریف اور ان کے علاوہ تمام خواتین و حضرات سے میں گزارش کرتا ہوں کہ اس محفل کی زینت تمہی سے ہے۔ آؤ، ہم سب تمام گلے شکوے بھلا کر مل بیٹھیں، ایک دوسرے کے دکھ درد غم بانٹیں۔ تم لوگ نہیں ہو تو یہ آنگن کتنا اجڑا اجڑا لگتا ہے۔ اب سب آ جاؤ، سب مل کر اس بزم کو پھر سے رونق بخشیں۔

حافظ عبداللہ شاکر، وزیر آباد
موبائل نمبر: 0313-7807795

☆

آداب عرض کی خدمت میں سلام۔ پہلی بار آداب عرض میں شرکت کر رہا ہوں۔ آداب عرض سے متعارف میرے دوست مبشر حسن نے کرایا جو اس کو پڑھنے کا جنون کی حد تک شوق رکھتا ہے۔ اب انشاء اللہ، آداب عرض سے ناتا زندگی بھر رہے گا۔ مجھے بھی لکھنے کا شوق ہے، بس آپ کی دعا کی ضرورت ہے۔

سرفراز رشید، ہیڈ بکائی شریف
موبائل نمبر: 0307-7427692

☆

قبیلہ آداب عرض کے دوستو! آج کے جدید دور میں ہر انسان پریشانیوں کے حصار میں جکڑا ہوا ہے۔ کسی کو گردش دوراں نے پریشان کر رکھا ہے تو کوئی غم روزگار جاناں کی فکر میں سرگرداں ہے۔ میری اہلیہ بھی کافی عرصہ سے مختلف بیماریوں میں مبتلا ہے۔ میں آپ سب سے اپیل کرونگا کہ ان کی صحت کاملہ کے لئے دعا کریں۔ رب العزت ہر بیمار کو شفا عطا فرمائے اور ہر دکھی کو سکھ دے---ڈاکٹر طلعت محمود! آپ کی یادآوری کا شکریہ، اپنی دعاؤں میں یاد رکھیئے گا---پرنس کشمیری! آپ کی سوڈا فیکٹری ہمارے لئے سوتن کا کردار ادا کر رہی ہے۔ جہاں کہیں گم ہو، خیریت کی اطلاع دیں---ملک عاشق حسین ساجد! ہم جیسے اہل دل لوگ بے وفا نہیں ہوا کرتے۔ حالات اور واقعات انہیں بے وفا بنا دیا کرتے ہیں---ایس اے ناز، مقبول بیگ ساتی بھائی! اپنی خیریت کی اطلاع دیں---ملک عامر عباس ناصر، عادل گلزار، بدر سعید! آپ لوگوں نے بھی رابطہ ختم کر دیا ہے، نہ جانے کیوں؟ آج کی دنیا میں ہر انسان مصروف ہے مگر رابطے تو بحال رہنے چاہئیں---میاں جاوید جالندھری، سرور رہنما لدھیانوی! آپ دونوں احباب کا ممنون و مشکور ہوں کہ آپ نے ہمیشہ مجھے یاد رکھا اور محبتوں کے پھول نچھاور کئے۔ آخر میں ادبی دوستوں کے لئے خوشخبری۔ مورخہ 20 نومبر 2011 بروز اتوار کندیاں ضلع میانوالی میں ایک ملکی مشاعرہ کا اہتمام کر رہا ہوں۔ سب دوستوں کو دعوت عام ہے۔ پاکستان بھر سے بہت سے دوستوں کی متوقع آمد ہے۔ ڈاکٹر طلعت، بدر سعید کی خصوصی آمد ہو گی۔ مزید تفصیلات کیلئے رابطہ کریں۔

دوست محمد خان وٹو، لیہ
موبائل نمبر: 0300-6763876

☆

ماہ ستمبر میں چند دن کے لئے لاہور گیا، بہت خواہش تھی کہ جناب خالد بھائی سے ملاقات ہو لیکن آداب عرض کے مسکن ''شمع پلازہ'' آفس بند پایا۔ خالد بھائی سے ملاقات کی خواہش تشنہ ہی رہی۔ بہر حال، آفس کو سلام کر کے بھی خوشی ہوئی---محترم جناب ڈاکٹر نسیم جاوید سید! آپ کی محبت میرا سرمایہ ہے لیکن تشنگی تب بے چینی بنتی جا رہی ہے جب آپ سے ملاقات ممکن نہیں بنتی۔ یوں آپ جیسے صاف شفاف انسان بھی دنیا کی بے اعتنائیوں کا شکار، ہم جیسے چاہنے والوں سے دور ہو گئے ہیں۔ اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو اور زندگی کی راہوں پر آپ ہمیشہ دوسروں کے لئے مشعل راہ رہیں۔ آپ نے اس بندہ کو اپنی یادوں میں یاد رکھا ہوا ہے، بہت شکریہ---محترم میاں جاوید جالندھری! آپ کی محبتوں میں ڈھلا شعری انداز بہت دلکش ہے۔ اس محفل کے قارئین کو ایسے ہی انداز میں یاد کرتے رہئے گا۔ آپ نے اس بندہ کو یاد رکھا، بہت شکریہ---محترم عبدالغفار عابد! آپ کی معذرت قبول نہیں بلکہ آپ پر تو بہت بڑا جرمانہ ہونا چاہئے کہ ساڑھے چار ماہ کے عرصہ میں اتنی بھی طلب نہ ہوئی کہ اسلام آباد میں بسنے والے آداب عرض کے متوالوں سے ملاقات کر لی جائے؟ یہ بات اچھی نہیں لگی---محترم اقبال جاوید! آپ کی ہمت اور شوق تعلیم کی داد دوں گا۔ آپ جیسے باہمت لوگوں کا اللہ مشکلات سے نکال لیتا ہے۔ خونی رشتوں کی تڑپ اور پیار کبھی ختم نہیں ہے۔ یہ اللہ کی ودیعت ہے۔ آپ کے بھائی افتخار احمد کی اس محبت کو سلام۔ اللہ آپ کی تمام تر مشکلات کو آسانیوں میں ڈھال دے، آمین---محترم جناب سید امتیاز حسین شاہ! آپ کی پیار اور شفقت بھری آواز سننے کی خواہش ہے، آپ کے فون کا انتظار رہے گا---محترم حافظ عبداللہ شاکر! اپنی دعاؤں میں ہمارا حصہ ضرور رکھا کریں---محترمہ عظمیٰ زرین! آپ کے خیالات حقیقت کی عکاسی کرتے ہیں۔ آپ کی سوچ سے میں مکمل اتفاق کرتا ہوں۔ اللہ جو سب کا رب ہے، انسانوں سے ستر ماؤں جتنا پیار کرتا ہے۔ ماں جس کے اندر اولاد کے لئے ساری کائنات جتنا پیار بھرا ہوتا ہے اور ماں کے لئے اس کی اولاد ہوتی ہے، اس میں تفریق کے عنصر کا شائبہ تک ممکن نہیں ہوتا۔ اس پیار میں سب برابر کے شریک ہوتے ہیں اور ستر ماؤں جتنا پیار کرنے والے ہمارے اللہ کے پیار بھری رحمتیں کتنی بے کنار ہوں گی؟ یہاں پاکستان میں انسانی تفریق ہی تو ہمیں رسوائیوں کی سمت لے کے جا رہی ہے۔ یہاں ہندوانہ روایات ہیں، جہاں انسانوں کو شودر جیسا جانا جائے، جہاں سٹیٹس سے انسانی تفریق تذلیل بن جائے وہاں اسلامی احکامات کی نفی کی جا رہی ہوتی ہے۔ بطور مسلمان ہمیں تو انسانی اقدار کا ضامن ہونا چاہئے تھا۔ جہاں پوری انسانیت کا رتبہ اور مقام برابر ہوتا کہ اسلام ہمیں یہی سبق دیتا ہے۔ جب اللہ نے انسانوں میں تفریق نہیں کی اور جو ہم کر رہے ہیں تو یہ گناہوں سے دامن ہی بھر رہے ہیں۔ افسوس اور دکھ کا مقام ہے کہ لالچ، حرص، مفاد پرستی، خودغرضی اور لامحدود خواہشات کی اندھی تقلید نے تو ہم مسلمانوں کو باقی اقوام سے پست کر دیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے۔صرف مسلمان ہونا قابل فخر نہیں، اعمال کی سچائی بلندی کا مقام پیدا کرتی ہے---محترم ریاض حسین تبسم! یاد رکھتے ہو، بہت شکریہ---عرفان بٹ! کہاں ہیں جی، آپ؟ آداب عرض سے وفا آپ کی ان صفحات میں شرکت پر محیط ہونی چاہئے---شاہد مشتاق! آپ میڈیا کی دنیا سے آداب عرض کو بھی پکار لیا کریں۔آداب عرض کے پرانے قارئین اس شمارہ کی بہتری اور ترقی کے لئے ممد ومعاون بننے چاہئیں۔آپ سب کی آداب عرض میں شرکت ہی اس سے وفا ہے---شاہدہ گل بہنا! آپ کی شاعری پڑھنے کو جی چاہتا ہے اس لئے آپ کی حاضری ضروری ٹھہری۔آداب عرض کے صفحات کو آپ جیسے قارئین نے ہی سجانا ہوتا ہے۔دعاؤں میں ضرور یاد رکھیں---بہنا حنا یاسمین، کرن شہزادی، زبیدہ مسکان، لبنیٰ حزیں! آپ سب کہاں ہیں؟ آداب عرض سے وفا نبھائیں اور یہاں حاضری لگوائیں---پُرخلوص دعائیں آپ سب کے نام!

☼ محمد اقبال عامر، اسلام آباد

موبائل نمبر: 0302-5165686

☆

پروفیسر محمد ظریف! آپ کی والدہ کی وفات کا سن کر دلی دکھ ہوا۔قانون قدرت ہے، ہر آنے والے کو جانا ہوتا ہے۔ہم اس دکھ میں برابر کے شریک ہیں۔خداوند کریم انہیں جنت میں جگہ دے، آمین---دستگیر شہزاد! آپ کی کہانی ''بربادیوں کا قصہ'' بہت ہی اچھی تھی---ریاض حسین تبسم!---

کبھی نہ ہاتھوں سے ہاتھ چھوٹے خیال رکھنا
کبھی نہ چاہت کا مان ٹوٹے خیال رکھنا

عبدالغفار عابد! اس بار بحث ونظر میں آپ کی تحریر پڑھنے کو نہیں ملی، کیوں؟---ملک عاشق حسین ساجد! دو چار دن کی زندگی ہے۔محبتوں اور دعاؤں کے سوا نہیں کچھ نہیں لے جانا---حافظ عبداللہ شاکر! بہت سی دعائیں آپ کے نام---

☼ محمد احمد فہیم قمالپوری

موبائل نمبر: 0343-8110276

☆

آداب عرض کے ساتھیو! زندگی کی مصروفیات اتنی زیادہ ہوگئی ہیں کہ چاہتے ہوئے بھی خط لکھنے کے لئے وقت نکال نہیں پاتا۔کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ زندگی کی مصروفیات اتنی بھی نہیں جتنی کہ ہم نے اپنے اوپر مسلط کر لی ہیں۔کوشش البتہ کر رہا ہوں کہ آہستہ آہستہ قلم سے رشتہ دوبارہ بحال ہو جائے۔بہرحال، آپ سب کے لئے ایک خوشی کی خبر کے ساتھ آیا ہوں اور وہ یہ ہے کہ میرے استاد محترم اور آپ سب کے دیرینہ ساتھی جناب وقار احمد آس کے گھر میں ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کی طرح ان کی صاحبزادی پون وقار داخل ہوئی ہے۔استاد محترم! آپ کو میری طرف سے بہت بہت مبارک ہو کہ اللہ کی رحمت آپ کے گھر آئی ہے۔رب کریم سے دعا ہے کہ ننھی پون کو زندگی کی تمام خوشیاں نصیب ہوں اور آپ کا دستِ شفقت ہمیشہ اس کے سر پر رہے، آمین!

☼ ابراہیم خلیل شہزاد، کامرہ اٹک

☆

قبیلہ ''چاند'' و آداب عرض کے مشترکہ سردار شاہ خالد جی اور دونوں قبیلوں کے ارکان کو میرا اسلام پہنچے۔چند روز پہلے تک اگر کوئی مجھے ''بزرگ'' یا ''بابا'' کہتا تھا تو مجھے ناگوار خاطر ہوا کرتا اس لئے کہ مجھے ''بیٹا، میرا بچہ، میرا لال'' اور ''میرا کاکا'' کہنے والی میری 96 سالہ ماں سعیدی خانم زوجہ صوبے دار شفیع احمد خاں مرحوم کا سایہ میرے سر پر سلامت تھا۔رمضان المبارک کی انیسویں شب مطابق ۲۹ اگست کو میں اُس وقت یک دم بوڑھا یا بزرگ ہو گیا جب میرے سر سے ماں کا سایہ اُٹھ گیا۔اس سانحہ ارتحال کے بعد میرے جن کرم فرماؤں نے ''چاند'' اور آداب عرض سے وابستہ قلم کاروں کو میری جانب سے پیغامات ارسال کیئے یا فون کے ذریعے اطلاع دی، میں اُن سب کا انتہائی ممنون ہوں۔میں اُن دوستوں، بھائیوں، عزیزوں، بچوں اور بہنوں کا بھی از حد شکر گزار ہوں جنہوں نے تعزیتی پیغامات پڑھ یا سن کر فون یا پیغام کے ذریعے میرا غم بٹایا اور میرے شریک غم ہوئے۔پروردگار عالم سے دعا ہے کہ وہ اپنے فضل و کرم سے ان دونوں جرائد سے وابستہ لکھاریوں اور قارئین کو ہر دکھ، مصیبت، تکلیف اور غم سے محفوظ رکھے، آمین! اس بار اس تھوڑے لکھے ہی کو بہت سمجھا جائے۔

☼ پروفیسر محمد ظریف، کراچی

موبائل نمبر: 0321-2125603

☆

☆ ڈاکٹر ماریہ جوزف

آپ کے نفسیاتی مسائل اور ان کا حل

○ اے۔اعوان، فیصل آباد

جناب ڈاکٹر ماریہ جوزف صاحبہ! آپ کا ''نفسیاتی علاج'' کا کالم پڑھا تو دل میں مختلف کیفیات نے جنم لیا۔آپ اگر میرے راز کو راز ہی رہنے دیں تو میں اک مسئلہ آپ کے گوش گزار کرنا چاہوں گا۔ہوسکتا ہے، کوئی حل آپ کا کوئی قاری ہی نکال دے---میرا مسئلہ ایسا ہے کہ میں نہ تو اپنوں کو بتا سکتا ہوں اور نہ ہی دوستوں کو۔میرا خیال تھا کہ یہ مسئلہ دائمی ہے اور زندگی کے ساتھ ہی جائے گا اور کسی کو بتا نہ سکوں گا۔کسی کو ایسا راز بتایا ہی نہیں جاسکتا۔آپ چونکہ مجھ سے واقف نہیں ہیں اور پھر بتانے سے آسان تحریر کرنا ہے سو میں آپ کے سامنے مسئلہ بیان کر رہا ہوں۔میں انتیس سال کا نوجوان ہوں اور سرکاری محکمہ میں اچھی پوسٹ پر ہوں۔میں ابھی سات سال کا تھا کہ میرے والد صاحب وفات پا گئے۔میرے والد صاحب کے بھائی وغیرہ نہ تھے اور نہ ہی میرا کوئی بڑا یا چھوٹا بھائی ہے اس لئے ہم شدید مالی مشکلات کا شکار ہو گئے۔میں پڑھنا چاہتا تھا، میری والدہ بھی مجھے پڑھانا چاہتی تھیں لیکن حالات بدستور خراب سے خراب ہوتے جا رہے تھے۔کبھی رشتہ دار دوست کہتے تھے کہ فکر نہ کرنا، جب بھی روپوں وغیرہ کی ضرورت ہو تو ہم سے مانگ لینا مگر جو سب کچھ جانتا بھی ہو اور پھر کہے کہ ضرورت ہو تو مانگ لینا، ایسے بندے سے تو قرض ادھار بھی نہیں لینا چاہئے۔ایسے میں میرے ایک ماموں نے ہماری اچانک مدد کرنا شروع کر دی۔ہم اِس اچانک مہربانی پر حیران تھے۔میں میٹرک کر چکا تھا اور ایف ایس سی کی تیاری کر رہا تھا۔ماموں ہر چھٹی پر ہمارے گھر ہوتے اور گھر کا خرچہ دے جاتے۔پھر مجھے نوکری مل گئی اور میں ملازمت کرنے لگا۔ابھی ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ اُس ماموں نے میری شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔والدہ نے بہت کہا کہ ابھی اور بہت ذمہ داریاں ہیں، خود میں بھی شادی نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن ماموں نہ مانے۔بعد میں ہمیں پتہ چلا کہ ماموں اپنی طلاق یافتہ بیٹی سے میری شادی کرنا چاہتے ہیں جو مجھ سے عمر میں چودہ سال بڑی ہے۔میں اکلوتا بیٹا تھا اِس لئے والدہ نے اور خود میں نے ہلکا سا احتجاج کیا مگر ماموں کے احسان اتنے تھے کہ ہم بول بھی نہ سکے۔ذرا سی بات پر کہہ دیتے کہ اگر میں نہ ہوتا تو آج بھوکے مر چکے ہوتے۔بہرحال، نہ چاہتے ہوئے بھی میری شادی ہو گی۔ماموں نے مزید یہ کیا کہ شہر میں ایک مہنگی جگہ ایک پلاٹ لے کر میرے نام کر دیا اور رقم وغیرہ بھی دی۔وہ لوگ خاصے کھاتے پیتے گھرانے سے ہیں اس لئے ہم میاں بیوی جب بھی اُن سے ملنے جاتے، وہ ڈھیروں تحائف ہمارے حوالے کر دیتے اور میں مزید احساس کمتری کا شکار ہوتا رہا۔میری بیوی بہت اچھی خاتون ہے۔وہ مجھ سے محبت کرتی ہے لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ محبت نہیں کرتی بلکہ مجھ پر ترس کھاتی ہے۔میری ہر بات مانتی ہے۔وہ خود کہتی ہے کہ تمہارے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ساتھ زیادتی ہوئی ہے مگر اِس میں اِس کا کوئی قصور نہیں، وہ خود مجبور تھی کہ کچھ بول نہ سکتی تھی۔ خیر، ہماری شادی کو دس سال بیت گئے ہیں۔ میری ایک بیٹی ہے۔ میں بہت کوشش کررہا ہوں کہ اِس کے ساتھ ہمیشہ محبت سے پیش آؤں مگر ہمارے ازدواجی معاملات ہمیں دور کررہے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھے کبھی بھی اُس کی طرف رغبت نہیں ہوئی۔ میں بہت کوشش کرتا ہوں کہ ہمارا ازدواجی تعلق خوب رہے۔ میری بیوی نے کبھی بھی میری پیش قدمی پر انکار نہیں کیا مگر میں صاف محسوس کرلیتا ہوں کہ اُس کو اِس میں ذرا بھی دلچسپی نہیں ہے، صرف میری خاطر وہ خاموش رہتی ہے۔ اِس سے میری تسکین نہیں ہوتی۔ میری ساری خواہشات مرتی جارہی ہیں۔ کتنی ہی خوبصورت لڑکیاں مجھ سے شادی کی خواہاں تھیں لیکن یہ اتفاق ہی ہے کہ کچھ اور ہی ہوگیا۔ میں تنگ آچکا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ... کوئی ہم عمر لڑکی مجھ سے شادی کرلے۔ دونوں اطراف سے گرم جوشی ہو تو بیوی نعمت معلوم ہوتی ہے۔ جب ایک جوان آدمی کئی کئی دن اپنی بیوی کے پاس نہیں جائے گا تو صاف ظاہر ہے کہ وہ آوارہ ہوجائے گا۔ میں سچ کہتا ہوں کہ میرا وقت بھی اِس طرح گزر رہا ہے۔ دوسرے ذرائع سے تسکین حاصل کرنا میرا مشغلہ بنتا جارہا ہے۔ میری بیوی مجھے دوسری شادی کا کہتی رہتی ہے مگر کوئی لڑکی بھلا پہلی بیوی کے ہوتے ہوئے شادی کرے گی اور اس کو میں طلاق ہرگز نہیں دے سکتا۔ میرا سارا خط شائع کردیجئے گا کہ شاید کوئی قاری بھی اِس الجھن کا شکار ہو یا کوئی اِس کا حل نکال سکتا یا بتا سکتا ہو۔

حل: بے شک آپ کا کہنا صحیح ہے کیونکہ آپ نے بتایا کہ آپ 7 سال کے تھے جب کے والد صاحب وفات پا گئے تھے۔ آپ کے ماموں نے آپ کی امداد تب شروع کی جب آپ میٹرک کرچکے تھے۔ اِس سے پہلے آپ بہت چھوٹے تھے اور آپ نے اور آپ کی امی نے جو کچھ برداشت کیا ہوگا، اس کا ہمیں بھی اندازہ ہے۔ یہ تو طے ہے کہ جب آپ کے ماموں نے دیکھا کہ آپ شریف ہیں، سسرال میں کسی نند دیور کا بھی جھگڑا نہیں اور سب سے بڑی بات کہ اپنی طلاق یافتہ بیٹی بھی کہیں بسانا ان کے ذہن میں ہوگا اور اس کے لئے اُنہیں آپ سے بہتر، تابعدار اور نیک لڑکا کہیں نظر نہ آیا ہوگا۔ بہرحال، جو ہونا تھا وہ ہوچکا۔ یہ سب تو پہلے سوچنے کی باتیں تھیں، اب لکیر پیٹنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اب تو ہمیں بس پازیٹو سوچ کو اپنانا ہے تاکہ ایک گھر ٹوٹنے سے، تباہ ہونے سے بچ جائے۔ آپ اب ماضی کو بھول جائیں، اسے یاد رکھنے سے آپ اپنے آپ کو مثبت راہ پر نہیں چلا پائیں گے۔ اب آتے ہیں آپ کی وائف کی طرف۔ آپ نے بتایا کہ وہ بہت اچھی خاتون ہیں۔ آپ سے بہت محبت کرتی ہیں تو یقیناً آپ کی ہر خوشی، ہر ضرورت کا خیال بھی رکھتی ہوں گی اور آپ نے اس بات کا خود اعتراف بھی کیا ہے۔ یہاں تک کہ آپ کی وائف کو بھی اس بات کا اچھی طرح احساس ہے کہ آپ کے ساتھ بہرحال زیادتی ہوئی ہے۔ آپ اس بات کو بھی نظر انداز کرچکے ہیں کہ ان کی عمر آپ سے پندرہ سال زیادہ ہے۔ آپ کی یہ بات بھی ٹھیک ہے کہ وہ ایک عورت تھی، وہ اپنے منہ سے اپنے والدین کے سامنے اپنی شادی کو شاید نہیں ڈسکس کرسکتی تھی۔ ہر گھر کا اپنا اپنا ماحول ہوتا ہے۔ مشرقی لڑکیاں تو ویسے بھی اپنی شادی کو اپنے والدین سے ڈسکس نہیں کرتیں سو یہ سب بھی اب جانے دیں۔ آپ نے یہ بھی اعتراف کیا ہے کہ آپ اپنی وائف سے ہر طرح سے مطمئن ہیں، بس صرف آپ کو ازدواجی معاملات ہی اپنی وائف سے دور کررہے ہیں۔ میں پھر آپ سے کہوں گی کہ آپ پہلے پچھلی تمام باتیں اگنور کردیں کیونکہ اب ان کو یاد رکھنے یا یاد کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا کیونکہ بہرحال اب وہ آپ کی بچی

کی ماں بھی ہیں۔ باقی رہا ازدواجی تعلق کا معاملہ تو وہ تب ہی دور ہوگا جب آپ اپنے ذہن کو منفی خیالات کی آمجگاہ نہ بننے دیں گے۔ آپ نے ہمیں بتایا ہے کہ آپ کو ان کی طرف بھی رغبت ہی نہیں ہوتی تو اس کا صاف مطلب ہے کہ یقیناً ان کی عمر اور ان کے والد نے جو آپ کے ساتھ کیا، ان سب باتوں کو آپ نے دل سے، ذہن سے قبول نہیں کیا۔ آپ نے یہ بھی کہا کہ مخالف کی جانب سے اگر محبت و گرمجوشی نہ ہو تو دوسرا فریق بجھ جاتا ہے۔ تو کیا کبھی آپ نے سوچا کہ آپ بھی تو ازدواجی تعلق میں ان کی طرف رغبت محسوس نہیں کرتے۔ ہوسکتا ہے، وہ بھی یہی سوچتی ہوں کہ آپ بھی یہ تعلق قائم کرتے ہوئے گرمجوش نہیں ہوتے اور یقیناً آپ بھی ان سے شاید ان کے والد کا احسان اتارنے کے لئے یہ تعلق قائم کررہے ہیں۔ اگر ایسے موقع پر ان کے ذہن میں بھی یہ سوچ آتی ہے تو پھر وہ اکیلی قصوروار تو نہ ہوئیں، نا! کچھ تو آپ کی طرف سے بھی ان کا دل بجھ جاتا ہوگا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آپ دونوں کے درمیان یہ تعلق اب تک اتنا مضبوط، اتنا شدید نہ رہا ہو۔ وہ یہ سب محسوس کرتی ہوں گی، انہیں اپنی عمر کا بھی احساس ہوگا تبھی تو وہ آپ کو دوسری شادی کے لئے فورس کررہی ہیں ورنہ کوئی بھی عورت اپنی سوتن کو برداشت نہیں کرتی جبکہ وہ خود آپ کو شادی کے لئے کہہ رہی ہیں۔ سب سے پہلے تو آپ کو اپنی وائف کے ساتھ اپنا رویہ مثبت کرنا ہوگا۔ کسی ایک تو پہل کرنا ہوگی، نا! اگر آپ نے ہم سے مشورہ مانگا ہے تو یقیناً پہل بھی آپ کو کرنا ہوگی اور ویسے بھی انسان کو اپنے اطمینان، اپنے سکون کے لئے اگر اپنے آپ کو، اپنے رویئے کو تھوڑا بدلنا بھی پڑے تو اس میں یہ سوچ نہیں ہونی چاہئے کہ میں تو مرد ہوں، میں کیوں بدلوں، کیوں جھکوں، عورت ہی اپنے آپ کو چینج کرے۔ اگر آپ اپنے رویئے کو بدلیں گے تو یقیناً اس کا اثر آپ کی وائف پر بھی پڑے گا۔ آپ دیکھئے گا کہ وہ بھی آپ جیسی ہوجائیں گی۔ ہم آپ کے اس مسئلے کا حل اس صفحے پر نہیں بتاسکتے تھے سو میں نے آپ کو جوابی خط لکھ دیا ہے جو کہ جلد ہی آپ کو مل جائے گا۔ آپ ہماری ہدایات پر عمل کریں گے تو وہ صرف یہ کہ آپ کی وائف کی دلچسپی اس تعلق میں بڑھ جائے گی بلکہ آپ بھی پرسکون ہوجائیں گے اور یقیناً آپ کا گھرانہ پیار محبت کا مثالی نمونہ بن جائے گا--- آپ نے یہ بھی کہا کہ آپ اس وجہ سے بے راہ روی کا شکار ہورہے ہیں۔ آپ خود سوچیں کہ اس طرح سے آپ مکمل طور پر تباہ ہوجائیں گے۔ آپ اپنا دل عبادت میں لگائیں، خدا سے معافی مانگیں۔ اپنے ذہن کو ہر آلودگی سے پاک رکھیں۔ مانتی ہوں کہ شروع میں تھوڑی مشکل ہوگی لیکن اگر یہی کچھ آپ کو اپنی بیوی سے مرضی کے مطابق مل گیا تو پھر کوئی مشکل نہ ہوگی۔ آپ میرا خط پاتے ہی مجھے اطلاع دیجئے گا کہ آپ کو خط موصول ہوگیا ہے اور پھر دی ہوئی ہدایات پر عمل کرکے ضرور بتایئے گا کہ آپ کی زندگی میں بہتری آئی یا نہیں۔

○ ایک مجبور ماں

عزت مآب ڈاکٹر صاحبہ! خدا آپ کو خدمت خلق کرنے کا صلہ دے، آمین!--- میں آداب عرض کی بہت پرانی کاری ہوں۔ آپ کا کالم پڑھا تو دل بہت خوش ہوا۔ سوچا، میں بھی اپنا مسئلہ آپ کو لکھوں، شاید کوئی حل نکل آئے۔ ویسے تو میرے پاس کوئی حل نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ! میرے تین بیٹے ہیں۔ یہ منجھلا بیٹا ہے، دو شادی شدہ ہیں۔ عمر اس کی 35 سال ہے۔ یہ پیدائشی ابنارمل تو نہیں کہا جاسکتا لیکن نارمل بھی نہیں۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ یہ جب 20 سال کا ہو تو آپ سمجھیں کہ دس کا ہوگیا ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ! اب تو وہ جوان ہے۔ جب وہ واش روم جاتا ہے تو گھنٹوں گزر جاتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اسے کوئی غلط عادت پڑگئی ہے۔ اسے کچھ بھی نہیں کہہ سکتی۔ ڈاکٹر حکیموں سے علاج کرواچکی ہوں، ہڈیوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کا ڈھانچہ بن گیا ہے۔ اگر آپ کے پاس کوئی حل ہو تو بتائیں، ساری عمر دعائیں دونگی۔ اللہ آپ کو توفیق دے کہ انسانیت کی خدمت کرتی رہیں۔

حل: میں آپ کی پریشانی سمجھ گئی ہوں لیکن آپ نے یہ وضاحت نہیں کی کہ آیا آپ کا بیٹا کوئی کام وغیرہ بھی کرتا ہے یا نہیں۔ اگر اس وقت اس کی عمر 35 سال ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اس کی ذہنی عمر ڈاکٹر کے مطابق 18 سال تو ہوئی، نا! تو اب وہ مکمل جوان ہے۔ اب یہ اس کی عمر کا تقاضا بھی ہے۔ ڈاکٹر یا حکیموں سے علاج کروانے سے واقعی کچھ حاصل نہ ہوگا کیونکہ اسے کوئی بھی جسمانی بیماری لاحق نہیں بلکہ وہ ذہنی طور پر بیمار ہے۔ ذہنی طور پر اس کی عمر 18 سال ہے مگر اس سے اپنی زندگی کے 35 سال تو بہر حال گزار ہی لئے ہیں۔ عمر کے جس حصے میں وہ اس وقت ہے اس میں کسی ہمسفر، کسی رازدان کی ضرورت ضرور ہوتی ہے۔ وہ خود کو بہت اکیلا محسوس کرتا ہو گا۔ بے شک آپ ماں ہیں، آپ سے وہ اپنے دل کی بات نہیں کہہ سکتا اور نہ ہی کسی بہن سے۔ بھائی یقیناً شادی شدہ ہونگے اور آج کے مصروف دور میں کسے اتنی فرصت ہوتی ہے کہ وہ اپنا وقت کسی کو دے۔ یقیناً اس کے بھائیوں کی بھی ذمہ داریاں ہیں، پھر جاب پر جانا ہوتا ہو گا۔ وہ سارا دن گھر تو نہیں رہ سکتے سو آپ کا یہ بیٹا یقیناً شدید تنہائی کا شکار ہے۔ عام نارمل انسان کو بھی توجہ اور ساتھ کی ضرورت ہوتی ہے اور ایسے بچے کو تو بہت ہی زیادہ ہوتی ہے۔ آپ اس کے متعلق مجھے تفصیل سے خط لکھیئے۔ یہ بتایئے کہ اس کے والد حیات ہیں یا نہیں، یہ بچہ کوئی کام وغیرہ کرتا ہے یا نہیں۔ اس کے علاوہ اس بچے کی زندگی کے یہ 35 سال کیسے گزرے، کس کس مصروفیت میں گزرے۔ پھر ہی میں آپ کو اس کا کوئی حتمی حل بتا سکوں گی۔ میں آپ کے خط کی منتظر رہوں گی۔

O ف۔ پنجاب:

ڈاکٹر صاحبہ! میں تھرڈ ایئر کی طالبہ ہوں۔ میں اپنی پڑھائی کے سلسلے میں دور گاؤں سے آ کر یہاں ہوسٹل میں رہتی ہوں۔ میری ایک روم میٹ ہے جو کہ اسی سال آئی ہے۔ وہ بہت الٹی سیدھی حرکتیں کرتی ہے۔ کسی کو میری دوست نہیں بننے دیتی۔ کہتی ہے کہ تمہارے لئے میں ہی کافی ہوں، صرف ہم دونوں دوست رہیں گی۔ اگر تم نے کسی اور کو بھی اپنی سہیلی بنایا تو میں خودکشی کرلوں گی سو اس کی وجہ سے کسی اور سے دوستی بھی نہیں کر سکتی۔ وہ میرے تمام نوٹس بنا دیتی ہے، میرا اسائنمنٹ بھی ساری خود ہی تیار کر دیتی ہے۔ میرے کھانے پینے، غرض ہر چیز کا ایسے خیال رکھتی ہے کہ میں اندر ہی اندر خود شرمندہ ہو جاتی ہوں۔ اصل پریشانی کی وجہ یہ ہے کہ ایک دن ہم دونوں باہر شاپنگ کے لئے گئیں۔ ایک لڑکے نے موٹر سائیکل پر میرے پاس گزرتے ہوئے ایک خط میری طرف پھینک دیا۔ میری دوست نے اس کی یہ حرکت فوراً نوٹ کر لی اور چونکہ وہ بہت آہستہ سپیڈ کر کے میرے پاس سے گزر رہا تھا اس لئے میری دوست نے اس کی قمیض کو پکڑ کر اس زور سے کھینچا کہ وہ لڑکا موٹر سائیکل سمیت زمین پر گر گیا۔ پھر میری دوست نے جوتا اتار کر تابڑ توڑ اس پر حملہ کر دیا۔ اس لڑکے کا منہ جگہ جگہ سے زخمی ہو گیا۔ میں نے بیچ بچاؤ کرانے کی کوشش کی لیکن وہ تو جیسے پاگل ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھیں بالکل سرخ ہو چکی تھیں۔ پھر جیسے تیسے لوگوں نے مل کر اس کو چھڑایا۔ بہر حال، ہم واپس ہاسٹل آ گئیں۔ میں نے اس سے کہا کہ یہ تم نے کیا کیا، اتنی بڑی غلطی تو نہ کی تھی اس نے، تم نے اس کے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا۔ راہ چلتے تو لڑکے فقرے بھی کستے ہیں لیکن شریف لڑکیاں ان کو نظر انداز کر کے گزر جاتی ہیں۔ وہ تو ایک دم بھڑک اٹھی، بولی کہ میں جب کسی لڑکی کو تمہارے ساتھ انوالو نہیں دیکھ سکتی تو یہ تو پھر لڑکا تھا۔ اس کی اتنی جرات کیسے ہوئی کہ وہ تمہیں خط دے یا تم سے کوئی تعلق

قائم کرنا چاہے--- خیر، میں چپ ہو رہی اور بات آئی گئی ہو گئی۔ اسی رات جب میں سو رہی تھی تو مجھے ایسے محسوس ہوا کہ کسی کا ہاتھ میری قمیض کے اندر سرک رہا ہے۔ میرا ذہن مکمل بیدار ہوا تو پتہ چلا کہ وہ ہاتھ میری اسی دوست کا ہے۔ نہ جانے وہ کب میرے ساتھ آ کر لیٹ گئی۔ میں نے اس کا ہاتھ ہٹانا چاہا تو اس نے کہا جو کچھ ایک لڑکا تمہارے ساتھ کر سکتا ہے، وہ سب تو میں بھی تمہیں دے سکتی ہوں۔ میں بہت ڈر گئی۔ اس سے ایک دم مجھے دیوانوں کی طرح چومنا شروع کر دیا تو مجھ سے کچھ بولا نہ گیا مگر جب وہ حد سے زیادہ جنونی ہو گئی تو میں نے اسے کہا کہ تم میری بات تو سن لو۔ وہ رک گئی اور بولی کہ کہو، کیا کہنا ہے۔ کیا تمہیں یہ سب اچھا نہیں لگ رہا؟ ایک مرد سے اور کیا حاصل ہوتا ہے، جنسی تسکین، نا! تو وہ تو تمہیں میں بھی دے سکتی ہوں--- میں نے کہا کہ تم پلیز، یہ سب نہ کرو۔ میں تو اس لڑکے کو جانتی تک نہیں اور نہ ہی میری زندگی میں کوئی لڑکا ہے۔ اس سے کہا کہ پھر تم اس کی اتنی طرف داری کیوں کر رہی تھیں؟ میں نے اس سے کہا کہ ایسی بات نہیں۔ وہ زخمی ہو گیا تھا، صرف اس لئے لیکن وہ میری کوئی بات ماننے کو تیار نہ تھی۔ میں یقیناً اس کا اس روپ میں دیکھ کر گھبرا گئی تھی۔ پھر میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی تو میں نے اس سے کہا کہ دیکھو، سارا دن میں تمہارے ساتھ ہوتی ہوں اور رات کو بھی۔ میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ مجھے جب کسی لڑکے کی خواہش ہو گی، میں تمہیں ضرور بتاؤں گی۔ پھر تم جو چاہے، کرنا پر ابھی مجھے ایسی کوئی ضرورت نہیں۔ بہر حال، بہت دلائل دے کر میں نے آخر اسے قائل کر ہی لیا اور مجھ سے وعدہ لے کر اپنے بیڈ پر چلی گئی۔ میں بہت پریشان ہوں۔ اگر کالج کی پرنسپل کو بتاؤں گی تو بدنامی ہو گی۔ گھر بتاؤں گی تو والدین پڑھائی چھڑوا لیں گے۔ کیا کروں؟ خدارا، کچھ تو حل بتایئے؟

حل: یہ تو آپ جانتی ہی ہوں گی کہ انسان اپنے دوستوں سے پہچانا جاتا ہے۔ اگر آپ ایک ایسی لڑکی کے ساتھ دوستی رکھیں گی جس کا کردار غلط ہو گا تو آپ کی شہرت بھی اچھی نہ ہو گی۔ جس طرح وہ آپ کو کسی دوسری لڑکی سے دوستی نہیں کرنے دیتی تو یقیناً لڑکیاں آپ دونوں کے بارے کوئی اچھی رائے نہ رکھتی ہوں گی۔ وہ ضرور آپ کے بارے اسی انداز سے سوچیں گی کہ کچھ تو آپ دونوں کے درمیان ہے جو آپ یوں ایک دوسرے کے علاوہ کسی کو اپنے درمیان نہیں آنے دیتیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ شاید دوسرا انجان ہے لیکن دراصل سب کو سب نظر آ رہا ہوتا ہے بلکہ دوسرے جتنی گہری نظر ہم پر رکھتے ہیں، ہم خود بھی نہیں رکھتے۔ اب جو حالات آپ نے بتائے ہیں، ان حالات میں اگر والدین آپ کا کالج جانا بند کر دیں تو اسے غلط نہیں کہا جائے گا لیکن آپ کو چاہئے کہ آپ ان حالات سے فوراً اپنے والدین اور اپنے کالج کی پرنسپل کو آگاہ کیجئے۔ ایسی جنونی اور دماغی مریض لڑکی آپ کے لئے کبھی بھی خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ میں یہ نہیں کہتی کہ آپ بھی غلط ہیں مگر وہ کہتے ہیں نا! کہ اگر پتھر پر بھی پانی پڑتا رہے تو ایک دن پگھل جاتا ہے اور انسان پر کب شیطان سوار ہو جائے، اس کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ آپ مسلسل اس لڑکی کے ساتھ ایک کمرے میں رہتی ہیں۔ کبھی بھی آپ اس کی باتوں میں آ گئیں یا شیطان نے آپ کے ذہن کو بھٹکا دیا تو پھر اس کا کوئی ازالہ نہ ہو گا۔ آپ کا مستقبل تباہ ہو جائے گا اور شاید آپ پھر اس کی عادی بھی ہو جائیں کیونکہ گناہ میں بہر حال بہت کشش ہوتی ہے۔ اگر آپ نے خط میں مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیا تو فوراً اپنے والدین یا کم از کم اپنی پرنسپل کو اس سے آگاہ کریں تاکہ وہ اس لڑکی کو فوراً کالج سے نکال دیں۔ یوں آپ پرسکون رہ کر اپنی پڑھائی بھی جاری رکھ سکیں گی اور آئندہ کسی بھی انہونی سے محفوظ رہیں گی کیونکہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ لڑکی شدید ذہنی بیمار ہے۔ اس طرح اس کے والدین کو بھی اپنی بچی کے بارے میں علم ہو جائے گا اور وہ اس کا کوئی علاج کروا کر اس کو بھی نارمل کر سکیں گے ورنہ دوسری صورت میں آئندہ آپ بھی نہ صرف یہ کہ بدنام ہوں گی بلکہ ہوسکتا ہے کہ کسی دوسرے کو اس بارے کسی طرح پتہ چل جائے تو پھر دونوں کی خیر نہیں ہوگی۔ آپ کو فیصلہ خود کرنا ہے۔ بہتر ہے کہ ہمت کیجئے کہ سچ کو کوئی ڈر خوف نہیں ہوتا۔

○ ایم۔ راولپنڈی:

آج سے 16 سال قبل والدین کی مرضی سے میری شادی ہوئی۔ بیوی تعلیم یافتہ نہ تھی۔ چار بیٹے ہیں جو ابھی پڑھ رہے ہیں۔ بڑا تیرہ سال کا اور چھوٹا تین سال کا ہے۔ ایک دس سال کا، دوسرا سات سال کا ہے۔ میں سرکاری ملازمت کے ساتھ ایک پرائیویٹ ادارے میں جزوقتی کام کرتا ہوں۔ چھ سال قبل یہاں ایک لڑکی ملازم ہوگئی جس کی عمر بیس سال تھی۔ آہستہ آہستہ اس کے اور میرے درمیان محبت کا سلسلہ ہوا اور ہم نے نکاح کرلیا۔ لڑکی کی خواہش پر اس نکاح کو خفیہ رکھا ہوا ہے۔ اس وقت یہ لڑکی ایف اے میں تھی۔ میں نے اسے بی اے کروایا اور اب اعلیٰ تعلیم دلوا رہا ہوں۔ اسی دوران میرا پہلی بیوی سے جھگڑا شروع ہوگیا جس کا قصوروار میں خود ہوں۔ نوبت طلاق تک پہنچ گئی۔ اس بات کو دو سال ہو گئے۔ اب دوسری بیوی کی بڑی بڑی فرمائشیں ہیں، بچوں کی طرف سے لاپروائی اور لاتعلقی ہے۔ مجھے ان کے خراجات کا پتہ بھی نہیں۔ میری بہن آتی ہے جو گھر پر ان کے لئے کھانا بناتی ہے، ان کے کام کرتی ہے۔ ان کی ماں بھی ان سے چھپ چھپ کر ملتی ہے۔ مجھے اس وقت بے حد دکھ ہوا جب میری بیوی نے مجھ سے باتوں باتوں میں کہہ دیا کہ والدین کی پسند پر ہونے والی شادی اچھی ہوتی ہے۔ میں دو دن بہت رویا کہ اس کی خاطر اپنا ہنستا بستا گھر اپنے ہاتھوں برباد کیا۔ اب لگتا ہے کہ یہ میرے ساتھ وفا نہ کرے گی۔ عجیب عجیب وسوسے ذہن میں آتے ہیں۔ پھر میں وہی کرتا ہوں جو یہ کہتی ہے۔ اپنے بچوں کی کتابوں، کاپیوں، یونیفارم کا پتہ نہیں ہوتا۔ اب میں کیا کروں، کون سا رخ اختیار کروں؟

حل: کاش یہ احساس آپ کو شادی کرنے سے پہلے ہوگیا ہوتا تو حالات آج یوں نہ ہوتے۔ میاں اور بیوی کے تعلقات کچھ اس نوعیت کے ہوتے ہیں کہ ایک کو دکھ دے کر دوسرا خوشی حاصل نہیں کرسکتا اور کوئی ایسا کرنے کی کوشش کرے کہ وہ صرف اپنی خوشی کو مدنظر رکھے تو یہ خوشی عارضی ہوتی ہے۔ دیر سے ہی صحیح، آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہے لیکن اب وقت لوٹ کر نہیں آ سکتا، اسی لئے تو اسلام میں ہر کام سوچ سمجھ کر کرنے کا کہا گیا ہے۔
اب ان حالات میں یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ اب آپ پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ سب سے پہلے بچوں کی وہ تمام ذمہ داریاں پوری کرنی چاہئیں جو ان کی اچھی خوراک، آرام، بہتر لباس اور اچھی تعلیم سے متعلق ہیں۔ ان کو وقت دیں تاکہ بہتر تربیت ہو سکے ورنہ وہ شدید احساسِ کمتری کا شکار ہو جائیں گے۔ بیوی کی صرف وہ ضرورت پوری کریں جو آپ پر فرض ہے۔ اس کی ناراضی کے ڈر سے غیر ضروری اخراجات جو کر رہے ہیں، انہیں روکیں۔ وہ اگر آپ سے شادی پر دکھ کا اظہار کرے تو آپ کو بھی غلطیوں اور پہلی بیوی کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا ذکر کردینا چاہیے لیکن یہ بھی احساس دلادیں کہ اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں لہٰذا بہتر ہے کہ افہام و تفہیم، دیانتداری اور ایک دوسرے کے ساتھ خلوص رکھتے ہوئے بچوں کے بہتر مستقبل کے لئے مل کر جدوجہد کی جائے۔ بچوں کو اجازت دیں کہ وہ اپنی ماں سے آزادانہ مل سکیں کیونکہ یہ ان کا حق بھی ہے۔

☆☆

کچھ تو کہیے

مرتب: م قادر یوسفی

''کچھ تو کہیئے'' کے سفر کے ساتھیو! خلوص و احترام ---اس ماہ کا موضوع ''ساون'' تھا اور ساون ایسا برسا کہ جل تھل سے بھی بات بہت آگے نکل گئی۔ صوبہ سندھ میں تو ساون نے آفت بن کر لوگوں کی جانیں لیں، کچھ کو گھر سے بے گھر کیا۔ مال و اسباب ضائع ہوئے۔ کھیت کھلیان نذر آب ہو گئے۔ ساون کے ہاتھوں ایسی تباہی نہ دیکھی تھی اور نہ قبل ازیں سنی تھی۔ ساون کے ہاتھوں انسان، حیوان، چرند، پرند، نباتات، حیوانات تباہی و بربادی سے دوچار ہو گئے۔ صرف آسمان ہی نہیں رویا، لاکھوں آنکھیں روئیں۔ عذاب، عذاب ہوتا ہے۔ یہ پانی کا عذاب جسے آگ بھی نہیں بجھا سکتی۔ آؤ، ساتھیو! ساون کی دلفریبوں کی بجائے ساون کی چیرہ دستیوں سے اُلجھتے ہوئے ایک دوسرے سے ملیں--- لیجیے، ایک دوست جناب اشعر جواد، کراچی 03452591636 سے جناب محسن نقوی کا قطعہ ارسال کیا۔ ذرا دیکھئے---

وہ بیتے دنوں کا ساون
نہ جانے کب کا برس گیا ہو گا
مگر اندر کی آگ سے محسن
اس کا چہرہ جھلس گیا ہو گا

✿ اشعر بھائی! ساون نے صرف اپنا چہرہ ہی نہیں جھلسایا بلکہ پورے وجیب کو غرق کردیا۔ میرا شعر دیکھئے---

وہ بارش برسی ، پھر مینہ آیا
دل میں ڈر ہے گھر گرنے کا!

☆ جناب عصمت خالد (آداب عرض) لاہور ایک پیارے سے شعر کے ساتھ تشریف لائی ہیں---

کبھی ٹوٹ کر نہ برسا میری آرزو کا ساون
کہ جب آئے گھر کے بادل تو اُڑا دیے ہوا نے

✿ بہن! اب تو لوگ ساون کے نہ برسنے کی دعائیں مانگ رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں---

اب تو ایسا یہ ٹوٹ کر برسا
جیسے ساون عذاب ہو ، یارو

☆ نعیم رضا بھٹی، منڈی بہاؤالدین سیل نمبر 0333-8248038 فرماتے ہیں---''ساون کا موسم انسان کو محبت کرنا سکھاتا ہے اور محبت میں سب ہرے کا درس ہے خالی دھرتی کے خشک میدانوں کو سیراب کرنے کا ظرف بادل میں ہے جو دھرتی کے پیٹ سے پتہ پتہ، بوٹا بوٹا، اور حسین خوبصورت پھول نکال کر بنجر دھرتی کو خوشنما بناتا ہے بلکہ مہکا دیتا ہے۔ ساون رت کسی کی آمد کی آہٹوں کو دھڑکنوں کی سماعت میں محفوظ کرلیتی ہے۔ بعض اوقات دل ساون رت میں بھی جلتا ہے۔''

✿ خوب، نعیم بھائی! آپ کی خوبصورت تحریر نے میری اداس محفل کو بڑی حد تک گرما دیا۔ ایسی خوبصورت تحریروں کے ساتھ آتے رہا کیجئے---اور آپ کی تحریر کا جواب تو آپ ہی کے الفاظ میں حاضر ہے---دل ساون رت میں بھی جلتا رہے تو آنکھیں ساون بن جاتی ہیں--- اور یہ ساون پھر دل کا موسم بن جاتا ہے آنکھوں سے گرنے والا ہر قطرہ ''سونامی'' بن جاتا ہے۔

☆ ہما شاہ ہارون آباد سے فرماتی ہیں---''ساون بادلوں کے ساتھ برستا ہے، میں کسی یاد میں برستی بوندوں کو برستے اشکوں میں مدغم کرکے زمیں و آسمان کے غموں کے ساتھ دل کا دکھ بھی بہاتی رہتی ہوں اور یہ برستی آنکھیں کسی کے انتظار میں چھاجوں برستی ہیں اور اور سیلاب کو دیکھ کر روتا بادل چپ ہو جاتا ہے۔''

✿ ہما شاہ! آپ کی اس پیاری، پُرمغز اور معنی خیز تحریر کو دیکھ کر ہمیں کچھ کہنے کی ہمت نہیں---ایک شعر پیش ہے، ذرا ملاحظہ فرمائیے---

نمی آنکھوں کی ان کی کہہ رہی ہے
کوئی دریا ہے طغیانی پہ شاید

☆ سید ندیم احمد شاہ لیہ سیل نمبر 0333-6205536 نے خوبصورت تحریر عطا کی ہے، ملاحظہ فرمائیں---

ساون رت میں آگ سی برسے
پھول بنے انگارے
وا اور رے بھاگ ہمارے

✿ خوب شاہ جی! خوب---آگ نہیں اب اگر پانی بھی برس رہا ہے تو عذاب بن گیا ہے۔ واقعی لگتا ہے، ہم سب کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"بھاگ" سو گئے ہیں۔

☆ جنابہ عظمیٰ شکور، سرگودھا سے فرماتی ہیں---"ساون میری پسند کا موسم ہے، ساون سے رنگ برستے ہیں۔ بارش میں بھیگ جانے کو جی چاہتا ہے اور اس حسین موسم میں دوستوں سے ملاقات ہو جائے تو بس مزہ ہی آجائے۔ بارش کے قطروں کو مٹھی میں بند کر لینے کو جی چاہتا ہے۔"

✿ عظمیٰ بہن! بہت ہی پیاری خواہشات ہیں آپ کی---بارشیں تو دھڑا دھڑ ہو رہی ہیں، اپنی آرزوئیں پوری کرلو، بہن!

☆ رانا محمد یامین، لیہ سیل نمبر 0303-8762825 سے ایک شعر لے کر آئے ہیں---

چار جانب عذاب پھیلا ہے
ساون کو نظر سی لگ گئی ہے

✿ رانا صاحب! آپ ہمیشہ پیاری باتیں کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے ذوق کو مزید نکھارے۔ ہمارا ساتھ دیتے رہو۔

☆ جناب غلام عباس عابد، چوک اعظم سیل نمبر 0301-7856143 سے تشریف لائے ہیں۔ آپ نے ایک شعر عطا کیا۔ دیکھئے---

تم بھی لوٹ آ جاؤ
دیکھو، ساون لوٹ آیا ہے

✿ بہت پیارا شعر آپ نے عطا کیا، عابد بھائی! لیکن یہ دیکھیں کہ ساون تو لوٹ آیا لیکن ایسے آیا کہ کچھ لیکر نہیں آیا بلکہ سب کچھ چھین کر جا رہا ہے۔ اُف میرے خدا!

☆ مجید احمد جائی! ملتان سے فرماتے ہیں---

پھر آنکھ سے اک ساون برسا
کوئی رویا ساری رات بہت

✿ مجید بھائی! اشعار کی ترتیب بدلنے کے لئے معذرت---لیجئے، یہ لائنیں بھی ملاحظہ فرمائیں---

کل رات ہوئی برسات بہت
کوئی رویا ساری رات بہت
گو ساتھ زمانے کے غم تھا
کوئی تنہا تھا اس رات بہت

☆ سید اشرف صاحب، لاہور سے ایک شعر کے ساتھ شامل ہوئے ہیں۔ سیل نمبر 0312-4380880 ہے---

آنکھ بن جاتی ہے ساون کی گھٹا شام کے بعد
لوٹ جاتا ہے اگر کوئی خفا شام کے بعد

✿ اشرف بھائی! تشریف آوری کا شکریہ، محفل میں شریک ہوتے رہا کریں---لیجئے، یہ شعر ملاحظہ ہو---

کہتے ہیں کہ پربت سے نکل کے چشمے
اپنی کھوئی ہوئی منزل کی طرف بہتے ہیں
اور سر شام ہوا ان کے لئے چلتی ہے
جن کے محبوب بہت دور کہیں رہتے ہیں

☆ افشاں راز! قتال پور سے سفر کے ساتھ تشریف فرما ہیں، ذرا ملاحظہ ہو---

وہ مست ہوائیں ساون کی
وہ دور سہانا بچپن کا
اب یاد ہے کس کو بھوتوں کی
پریوں کی کہانی بھول گئے

✿ شمولیت کا شکریہ---لیجئے یہ سطور ملاحظہ ہوں---

وہ ننھے سے بچے، وہ شامیں سہانی
وہ کاغذ کی کشتی و بارش کا پانی
وہ آپی وہ نانی، وہ پیاری کہانی
کوئی ہم کو لا دے وہ پیارا سا بچپن

☆ تہمینہ ملک، بھکر سے ایک شعر کے ساتھ شامل محفل ہوئیں---

ہائے رے ساون تیری قسمت!
تیرے رونے پہ لوگوں کو خوشی ہوتی ہے

✿ ہر ماہ اپنی شرکت کو یقینی بنائیے---ہم آپ کی شمولیت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے یہ شعر پیش کر رہے ہیں---

ان کی یادوں نے گھیر رکھا ہے
ہم بھی ساون کے ساتھ روئے ہیں

☆ جناب سلطان ساجد، جڑانوالہ سے فرماتے ہیں---

ساون نے بھی کسی سے پیار کیا تھا
اس کو بادل کا نام دیا تھا
روتے تھے دونوں جدائی میں
لوگوں نے اُسے بارش سمجھا تھا

✿ ساجد بھائی! خوش آمدید!---

ساون کی اپنی کہانی ہے
قدرت کی ایک نشانی ہے
اسے رونا کہو یا بارش کہو
یہ آپ کی اپنی سوچیں ہیں!

☆ جناب احمد فہیم قتالپوری، سیل نمبر 03438110276 فرماتے ہیں---

تم پوچھو اور ہم نہ بتائیں، ایسے تو حالات نہیں
ایک ذرا سا دل ٹوٹا ہے اور تو کوئی بات نہیں
کس کو خبر تھی سانولے بادل بن برسے اُڑ جائیں گے
ساون آیا لیکن اپنی قسمت میں برسات نہیں

✿ فہیم میاں! اس قدر حیرت ناک حد تک مایوسی، اُف میرے خدا! کچھ ایسے لوگ بھی زندہ ہیں جہاں میں---آپ کی مزاج پرسی کے لئے ایک اپنا قطعہ، پسند آئے تو بتایئے گا---

وہ ہیں مغرور اس خدائی پہ
اس لئے اس قدر ستاتے ہیں
ہم فقیروں کے آستانے پر
لوگ اکثر جبیں جھکاتے ہیں

☆ جناب عاشق حسین ساجد! ہیڈ بلوکی سیل نمبر 0308-6783157 فرماتے ہیں---

ساون کی برسات کی بوندیں
کچے گھر بہا جاتی ہیں
کچے گھروں کو کھا جاتی ہیں
کچے گھروں کا کیا بھروسہ
کچے لوگوں کی کچی باتیں

✿ ساجد بھائی! آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ "آپ کے نام" اپنے مراسلے میں گو یاد نہیں کرتے تاہم یہ بھی نوازش ہے کہ آپ میری محفل کو چمکانے آجاتے ہیں۔ اس خوشی میں آپ کو اپنا شعر سناتا ہوں---

اس طرح میری تمنا بھی کرے گا کوئی
ہم نے سوچا بھی نہ تھا کوئی ہمیں چاہتا ہو گا

دعاؤں میں یاد کیجئے، ساجد بھائی!

☆ ریاض تبسم چوہان! فیصل آباد سیل نمبر 0343-7677313 سے اپنے اشعار کے ساتھ بزم کی رونق بڑھانے کے لئے آئے ہیں---

مجھے بھی دام کھرے مل سکیں گے پھر فن کے
جلے جو شہر تو لکھوں میں گیت ساون کے
تیرے فلیٹ کی آرائشیں بھی خوب سہی
نہیں ہے گھر کا تصور بغیر آنگن کے!
اب اپنے ماضی کی پرچھائیوں سے ڈرتے ہیں
ہم ایک جان تھے، ساتھی تھے دل کی دھڑکن کے
اداس یوں ہے عروس البلاد کا چہرہ
اجڑ گئے ہیں حسیں خواب جیسے دلہن کے

✿ خوب تبسم بھائی! آپ واقعی کمال کے آدمی ہیں۔ آپ نے تو ہمارے قلم کو بھی گونگا کر دیا۔ کوشش کرتا ہوں کہ کوئی اپنا تازہ شعر ذہن میں آجائے تو نذر کر دوں---ہاں، لیجئے---

وہ بکھر رہا ہے دامادہ اور بیچارا
اجاڑ کے مجھے کوئی بہت اداس ہوا

شعر پسند آئے تو بتایئے گا، تبسم بھائی!

☆ جناب دستگیر شہزاد، ٹوبہ ٹیک سنگھ سیل نمبر 0300-9667909 سے فرماتے ہیں---

لاکھ بہانے بنائے، یہ ساون رت ہے
بادل تو برسا کرتے ہیں
اِن آنکھوں میں قوس وقزح جو ناچ رہی ہے
اس سے یہ میں جان گیا ہوں
کن کلیوں سے رنگ لئے ہیں تو نے
تیرے دل میں کتنے پھولوں کے گھر اُگ آئے ہیں
جن میں تو نے خوشبوؤں کے دیئے جلائے
میرے لئے، بس میرے لئے!

✿ دستگیر بھائی! آپ کی نظم کی یہ دو لائنیں جواباً پیش کر رہا ہوں---

اب تو مجھ کو سمندر کی تہہ سے بھی ڈھونڈنے بھیجے گی
تو میں وہ بھی لا دوں گا
تو مجھ کو اک تنہا چوٹی پر گاڑ آئے گی
میری آنکھ سے تیرے دکھ کا ساون نہیں برسے گا

اور ہاں، دستگیر بھائی! آپ کہتے ہیں کہ میسج کے اختتام پر میرا تبصرہ آپ کو اچھا لگتا ہے۔ لیجئے یہ شعر ملاحظہ فرمائیں۔ میری اپنی کاوش ہے پسند آئے تو ضرور بتایئے گا---

تو تنہا لڑ رہا ہے زندگی کے تلخ لمحوں سے
زمین و آسماں دونوں تیرے مدمقابل ہیں

☆ جنابہ شاہدہ صاعقی، ہارون آباد سے تشریف لائی ہیں---

ساون ایک اشارہ ہے
ماں دھرتی کو بہلانے کا
دکھ کے بادل چھٹ بھی جائیں
ساون چاہے روٹھ بھی جائے
اشک فشانی کب رکتی ہے

✿ شاہدہ بہن! آپ کے بے نظیر کلام کے سامنے کچھ کہنا محفل کو بے مزہ کرنے کے مترادف ہے اس لئے آپ ہی کی باقی ماندہ لائنیں جواباً نذر قارئین کر رہا ہوں---

موسم دل کے اندر ہے
آنکھوں میں خاموشی ہو تو
دل تو شور مچاتا ہے
بن بادل بھی روتا ہے
پاگل سا ہو جاتا ہے

بہن! ہر ماہ شامل ہوا کیجئے، شکریہ!

قارئین آپ سب نے ساون، بھادوں کا بچھڑنا دیکھ لیا۔ لاکھوں لوگ عذاب میں مبتلا ہوئے۔ اللہ پاک اپنی مخلوق کو اس عذاب سے بچائے۔

اگلے ماہ کا عنوان "شبنم"

شبنم

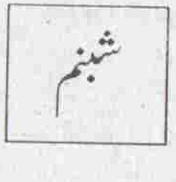

موبائل نمبر: 0333-6202153 پر اپنا ایس ایم ایس کیجئے۔

☆☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طب یونانی' طب روحانی' طب بنوی سے علاج

حکیم شیخ محمد امین
0333-5203553
www.devapk.com

قارئین کے بے شمار خطوط اس وقت میرے سامنے موجود ہیں اللہ تعالیٰ کے آگے میں سر بہ سجود ہوں جس کے فضل و کرم سے خواتین و حضرات کو شفا مل رہی ہے اور ان شاء اللہ شفا کا یہ عمل جاری رہے گا۔ میرے اساتذہ کرام میں حکیم عبدالغنی امرتسری اور حاذق طبیب حکیم حاجی شیخ عبدالقیوم ہیں جن کی رہنمائی اور فیض سے میں نے بہت کچھ حاصل کیا ہے اور یہی تعلیم میں صدقہ جاریہ سمجھ کر پھیلا رہا ہوں۔ یاد رہے کہ اگر کسی مریض کو اس کے مرض کے بارے میں کوئی نسخہ تجویز کیا گیا ہے تو ان علامات کا دوسرا مریض بھی مذکورہ دوا استعمال کر سکتا ہے کیونکہ یونانی ادویات سے کوئی ضمنی بُرے اثرات نہیں ہوتے۔ اس شمارے میں جن مریضوں کے خط شامل اشاعت نہیں ہو سکے ان کا براہ راست جوابات دے دیا گیا ہے۔ حکیم صاحب سے اِن کے راولپنڈی کے مطب فون نمبر 0333-5203553 پر مشورہ کر سکتے ہیں www.devapk.com پر بھی وزٹ کر سکتے ہیں۔

قد بڑا کرنے کا راز

س: ان تمام بچوں نے درازی قد کے لئے نسخہ تحریر کرنے کا لکھا ہے ان میں سے بیشتر لوگوں نے ٹی وی پر قد بڑھانے کے اشتہارات کے بارے میں کہا ہے کہ انہوں نے ہزاروں روپے یہ اشتہارات دیکھ کر خرچ کئے مگر فائدہ نہ ہوا۔ یہ صاحبہ لکھتی ہیں کہ انہیں اچھا سبق ملا ہے کہ ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی۔

(عامر' لاہور۔ آمنہ' میرپور۔ صدیق' گوجرانوالہ)

ج: آپ لوگوں کو بھی عقل سے کام لینا چاہئے کہ آپ نہیں سمجھتے کہ جو لڑکیاں ان اشتہارات میں جلوہ گر ہیں وہ خود ہی ٹھگنی ہیں۔ آپ سب خواتین و حضرات اپنے یا اپنے بچوں کے قد میں اضافے کے لئے آئیڈیل ہائیٹ استعمال کریں اور لٹکنے کی ورزش کریں' کھانے میں سبزیاں زیادہ استعمال کریں۔ تازہ پھلوں کا رس استعمال کریں۔ ان شاء اللہ قد میں اضافہ ہوگا۔

موٹاپے کا سدباب

س: عبدالستار' کوٹ ادو۔ محمد طارق' جہلم۔ محمد یعقوب' سکھر۔ اصغر' کوئٹہ۔ عبدالرحمٰن' نوشہرہ۔ فاطمہ' ساہیوال۔ ہما اور مہرین' کراچی۔ سائمہ ارم' نگینہ ناز' گوجرانوالہ۔ سلمہ' شاہ بی بی' چکوال۔ بیگم ذوالفقار' ملتان نے موٹاپا کم کرنے کے بارے میں پوچھا ہے کہ کوئی اچھا مشورہ دیں اور پرہیز بھی بتائیں۔

ج: تمام قارئین کو موٹاپا کے سدباب کے لئے دُنیا بھر میں مانی ہوئی ادویات ہائی سلم گولیاں اور عرق اجوائن تجویز کی جاتی ہیں۔ 3 ماہ مسلسل استعمال کریں' واضح رہے کہ روزمرہ کے معمولات میں بے قاعدگی مثلاً مستقل بیٹھے رہنا غذا میں بے اعتدالی' عموماً وزن بڑھنے کا سبب ہیں یہ بات بھی ذہن نشین کر لیں کہ موٹاپا کئی اور امراض کی بھی نشاندہی کرتا ہے اس کے لئے موٹاپا کم کرنا انتہائی ضروری ہے کھانے پینے میں اعتدال لا کر ہلکی پھلکی ورزش کرنے کے ساتھ چاول' بڑا گوشت زیادہ

میٹھا' کولڈ ڈرنکس کا استعمال کم کر دیں اور کھانا کھانے کے فوراً بعد سونا ترک کر دیں۔ سلاد اور اُبلی سبزیوں کا استعمال کریں یہ بات بھی یاد رکھیں کہ زائد وزن اور موٹاپا صحت مند جسم کی نشاندہی نہیں کرتا ایسی خواتین جن کا پیٹ زچگی کے بعد بڑھ کر لٹک گیا ہے یا کمر اور کولہوں پر زیادہ گوشت ہے جس کی وجہ سے جسم انتہائی بے ڈول ہو گیا ہے ایسی خواتین ہائی سلم گولیاں' عرق و سموں کے ساتھ استعمال کرنی چاہئیں ہائی سلم گولیاں زائد چربی کو تحلیل کرتی ہیں ہائی سلم گولیاں شروع کرنے سے قبل اپنا وزن ضرور چیک کر لیں اور ہفتے کے بعد وزن باقاعدگی سے چیک کر کے چارٹ بنالیں۔

نسوانی حُسن

50 سے زائد لڑکیوں اور خواتین نے نسوانی حسن میں کمی کے لئے نسخہ تجویز کرنے کو کہا ہے تمام بچیاں بیوٹواپ لوشن اور WC کیپسول کے ساتھ دیوایونانی کیپسول مسلسل 80 دن تک استعمال کریں۔ جن بچیوں کو باقاعدہ نشوونما نہیں ہو سکی یا خواتین کے بچوں کی پیدائش کے بعد اگر سینہ ڈھلک گیا ہو تو وہ بریسٹ ڈویلپنگ آلہ ضرور استعمال کریں۔ یہ آلہ آسان ترین بریسٹ تھراپی ہے۔ آلے کا استعمال انتہائی آسان ہے۔ 15 منٹ صبح اور 15 منٹ رات کو استعمال کرنے سے نہ صرف 2 سے 4 فیصد تک اضافہ ہوتا ہے بلکہ مرجھائے ہوئے بریسٹ بھی اصل حالت میں آ جاتے ہیں۔ یہ آلہ بذریعہ ڈاک اور کوریئر کے ذریعے گھر تک بھی پہنچایا جاتا ہے لٹریچر مفت منگوانے کے لئے جوابی لفافہ لازمی روانہ کریں۔

نوٹ: کچھ خطوط ایسے ہوتے ہیں جو قابل اشاعت نہیں ہوتے اِن لوگوں کو ان کے پتہ پر جواب براہ راست دے دیا جاتا ہے ہم خطوط کا ریکارڈ صرف 60 دن تک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ر کھتے ہیں اس کے بعد یہ خطوط تلف کر دیے جاتے ہیں۔ بیرون ممالک میں مقیم خواتین و حضرات ہماری ویب سائٹ www.devapk.com جو اُردو زبان میں ہے وزٹ کریں۔ ان کو اپنے بہت سے سوالوں کے جواب مل جائیں گے۔

امراض خاص

ثمینہ ناز' بھکر۔ راحت نسیم' واہ کینٹ۔ ظل ہما' مردان۔ درخشندہ' ایبٹ آباد۔ فاطمہ بیگم' کاموکی۔ مسز ایچ ارشاد' دوبئی۔ ان تمام نے جو علامات تحریر کی ہیں وہ خواتین کے پوشیدہ امراض کی نشاندہی کرتی ہیں اور کچھ خواتین نے اپنے شوہروں کے بارے میں بھی لکھا ہے کہ اُن کو بھی علاج کی ضرورت ہے۔ خواتین اکسیر نسواں (اجمل دواخانہ) سپاری پاک (ہمدرد) اور WC کیپسول استعمال کریں اور مزید مشورہ کے لئے 0333-520355 پر بات کریں۔ ایام کی خرابی والی خواتین مستورین (ہمدرد) سپارک پاک (ہمدرد) روبلیوسی کیپسول مسلسل 2 ماہ استعمال کریں۔

بے اولادی

نی' لاہور۔ مدیحہ' راولپنڈی۔ ریشم گل' کوہاٹ۔ حنا' لاہور۔ فرزانہ' چک جھمرہ۔ بیگم الطاف' سرگودھا۔ آپ تمام نے اپنے خطوط میں بڑے دُکھ اور محرومی کا اظہار کیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ آپ بہت زیادہ اذیت میں زندگی بسر کر رہی ہیں اولاد واقعی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے اور ہمارا معاشرہ بے اولاد مرد یا عورت کے ساتھ جو سلوک کرتا ہے آپ سب نے اپنے خطوط میں اس کا تجزیہ خود ہی پیش کر دیا ہے۔ بہرحال آپ کی رپورٹس دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ خواتین کا مسئلہ زیادہ پیچیدہ نہیں جبکہ اصل پرابلم مردوں میں ہے۔ خواتین کو علیحدہ علیحدہ خطوط میں نسخہ لکھ کر روانہ کر دیا گیا ہے اور مردوں کے لئیے مندرجہ ذیل ادویات تجویز کی جاتی ہیں یہ ادویات مسلسل 3 سے 4 ماہ تک استعمال کریں ان شاء اللہ اولاد جیسی نعمت سے محروم نہیں رہیں گے۔ یونیک گولیاں اور پراگ گولیاں یہ ادویات نہ صرف سپرم یا جرثوموں میں اضافہ کرتی ہیں بلکہ مردوں کے خاص مرض LSP کو بھی دور کرتی ہیں۔

گرتے بالوں کا سدباب

کچھ خواتین و حضرات نے گرتے بالوں کو روکنے کا نسخہ مانگا ہے آپ تمام لوگ گرتے بالوں کے لئے ہی نہیں بلکہ خشکی اور سکری کے خاتمہ کے لئے روغن آس اور پاکستان کا پہلا ہربل شیمپو G - H استعمال کریں اور خوراک میں تازہ اور سبز پتوں والی سبزیوں کا استعمال زیادہ کریں تیز مرچ مصالحے چکنائی اور مصنوعی اجزاء والے شیمپو کا استعمال چھوڑ دیں۔

ہیپاٹائٹس کا علاج

س: محمد صمد خان' بنوں۔ نوازش علی' میانوالی۔ نوروز گل' وزیرستان۔ آپ لوگوں نے ہیپاٹائٹس بی اور شوگر کی بیماری کا ذکر کیا ہے۔ صفدر خان' بنوں کے دوست خان زادہ نے مجھ سے علاج کروایا تھا۔ ہیپاٹائٹس کے ساتھ ساتھ ان کی شوگر بھی اب نارمل ہو گئی ہے اُن کے کہنے پر اُنہوں نے مجھے خط لکھا ہے۔

ج: تمام احباب کو میرا مشورہ ہے کہ آپ اپنی ہیپاٹائٹس کی رپورٹس بذاتِ خود مطب پر آ کر چیک کروائیں یا بذریعہ ڈاک مجھے ارسال کر دیں۔ ہیپاٹائٹس کے مکمل خاتمہ کے لئے مَیں ایک کمبینیشن اپنے مریضوں کو استعمال کرواتا ہوں جو بفضل تعالیٰ مکمل طور پر صحت مند ہو جاتے ہیں اور ہیپاٹائٹس کا وائرس زندگی بھر کے لئے Negative ہو جاتا ہے۔ یاد رہے کہ یہ مسلسل 6 ماہ تک استعمال کرنی ہوتی ہے۔

☆☆

سوچ نگر آپ کے احساس کو زباں دینے والا ایک عنوان

زندگی کے نشیب و فراز بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں لیکن احساس پر گزرنے والے ان المیوں کو اظہار کا وسیلہ نہیں ملتا۔ ایسی باتیں جو آپ کسی سے نہ کہہ سکیں' ہمیں لکھ بھیجئے۔ آپ کے احساس کو ہم زبان دیں گے لیکن خیال رہے کہ آپ کی سوچ زیادہ سے زیادہ 20 سطروں پر مشتمل ہونی چاہئے۔ اپنی سوچ سطریں اس پتہ پر ارسال فرمائیے۔

صباحت نگراں "سوچ نگر" ماہنامہ "آداب عرض" پوسٹ بکس نمبر 4132 ملتان روڈ لاہور 54500

غرور و تکبر

سرور رہنما لدھیانوی، حیدرآباد

بزرگوں سے سُنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی 99 صفات میں سے اکثر صفات ایسی ہیں کہ جن کا عکس اُس کے نیک بندوں میں بھی جھلکتا ہے۔ مثال کے طور پر رحم کرنا، انصاف کرنا، معاف کر دینا، نرمی اختیار کرنا اور شفقت سے پیش آنا۔ اس طرح دیگر صفات کی جھلکیاں اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کی سیرت و کردار میں دیکھی جا سکتی ہیں البتہ خدا تعالیٰ کی ایک صفت ایسی بھی ہے جس اُس نے صرف اپنے لئے مخصوص کیا ہے اور وہ ہے تکبر۔ انسانوں کو غرور اور تکبر سے سختی سے منع کیا گیا ہے مگر آج معاملہ کچھ اور ہے۔ اس دنیا میں جس کے پاس تھوڑی سی دولت آ جاتی ہے، وہ اس چند روزہ سرائے کو ہی اپنی مستقل قیام گاہ بنا لیتا ہے اور ایسی ایسی حرکتیں سرزد کرنے لگتا ہے گویا کہ اُس نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یہیں رہنا ہے۔ بیش قیمت گاڑی دولت کی بدولت اپنے سے کم حیثیت لوگوں کو حقارت سے دیکھنے کو وہ اپنا حق تصور کرنے لگتا ہے اور یہ بھول جاتا ہے کہ ایک دن اسے بھی اس دنیا سے جانا ہے۔ دُنیا کی رنگینیوں میں مست یہ بھٹکے ہوئے لوگ جنہیں دنیا کی حقیقت کا پتہ ہی نہیں، جنہیں یہ ظالم دنیا اگر مل بھی گئی تو کیا ملا، بالآخر قبر کی مٹی ہی اُن کا مقدر ٹھہرتی ہے۔ موت ایک اٹل حقیقت ہے۔ موت کا استقبال تو پیغمبروں کو بھی کرنا پڑا۔ بیشک ہر شخص کو موت کے ذائقے سے ہمکنار ہونا ہے۔ نمرود و فرعون کیا لے کر گئے؟ سب ٹھاٹھ یہیں پڑا رہ جائے گا جب کوئی اس دنیا سے جائے گا۔ یہ فانی دنیا، یہ رنگینیاں، یہ عیش و عشرت اور یہ زندگی کے میلے کبھی کم نہ ہوں گے۔ دُنیا کا لفظ "دنایت" سے نکلا ہے، جس کے معنی ذلت اور کمینگی کے ہیں۔ یہ دنیا اگر کسی کو مل بھی جائے تو انجام صرف فنا اور قبر کی مٹی ہے۔ غرور و تکبر سے اکڑی ہوئی گردنیں، مال و زر، جاہ و جلال یہ سب کچھ یہیں رہ جائے گا۔ خوبصورتی قبر میں گل سڑ جائے گی۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ "خوشیاں خوبصورت جسموں کے لئے اور غم خوبصورت دلوں کے لئے ہوتے ہیں" ---- تو اے غرور و تکبر میں ڈوبے ہوئے گراہو! ابھی وقت ہے۔ جو صفت اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے مخصوص کر لی ہے، اسے اپنی خوبی سمجھنے سے پرہیز کرو۔ اے خود کو لوگوں کا رزق بانٹنے اور چھیننے کا مالک و مختار سمجھنے والو! ہوش میں آ جاؤ۔ تم میں سرخاب کے پر نہیں لگے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں بے حساب دولت سے سرفراز کیا۔ تمہیں بے شمار دولت صرف اس لئے عطا کی گئی کہ کروڑوں انسانوں میں سے اللہ تعالیٰ نے تمہیں آزمائش کے لیے منتخب کیا۔ سنبھل جاؤ کہ اللہ تعالیٰ کی بے آواز لاٹھی حرکت میں آنے والی ہے۔ ہے کوئی ٹھوکر کھا کر سنبھلنے والا، ہے کوئی اپنے غرور و تکبر کو خاک میں دفن کرنے والا!

آئیے، اپنی اصلاح کریں

عبدالعزیز چشتی، شورکوٹ

دولہا سر پہ شادی کا خوبصورت سہرا سجائے باراتیوں کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ بہنیں اور بھابیاں خوشی کے سہانے گیت گاتی، ہنستی مسکراتی بارات کے ساتھ جا رہی تھیں۔ فوجی بینڈ اپنی خوبصورت دُھنیں فضا میں بکھیرتا جا رہا تھا۔ سب سے آگے دولہا کے دوست بلی لڈیاں اور بھنگڑے ڈالتے جا رہے تھے۔ دولہا کا ایک دوست اپنے پسٹل سے ہوائی فائر کرتا جا رہا تھا کہ اچانک ایک گولی پسٹل کی نالی میں پھنس گئی۔ گھوڑا دبایا لیکن

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گولی فائر نہ ہوئی۔ پسٹل والے دوست نے چلتے چلتے دولہا کے قریب جا کر ایک بار پھر فائر کی کوشش کی۔ گھوڑا دبایا تو غیر متوقع طور پر فائر ہو گیا۔ وہی ظالم گولی دولہا کا سینہ چیرتی ہوئی جسم کے پار ہو گئی۔ دولہا زمین پر گرا خون میں لت پت دولہا دو لمحے تڑپا اور اپنی جان کی بازی ہار گیا۔ سہرے کی لڑیاں خاک اور خون میں مل گئیں۔ خوشیوں بھرا گھر ماتم کدہ بن گیا، کہرام بچ گیا۔ سب پروگرام ٹھپ ہو گئے، ایک قیامت صغریٰ برپا ہو گئی۔ پسٹل والا دوست بھی یہ صدمہ برداشت نہ کر سکا، اُس نے اُسی پسٹل سے اپنے سر میں گولی مار کر خودکشی کر لی۔ باراتیوں، عزیزوں اور دوستوں کے درمیان دونوں جوانوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ فضا سوگوار اور ہر آنکھ اشکبار تھی۔ اُدھر دلہن کے دل پر کیا گزری ہو گی جسے ایک شہزادہ نکاح کے بعد ساتھ لے کر جانے والا تھا؟--- سب خواب بکھر گئے، سب سپنے چکنا چور ہو گئے۔ آرزوئیں حسرتیں اور خواہشیں دم توڑ گئیں۔ دل کے ارمان دل میں رہ گئے، گھروں میں صف ماتم بچھ گئی۔ معمولی سی غفلت اور بے احتیاطی سے لوگوں کو ایک بڑا سانحہ دیکھنا پڑا اور عبرت ناک انجام تک پہنچا پڑا۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ عقل مندی اور دانشمندی کا دعویٰ کرنے والے لوگ اچانک پٹڑی سے کیوں اُتر جاتے ہیں۔ کیا آتش بازی کی یہ بُری رسمیں ختم نہیں ہو سکتیں، کیا خوشیوں کو خوشیوں کے دائروں میں رہ کر نہیں منایا جا سکتا، انسان اپنی خوشیوں کے خود قاتل کیوں بن جاتے ہیں؟ بے احتیاطیوں کی دھول سے اٹی خوشیاں کبھی دیرپا ثابت نہیں ہوتیں--- معزز قارئین! آئیں، ہم ایسی رسموں کو ترک کرنے کی کوشش کریں اور ان انہونیوں سے بچنے کی کوشش کریں۔ اصلاح معاشرہ کی اس مہم میں میرا ساتھ دیں۔

آئیں، ذرا سوچیں

خرم ہیثم

سوچ افسردگی کے پہلو میں سونے کے لئے مچل رہی ہے کہ اس حقیقت کو کیسے لفظوں کی پوشاک پہناؤں جس حقیقت کے بل بوتے پر دنیا بھر میں ہماری رسوائیوں کو سرعام کر دیا گیا۔ گزشتہ دنوں مجھے فیس بک پہ ایک ویڈیو موصول ہوئی جس کے ٹائٹل پہ جناب سہیل احمد کی تصویر آویزاں تھی جوان کے ٹی وی پروگرام حسب حال سے لی گئی تھی۔ میں نے اس ویڈیو کو اوپن کیا تو مجھے سکرین پہ ایک یورپین ٹی وی چینل کا کلپ دیکھنے کو ملا جس میں دو مرد اور ایک لیڈی اینکر پاکستان سے متعلق ایک رپورٹ پیش کر رہے تھے اور لیڈی اینکر رپورٹ کا ایک لفظ پڑھتی تو دس منٹ تک ہنستی رہتی اور قہقہوں کو سجائے وہ بتا رہی تھی کہ اسلام کے قلعہ پاکستان میں بے حیائی کے سب بندھن ٹوٹ چکے ہیں، واہیات ویب سائٹس کو سرچ کرنے میں پاکستان اقوام عالم میں پہلے نمبر پہ آیا ہے--- یہ رپورٹ بالکل حقیقت پہ مبنی تھی جس کی تصدیق حسب حال کے اینکر جنید نے بھی کی کہ واقعی ہم پاکستانیوں نے اسلام کے لبادے میں اسلام کی دھجیاں اڑا کر رکھ دی ہیں۔ ہمیں نہ دین کا پاس رہا، نہ اسلام کی سربلندی کا احساس۔ ہمیں نہ عزتوں کا احترام رہا، نہ غیرتوں کا شعور۔ آپ کوئی بھی اخبار اٹھا کر دیکھ لیں، وہاں روز درندگی کی بیسویں خبریں ایسی ہوں گی جس میں واضح لکھا ہو گا کہ فلاں شہر میں چار پانچ سالہ بچی کی عزت کو پامال کر دیا گیا۔ پہلے پہل ایسی خبریں خواتین سے متعلق پڑھا کرتے مگر اب اس قوم پہ حیوانیت مکمل طور پر چھا چکی ہے، اب انسانی شکل وصورت سے ملتے جلتے درندوں نے معصوم بچیوں پہ جنسی تشدد کی اخیر کر دی ہے۔ کیا قصور ہوتا ہے پھول سی بچیوں کا جنہیں انسان نما حیوان مسل کر رکھ دیتے ہیں اور پھر ایسے حیوان پولیس سے مک مکا کر کے پھر سے سفید پوش اور معزز بن جاتے ہیں۔ ابھی چار ماہ پہلے میں نے ایک اخبار پہ سرگودھا کی اس ڈیڑھ سالہ بچی کی تصویر دیکھی جسے جنسی ہوس کا نشانہ بنایا گیا اور ڈاکٹر نے بھی زیادتی کی تصدیق کر دی اور وہ بچی باپ کی گود میں بیٹھی تھی۔ اب تصور کیجئے، ڈیڑھ سالہ بچی تو ٹھیک طرح سے لفظوں کو ادا بھی نہ کر پاتی ہو گی اور تو اور چند برس پہلے اسی پاکستان میں ایک شخص نے ایک نوجوان لڑکی کی لاش کو قبر سے نکال کر جنسی تشدد کیا۔ اب بے حرکت جسم پہ اس قدر ظلم کہ جنگل کے درندے بھی گھبرا گئے ہوں گے؟--- ایک انگریز کالم نگار نے بھی ہمارے چہروں پہ یہی طمانچہ مارا تھا کہ ویسے تو پاکستانی ہم پہ انگلیاں اٹھاتے ہیں کہ ہم نے عورت کو بے پناہ آزادی دے رکھی ہے مگر ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے گریبانوں میں جھانکنا گوارا نہیں کرتے کہ وہ اپنی عورتوں سے کیسا بھیانک سلوک کر رہے ہیں۔ ان کے تھانوں میں روزانہ کتنے ایسے کیس رجسٹرڈ ہوتے ہیں جن میں عورتوں پہ ظلم و جفا کی کہانیاں ثبت ہوتی ہیں--- مجھے انگریز کالم نگار کی بات میں سچائی نظر آئی کہ ہم واقعی ایک طرف تو اسلام کا پرچار کرتے تھکتے نہیں، دوسری طرف اسلام کو ہم ہی دیمک کی طرح چاٹ رہے ہیں اور قیامت یہ ہے کہ بعض درندے مساجد میں، یعنی خانہ خدا میں بھی بچوں پہ جنسی تشدد کرنے میں سبقت لے گئے ہیں--- آئیں، سوچیں کہ کیا ہم اسلام سے مخلص ہیں، کیا ہم اپنی حیوانیت سے یہی دین حق کا پرچار کر رہے ہیں؟

یادیں

مہر پرویز احمد دولو، میاں چنوں

یادوں کی پگڈنڈی پر چلتے ہوئے کتنے ہی راستے ایسے بھی آتے ہیں جو اپنوں تک لے جاتے ہیں لیکن وقت کی ستم ظریفی ہے کہ بندہ کوشش کے باوجود ان راستوں پر چل کر اپنوں تک نہیں جا سکتا۔ اَنا کے نوکیلے اور خار چھر راستوں میں اتنی تعداد میں بکھیر رکھے ہوتے ہیں کہ صرف پاؤں ہی نہیں، روح تک کے لہولہان ہونے کا خدشہ ہوتا ہے۔ اَنا کی تسکین کے لئے آگ کے سمندر بھی عبور کرنے پڑیں تو پرواہ نہیں کی جاتی۔ صرف راستے تو کیا، منزلوں کو بھی پس پشت ڈال دیا جاتا ہے لیکن یادوں کی کسک تو روگ بن رہتی ہے۔ آگے جاتے ہوئے کتنی ہی دیر تک پیچھے مڑ کر دیکھتا جاتا ہے کہ شاید کوئی اپنا آواز دے رہی ڈالے اور واپسی کا اک بہانہ ہاتھ آ جائے۔

سفارش

محمد احمد فہیم قتالپوری

اس لفظ کی مجھے اُس دن سمجھ آئی جب میں نے ایئر فورس میں اپلائی کیا تھا۔ میں جب کاغذات جمع کروانے گیا تو ایک لڑکے نے مجھ سے پوچھا کہ کوئی سفارش وغیرہ ہے؟--- میں چونک پڑا کہ واقعی اس کی بات سولہ آنے ٹھیک ہے۔ میں گھر آیا اور ایک دوست سے پوچھا کہ کس کی سفارش کروانی چاہیے؟ اس نے کہا کہ فلاں آدمی کی اور اس نے یہ بھی کہا کہ تم اب سفارش ڈھونڈ رہے ہو۔ انہوں نے جن کو رکھنا تھا، ان کی لسٹ بھی تیار ہو گئی ہو گی۔ میں پریشان ہو گیا اور سوچنے لگا کہ ایک غریب باپ جس کو سب بہن بھائی، رشتے دار چھوڑ کر چلے جائیں اور انتہائی مشقت اٹھا کر مزدوری کر کے اپنے بیٹے کو تعلیم دلوائے۔ جب وہ اسے گریجوایٹ کروائے اور اس کی ہڈیاں محنت کرنے کے قابل بھی نہ رہیں تو وہ سفارش کہاں سے لے کر آئے؟ کیا اس گریجوایٹ والے کو خودکشی کا خیال نہیں آئے گا جس نے اس اُمید پر محنت کی اور اپنا سکھ چین برباد کیا کہ میں فوج میں جاؤں گا۔ میرے بھائیو! اب اس غریب کی صرف یہی سزا ہے کہ وہ اپنے آپ کو، اپنے بیٹے اور اس کی ڈگریوں کو آگ لگا دے کہ کیوں اس نے محنت کی اور اپنے بیٹے کو تعلیم دلوائی--- آج کا حکمران بھی صرف اپنی بیبیوں کو بھرنے میں لگا ہوا ہے۔ کوئی کسی کا ساتھ نہیں دیتا، کوئی کسی کی پرواہ نہیں کرتا، سب اپنے ہی پیٹ کا دوزخ بھرتے ہیں۔

آہ، مجبوریاں

ایم۔ پرویز

مجبوریوں کے دیس میں رہنا بھی عذاب سے کم نہیں ہوتا۔ مسائل پہاڑوں کی کھائیوں کی طرح منہ کھولے ہڑپ کرنے کے لئے تیار کھڑے ہوتے ہیں۔ ایک مجبور آدمی ان دیوہیکل ضروریات سے کب تک نبرد آزما رہتا ہے، آخر پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لئے اس کو ایک دن بہت کچھ کھونا پڑتا ہے۔ شاید انسانیت کے درجے سے بھی گرنا پڑتا ہے تب جا کر اس کی سانس کی ڈوری منزل کی جانب رواں دواں رہتی ہے۔ مجبوریاں انسانیت اور انانیت کو ریزہ ریزہ کر دیتی ہیں، سسکتی خواہشات آنکھوں کے سامنے دم توڑ دیتی ہیں اور انسان کو آہ بھرنے کی اجازت بھی نہیں ہوتی۔ رشتوں کی ڈوری میں بندھا انسان تو ہر لمحہ مرتا اور جیتا ہے۔ رشتوں کی پاسداری کے لئے اس کو بہت کٹھن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس کو سسکا سسکا کر، تڑپا تڑپا کر زندگی کی بھیک دی جاتی ہے اور ڈگڈگی بجا کر انسانیت کی ذلت کا تماشہ دکھانے والا خوب محظوظ ہوتا ہے۔ اے کاش! کوئی مجبور نہ ہو۔

انقلاب

اے۔ چشتی

مثبت تبدیلی کا دوسرا نام انقلاب ہے۔ ظلم وستم، جبر وتشدد، جنگ وجدل کے خاتمے پر جو نئے حالات رونما ہوتے ہیں، ان کا نام انقلاب ہے۔ زندگی ایک ہی ڈگر پر چلتی رہے تو اس کی رعنائیاں اور توانائیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ انقلاب زندگی کی علامت ہیں۔ انقلابات ہی میں ہماری خوشیوں، خوشحالی، ترقی، کامیابی اور بہتر مستقبل کے راز مضمر ہیں۔ بزدلی، سستی، کوتاہی، مایوسی، پریشانی انقلاب نہیں لا سکتی۔ جرات، جسارت،

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حوصلے، محبت، عزم کے بغیر انقلاب نہیں آسکتا۔ انقلاب لانے کے لئے جملہ صلاحیتوں کو بروئے کار لانا پڑتا ہے، انقلاب لانے کے لئے قربانیاں بھی دینا پڑتی ہیں۔ تبدیلی اور انقلاب ہر دور کی اولین ضرورت ہے۔ قیام امن، کامیاب اور دیرپا انسان دوستی، محبت، پیار، خلوص اور ہمدردی کو فروغ دینے کے لئے جدوجہد، تگ ودو، محبت، جفاکشی اور کوشش شرط اول ہے--- آئیں، اپنی زندگیوں کو انقلاب کی بھٹی سے گزاریں کہ یہی انقلاب ہے۔

خود فریبی

عبدالغفار عابد، چیچہ وطنی

اضطراب لحہ لحہ بڑھ رہا ہے۔ بے کلی، جان کنی کی حدوں کو چھونے لگی ہے۔ سوالوں کا ایک گھنا جنگل ہے اور دلوں میں اُمید کا دیا روشن کرنے والی ایک پگڈنڈی تک نہیں۔ مایوسی گناہ ہے اور اللہ کی رحمت سے نا اُمید ہونا مرد مسلمان کو زیبا نہیں لیکن کیا یہ اس خالق ارض وسما کا طے کردہ اصول نہیں کہ وہ ایسی قوموں کی مدد نہیں کرتا جو خود اپنا چلن تبدیل کرنے پر آمادہ نہ ہوں؟--- وطن عزیز خطرے میں ہے۔ ہماری فوج کے ادارے دشمنوں کا ہدف بنے ہوئے ہیں۔ پاکستان کے تمام دشمن ایک ہو رہے ہیں اور ہم ہیں کہ خود فریبی کا شکار ہیں۔ پتہ نہیں کہ ہماری آنکھ کب کھلے گی۔ وطن عزیز کو ہمارے اتحاد کی ضرورت ہے اس لئے کہ اب ہمارے پاس وقت تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ ملک انصاف اور قانون کی پاسداری پہ قائم رہتا ہے، نشوونما پاتا ہے۔ اسے ایثار، ریاضت اور آہنگ کی ضرورت ہوتی ہے۔ خوفزدہ ہونے اور گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ملک لمیٹڈ کمپنیاں نہیں ہوتے کہ دیوالیہ ہو جائیں۔ قدرت کے کچھ قوانین ہیں اور ان کی پاسداری کرنا ہوتی ہے۔ اللہ کی کوئی لاڈلی مخلوق کبھی نہیں تھی جس کے لئے وہ اُصول بدل دے۔ ہم سب کو اپنے گریبانوں میں منہ ڈالنا چاہیے۔ وطن عزیز خطرے میں ہے۔ چیخ و پکار کا نہیں، ٹھنڈے دل سے غور وفکر اور ایثار کا وقت ہے۔ خود فریبی ہی روا نہیں، کسی حال میں خود فریبی روا نہیں۔

عید مناؤں کیسے

شاہد محمود مغل، ماڑی ٹھاکراں

جب عید کی صبح اپنے سنگ مسرتوں کی بہار لے کر طلوع ہوئی تو ہر آنکھ میں خوشیوں کے دیپ جل رہے تھے، ہر دل میں ہر دل میں لاکھوں ارمان مچل رہے تھے، ہر کسی کے لبوں پہ خوشیوں کے نئے رنگ بھرنے لگے۔ میری آنکھ اسی مسرت وانبساط کے شوروغل میں کھلی تو میں چاہا کہ اوروں کی طرح خوشیاں مناؤں، بن سنور کے تیرے پاس جاؤں، تم محبت سے چھلکتی آنکھوں سے مجھے دیکھو اور میں بڑے پیار سے، بڑے چاہ سے، بڑے مان سے تمہیں دیکھوں تو میری عید ہو جائے مگر جب میرے پاس تم نہیں تو مجھے کوئی خوشی بھی راس نہیں۔ بچھڑ کے تم سے دُکھ بھرے دل سے میں عید مناؤں کیسے؟

دعا

عاطف حسین، چکوال

عام طور پر ہم یہ شکوہ کرتے ہیں اور یہ شکوہ سننے میں بھی آتا ہے کہ ہماری دعائیں قبول نہیں ہوتی۔ خدا جانے ہم نے کیا خطا کی ہے کہ ہمیں معافی بھی نصیب نہیں ہوتی۔ ہماری پریشانیاں ہی دور نہیں ہوتی، وغیرہ وغیرہ--- ہم اپنی دعاؤں کی عدم قبولیت کا شکوہ تو کرتے ہیں لیکن اس امر کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ دعاؤں کی قبولیت کے لئے ایک عمل بطور شرط ہے اور ہم نے اسے اپنی زندگیوں سے مکمل خارج کر دیا ہے۔ اگر شرط پوری نہ ہو تو کیا صلے کی توقع کی جا سکتی ہے؟ اللہ تعالیٰ قرآن مجید کی سورۃ التوبہ میں فرماتا ہے کہ ''اے خدا کے بندو! بے شک اللہ تعالیٰ تمہاری دعائیں سنتے اور تو قبول فرماتے ہیں لیکن ہماری دعاؤں کی قبولیت واجابت کے لئے ایک شرط مقرر کر دی گئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہم نے تم کو جس مال ودولت سے نوازا ہے، وہ ہماری امانت ہے۔ تمہارے اپنے معاشرے اور گردوپیش میں ہمارے کتنے بندے ایسے ہیں جو معاشرتی ناانصافی کا شکار ہو کر معاشی تعطل کی نذر ہو گئے ہیں۔ تم اگر ان کی پریشانیوں کی پرواہ نہ کرو، ان کے معاشی تعطل کو رفع کرنا اپنا فرض نہ سمجھو، انہیں ضروریات زندگی بہم پہنچا کر تخلیقی جدوجہد بحال کرنے کی سعی نہ کرو اور ان سے دل سوزی ودردمندی کا عمل مظاہرہ نہ کرو تو پھر ہم سے کیسے توقع رکھتے ہو کہ ہم تم سے راضی ہو جائیں گے کیونکہ ان پریشان حال لوگوں کا ہماری ذات سے اتنا گہرا تعلق ہے کہ جو کچھ بھی صدقہ وخیرات تم انہیں دینا چاہو، وہ ہم براہِ راست اپنے دست قدرت سے وصول کرتے ہیں اور اپنی طرف سے انہیں عطا کرتے ہیں اور اگر کبھی ترس کھا کر ان کی مالی معاونت کرتے بھی ہو تو اس قدر رعونت اور فخر وتمکنت کے ساتھ کہ وہ عمر بھر تمہارے احسان مند رہیں۔ اس وقت تمہیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ متکبرانہ سلوک تم ان سے نہیں بلکہ اپنے خالق مالک سے کر رہے ہو کیونکہ تمہارے صدقات وصول کرنے والا ہاتھ ان لوگوں کا نہیں، اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے۔ اپنے رب سے اتنا نازیبا سلوک کرنے کے بعد تم توبہ اور عدم قبولیت کا شکوہ بھی کرتے ہو---؟''

محبتیں صلہ چاہتی ہیں

محسن شہزاد، اسلام آباد

محبتوں میں خوشی تب حاصل ہوتی ہے جب وعدے، اعتماد اور پاکیزگی قائم رہے اور محبتیں مکمل تب ہوتی ہیں جب وہ اپنی عمر بھر کی ریاضت کا صلہ مانگتی ہیں۔ جی ہاں، ہماری محبتیں صلہ مانگتی ہیں، ہماری محبتیں اپنا حساب چاہتی ہیں۔ یہ بالکل رعایت نہیں کرتیں، ان کو اپنا صلہ چاہیے۔ محبتیں صلہ چاہتی ہیں، اپنے اس ایک ایک پل کا جو کسی کے انتظار میں ایک صدی کی طرح گزرتا ہے۔ محبتیں صلہ چاہتی ہیں، اپنے آنسوؤں کا جو کسی کی یاد میں دریاؤں کی مانند بہتے ہیں۔ جب ہماری محبتیں اپنا صلہ پالیتی ہیں تو وہ ہر وقت مسکراتی رہتی ہیں، ایک معصوم بچے کی طرح خوش ہو جاتی ہیں اور پھر انہیں دنیا جہان میں کوئی غم نظر نہیں آتا لیکن جب محبتوں میں کچھ حاصل نہیں ہوتا تو وہ بکھر جاتی ہیں، ویران ہو جاتی ہیں، اداس رہنے لگتی ہیں۔

بچے، ہمارا مستقبل

جاوید بلوچ، خوشاب

جب بھی دہشت گرد دھمکی دیتے ہیں، سکول وکالج بند کر دیئے جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہم ان سے ہار مان لیتے ہیں اور دشمن جن مذموم مقاصد کی تکمیل چاہتے ہیں، بغیر ہتھیار استعمال کئے پورے ہو جاتے ہیں کیونکہ کسی بھی قوم کو تباہی وبربادی کے دہانے پر پہنچانا ہو تو اس کی نوجوان نسل کو بے راہ روی کا شکار بنا دو۔ بزدل اور بے عمل بنا دو، نفسیاتی مریض بنا دو۔ دشمن بم بلاسٹ کی دھمکی دے کر گھر بیٹھے اپنی اس کاوش میں کامیاب ہو رہا ہے۔ سکول کالج کی بندش نے نوجوان نسل کو فرصت کے لمحات مہیا کر دیئے ہیں اس لئے وہ موویز، انٹرنیٹ پر چیٹنگ اور سیل فون پر لمبی لمبی گفتگو میں مگن ہو کر رہ گئے ہیں۔ چھوٹے بچوں کا یہ حال ہو چکا ہے کہ وہ دستک کی آواز سن کر کانپنے لگتے ہیں اور جب سکول جاتے ہیں تو ہراساں چہرے، خوفزدہ آنکھیں اور ذہنی انتشار کا شکار رہتے ہیں۔ ان دھمکیوں اور سکولوں کی بندش نے بچوں کی تعلیم سے دلچسپی ختم کر کے رکھ دی ہے۔ وہ کلاس میں ہوتے ہوئے بھی خود کو غیر محفوظ سمجھتے ہیں اور ہر آہٹ انہیں خوفزدہ کر دیتی ہے--- حضورؐ نے بچوں کو چمن کا پھول قرار دیا ہے۔ ان پھولوں کو مرجھانے مت دیں۔ ان کے چہرے کی شگفتگی اور تروتازگی، خوف میں مت بدلیں۔ یہ آپ کے اپنے اختیار میں ہے کہ آپ دہشت گردوں سے مکمل مرعوب ہوتے ہیں جبکہ ہم مسلمان ہیں اور اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ہمیں سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی سے نہیں ڈرنا چاہیے۔ جب بچوں میں صرف اللہ تعالیٰ کا ڈر پیدا ہوگا تو وہ نہ صرف بے راہ روی کے عمل سے بچیں گے بلکہ ان دھمکیوں سے بھی مرعوب نہیں ہوں گے۔

فلاح

میاں عقیل احمد، جڑانوالہ

اسلام دنیا کا واحد مذہب ہے جس میں انسانی فطرت کے مطابق ہی تمام تعلیمات واحکامات وارد ہوئے ہیں جبکہ دیگر تمام مذاہب کی تعلیمات واحکامات اس قدر مشکل ترین ہیں کہ ان پر عمل کرنا کسی انسان کے بس میں نہیں ہے۔ اسلام میں کامیابی، نجات، فلاح اور دیگر عظیم المرتبت درجات حاصل کرنے کے لئے صرف ایک ہی اُصول ہے جو کہ قرآن حکیم نے یوں بیان کیا ہے۔ ''جس نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی تو پس اس نے بہت بڑی کامیابی پالی'' --- اگر ہم دیکھیں تو اللہ اور اس کے محبوب ترین رسول محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تمام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تعلیمات فطرت کے عین مطابق ہیں۔ ان میں سے کوئی ایسا عمل نہیں جو طبیعت پر گراں گزرے کیونکہ اللہ نے قرآن میں ارشاد فرمایا ہے۔ ''اللہ کسی جان کو اس کی برداشت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا'' --- اس لئے ہمیں اسلامی تعلیمات پر عمل کر کے فلاح و نجات حاصل کرنی چاہیے۔ آیئے، دیکھیں کہ دنیا کے دیگر مذاہب میں فلاح حاصل کرنے کا کون سا طریقہ ہے۔ عیسائیت میں ہے کہ دنیا اور دنیا کی لذتوں سے منہ موڑ کر جنگلوں میں بسیرا کیا جائے تو انسان نجات حاصل کر سکتا ہے۔ ہندومت میں ہے کہ انسان رہبانیت اختیار کر کے جنگلوں بیابانوں میں مکتی (نجات) تلاش کرے۔ بدھ مت میں فلاح کا یہ اُصول ہے کہ انسان کوئی ملازمت نہ کرے بلکہ بھیک مانگ کر گزر بسر کرے، اس طرح نروان اور نجات مل سکتی ہے مگر اسلام اس قدر آسان ترین دین ہے کہ اس میں دین کے ساتھ دنیا کے امتزاج کو بھی برقرار رکھا گیا ہے اسی لئے حضور کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے۔ ''اسلام میں رہبانیت (ترک دنیا) نہیں ہے'' --- بلکہ قرآن مجید میں یہ دعا تعلیم فرمائی گئی ہے۔ ''پروردگار! ہم کو دنیا میں بھی نعمت عطا فرما اور آخرت میں بھی نعمت بخشنا اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھنا'' --- آخر ہم کب تک اسلامی تعلیمات کا مذاق اڑاتے ہوئے انہیں پس پشت ڈال کر اپنی من مانیاں کرتے رہیں گے؟ ہم مسلمان ہیں۔ ہمیں اللہ کریم سے ڈرنا چاہیے۔ اللہ تبارک سب کو اسلامی تعلیمات پر عمل کی توفیق عطا فرمائے، آمین!

زندگی

حسن حبیب، خوشاب

زندگی ایک ایسی پگڈنڈی ہے، جس میں بہت بل آتے ہیں، بہت موڑ آتے ہیں اور ہر موڑ پہ آپ کو ایک چہرہ ملتا ہے جو کبھی محبت دیتا ہے اور کبھی دُکھ دیتا ہے۔ کبھی خوشی دیتا ہے اور کبھی خوشیاں چھین لیتا ہے اور کبھی ایسی یادیں چھوڑ جاتا ہے جو عمر بھر نہیں بھلا سکتے۔ جو انسان اس پگڈنڈی پر چلنا سیکھ لیتا ہے، وہ اپنی منزل پالیتا ہے اور جو انسان گزرے لمحات کو یاد کرتا رہتا ہے، وہ آخر راستہ کھو بیٹھتا ہے۔ پھر اس کا کوئی ہمسفر نہیں ہوتا اسی لئے تو کہتے ہیں کہ ''زندگی زندہ دلی کا نام ہے'' یا ''زندگی صرف چند دنوں کے لئے ہوتی ہے اور اچھا نام ہمیشہ کے لئے'' --- زندگی کی راہوں میں قدم قدم پر ملانے والے لوگوں میں بعض چہرے ایسے ہوتے ہیں جو چپکے سے آنکھوں کے راستے دل کے انتہائی نرم گوشوں میں اُتر جاتے ہیں، کبھی نہ بچھڑنے کے لئے، کبھی نہ بھولنے کے لئے۔ یہ عزیز ہستیاں اگر کبھی ہم سے بچھڑ جائیں تو دل میں اُن کی یادیں ہمیشہ تازہ رہتی ہیں۔ ان یادوں سے دل کے چمن میں بہاریں ہوتی ہیں --- ہماری زندگی خوشبو کی مانند ہے جسے محسوس تو کیا جا سکتا ہے لیکن چھوا نہیں جا سکتا۔ زندگی موت کا دوسرا نام ہے اور جو موت سے نہیں ڈرتے، انہیں ہی زندگی عطا ہوتی ہے۔ زندگی میں پیش آنے والی مشکلات اور آزمائشوں کا سامنا دلیری سے کرنا چاہیے۔ ٹیپو سلطان اکثر اوقات کہا کرتے تھے کہ ''گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے'' --- ہماری زندگی کا بھی ایک مقصد ہے، جس کے لئے ہمیں تخلیق کیا گیا ہے۔ کیا کبھی ہم نے الگ بیٹھ کر یہ تدبر کیا ہے کہ ہمیں آخر کیوں پیدا کیا گیا ہے، کیا ہماری تخلیق کے بغیر یہ کائنات بدصورت لگتی تھی؟ --- ہرگز نہیں۔ کیا ہمارا مقصد تخلیق صرف کھانا پینا اور عیش و عشرت کرنا ہے؟ بالکل نہیں۔ اس وسیع و عریض زمین پہ ہماری آمد کا مقصد صرف اور صرف ایک ہے اور وہ ہے عبادت الٰہی ---!

صرف اپنا ہی خیال کیوں

سعید اسلم، منچن آباد

کافی دنوں سے ایک بات ذہن میں کھٹک رہی تھی، اکثر اوقات ٹیلی فون کال کے آخر میں یا خط کے آخر میں ایک جملہ سوچنے پر مجبور کر دیتا تھا کیونکہ وہ جملہ صرف اور صرف اپنا مخلص پن جتانے کے لئے بولا اور لکھا جاتا تھا اور وہ جملہ ہے کہ اپنا خیال رکھنا --- ویسے سوچنے کی بات یہ ہے کہ اپنا خیال رکھنا تو انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ہم سب یہ کہیں بلکہ عملی طور پر بھی ثابت کریں کہ دوسروں کا خیال رکھا کرو اور رکھنا ضروری [illegible] ہماری اسلامی تاریخ کی ایک ایک سطر سے ثابت ہے اور محسن انسانیت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقصد حیات ہی یہی تھا کہ [illegible] اور دوسروں کو اپنا مقصد [illegible] دو۔ خود تکلیف اُٹھا کر دوسروں کے لئے آسانی پیدا کرو اور اگر کوئی بھی گالی دے تو تم خاموشی اختیار کرو [illegible] دوسروں کا خیال رکھنا زیادہ مقدم ہے۔ اگر ہم والدین ہیں تو اپنے بچوں کا خیال اور اگر بچے ہیں تو والدین

کے حقوق کا خاص خیال رکھیں۔ اس کے علاوہ پڑوسیوں کا خیال، عزیز و اقارب کا خیال اور تو اور جانوروں کا خیال رکھنا بھی فرائض میں شامل ہے۔ ہمارا دین اسلام ہرگز یہ نہیں سکھاتا کہ اپنی خوشی کی خاطر کسی کو پریشان کیا جائے اور کسی کی حق تلفی کی جائے۔ معاشرے کے ہر فرد کا یہی ذہن ہونا چاہیے کہ ہم نے اپنے اردگرد کے ماحول میں بسنے والی ہر مخلوق کا خیال خود پریشانی اُٹھا کر رکھیں تا کہ ہم اپنے ہر عمل سے نبی آخر الزماںؐ کے اُمتی ہونا ثابت ہوں۔ خداوند کریم ہمیں دوسروں کا خیال رکھنے کی طاقت و ہمت عطا فرمائے تا کہ ہمارا خیال بھی رکھا جائے اور خود غرضی و خود پسندی جیسی لعنت سے اللہ محفوظ فرمائے، آمین!

زندگی، اے زندگی

مسعود تنہا، لاہور

اے دوست! گزشتہ کئی برسوں سے تمہاری سندر یادوں کی آہٹ محسوس کر رہا ہوں جواب میرے دل پر کسی گہری ضرب کی طرح محسوس ہوتی ہیں۔ سوچنے لگتا ہوں تو تمہارے ہی خواب دل و دماغ کی وادی میں سروں کے تال چھیڑنے لگتے ہیں اور شب و روز میرے تن وجود کو جکڑے رکھتے ہیں۔ میری تشنہ آنکھیں ہر ساعت، ہر پل تمہاری دید کی تمنائی رہتی ہیں۔ من میں پہلی اضطرابی، بے چینی، بے کلی، سرد لمحوں کی آہٹ، رفاقتوں میں نارسائی کا خوف --- ایسے لگتا ہے، جیسے میں کسی گہرائی میں تیزی سے گر رہا ہوں اور ہمارے درمیان کبھی نہ پُر ہونے والا خلا پیدا ہو گیا ہے۔ اعتماد پر دراڑیں پڑ چکیں ہیں، یاد پرچھائیوں کی طرح ہے جو مجھے تمہاری جدائی کا احساس دلا رہی ہے۔ زندگی کا کوئی مقصد متعین نہیں رہا۔ لوگوں میں بے فکری اور بے خبری سے رہنا کیوں ضروری لگتا ہے جبکہ بہت سے اپنی زندگی کی رنگارنگی اور گہما گہمیوں میں خود مصروف رکھے ہوئے ہیں اور میں کہ ان سے بالکل مختلف اور الگ تھلگ۔ آخر میں اکیلا کیوں بلکہ ہم سب ہی اندر سے اتنے اکیلے کیوں ہیں، جواب دیجئے؟ زندگی میں محبت، نفرت، خلوص، ہمدردی، حسد، وفا، جفا، انا، سزا، قربت، فرقت، ظلم، بغاوت، جبر اور دُکھ ایک ساتھ ہیں لیکن ہمارے دامن میں کیا ہے؟ لوگو! آنسو جی بھر کے ہنسو ہماری کیفیت پر، ہماری تنہائیوں پر لیکن تم تھک ہار جاؤ گے۔ ہم اور تو کچھ بھی نہ کر سکے پر یہ ضرور ہوا ہے کہ ہمیں ضبط کرنا آ گیا ہے۔

کون سا رستہ اچھا ہے

جبار احمد تبسم، اٹک

محبت یہ نہیں کہ کسی کو چاہا جائے اور جواب میں وہ بھی اُسے چاہے۔ محبت تو کسی کی یاد میں اکیلے ہی جلنے کا نام ہے۔ محبت کسی کو پا لینے کی نہیں بلکہ کسی کو کھو دینے کا نام ہے۔ بچھڑنے سے کوئی مر نہیں جاتا البتہ اگر پیار کرنے والے دو دل بچھڑ جائیں تو اُن کے دل ایک بنجر زمین کی طرح ہو جاتے ہیں جن پر کبھی بھی کوئی خوشی کی کونپل نہیں پھوٹتی --- کہتے ہیں اگر انسان سمندر میں ڈوب جائے تو بچ سکتا ہے اور اگر جدائی کے آنسوؤں میں ڈوب جائے تو تڑپ تڑپ کر مر جاتا ہے مگر زندگی ایک پھول ہے اور ہر پھول ایک دن مرجھا جاتا ہے۔ زندگی ایک سائے کی مانند ہوتی ہے اور سائے روشنی کے محتاج ہوتے ہیں جیسے زندگی موت کی محتاج ہے۔ زندگی ایک خواب ہے اور ہر خواب کی قسمت میں ٹوٹنا ہوتا ہے۔ کوئی اس سے جا کے کہہ دے، وہ طمانیت کا چمکتا دمکتا جگنو جو آپ نے مرے لیے مرے خوابوں میں سوچا تھا، وہ لا یئے میری مٹھی میں قید کر دیجئے ساری دولت اور تعیش پرستی کی طرز زندگی لے کر مجھے ایک لمحہ روحانی مسرت اور طمانیت کا دیجئے۔ ساری دولت ہیرے جواہرات، آسائشیں اور سہولتیں اپنی جگہ مگر ان کے باوجود سکون، سچی خوشی اور روحانی مسرت کا کوئی ایک لمحہ بھی ہماری مٹھی میں قید کیوں نہیں رہتا۔ یہی سوچتا ہوں کہ درمیانے لوگ کہاں چلے گئے جو اپنوں کو اربوں روپوں کی جاگیر نہیں دے سکتے لیکن اِن کو محبت و چاہت جیسی خوشیاں ورثے میں دیتے ہیں۔ سوچتا ہوں کہ اس کے بعد کیا لکھوں۔ تم نے پوچھا ہے کہ میرے لیے کیا اہم ہے۔ کوئی لمحہ، کوئی انسان، خود میں اِس سوال کے سامنے کھڑا ہوتا ہوں تو میرے دل میں ایک ہوک سی اُٹھتی ہے اور میں لمحوں پیچھے چلا جاتا ہوں مگر جب نظر اُٹھا کر دیکھتا ہوں تو صدیوں کا بوجھ میرے کندھوں پر ہوتا ہے --- اگر تم زندگی کے سفر میں کامیاب رہنا چاہتے ہو تو اپنے لبوں کو سی لو، دُکھوں کو اپنے سینے میں دفن کر لو۔ کسی کو اپنا سمجھ کر کچھ کہنے کی کوشش مت کرنا۔ اپنے دُکھوں کو سمیٹ کر اتنے باہمت بن جاؤ کہ لوگ تمہاری مثال دیں اور ایسا انسان بننے کے لیے قربانی دینی پڑے گی، اپنی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آنکھوں کے آنسو اپنی پلکوں میں جذب کر کے اپنے لبوں پر مسکراہٹ سجانا سیکھو کیونکہ لوگ مسکراہٹ کے بدلے مسکراہٹ چاہتے ہیں آنسو نہیں مگر وقت اور انسانی زندگی کا گہرا تعلق ہے۔ جوں جوں وقت گزرتا ہے زندگی کم ہوتی جاتی ہے۔ جو لوگ وقت کو اچھے کاموں میں صرف کرتے ہیں اور دن رات ملک و قوم کے لئے محنت کرتے ہیں اُن کی زندگی سنورتی ہے اور دُنیا میں اعلیٰ مقام حاصل ہوتا ہے اور آخرت میں جنت۔ یہی لوگ کامیاب کہلانے کے حقدار ہیں۔ جو لوگ وقت کو غیر ضروری کاموں میں صرف کرتے ہیں اور اپنا وقت ضائع کرتے ہیں وہ دُنیا میں بلند مقام حاصل نہیں کر سکتے اور آخرت میں خسارہ پاتے ہیں اور یہی لوگ ناکام ہیں۔ اب ہمیں یہ سوچنا ہے کہ کون سا راستہ اچھا ہے۔

خاموشی

ملک وسیم اختر، شکر گڑھ

زبان کا بند رہنا خاموشی کہلاتا ہے۔ لیکن کہتے ہیں کہ خاموشی کی بھی ایک اپنی زبان ہوتی ہے۔ دُنیا کی ہر شے خاموشی کے ساتھ محوِ سفر ہے مگر کائنات میں کوئی شور کوئی ہنگامہ برپا نہیں۔ مثلاً سورج کو ہی لیجئے۔ سارا دن غصہ کھاتا اور کھلاتا ہے مگر یہ غصہ بھی خاموشی کی شکل میں ہے ورنہ ساری کائنات جل کر راکھ ہو جائے۔ کوئی چیز اپنی جگہ پر سلامت نہ رہے--- دوسری طرف چاند بھی اپنا سفر خاموشی کے ساتھ جاری رکھے ہوئے ہے۔ ہمیشہ میٹھی سی مسکراہٹ چہرے پر رکھتا ہے۔ جیسے دُنیا کو طنز سے کہہ رہا ہو کہ دیکھو دُنیا میں ہنگامہ برپا کرنے والو! جیو تو میری طرح' خود بھی سکون سے رہو اور دوسروں کو بھی رہنے دو---- دوسری طرف پہاڑوں کو ہی لیجئے۔ ان کی شان اور ہیبت اِن کی خاموشی میں ہی پنہاں ہے۔ آسمان اور زمین کی ساری تخلیقات اِنسان کے لیئے کوئی نہ کوئی درس رکھتی ہیں۔ ستارے بھائی چارے کی تلقین کرتے ہیں کہ زندگی گزارو ایک ضبط کے ساتھ۔ جتنا اُلجھو گے زندگی اتنی ہی مشکل بناؤ گے۔ سورج غصے میں بھی پیار کا دائمہ انداز رکھتا ہے اور چاند کو روشنی اُدھار دیتا ہے۔ پہاڑوں کی خاموشی بھی درس دیتی ہے کہ بڑے ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ گرجتے رہو مگر ہم زمین والوں پر کوئی اثر کہاں؟ ہم تو بس اپنی دُھن میں بولے جا رہے ہیں' بغیر کچھ سوچے سمجھے۔ جیسے زندگی کے یہ چار دن ملے ہی لڑائی جھگڑے کے لئے ہیں۔ خدا نے ہماری فطرت کو سمجھ کر ہی ہم میں کوئی شیر جیسا بہادر بنا دیا ہے اور کوئی گیدڑ جیسا بزدل۔ کوئی چیتے جیسا تیز بنا دیا ہے اور کوئی کچھوے جیسا سست مگر ہم ہیں تو آخر اشرف المخلوقات ہی نا! شاید اسی احساس تفاخر نے آج تک ہمیں قدرت کو سمجھنے کا موقع نہیں دیا۔

قول و فعل میں تضاد کیوں؟

سید سلیم اختر، میانوالی

ہمارے دوست کے والد صاحب لندن (ہیتھرو) ایئر پورٹ سے کسی دوسری پرواز میں کہیں جانے والے تھے تب اُن پہ یہ عقدہ کھلا کہ وہ اپنا پاسپورٹ گم کر بیٹھے ہیں۔ اُنہوں نے متعلقہ جگہ اطلاع دی۔ جواب ملا کہ پاسپورٹ آپ کو مل جائے گا' یہ کسی کے کام کا نہیں ہے۔ ہاں اگر کسی پاکستانی کے ہاتھ لگ گیا تو شاید تب نہ ملے--- سوچنے کی بات یہ نہیں کہ پاسپورٹ اُن کو مل گیا یا نہیں' ہمارے لئے لمحہ فکریہ یہ ہے کہ ہم اتنے بدنام کیوں ہیں؟ پاکستان کو اِسلام کے حوالے سے یا اِسلام کو پاکستان کے حوالے سے بدنام کیوں کیا جا رہا ہے۔ یہود و نصاریٰ ہمارے دین کو بدنام کرنے کی سازش کر رہے ہیں۔ امریکہ کے دو سو سے زائد ریڈیو اسٹیشن صرف عیسائیت کی تبلیغ کر رہے ہیں--- اِسلامی ممالک میں بم بلاسٹ ہو جائے تو اِسے ''اِسلامی شدت پسندی'' کا نام دیا جاتا ہے اور جو پچھلے دنوں امریکہ کی ریاست میں ایک طالب علم نے اپنے ساتھی بتیس طالب علموں نے قتل کر دیا' اُسے وہ ''کرسچن شدت پسندی'' کا نام کیوں نہیں دیتے؟ مغرب کو آج کل عورت کی آزادی کا وہم کھائے جا رہا ہے اور وہ اس کا الزام اِسلام کو دے رہے ہیں کہ وہ عورت کی آزادی کے خلاف ہے۔ یہود و نصاریٰ اِس حقیقت سے بے خبر نظر آتے ہیں کہ کچھ صدیوں پہلے ہی اُنہوں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ عورت بھی اِنسان ہے یعنی پہلے وہ عورت کو اِنسان ہی نہیں سمجھتے تھے اور یہ لوگ آج کل عورت کی آزادی کی بات کر رہے ہیں حالانکہ عورت کی آزادی کا تصور سب سے پہلے اِسلام ہی نے پیش کیا تھا' پھر یہ قول و فعل میں اتنا تضاد کیوں ہے؟

☆☆

میرا پسندیدہ شعر

آپ کے اعلیٰ شعری ذوق کا آئینہ دار ایک عنوان

شعر انسانی جذبات و احساسات کا ترجمان ہوتا ہے' ایک پیغام ہوتا ہے۔ آپ اپنی پسند کے چار اشعار ارسال کر سکتے ہیں اور شاعر کا نام بھی ساتھ لکھیے۔ اشعار اس پتہ پر ارسال فرمائیے۔

نگراں ''میرا پسندیدہ شعر'' ماہنامہ ''آداب عرض'' پوسٹ بکس نمبر 4132 ملتان روڈ لاہور 54500

مرینہ ابرار، تھل — صابر انصاری

تیرے اک جواب کی خاطر
تجھ سے کتنے سوال کرتے رہے

روبینہ مصور، لاہور — نامعلوم

خیالوں میں اِک جال بن کر
اُمید کی چند کرنیں چن کر
خواہش کے ساحل پر مسکرائیں
اک دوسرے کی باتیں سن کر

اشفاق شاہین اور مارہ — اعزاز آذر

بچھڑا جو تُو' تو لوگ بچھڑتے چلے گئے
تیرا خیال شہر میں تنہا بنا گیا

صاحبزادہ ذیشان کلیم معصومی، ملتان — شفیق آصف

جو تیری محبت میں گرفتار ہوئے ہیں
وہ لوگ تو رُسوا سرِ بازار ہوئے ہیں
کچھ شب کی سیاہی میں کمی آنے لگی ہے
کچھ دن کے اُجالے بھی نمودار ہوئے ہیں

خالد نذیر، لاہور — ناز

بندگی ہم نے چھوڑ دی ہے' ناز
کیا کریں جب لوگ ہی خدا ہو جائیں

سائرہ یاسمین خان، مردان — علی شاہ

محبت کی زباں میں بولتا ہے
وہ ہر اک لفظ پہلے تولتا ہے
ہر اک کو سحر میں رکھتا ہے اکثر
ہمیشہ پیار کے رَس گھولتا ہے

فرحت ہما، کوٹ... — اسلم ہمدم

عجیب بات ہے ہم قتل بھی ہوئے' لیکن
کسی بھی شخص پر الزام تک نہیں آیا

احمل صحرائی، نور پور — اسحاق

لگی ہے جو دل میں سناؤں تو کسے
تیرے بعد عیدیں مناؤں تو کسے
تیرے بعد کس کا رہوں منتظر
تیرے بعد گھر کو سجاؤں تو کسے

مرسلین موہن، اسلام آباد — حسن عباسی

شرط اتنی ہے کہ بارش کی طرح آنا تم
دیکھنا' کیسے میں شاخوں سے نکل آؤں گا

میاں جاوید جالندھری — نامعلوم

چراغ آرزو اِس دل میں کیا جلایا ہے
ترے خیال' تری یاد نے ستایا ہے
کسی کی بات میں آ کر نہ چھوڑ دینا مجھے
بڑے خلوص سے اپنا تجھے بنایا ہے

علی رضا، مری — وقار عمران

گزرتے وقت کو تم کیسے روک پاؤ گے
یہ کارواں تو ہمیشہ سفر میں رہتا ہے

جبار احمد تبسم، اٹک — محسن نقوی

آ جا کہ ابھی ضبط کا موسم نہیں گزرا
آ جا کہ پہاڑوں پہ ابھی برف جمی ہے
خوشبو کے جزیروں سے ستاروں کی حدوں تک
اس شہر میں سب کچھ ہے' بس اک تیری کمی ہے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رحمت انصاری، ملتان — اسلم ہمدم

تو میرے واسطے اس بات کا اقرار نہ کر
میں ہوں غریب، میری جان، مجھے پیار نہ کر
تمہارے عشق میں پھرتے ہیں کتنے دیوانے
معیارِ عشق میں اِن کو کہیں شمار نہ کر

علی احمد، سیالکوٹ — ناصر کاظمی

سایۂ گل میں بیٹھ کر ناصر
ہم بہت روئے وہ جب یاد آیا

صفدر عباس ڈھون، نور پور تھل — نامعلوم

میں فقط اِس جرم میں دُنیا میں رُسوا ہو گیا
میں نے جس چہرے کو دیکھا، تیرے جیسا ہو گیا
چاند میں کیسے نظر آئے تیری صورت مجھے
آندھیوں سے آسماں کا رنگ میلا ہو گیا

منتظر مہدی، نور پور — سعید عاصم

میں چاہتا ہوں، اسے قید کر دیا جائے
کہ تیری زلف سے کیوں یہ ہوا اُلجھتی ہے

شیخ عبدالرزاق، مسہ سندیلہ — ندیم اقبال

پھر وہی بول تم نے بولے ہیں
دل کے گمنام زخم کھولے ہیں
مدعا پوچھتے ہیں آنے کا
کتنے سادہ ہیں، کتنے بھولے ہیں

غلام نبی ابڑو، مورو (سندھ) — نامعلوم

اِس دُنیا کی اندھیر نگری میں، دوستو
روشنی کرنے کو کبھی گھربار جلانا پڑتا ہے

راجہ عظمت علی، چیچہ وطنی — کامی شاہ

طویل راتوں کی داستانیں
میں راستوں کو سنا رہا ہوں
وہ آنے والا نہیں ہے واپس
جسے میں واپس بلا رہا ہوں

سنجیدہ بانو، کراچی — خالد بن حامد

شہروں شہروں پھیلاتے ہیں نفرت کی بیماری لوگ
جانے کہاں سے آجاتے ہیں لاشوں کے بیوپاری لوگ
دھرتی کی مسموم فضا میں اب جینا ناممکن ہے
بہتر ہوگا، کر لیں خلا میں بسنے کی تیاری لوگ

محمد بابر، فیصل آباد — اعزاز آزر

جنوں میں ہوش کے سب سلسلے بھی ساتھ رکھتا ہے
وفا کرتا ہے لیکن فاصلے بھی ساتھ رکھتا ہے

حکیم خان حکیم، کامل پور موسیٰ — حکیم خان حکیم

ایسا روشن ہوا دماغ، حکیم
گم ہوئی روشنی اندھیروں میں
علم و حکمت کے گل چراغ ہوئے
کھو گیا آدمی اندھیروں میں

محمد رمضان پریشان جٹ، فیصل آباد — نامعلوم

یہ سال بھی گزر گیا تیرے پیار کی مانند
آتے ہوئے کچھ اور تھا، جاتے ہوئے کچھ اور

اِرسہ مون، چک نمبر 33 — نامعلوم

لہروں میں ڈوبتے رہے، دریا نہیں ملا
اُس سے بچھڑ کے کوئی بھی ویسا نہیں ملا
کچھ لوگ تھوڑی دیر کو اچھے لگے، مگر
ہم جس کے ہو سکیں، کوئی ویسا نہ ملا

نجیب اللہ اُلفت، چیچہ وطنی — علی شاہ

نت نئی ہڑتال ہے جمہوریت کے نام پر
سب حکومت ہے جھگڑا کچھ شہنشاؤں کے بیچ

اقبال حیدر، سیالکوٹ — نامعلوم

توڑ دی ہر آس کی ڈوری، آسوں میں کیا رکھا ہے
قسمت میں جو لکھا ہے، وہ آخر ہو کر رہنا ہے
عشق محبت باتیں ہیں سب، اِن باتوں میں کیا رکھا ہے
چند لکیریں اُلجھی سی، اور ہاتھوں میں کیا رکھا ہے

صباحت خالد — نامعلوم

اک یہی آس ہے کافی ہے میرے جینے میں
دل دھڑکتا نہیں، آپ دھڑکتے ہیں میرے سینے میں

حاجی مختار احمد گوندل، راولپنڈی — نامعلوم

اُسے دریدہ لباسوں کا خیال کیا آتا
امیرِ شہر کی اپنی ضرورتیں تھیں بہت

اعظم خان خٹک، ڈھوک بازگل — نامعلوم

بے رُخی اس سے بڑی اور بھلا کیا ہوگی
ایک مدت سے ہمیں اُس نے ستایا بھی نہیں

محمد بلال تری خیل، میانوالی — نامعلوم

کیونکر کہیں کہ جان سے پیارا نہیں رہا
یہ اور بات، اب وہ ہمارا نہیں رہا

راحت نصیر خان نیازی کالے خیل، میانوالی — محشر بدایونی

نہ سنا تم نے شورِ جاں اُٹھتا
اور کیا گونج آسماں اُٹھتا
محشر اصلاحِ وقت کو مرے بعد
مجھ سا بن کوئی حق بیاں اُٹھتا

سبط الحسن، واہ کینٹ — نامعلوم

میرے دامن میں رُسوائیوں کی خیرات ڈال کر
زمانے کو چراغ بانٹتا پھرتا وہ اک شخص

امبر احمد، میانوالی — نامعلوم

وہ شخص جس پہ اپنے دل و جاں نثار کر دوں
وہ اگر خفا نہیں ہے تو ضرور بدگماں ہے

ملک وسیم اختر، شکر گڑھ — ساغر صدیقی

آؤ اِک سجدہ کریں عالمِ مدہوشی میں
لوگ کہتے ہیں کہ ساغر کو خدا یاد نہیں

معظم علی، کراچی — نامعلوم

وہ چلا جائے گا زخموں کی تجارت کر کے
مدتوں اُس شخص کا اِس شہر میں چرچا ہوگا

بشریٰ علوی — قتیل شفائی

شکایتوں کی نہیں ہے قتیل کو عادت
وہ دل پہ چوٹ بھی کھا کے مکر گیا ہوگا

ریاض بٹ، حسن ابدال — نامعلوم

یہ محبت بھی ایسا ریشم ہے
ہاتھ ڈالا ہے جس نے، اُلجھا ہے

ندیم قبال، منچن آباد — خالد علیم

اُسے کہو، ہمیں بے چارگی کی خو ہے، مگر
وہ ہمارے ظرف کو اتنا نہ آزمایا کرے

صبیحہ رشید، کراچی — نامعلوم

جو رکھتے ہیں اوروں کے لئے پیار کا جذبہ
وہ لوگ کبھی ٹوٹ کے بکھرا نہیں کرتے

سیّد سلیم اختر، میانوالی — منیر نیازی

رات اِک اُجڑے مکان پر جا کے آواز دی
گونج اُٹھے بام و دَر میری صدا کے سامنے
تیز تھی اتنی کہ سارا شہر سونا کر گئی
دیر تک بیٹھا رہا میں اُس ہوا کے سامنے

عاصمہ رانی، کھیالی ٹاؤن — نامعلوم

یوں قید کیا ہے اُس نے وفا کی زنجیروں میں
خود کو آزاد کرنا چاہوں تو زنجیر کھینچ لیتا ہے

صغیر احمد عاجز، کہوٹہ — راحت امیر تری خیلوی

تمہارے سامنے جانم، جہانِ آب و گل کیا ہے
تمہارے نام میں ساری ہی کائنات لکھ دوں گا

میاں محمد ثاقب علی ظفر آرائیں، میاں چنوں — ثاقب علی ظفر

نہ جانے کون سا ظلم اور رہ گیا ہے، ظفر
دُعا وہ مانگتے ہیں میری زندگی کے لئے

مقصود بلوچ، دادو (سندھ) — محسن اسرار

جتنا مجھے سفر کے لیئے وقت چاہئے
اتنا وہ انتظار کرے گا بھی یا نہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بحث و نظر

آپ کے خطوط ہمارے انتخاب کی کسوٹی ہیں

آداب عرض کی کہانیاں اسی معاشرے میں بسنے والے کرداروں اور رونما ہونے والے واقعات کی عکاس ہوتی ہیں' منفی اور مثبت رویئوں کا اظہار بھی ان سے عیاں ہیں۔ کہانیوں اور دیگر عنوانات کے مواد کا انتخاب ایڈیٹر کی رمز شناسی پر منحصر ہے لیکن آپ اختلاف یا اتفاق کا حق رکھتے ہیں۔ آپ اپنی رائے' اپنے خیالات کا اظہار فرمایئے تاکہ ادارہ اور آداب عرض قبیلہ کے دوسرے افراد بھی اس سے استفادہ کر سکیں۔ آپ کے خطوط ہمیں اس پتہ پر ہر ماہ کی **15** تاریخ تک مل جانے چاہئیں۔

نگراں بحث و نظر ماہنامہ ''آداب عرض'' پوسٹ بکس نمبر **4132** ملتان روڈ لاہور **54500**

''آسیب'' ماورائی مخلوق کی انسانوں سے چھیڑ چھاڑ کی کہانی ہے۔ اسے حقیقی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ فرقان فیملی کا جن حالات اور واقعات سے سامنا ہے، اس کے تناظر میں پریشانی تو معمولی بات ہے۔ اگر کوئی کمزور دل رکھتا ہو تو وہ گھر سے بھاگنے میں عافیت جانے گا، یہاں تو سارا معاملہ افہام و تفہیم سے حل ہوتا رہا وگرنہ عورتیں ایسے معاملات میں کہاں چپ رہتی ہیں۔ بات کو بڑھا کر اور کہاں سے کہاں لے جاتی ہیں۔ جب حالات کی صورت تک بدل جاتی ہے اور اتنی غلط فہمیاں جنم لیتی ہیں کہ رشتے ٹوٹنے تک بات جا پہنچتی ہے۔ اختلافات دو قریبی [illegible] کو زندگی بھر کے لئے ایک دوسرے سے دور کر دیتے ہیں بلکہ بڑھ چڑھ کر اتنے الزامات لگائے جاتے ہیں کہ عزت سر بازار اچھالی جاتی ہے۔ [illegible] دیکھنے والوں کی کمی نہیں ہوتی۔ یہاں جو محبت اکبر اور نیلم کے درمیان تھی اور جیسی قرابت داری اور اپنائیت دونوں گھرانوں کے درمیان تھی [illegible] کیا اجڑتے بلکہ تباہی کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا لیکن سوچنے کی بات ہے کہ ایسے واقعات سے کیوں سامنا رہا، کیا [illegible] تھیں [illegible] کے مرتکب ہوئے کہ جنات کو خدا واسطے کا بیر ہو گیا۔ اتنی بد مزگی پیدا ہوئی، جگ ہنسائی کے ساتھ خوشی کے موقع پر شرمندگی اٹھانا پڑی۔ ہم یہ واقعات صرف پڑھ رہے ہیں۔ چند منٹوں میں یہ صفحات پڑھ ڈالے ہیں لیکن اس خاندان کی حالت کا اندازہ کیجئے جس نے طویل وقت تک غیر معمولی واقعات کا عملی طور پر سامنا کیا۔ جب ہر قدم پر مشکلات اور رکاوٹوں کا سامنا تھا۔ گو سارے حالات [illegible] حقیقی انداز تحریر میں پیش کئے گئے ہیں اس لئے دماغ میں کھٹکے ہیں، نہ خوف زدہ ہوئے ہیں۔ اب یہ تجسس ذہن میں ہلچل مچائے ہوئے ہے کہ آنے والے وقت میں زندگی کا نیا سفر شروع کرنے والے جوڑے کے ساتھ کیا بیتی ہے۔ ایک ماہ کا انتظار کافی بھاری پڑے گا ------ ''رشتوں کی تصویر'' میں قصور امجد کا نہیں ہے۔ یہ دولت اور زمین چیز ہی ایسی ہیں کہ رشتوں کا احساس مٹ جاتا ہے، پھر احساس برتری کہیں کا نہیں رہنے دیتا۔ اپنی زرعی زمین ہو، ہاری کام کر رہے ہوں، ہر حکم کے پابند ہوں۔ ان کا مرنا جینا، روزی روٹی ہاتھ میں ہو تو بندہ خود کو توپ شے سمجھنے لگتا ہے۔ گردن اکڑی ہو تو اللہ، رسولؐ اور اس کے احکامات، رشتہ داروں سے برتاؤ اور یتیم سے سلوک کی تعلیمات کہاں یاد رہتی ہیں۔ وہ اللہ کے پیارے اور جنتی لوگ ہوتے ہیں جو سب اختیارات اور نعمتیں رکھنے کے باوجود شکر گزار رہتے ہیں، خوف زدہ اور سیدھے راستے کا انتخاب کرتے ہیں۔ نذیر بٹ کوئی جاگیردار نہ تھا، بس روزی روٹی کی فکر نہ تھی۔ وہ قناعت پسند تھا، کوئی خواہش دل میں نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اسے سکون قلب جیسی دولت میسر تھی۔ پھر اللہ نے اس سے ایسا نیک کام کرایا جس کا پھل وہ دونوں جہانوں میں کھائے گا اور افتخار بھی انسانی روپ میں نیک روح ہے، انسانیت جس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ دنیاوی تقاضے اور ظالموں کو احسان کی مار سے اپنا [illegible] ہے۔ مزے کی بات ہے کہ اس میں کسی چالاکی کی، دکھاوے اور دنیاوی تقاضوں کا دخل نہیں ہے۔ اس نے چچا کو خلوص نیت سے گلے [illegible]، وہ حالات کے تھپیڑے سہتے ہوئے بکھر چکے تھے۔ اولاد کے بگڑنے کا صدمہ کافی بھاری تھا گویا اپنے مضبوط سہارے کی ضرورت [illegible] نئی زندگی مل گئی ہے۔ ان کی کامیابیوں اور خوش قسمتی کا اندازہ لگا لیجئے۔ دو مائیں اور دو باپ اس کی سلامتی کے لئے دعائیں مانگتے رہتے ہیں۔ ایسی اولاد سے مصیبتیں اور پریشانیاں کنی کترا کر نکل جاتی ہیں ------ ''آخری لڑکی'' احمد اعجاز کی نامکمل رہ جانے والی کہانی ''وقت کی [illegible]'' [illegible] میں تھہراؤ کی بجائے واقعات میں روانی ہے۔ اسے احمد اعجاز بھائی کی احتیاط پسندی سمجھا جائے یا یہ

انداز، سابقہ تحریر کے حوالے سے قارئین کی رائے کو مدنظر رکھ کر اپنایا گیا ہے۔ بہر حال، اب دلچسپی، تسلسل اور تجسس یکجا ہو گئے ہیں۔ شرجیل سادہ، بے ضرر، خود کو بچا کر رکھنے والا اور ضرورت مند جوان ہے۔ اس کے جذبات، خیالات اور شرافت پر شب خون مارا جا رہا ہے۔ اشاروں، حرکات اور چھیڑ چھاڑ سے اسے ایسی سٹیج پر لایا جا رہا ہے جہاں اسے پھڑ کنے کا موقع تک نہ ملے گا اور وہ شکاری کے ہاتھ آ کر اسی کے رحم و کرم پر ہوگا۔ جب اس کے منہ خون لگ جائے گا، سہولیات اور آسائشات کا عادی بن جائے گا تو قید قفس بھی عیاشی کے زمرے میں آئے گی۔ پھر سارہ تو باؤلی ہوئی پھرتی ہے۔ وہ ایک خود مختار عورت ہے۔ وہ کسی کروڑ پتی کی بیوہ ہے۔ حسن اور اداؤں کے جلوے دکھا کر کسی حسن پرست سے ساری جائیداد اپنے نام کروا کر اسے دھتکار چکی ہے، اسے کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ دن رات اس کے اپنے ہیں۔ بیٹی اپنے کمرے تک اور نوکرانی ثمینہ سرونٹ کوارٹر تک محدود ہیں۔ پر محل نما رہائش میں لاتعداد کمرے ہیں، کسی کے ڈسٹرب کرنے کا امکان ہی کہاں رہتا ہے؟ اب تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ شرجیل آسان شکار ثابت ہوتا ہے یا کسی حد تک مزاحمت کر پائے گا، ہم تماشائیوں کے ہجوم میں کھڑے سب دیکھنے کے لئے تاب ہیں ------ ''عذاب مسلسل'' میں زینت کا فیصلہ آسان نہ تھا۔ عامر جیسے دیکھے بھالے، خوبصورت، تعلیم یافتہ اور گویا گھر کے لڑکے کو نظر انداز کرنا خاصا مشکل تھا۔ پھر لڑکیوں کے لئے اس کی ذات آئیڈیل کی طرح تھی۔ محض انا کی تسکین اور اس کی خود پرستی کو چیلنج کرنے کو سارے جذب، خواہش اور خوابوں پر اپنی ذات کو ترجیح دی۔ ادھر عامر نے دل کی دنیا ویران کر لی، تعبیر محض ایک ہاتھ کی دوری پر تھی لیکن خود غرضی کی انتہا کر دی۔ چاہتا تو عابدہ کا ہاتھ پکڑ سکتا تھا، یوں بات رہ جاتی لیکن پیچھے مڑ کر دیکھنے کی زحمت نہ کی۔ شاید وہ اپنے تاثرات چھپانا چاہتا ہو لیکن سارے دلوں میں ایک کسک رہے گی بلکہ میرا مشورہ ہے کہ اس تکون سے زینت کو نکل جانا چاہئے۔ وہ ایک اعلیٰ مقام پر ہے، محض ایسی باتیں سوچنا بھی خیانت کے زمرے میں آتا ہے۔ حسب روایت اشعار ہونے کے باوجود راحت وفا صاحبہ نے ہر کردار کے جذبات کی صحیح ترجمانی کی ہے جس کے لئے میرے نیک جذبات قبول فرمائیے ------ ''مرحلے وفا کے'' میں توصیف نئی مہم پر نکلے ہیں۔ وہ ہر مشکل صورت حال کا مقابلہ کرنا جانتے ہیں۔ پھر [illegible] ساتھ ہے، خطرہ وہاں بظاہر ہر کوئی بات نہیں لیکن کبھی حادثے اور انہونیاں تاک میں ہوتی ہیں۔ ناقابل اعتبار صورت حال بن جاتی ہے لیکن مقصد نیک ہے۔ پگلی ہوئی روحیں آزاد کرانا چاہتے ہیں۔ جو لوگ انہیں اس دلدل تک پہنچانے کے ذمہ دار ہیں۔ حیران بیٹھا ہوں [illegible] کے شکنجے میں کیوں نہیں آتے، کسی آزار میں مبتلا نہیں ہوتے۔ کوئی ناگہانی افتاد پڑے اور لنگڑے ہو جائیں، بھلا ان معصوم لڑکیوں کو کس جرم کی سزا ملی؟ والدین، بھائی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں، عمر بھر کا رونا نصیب بن گیا ہے۔ کوئی مستقبل نہیں۔ جب زندگی کا کوئی مقصد سامنے نہ ہو تو کون جینا چاہے گا لیکن ایسے ذمہ داروں کو سزا جب تک ملے گی تب تک وہ کئی دوسرے گھر اجاڑ چکے ہوں گے اور کتنی لڑکیاں، عورت بن جائیں گی۔ آخر توصیف کس کس کو انصاف دلائے گا۔ یہ سچ ہے کہ ایسی لڑکیوں پر گھر والے فاتحہ پڑھ چکے ہوتے ہیں۔ وہ انہیں قبول کر کے نئے سرے سے کیسے زخم تازہ کریں، ملنے جلنے والوں کا کیسے سامنا کریں، بے سروپا سوالوں کا کیا اور کب تک جواب دیں؟ یہ بڑا نازک معاملہ اور المیہ ہے۔ ہم انفرادی طور پر ایسے تنگ معاشرہ افراد پر نگاہ رکھ کر کسی حد تک روک ٹوک کر سکتے ہیں۔ یہ لوگ اگر نظر میں آ جائیں تو اپنی دہشت کے باوجود احتیاط برتتے ہیں اور کچھ ایسی ہی نظر ہمیں اپنی جوان بچیوں پر رکھنی ہوگی۔ کہاں نکیل کی کمزوری اور کہاں اونٹ کی طاقت اور سرکشی، بس یہ توفیق کی بات ہے۔ بس اللہ سب کو نیک راہ پر چلائے اور دل میں انسانیت کا درد ڈال دے تو معاشرہ کے سلجھاؤ کی امید کی جاسکتی ہے ورنہ توصیف جادو کی چھڑی سے بھی سب کو ایک ساتھ نہیں ہانک سکتا۔ بھائی نسیم جاوید سید صاحب! جب آپ سعودی عرب میں قیام، وہاں کے شہروں اور معاشرت کی بات کرتے ہیں تو کتنی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں اور میں یہ سب بڑی توجہ اور شوق سے پڑھتا ہوں۔ میرا ایک وقت میں وہاں چالیس دن سے زیادہ کبھی قیام نہیں رہا۔ حج اور عمرہ کی ادائیگی کا کئی بار موقع حاصل ہوا۔ اب اس سرزمین سے ایسی انسیت ہو گئی ہے کہ خوابوں خیالوں میں خود کو وہاں پاتا ہوں۔ امید ہے، آپ یہ روایت وقتاً فوقتاً جاری رکھیں گے ---- ''بربادولوں کا قصہ'' کے ارسلان شکی مزاج [illegible] زیادہ چڑچڑے دکھائی دیئے۔ ایک وجہ شراب پینا ہے لیکن حالات بتاتے ہیں کہ انہیں تنہا کر دیا گیا۔ جب بیٹی کے لئے لڑکا ڈھونڈ اجا [illegible] مشورہ [illegible] دکھائی نہیں دیا۔ شاید انہیں یہی دکھ ہو وگرنہ شادی شدہ بیٹے اور جوان بیٹی کے ہوتے ہوئے بیوی کو ایک نظر سے دیکھنا اور برملا الزام تراشی کی کوئی وجہ سامنے نہیں ہے۔ اس کے باوجود میرا کا سخت اور فیصلہ کن رویہ بھی درست نہیں ہے۔ غلطیاں کس سے نہیں ہوتیں؟ لوگ تحمل [illegible] غصہ میں منہ سے گزر جاتے ہیں، دوسرے کی جان تک لے بیٹھتے ہیں لیکن جب شرمندگی کے ساتھ معافی مانگ لی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جائے اور اپنی زیادتی کا اعتراف کرلیا جائے تو صلح کرلینا بہتر عمل ہے۔ پھر ارسلان تو ایک طرح سے معذوری اور لاچاری کی زندگی گزار رہے تھے۔ سمیرا کے پاس اپنے فیصلہ پر اب بھی نظر ثانی کا وقت ہے، ان کا رشتہ شرعی طور پر قائم ہے۔ اگر دو بچھڑے مل جائیں تو کوئی رکاوٹ اور ممانعت نہیں ہے۔ ''عشق بیڑی کا لچ دی'' میں نجمہ کی منافقت پر حیران ہوں کہ وہ پھوپھو ہوتے ہوئے کیسی دورخی پالیسی اپنائے ہوئے ہیں اور محض پیسہ اور جائیداد کے لئے دلوں میں آگ بھڑکاتی پھرتی ہیں۔ وہ یہ بھول رہی ہیں کہ کفن کی جیب ہی نہیں ہوتی۔ دوسری بات یہ ہے کہ لالچ کی آخر کتنی حد ہے، دو روٹی سے زیادہ کس کی طلب ہوتی ہے؟ جتنے لذیز کھانے کھالو، ذائقہ اور سواد منہ تک ہے، اس کے بعد اس کی شکل تو محض گند میں تبدیل ہو جاتی ہے اور یہ دولت، جائیداد اور نعمتیں کس کے نصیب میں ہوں گی، کون جانتا ہے اور ماہا بھی تصویر کا ایک رخ دیکھ رہی ہے، کسی معاملے پر ٹھنڈے مزاج سے بیٹھ کر غور ہی نہیں کیا۔ اپنی سوچوں کے مطابق تول اور پرکھ رہی ہے اور صرف بلال سے دشمنی پر تلی ہوئی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ گھریلو حالات موافق ہوں تو تبلیغ دین کے لئے نکلنا چاہئے، جب قریبی اور زیر کفالت لوگ ڈسٹرب ہونے لگیں تو مناسب وقت اور موقع کا انتظار کر لینا چاہئے۔ دراصل بلال میں یہ تبدیلی راتوں رات آئی ہے اس لئے سب حیران ہیں اور ان کا یہ مولوی پن انہیں ہضم نہیں ہو رہا۔ شاید گھر میں پہلے مذہبی فرائض اور عقائد کا اہتمام نہیں ہوا ہو گا اس لئے وہ عجیب شخصیت بن گئے ہیں لیکن سوچنے کی بات ہے کہ ان میں جیسی تبدیلی آئی ہے، کسی دوسری ذات کو نقصان کیا ہے؟ وہ بھی زور زبردستی کرتے نظر نہیں آئے تو سب کو ان حالات کو ایزی لینا چاہئے۔ یوں تماشہ بنانے اور دکھانے والی بات بن جائے گی لیکن اب بہتری کی امید لگی ہے۔ اب جندر کور نے ماہا کے دل میں چنگاری چھوڑی ہے۔ سوچنے، سمجھنے کا موقع بن رہا ہے۔ یہی بات قریب لانے اور غلط فہمیاں دور کرنے کا بہانہ بن جائے تو کہہ سکتے ہیں کہ مہانوں کا آنا مبارک ثابت ہوا ہے۔ ماہا نے تھوڑی سی لچک لے لی تو گئی رتیں لوٹ آئیں گی اور پچھتاوے اتنا قریب کر دیں گے کہ ہم جیسے خیر خواہی چاہنے والوں کا کوئی حال تک پوچھنے نہ آئے لیکن ہم بھلے لوگ ہیں۔ ایوارڈ لینے کی خواہش نہیں رکھتے، بس دعا گو رہتے ہیں کہ بچھڑے مل جائیں ... اور کھڑے رہ کر بھی خوش ہو لیں گے ---- ''بیساکھیاں'' میں گلشن کتنا دردمند دل رکھتی تھی، ایثار کا جذبہ بھی تھا ورنہ حسن علی گاؤں کا آئیڈیل جوان تھا۔ ملازمی تھا جس کی دیہاتوں میں عزت اور کافی آؤ بھگت ہوتی ہے لیکن گلشن محض انسانی ہمدردی میں اس سے دستبردار ہونے کو تیار تھی۔ یہ معمولی قربانی نہیں ہے لیکن آخر اس سے کہاں خطا سرزد ہوئی کہ وہ بھی عمر بھر کے لئے لنگڑی ہوگئی؟ بس قدرت کے رنگ نرالے ہیں۔ جو ہمیں نظر نہیں آرہا ہوتا ہے، وہ دیکھ رہی ہوتی ہے۔ سارے فیصلوں کا اختیار بھی اسی کے پاس ہے۔ جو شاکر ہو گیا، اسے نواز دیا گیا ورنہ دھکے، ذلالت اور پریشانیاں حصے میں آتی ہیں۔ پھر ایسی محرمیوں پر مفت کے رونے سے بہتر ہے کہ اپنی ابھی سے اصلاح کرلی جائے۔ پھر دیکھئے کیسے لوح وقلم ہمارے ہاتھ اور اختیار میں دیئے جاتے ہیں لیکن اس کے لئے شرط وفا ہے۔ دیکھنا ہوگا کہ ہم اس پر کتنا پورے اترے ہیں اور ناقابل فراموش واقعات میں بھی کوئی مختصر واقعہ اتنا اثر کرتا ہے کہ افسانہ، ناول اور طویل داستان کی اہمیت نہیں رہتی بلکہ ایسی کہانیوں میں کرداروں کی زیادتی ابھاردیتی ہے۔ ''وہ جسے چاہے، عزت دے'' یا ذلت دے کر پورے معاشرہ میں عبرت کا نشان بنادے۔ وہ طاقت رکھتا ہے اور قادر ہے اور آپ نے اپنے اردگرد دیکھا ہوگا کہ بااثر طبقہ کسی غریب کسان، اپاہج یا مزدور کی بیٹی اٹھالے جاتے ہیں۔ اسے نوچتے ہیں، اذیتیں دیتے ہیں۔ چند دن بعد اس مظلوم لڑکی کی لاش ویران کھیتوں میں یا نہر میں تیرتی ملتی ہے اور عیاش جوان اپنی اوطاق میں بیٹھا خباثت سے مسکراتے ہوئے نیا شکار تاڑ رہا ہوتا ہے۔ اب انصاف سے جواب دیجئے کہ لڑکی کا کیا قصور تھا کہ عزت گنوانے کے ساتھ جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھی اور درندگی کے مرتکب کو کیا سزا ہوئی؟ یہاں خان صاحب کا تو جرم اس لحاظ سے معمولی سا ہے لیکن زندگی کی صحیح راہ متعین کرنے کا آئینہ ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہم کب عبرت پکڑتے ہیں؟ ''جب گردش آتی ہے'' تو سب کچھ الٹ پلٹ ہو جاتا ہے لیکن اس خاندان کے ساتھ انہونی ہوئی۔ کتنی اموات کے بعد نوجوان بیٹی پاگل ہوگئی جسے سنبھالنا عذاب سے کم نہیں ہوتا۔ یہاں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ مریضہ تھی یا واقعی سایہ والا مسئلہ تھا۔ جیسے اس نے اپنی حفاظت کرتے ہوئے اوباش لڑکے کو ہانڈی مار کر زخمی کیا، پھر شرعی خاوند کو اپنے جسم کو ہاتھ نہ لگانے دیا اور اسے پہلوان کی طرح زمین پر پٹخ دیا۔ یہ بیماری سے ہٹ کر دوسری بات لگتی ہے۔ اگر اہل رائے کو تسلیم کرلیا جائے تو یہ بربادی اتفاق کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ کسی غلطی کی پاداش میں غیر ماورائی مخلوق کی کارروائی لگتی ہے۔ ''کیسے ذہین لوگ'' میں فراڈ بزرگ کی منصوبہ بندی اور ذہانت کی داد دیجئے۔ ان نے کیسا جال بچھایا اور کامیاب اداکاری سے سادہ لوحوں کو چکما دے گئے۔ سچی بات ہے کہ جب لالچ ذہن میں جگہ بنالے تو تعلیم یافتہ طبقہ بھی مات کھا جاتا ہے۔

دیہاتیوں کی بات ہی دوسری ہے۔ اب بھی کئی مبارک باد کے خط لئے پھر رہے ہوتے ہیں کہ شہر میں پلاٹ نکل آیا ہے، بس یہ معمولی رقم جمع کرانا ہوگی۔ کبھی کوئی موبائل کمپنی کا نمائندہ بن کر پانچ لاکھ انعام کی خوشخبری سناتا ہے۔ لاکھ سمجھانے کے باوجود بھی لوگ اعتبار کر لیتے ہیں حالانکہ کئی بار گھر کی بوڑھی عورتیں سونا اور جمع پونجی دگنی کرانے کے چکر میں محروم ہو چکی ہیں۔ چور، ٹھگ، ڈاکو اور جیب کترے نت نئے طریقے ایجاد کرتے ہیں۔ روزانہ بھیس بدل کر نکلتے ہیں اور شام کو خالی ہاتھ گھر نہیں لوٹتے۔ بیوقوف پیدا ہوتے رہیں گے اور ان نوسربازوں کے رزق کا سامان ہوتا رہے گا۔ ''ہمدردی کی آڑ میں'' دراصل ہم صنف نازک کی اداؤں کا شکار ہوتے ہیں اور تعلق بنانے میں جلد بازی کا مظاہرہ کر کے اپنے حساس جذبوں کو طمانیت دیتے ہیں۔ دل میں ہی خیال کیجئے کہ کوئی عام صورت لڑکی نے بہروپ ہی ایسا بھرا کہ گھر بار نہ دیکھا اور اپنی ضمانت پر ادھار لے کر دیا تو اب کف افسوس ملنے سے بہتر ہے کہ اپنی بیوقوفی پر مسکرائے اور آئندہ محتاط رہے۔ ''حسن باوفا نہیں'' میں جب بیوی کے کرتوت آنکھوں سے دیکھ لئے ہیں یا تو معافی قبول کر لیتے اور یہ شرعی طریقہ بھی ہے لیکن اپنی محبتوں کے جواب میں بے وفائی برداشت نہیں کر سکے۔ اسے فارغ کر چکے ہیں تو اب مستقبل کی سوچئے۔ بقول آپ کے، خوبصورت اور جوان ہو، ذاتی مکان اور اچھی سروس ہے تو نئے سرے سے گھر بسایئے اور نئی زندگی کا آغاز کیجئے۔ یوں رونے دھونے سے خود کو ایذا نہ دیجئے۔ یوں تو آپ تماشہ بن جائیں گی اور بیوی کو اپنی بیگناہی کا یقین دلانے میں آسانی ہو جائے گی اور آپ ظالم اور شکی مزاج گردانے جائیں گے۔ خود کو سنبھالئے اور نئے حالات میں ڈھالئے، زمانے کے ساتھ تب ہی چل سکیں گے۔ ''اصول زندگی'' جیسا یقین صرف مولانا برکت علی جیسے نیک لوگوں کا خاصا ہے اس لئے زمین، جائیداد اور ملازمت نہ ہونے کے باوجود سکون کی زندگی گزارتے ہیں۔ ادھر ہم ہیں پورے سال کا اناج گھر میں ذخیرہ کر کے بھی مطمئن نہیں ہوتے اور جائز و ناجائز ذرائع استعمال کر کے دوزخ خریدتے ہیں۔ اگر تقویٰ اپنا کر سیدھی راہ چلیں اور صبر شکر سے رہیں تو رزق کے کئی وسیلے پیدا ہو جاتے ہیں اور بھی پشیمانی سے سامنا نہیں رہتا۔ بھائی نسیم جاوید سید صاحب! غیر حاضری کی وجہ عمرہ کی ادائیگی کے لئے سعودی عرب میں ہونا تھا۔ یاد کرنے کا شکریہ قبول کیجئے۔ صفحہ نمبر 179 پر معلومات ہی معلومات میں خانہ کعبہ کی بلندی غلط عرض کی گئی ہے۔ قارئین کی معلومات کے لئے پوری عمارت کی پیمائش لکھ رہا ہوں جو کچھ یوں ہے۔ موجودہ عمارت سلیٹی رنگ کے بڑے پتھروں سے بنی ہوئی ہے۔ دروازہ مسجد کے صحن سے چھ فٹ اونچا ہے۔ چوڑائی تقریباً 33 فٹ، اونچائی 45 فٹ اور لمبائی تقریباً 55 فٹ ہے۔ حجر اسود مشرقی کونے میں چار فٹ کی اونچائی پر ہے۔ اس عمارت کے اردگرد جو جگہ ہے، وہ مسجد الحرام کہلاتی ہے جو صحن اور طویل اور وسیع برآمدوں پر مشتمل ہے۔ اس کا رقبہ 150 ایکٹر کے قریب ہے۔

✿ ..... اعجاز حسین سٹھار، نور پور تھل

اگست کا تازہ شمارہ میرے سامنے ہے۔ قرآن و حدیث کے حوالے سے ایک مفصل اور جامع مضمون لکھنے پر م۔ قادر یوسفی ڈھیر والی مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ منظوم حکایات میں تمام نعتیں قابل تحسین ہیں۔ خصوصی طور پر ابراہیم حسان اور ضیاء الدین صاحب کو اتنا لکھنے پر تہہ دل سے مبارک باد۔ نظموں میں ''ابھی بچھڑنے کے دن نہیں'' عکاشہ سحر ملتان اور ''فریاد'' زینب نور اولاڑہ پسند آئیں۔ کہانیاں تمام ہی اچھی تھیں۔ غزلوں میں ثاقب چوہان، شکیل سالک، امین اڈیرائی، صابر انصاری، نعیم اختر، جیول کمار، ایم ڈی کنول کا کلام بہت پسند آیا۔ قارئین اور لکھاری اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔

✿ ..... یادش منصور

اس خط کے لکھنے کا مقصد صرف اور صرف ڈاکٹر ماریہ جوزف کو خراج پیش کرنا ہے۔ اُف، کس قدر اچھی ہیں۔ میں نے سارے مسائل بغور پڑھے۔ زبردست جوابات تھے۔ بہت زبردست، ڈاکٹر ماریہ جوزف! جانے کتنے لوگ ہیں جو اس قسم کی ذہنی بیماریوں کا شکار ہیں اور خود کا علاج نہیں کراپاتے مگر اس ''آداب عرض'' کے توسط کتنے ہی لوگوں کا بھلا ہو رہا ہے اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو کہ ڈاکٹرز کی فیس افورڈ نہیں کر سکتے، اُن کے لئے بھی آسانی ہے اور جب ڈاکٹر مریضوں کے ساتھ ایسا مخلص ہو تو مریض بات کر کے ہی صحت یاب ہو جایا کرتا ہے، بات یقین کی ہوتی ہے۔ مجھے اسقدر اچھا لگا یہ سلسلہ کہ لکھنے بیٹھ گئی کہ اُن کو اپنی بے شمار دعائیں دے ڈالوں اور نہ جانے وہ کتنی ہی دعائیں اکٹھی کر رہی ہیں، جزاک اللہ! میری بہت ساری دعائیں ڈاکٹر ماریہ صاحبہ کو، خوش رہیں اور یونہی انسانیت کی خدمت کرتی جائیں کہ دعائیں بہت طاقتور ہوتی ہیں اور نجات کا ذریعہ بن جایا کرتی ہیں۔ اللہ پاک آپ کو آپ کی نیک نیتی کا پھل دے۔ میرے نزدیک انسان کا انسان ہونا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ضروری ہے، چاہے ہو کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو۔ ''آداب عرض'' کے لئے بہت سی دعائیں!

✿...... **عظمیٰ شکور، ہڑ ودھا**

اس دفعہ سوچا کہ کیوں نہ تبصرہ لکھا جائے اس لئے قلم اٹھایا اور تبصرہ لکھنے بیٹھ گیا۔ اس دفعہ آداب عرض 12 ستمبر کو ملا۔ سب سے پہلے خالد صاحب کی بہت ہی اچھی غزل پڑھنے کو ملی۔ خاص کر اس کا شعر بہت اچھا تھا---

پنکھڑی ہیں گلاب کی وہ لب
تیز خنجر زباں ہے کیا کہیئے

اس کے بعد قادر یوسفی کی ''حضرت یونس'' پر تحریر بہت اچھی تھی۔ معلومات میں اضافہ ہوا---انور علیگی کی ''آسیب'' کی پہلی قسط بہت اچھی تھی---راحت وفا کی تحریر بہت ہی اچھی ہوتی ہے---''عشق کانچ کی سیڑھی بھی بہت اچھی تھی---''مرحلے وفا کے'' پڑھ کر معاشرے کے بگاڑ کے حل بارے معلوم ہوا کہ ہم کس طرح بگاڑوں سے بچ سکتے ہیں---''نا قابل فراموش میں بھی تحریریں اچھی تھیں۔ خاص کر'' کیسے ذہین لوگ، حسن باوفا نہیں'' پڑھ کر پتہ چلا کہ دنیا میں عورتیں کیسے کیسے کام کر جاتی ہیں۔ سوچ نگر میں راشد عباسی، عافیہ احمد، میاں عقیل احمد، محمد قبال عامر، سید وہاب، محسن بشیر، زوب شاذ، تاج ہریانوی، محمد ارقم، کامران شہزاد اور ارسہ مون کی تحریریں لاجواب تھیں۔ ''میرا پسندیدہ شعر بھی چھا جا رہا ہے، ایک شعر ایک پیام'' بھی اچھا تھا۔ آخر میں ریاض حسین تبسم چوہان کے نام شعر---

کوئی تو آئے گا اس دل کے ویران خانے میں
اس امید پر گزری ہے صبح و شام میری

✿...... **میاں شاہد سلیم، اخلاصپور شکر گڑھ**

اگست کا تازہ شمارہ سامنے ہے۔ آداب عرض میں نو وارد ہوں۔ تمام لکھاری جتنی جانفشانی سے لکھتے ہیں اور جس انداز سے ان مضامین کی ترتیب ہوتی ہے، اس میں آداب عرض کے مدیر اعلیٰ سٹاف بے حد مبارکباد کے مستحق ہیں۔ تمام کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ نظموں میں عکاشہ سحر سان کی ''ابھی بچھڑنے کے دن نہیں ہیں'' بہت اچھی لگی۔ فریاد زینب نور کی نظم پسند آئی۔ غزلوں میں شکیل سالک، صابر انصاری، نعیم اختر، امین برائی کامران شہزاد، ثاقب چوہان اور پادش منصور کا کلام بے حد پسند آیا۔

✿...... **جیول کمار جیول، رحیم یار خان**

اگست کا آداب عرض ۱۲ تاریخ کو خریدا۔ ٹائٹل روایتی انداز لئے اچھا لگا۔ طویل حقائق میں ''آخری لڑکی، دکھ کی ہوائیں'' اچھی اور دکھی لوں کی غماز کہانیاں ہیں---منظوم حکایات میں ''حمد'' اور ''نعتیں'' معیاری اور قابل قدر ہیں۔ منظومات میں اسحاق ظفر، جواد حسنین بشر، لزار بخاری، اشرف خان اشرف، عکاشہ سحر، سیدہ آمنہ اور ابن عظیم فاطمی نے بہت متاثر کیا ہے۔ غزلیات میں شکیل احمد شکیل، سید اطہر علی یاب، سید فہیم الدین، حفیظ انجم، صفدر علی صفدر، مبشر سعید، قدیر رانا، محسن سلیم، رضا مہدی، لیلیٰ خٹک، مسعود رضا، باسط اسمٰعیل باسط، جیول کمار بل، ہما شاہ نے بہت عمدہ اشعار سے نوازا ایم زیڈ کنول نے کیا خوب کہا ہے---

کنول کو آب میں رکھا تو خوشبوئیں بولیں
جہان خاک میں ہم بے ادب نہیں رکھتے

انور اقبال انور کا خیال---

نظریں ملا کر مجھ کو وہ مدہوش کر گئے
آنکھیں تھیں اس کی یا کوئی جام تھا

ریحانہ صادق روحی کا شعر دیکھئے---

کیوں کسی سے کوئی سوال کریں
اپنی عزت کا پاس رکھتے ہیں

افضال عاجز کی غزل کا مطلع کیا خوب ہے---

خواب سے باہر نکل تعبیر بن، نزدیک آ
اے نگار انجمن، غنچہ دہن نزدیک آ

علاوہ ازیں ثاقب چوہان، [illegible] اختر عاکف، بہزاد جاذب، شکیل سالک اور عبد العزیز چشتی کا کلام قابل ستائش ہے۔

✿ **حکیم خان حکیم، کامل پور موسیٰ**

☆☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عِلم و عرفان پبلشرز کی نئی کُتب

مشہور صحافی

دستگیر شہزاد

کے قلم سے لکھی جرم و سزا کی سچی کہانیاں

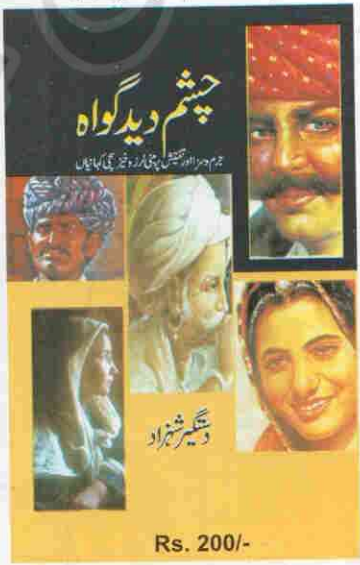

پاکستان کے مشہور و معروف رائٹر
امجد جاوید کا نیا ناول

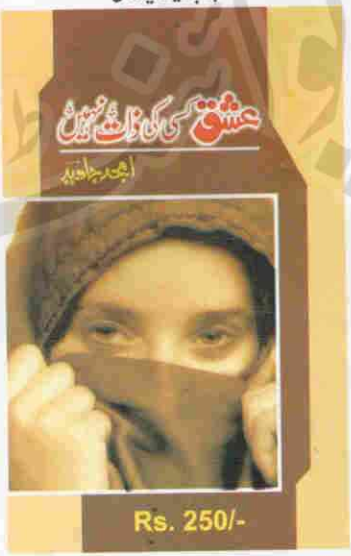

کتب اپنے قریبی بکسٹال یا براہِ راست ہم سے طلب فرمائیں۔

عِلم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40-اُردو بازار، لاہور۔
فون: 7352332، 7232336 فیکس: 7223584
www.ilmoirfanpublishers.com E-mail: ilmoirfanpublishers@hotmail.com

Courtesy www.pdfbooksfree.pk